مارچ 2021
گھر کے ہر فرد کے لیے
پاکیزہ
www.pklibrary.com

اداریہ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پرنٹر: نیشان رسول مقام اشاعت نگراز نذفلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

عزیز قارئین کرام! السلام علیکم

جس طرح بہار کی آمد پر نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور پھر وہ خوب صورت پھول و پھل اور... تومند درخت کی صورت ابھر کر سامنے آتی ہیں بالکل اسی طرح 23 مارچ 1940ء کو دو قومی نظریے کی کونپل کو استحکام حاصل ہوا اور بالآخر قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت اور ان کے مخلص ساتھیوں کی انتھک محنت اور جدوجہد کے بعد مملکتِ خداداد پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مارچ کے شروع ہوتے ہی ہر طرف سبزہ اور ہریالی نمو پانے لگتی ہے اور بہار کے موسم میں پھولوں کے ساتھ، ساتھ ذہن و دل میں بھی کچھ کلیاں سی کھل جاتی ہیں اور ہم ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اس مملکتِ خداداد میں اپنے فرائض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ......

مارچ میں بہار کی آمد کے ساتھ خواتین کا عالمی دن بھی منایا جاتا ہے۔ اور ہم مغربی تقلید کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس دن کو بھی مناتے ہیں حالانکہ مذہب اسلام میں عورت کو جو آزادی اور مقام و مرتبہ حاصل ہے اس کے لیے کوئی ایک دن مخصوص نہیں ہے اور دین اسلام میں عورت کو جو تحفظ حاصل ہے وہ کہیں اور حاصل نہیں......

ان تمام باتوں سے ہٹ کر نئی نسل سے ہمیں پوری امید ہے کہ وہ اس ملک کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار رہیں گے اور بالخصوص خواتین اپنے مقام اور مرتبے کو پہچانتے ہوئے اپنی تمام مثبت صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گی۔

مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں

پھر ہم نے اس کے بعد کئی رسولوں کو ان کی اپنی، اپنی قوم کی طرف بھیجا۔ پس وہ ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے پھر جس، جس بات کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، اس پر وہ ایمان نہ لائے۔ اسی طرح ہم حد سے بڑھ جانے والوں کے دلوں پر چھاپ لگا دیتے ہیں۔ (۷۴) پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی آیتوں کے ساتھ بھیجا۔ پس انہوں نے بڑائی چاہی۔ اور وہ جرم کرنے والے لوگ تھے۔ (۷۵) پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا۔ تو انہوں نے کہا یقیناً یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ (۷۶) موسیٰ نے کہا کہ جب تمہارے پاس حق آیا تو تم یہ کہتے ہو کہ کیا یہ جادو ہے اور جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے۔ (۷۷) انہوں نے کہا کہ کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ جس (مذہب) پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا تو ہمیں اس سے پھیر دے۔ اور تم دونوں ہی کے لیے زمین پر بڑائی ہو جائے۔ حالانکہ ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ (۷۸) اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر زیادہ علم رکھنے والے جادوگر کو لاؤ۔ (۷۹) پھر جب جادوگر آگئے، موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ڈالو۔ (۸۰) پس جب وہ ڈال چکے، موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو، وہ تو جادو ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اسے عنقریب باطل کر دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کے عمل کو درست نہیں ہونے دیتا۔ (۸۱) اور اللہ تعالیٰ اپنی باتوں کے ذریعے سے حق کو حق ثابت کر دیتا ہے اگرچہ جرم کرنے والوں کو برا ہی لگے۔ (۸۲) پس فرعون اور اس کے سرداروں کے خوف سے کہ وہ انہیں تکلیف نہ پہنچائیں۔ موسیٰ پر اس کی قوم کی نسل کے کچھ لوگوں کے سوا اور کوئی بھی ایمان نہ لایا۔ اور یقیناً فرعون زمین میں سرکش تھا۔ اور بے شک وہ زیادتی کرنے والوں میں سے تھا۔ (۸۳) اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو۔ پس اگر تم فرمانبردار ہو تو اسی پر بھروسا رکھو۔ (۸۴) پس انہوں نے کہا ہم نے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا ہے۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں ظالموں کی قوم کے لیے آزمائش نہ قرار دے۔ (۸۵) اور ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ کافروں کی قوم سے نجات دے۔ (۸۶) اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ تم دونوں اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر بناؤ۔ اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ بناؤ اور نماز قائم کرو، اور مومنوں کو خوشخبری دو۔ (۸۷) اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمیں ظالموں کی قوم کے لیے یقیناً تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگانی میں زینت اور مال دے رکھا ہے۔ اے ہمارے پروردگار اس لیے کہ وہ تیرے راستے سے بھٹکا ئیں۔ اے ہمارے پروردگار ان کے مالوں کو مٹا دے۔ اور ان کے دلوں پر سختی رہنے دے۔ پس وہ نہیں ایمان لائیں گے جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ (۸۸) (خدا نے) فرمایا کہ یقیناً تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی۔ پس تم دونوں ثابت قدم رہو۔ اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کرو، جو علم نہیں رکھتے ہیں۔ (۸۹)

(سورۂ یونس ۱۰ پارہ ۱۱ آیات ۷۴ تا ۸۹)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا كَلِیْمُ اللّٰہ ﷺ

ہمارے پیارے نبی، افضل الانبیا، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا کلیم اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی و مفہوم اللہ سے کلام کرنے والے، اللہ کے دوست کے ہیں۔

1۔القرآن: (اللہ سے کلام کرنے والے.....)

۱۔ ترجمہ: اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو صرف وہی کہتے ہیں جو انہیں وحی کی جاتی ہے۔

(سورۂ نجم آیت ۴۔)

اللہ کے دوست.....

۲۔ ترجمہ: یہی خدا میرا پروردگار ہے، میں اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(سورۂ شوریٰ آیت ۱۰)

2۔الحدیث: (اللہ سے کلام کرنے والے)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جتنے انبیا بھی مبعوث ہوئے ہیں ان میں سے ہر نبی کو ایسے ہی معجزات عطا کیے گئے جیسے اس سے پہلے نبی کو مل چکے تھے اور جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھے جو چیز دی گئی ہے وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف نازل فرمائی اور قیامت تک باقی رہے گی کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ روزِ قیامت میری پیروی کرنے والے تعداد میں سب سے زیادہ ہوں گے۔

(بخاری)

3۔الوانے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری زندگی کبھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ وہ معجزہ کر دکھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حوالے سے اپنی کوئی علامت بھی قائم نہ کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ یہی فرماتے تھے کہ تمام علامتیں اور نشانات اللہ کے ہیں اور خدا کے کلام کا ان پر نزول سب سے بڑا معجزہ ہے۔

(آربیل)

4۔الفضائل: اگر کسی کی زبان میں لکنت ہو تو وہ ہر نماز کے بعد اس اسم پاک "سیدنا کلیم" کو بکثرت پڑھا کرے۔ زبان کی لکنت بہت جلد دور ہو جائے گی۔

(قیصر حیات کی کتاب انوار اسماالنبی ﷺ سے اقتباس)

میرا سارا زنگ اتار دو

افشاں آفریدی

سلسلے وار ناول

یہ دنیا دار العمل ہے، جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔ جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا نہ بھلا وا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر...

حادثوں میں گزری ہے راہ بس تباہی ہے
زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے ۔ نیند تک پرائی ہے
عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِّ مکنون، سائرہ بیگم کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھائی تھی۔ ایک رات دُرِ مکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور عکرمہ کو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ اسٹڈی میں دُرِّ مکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوائی تھی وہ بے کر عکرمہ لگتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، دُرِّ مکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آ جاتا ہے کہ اس نے منصور صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آ جاتا ہے۔ زاویار کو دیکھ کر دُرِّ مکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ عینی، دُرِ مکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ دُرِ مکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کے بعد عکرمہ اور سیف کی فیملی اس کی ذمے داری نہیں اٹھا سکے گی۔ عکرمہ اندر آتا ہے تو دُرِّ مکنون بتاتی ہے کہ کوئی طاہرہ آنٹی آئی ہیں، عکرمہ بہت تیزی سے ان سے ملنے کے لیے جاتا ہے۔ دادی، عکرمہ اور مظفر صاحب کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو دُرِ مکنون کی میڈیکل فائل زوبیا کے ذریعے دے دی ہے۔ دُرِ مکنون جب طاہرہ بانو کے پاس سے واپس آتی ہے تو عینی کا فون آتا ہے۔ اس کے فون رکھتے ہی دوبارہ بیل ہوتی ہے تو وہ عینی کا ہی سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن وہ زاویار کا فون تھا اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے دُرِّ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ دُرِ مکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ ردا کی شادی میں سائرہ بیگم، دُرِّ مکنون کو ایک فیملی سے ملواتی ہیں رخصتی کے بعد آصف اپنی پھپو کو ائرپورٹ چھوڑنے جاتا ہے تو واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آصف کا آپریشن تھا تو سب اسپتال میں تھے اظہار صاحب کو اپنی فیملی کے ساتھ واپس جانا تھا عکرمہ ٹکٹ لے کر آتا ہے تو اظہار اسپتال میں نہیں تھے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور زوبیا کے ساتھ گھر آ جاتا ہے، سیڑھیوں پر دُرِ مکنون کا دوپٹا پڑا دیکھ کر وہ دادی کے کمرے کا دروازہ بجاڈالتا ہے۔ ماسٹر کی سے جب وہ لوگ دادی کا کمرا کھولتے ہیں تو دہشت زدہ رہ جاتے ہیں کیونکہ دُرِ مکنون کمرے کے انتہائی سرے پر دیوار کے قریب اوندھے منہ پڑی تھی۔ عکرمہ جب اسپتال سے گھر آتا ہے تو واچ مین اسے اظہار صاحب کا گولڈ پلیٹڈ پسٹل کی شکل کا لائٹر لا کر دیتا ہے کہ کل گیٹ کے پاس گرا ہوا تھا۔ عکرمہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ کل زارا نے اظہار صاحب کو لائٹر دیا تھا اور انہوں نے گاڑی میں اسموکنگ بھی کی تھی ان کا ارادہ اسپتال سے ڈائریکٹ ائرپورٹ جانے کا تھا اور وہ انہیں اسپتال ڈراپ کر کے ٹکٹس لینے گیا تھا تو لائٹر واپس شیرازی ولا کیسے آیا۔ اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ دُرِ مکنون کو کوما میں گئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ مظفر شیرازی بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو دادی کہتی ہیں کہ ڈاکٹر تو پُر امید ہیں جب وہ صحت یاب ہو کر آئے گی تو جشنِ صحت منائیں گے اور اسی تقریب میں، میں اسے اپنے پوتے سے منسوب کر دوں گی۔ مظفر صاحب کے پوچھنے پر دادی سیف کا نام لیتی ہیں تو مظفر صاحب کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دُرِّ مکنون ان کی اور سائرہ شیرازی کی سگی بیٹی ہے۔ عکرمہ بھی یہ بات سن لیتا ہے۔ دادی کہتی ہیں کہ انہیں دُرِ مکنون کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ ان کی ہے۔ نہیں جانتی تھیں کہ یہی سچ ہے۔ جب سے اسے دُرِ مکنون سے اپنے اور اس کے رشتے کا پتا چلا تھا وہ اور بھی زیادہ ذمے دار ہو گیا تھا کہ وہ اس کی سگی چچازاد تھی۔ دُرِ مکنون گھر آتی ہے تو سب اس کے استقبال کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ آصف کو وہیل چیئر پر دیکھ کر وہ آزردہ ہو جاتی ہے۔ عکرمہ، دادی اور مظفر صاحب کو بتا دیتا ہے کہ دُرِّ مکنون اس کا انتخاب ہے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کے دُرِ مکنون سے شادی کے فیصلے پر بہت سیخ پا ہوتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ردا کو آصف سے طلاق دلوا کر عکرمہ سے شادی کر دیں۔ دادی نے زوبیا کو بلا کر دُرِ مکنون تک عکرمہ کا پرپوزل پہنچایا تو دُرِ مکنون انکار کر دیتی ہے۔ عکرمہ، دُرِ مکنون سے بات کر کے اسے اس رشتے پر کنوِنس کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ سوچتی ہے کہ اس کا انکار بہتر ہے۔ طاہرہ بھی دُرِّ مکنون کو سمجھاتی ہیں تو وہ عکرمہ سے رشتے کے لیے ہاں کر دیتی ہے۔ ولی (عکرمہ کا دوست) بھی یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ عکرمہ کا بھائی عبید آ رہا تھا تو عکرمہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، عکرمہ فضول رسومات نہیں کرنا چاہتا تو زارا اسے سمجھاتی ہے

کہ وہ نہیں چاہتا تو دُرِمکنون تو چاہتی ہوگی۔ عکرمہ، دُرِمکنون سے بات کرتا ہے تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ زاویار کا فون آتا ہے اور وہ دُرِمکنون سے معافی مانگتا ہے تو دُرِمکنون، عکرمہ کو اپنے اور زاویار اور اپنے ماضی کے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ زاویار، دُرِمکنون کی دوست مینی کا بھائی تھا مینی اور دُرِمکنون اس سے پہلے ایک پروجیکٹ میں مدد لیتی ہیں اور پھر وہ ان کے کلس میں ایڈمیشن کے لیے ان کی تیاری کرواتا ہے۔ زاویار، دُرِمکنون کو پسند کرنے لگتا ہے۔ صوفیہ (دُرِمکنون کی ماں) مکرم صاحب کی چھٹی بیٹی تھی جو ان کی دوسری بیوی سے تھی ان کی پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں۔ جن میں دو پیدا ہوتے ہی مر گئیں۔ ان کو اولاد نرینہ کی خواہش نے دوسری شادی پر مجبور کیا لیکن دوسری بیوی سے بھی بیٹی ہوئی تو مجبوراً دل کو سمجھا لیا۔ چار بیٹیوں کی شادی کے بعد ان کی (پہلی بیوی کی) سائرہ اور صوفیہ ہی رہ گئی تھیں۔ شادی کے لیے جب زاہد علی نے اپنی والدہ کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجا جو اس کالونی میں نئے، نئے شفٹ ہوئے تھے۔ زاہد علی کی والدہ نے جب مکرم صاحب کی بیٹیوں کو دیکھا تو سوچا کہ زاہد علی نے سائرہ کو ہی پسند کیا ہوگا اور ان کے لیے رشتہ ڈال دیا جو قبول ہو گیا۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے جب وہ سب سے چھپ کر اپنے دوست مظفر کے ساتھ ان کے گھر گئے تو دلہن کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ انہوں نے شادی سے انکار کیا تو مظفر کی والدہ نے ان کے لیے سائرہ کا رشتہ دیا جو قبول کر لیا گیا لیکن سائرہ کے دل سے یہ بات نہ نکلی۔ سائرہ کی لگاتار چار بیٹیاں ہوئیں جن میں سے ایک پیدائش کے فوراً بعد انتقال کر گئی اب اتنے سال بعد صوفیہ اور سائرہ دونوں امید سے ہو گئیں۔ صوفیہ کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اس بار وہ خوش تھیں کہ خدا نے ان کی گود بھری کی لیکن جب ان کے مردہ بچے نے جنم لیا تو مظفر نے اپنی بیٹی (دُرِمکنون) صوفیہ اور زاہد علی کی گود میں ڈال دی۔ اس بات سے صرف زاہد علی اور مظفر ہی باخبر تھے۔ دُرِمکنون، صباحت کی منگنی کی شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو ٹیکسی خراب ہو جاتی ہے تو ٹیکسی والا اسے راستے میں ہی اتار دیتا ہے۔ وہاں زاویار آ جاتا ہے وہ اس کے ساتھ جاتی ہے وہ راستے میں اسے پروپوز کرتا ہے...... ایک جگہ زاویار کولڈ ڈرنک لینے کے لیے رکتا ہے ان کے پیچھے کچھ بدمعاش ٹائپ لوگ لگ جاتے ہیں جو اسلحے کے زور پر دُرِمکنون کو اغوا کر لیتے ہیں اور زاویار موت کے خوف سے اسے ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ عکرمہ کہتا ہے کہ وہ زاویار کو معاف کر دے۔ عبید اور سدرہ، بچوں سمیت کراچی آ گئے تھے۔ دُرِمکنون، طاہرہ کے ساتھ ایک کاؤنسلنگ نشست میں جا رہی تھی۔ دُرِمکنون، سدرہ، عبید اور عکرمہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو واپسی پر زاویار کو شیرازی ولا کے باہر دیکھ کر ڈسٹرب ہوتی ہے لان میں آصف اور ردا کی آوازیں اسے کسی کا احساس دلاتی ہیں لاؤنج میں جانے لگتی ہے تو سائرہ بیگم کی ناگوار باتیں اس کے کان میں پڑتی ہیں۔ طاہرہ، دُرِمکنون کو کہتی ہیں کہ قرآن کی ہر آیت ہمیں وعظ و نصیحت کرتی ہے اگر ہم سننا چاہیں تو......
آصف گھر چھوڑ کر کسی کو بھی بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا اور اس سب کی ذمے دار سائرہ بیگم، دُرِمکنون کو ٹھہراتی ہیں۔ عکرمہ، ردا کو تسلی دیتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آصف کے سامان میں سے ایک ٹریولنگ ایجنسی کا بل ملتا ہے جس سے ان لوگوں کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ لندن گیا ہے۔ دادی کی باتوں سے اسے سائرہ شیرازی کی نفرت اور عناد کی وجہ معلوم ہوئی۔ سائرہ بیگم چاہتی ہیں کہ عکرمہ اور دُرِمکنون کی شادی ابھی نہ ہو لیکن کوئی بھی شادی ملتوی کرنے کے حق میں نہیں ہوتا۔ آصف کا میسج آتا ہے، ردا کے پاس کہ عکرمہ اور دُرِمکنون کی شادی انجوائے کرنا۔ عکرمہ، ردا کو یقین دلاتا ہے کہ وہ جلد آصف کو ڈھونڈ کر لائے گا۔ سائرہ بیگم، افروزہ سے بات کرتے ہوئے دُرِمکنون کو سنانے کے لیے کہتی ہیں کہ اگر صوفیہ آج ہوتی تو میں اس سے عکرمہ کو مانگ لیتی...... لیکن اب کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ یہ بات سن کر دُرِمکنون، عکرمہ سے بات کرنے جاتی ہے مگر کر نہیں پاتی۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ جلال انصاری (آغا جان)، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کریں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کر دیتے ہیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔ زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پا رہا تھا۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور مینی بھی تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کر لو...... لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔ زاویار، طارق اور خولہ کی انگیجمنٹ میں جاتا ہے تو طارق اس کے اور آغا جان کے درمیان ہونے والی ناراضی پر بات کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی خوشی کو انجوائے کرو۔ عاصمہ، زاویار کو جلال انصاری کا فیصلہ ماننے کے لیے راضی کرنا چاہتی ہیں تو وہ بتاتا

ہے کیونکہ طارق اپنی کسی ڈاکٹر کولیگ میں انٹرسٹڈ تھا اس لیے آغا جان نے طارق کو خولہ سے منسوب کر دیا حالانکہ شہریار انصاری، طارق سے بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ انکشاف سن کر وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔ آغا جان، شہرین کے ساتھ زوی سے ملنے آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زاویار شادی کر لے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں نہ کے سوا کچھ نہیں۔ زاویار باپ سے کہتا ہے کہ شیری کو اس کے نام پر نہ بٹھائیں اسے اس سے شادی نہیں کرنی ہے۔ جس پر اس کو شہرین کی طرف سے تھینکس کا میسج ملتا ہے تو اسے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا ہے۔ زاویار اور اس کے دوستوں نے آج ایک اغوا شدہ لڑکی کو بازیاب کرایا تھا اس کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تھا مگر اس کے گھر والے اسے قبول نہیں کر رہے تھے کہ کئی لڑکیوں کے سامنے اسے اغوا کیا گیا اب اگر وہ اس لڑکی (کلثوم) کو قبول کر لیں گے تو باقی چار لڑکیوں کی شادی میں مسئلہ ہوگا۔ زاویار، کلثوم کو یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل میں چھوڑتا ہے۔ نازیہ، عاصمہ کو بتاتی ہیں کہ دُرِ مکنون کی شادی عکرمہ سے ہو رہی ہے تو زاویار بہت اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ ساحل سمندر پر آتا ہے تو کلثوم اسے فون کرتی ہے وہ فون سن کر ہاسٹل پہنچتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے اور وارڈن سرفراز کے منع کرنے کی وجہ سے جانے نہیں دے رہی تو زاویار اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ کلثوم کی ماں اس کی شادی ایک چار بچوں کے باپ سے کرنا چاہتی ہے اور زاویار کو کہتی ہیں کہ وہ اسے یہ شادی کرنے پر راضی کرے۔ زاویار، اسما (آفس کی لڑکی) کے ذریعے دُرِ مکنون سے بات کرتا ہے تو وہ زاویار کو دُرِ مکنون کے حوالے سے چھیڑتی ہے تو وہ اس کو بتاتا ہے کہ اس مہینے دُرِ مکنون کی شادی ہے وہ اس کی دوست ہے اور اس سے ناراض تھی تو وہ اس کو منانا چاہتا تھا۔ زاویار، اسما کو یہ کہہ کر بہلا دیتا ہے لیکن خود کو بہلانا اتنا ہی مشکل تھا۔ سرفراز، زاویار کو بتاتا ہے کہ بابر زمان کا پتا چل گیا ہے۔ تین سال پہلے اس کے باپ نے ایک لڑکی (دُرِ مکنون) کے اس کی قید سے بازیاب ہونے پر اس پر کیس ہونے کی وجہ سے شوکت زمان نے باہر بھیج دیا تھا اور اب وہ چند ہفتوں میں لاہور آنے والا ہے۔ زاویار لاہور جانے کا ارادہ باندھتا ہے تو سرفراز نے اسے تنبیہ کی۔ زاویار فون کر کے آغا جان سے دو شرطیں رکھتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے محکمے کا سیکشن اور کیس دیں گے اور فیملی کو اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے تو وہ لاہور آنے کے لیے تیار ہے اس پر آغا جان شیری سے شادی کا کہتے ہیں۔ زاویار، عاصمہ، مہران اور موحنہ کو بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ابروڈ جانا چاہتا ہے اور اس سے پہلے وہ لاہور جائے گا کیونکہ پاپا اور آغا جان بہت بلا رہے ہیں۔ عاصمہ اسے جانے کی اجازت تو دیتی ہیں لیکن سوچتی ہیں کہ نہ جانے کیا سوچا ہے زاویار نے اپنے دل میں...... سرفراز، زاویار کو بتاتا ہے کہ وہ کلثوم سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے حنا شاہ اسے چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔ سرفراز، زاویار کو تنبیہ کرتا ہے کہ بابر زمان اور شوکت زمان بارسوخ اور خطرناک لوگ ہیں وہ کسی بھی طرح قانون شکنی نہ کرے۔ زاویار، سرفراز سے کہتا ہے کہ اس کی خالہ مہرج پیرو جاتی ہیں وہ کلثوم کے لیے کسی رشتے کی بات کرے گا۔ زاویار کا لاہور میں استقبال اس کی توقع سے بڑھ کر ہوا تھا۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 24

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا یہ۔ لان اب خالی ہو چکا تھا۔ وہ کین کی کرسی پر نیم دراز ہو کر پورے چاند کو تکنے لگا تھا کہ اچانک دل میں کیا سمائی کہ وہ کرسی سے اٹھا اور مین گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ واچ مین گیٹ کے ساتھ بنے کیبن میں جاگ رہا تھا۔ حیرت سے اسے جاتے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔ زاویار کے تیکھے مزاج سے ٹھیک ٹھاک آگہی تھی اسے۔ خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ وہ خالی الذہن سا چل پڑا تھا کہ آخری بنگلے تک پہنچ کر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔

"یہاں رہتی تھی دُرِ مکنون... یہ بھی اس کا گھر تھا۔ وہ گھر جس کی خوشیوں کو بابر زمان کی سفاکیت ہڑپ کر گئی۔"

"یہاں آ کر اس کے دل پر جیسے بوجھ آ گرا تھا۔ احساسِ ندامت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی بابر زمان کے خیال نے اس کے دل و دماغ میں کھولن بھر دی۔ پھر اسے نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر اسی روڈ پر اضطراری حالت میں ٹہلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے موبائل پر رنگ ہوئی۔ جسے اس نے بے خیالی میں ریسیو کر لیا تھا۔ فون اس کی جیب میں ہی تھا۔

"رات کے تین بج رہے ہیں زوی۔ خدا کے لیے گھر آ جاؤ۔ یہ تمہیں الوؤں اور چمگادڑوں کی طرح راتوں کو جاگنے کی بیماری کب سے ہو گئی ہے؟" دوسری طرف شہرین تھی۔

"this is none of your business دس بار کہا ہے کہ اپنے کام سے کام اور اپنے مطلب سے مطلب رکھا کرو۔" اسے یک دم غصہ آیا تھا۔

"اور اگر میرا ہر کام اور مطلب تم سے ہی منسلک ہو تو؟" اس بار شہرین کے لہجے میں واضح شرارت تھی۔

"تو تمہارا سر۔ گوٹو ہیل۔" سامنے پڑے پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے اس نے جھلا کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

دو پُرسکون کی یادوں کے تالاب میں شہرین کی کال کا پتھر سارا سکون درہم برہم کر گیا تھا۔ وہ ایک عالم بیزاری میں انصاری ہاؤس لوٹا تھا۔ البتہ صبح ناشتے کی ٹیبل پر آتے ہوئے اس کا موڈ خاصا بہتر تھا۔

شہرین نے کس قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

اپنے گھر میں اس کی صبح پہلے دس بجے ہوتی ہو مگر انصاری ہاؤس کی روایت کے مطابق وہ خود بھی آٹھ بجے ٹیبل پر موجود تھی۔

"کیا لو گے زوی۔ پراٹھا بنوا دوں یا سینڈوچ کھاؤ گے؟" سنوبر پھوپی کا شفیق انداز ہمیشہ کی طرح تھا۔

"بوائل ایگ ود کافی۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"یہ اپنا زوی، مسکراتے ہوئے کس قدر اچھا لگتا ہے ناں۔" میمونہ بیگم نے شہرین کی طرف جھک کر کہا تو وہ چڑ گئی۔

"غصے میں کس قدر بھیانک لگتا ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے آپ کو۔" ان کی سرگوشی کے جواب میں وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اسے دیکھنے لگی جو سنوبر پھوپی کے لاڈ کے نرغے میں تھا۔

وہ اسے پراٹھا اور قیمہ کھانے پر مجبور کر رہی تھیں کہ اتنے میں شہریار صاحب، آغا جان کے ساتھ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ ان دونوں کے کرسی سنبھالتے ہی سب نے ناشتا شروع کر دیا تھا۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے برخوردار۔ کہیں جاب کے لیے اپلائی کیا ہے یا کرو گے؟" کچھ دیر بعد شہریار صاحب نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ایک دو آفرز ہیں میرے پاس۔ سرفراز کے بڑے بھائی کی اپنی فرم ہے۔ اُدھر سے بھی اصرار ہے بہت مگر اس بار آپ کے بزنس کو جوائن کرنا چاہتا ہوں۔" کافی کا سپ لے کر کپ واپس رکھتے ہوئے وہ باپ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ان کے سوال کے جواب میں جو اس نے کہا وہ انصاری ہاؤس کے مکینوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال گیا۔

"کیا واقعی؟"

"آر یو شیور؟"

"وٹس کول؟"

ٹیبل پر متفرق آوازیں بیک وقت گونج کر تھمیں تو شہریار صاحب نے تحیر سے نکل کر بیٹے کو محبت سے دیکھا۔

"یہ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے زوی۔ مجھے اور اقرار کو اب واقعی تمہاری ضرورت ہے۔" ان کی مسرت چہرے سے مترشح تھی۔

"وٹس لائک مائی سن۔" اقرار چچا نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ ابرار چچا کی اپنی جاب تھی۔ انہوں نے خاندانی بزنس میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ البتہ انہوں نے بھی اس کے اقدام کو سراہا۔ سب نے ہی کچھ نہ کچھ مسرت آمیز تبصرے کیے۔

"تو پھر آج سے جوائن کر رہے ہو مائی سن......؟" آغا جان نے شفیق مسکراہٹ سمیت سوال کیا تو وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

تاہم حیرت سب کو تھی۔ یہ وہی زاویار تھا جس نے شہریار صاحب کے بہت کہنے پر بھی بزنس پڑھنے کی حامی نہیں بھری تھی۔ اس کا رجحان شروع سے ہی بزنس کی طرف نہیں تھا۔
باپ سمیت چچا اور دادی کی بہت سی امیدیں اس سے وابستہ تھیں کہ وہ خاندانی کاروبار کو بڑھانے میں ان کا ہاتھ بٹائے گا مگر اس وقت اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور آج جب وہ اس سے ایسی کوئی توقع نہیں رکھتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ شامل ہونے کا عندیہ دے رہا تھا۔
خوشی کتنی ہی غیر متوقع اور اچانک کیوں نہ ہو اس کی طرف ہاتھ بڑھانے میں کوئی دیر نہیں کرتا۔ انصاری ہاؤس کے مکینوں نے بھی اس خوشی کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔
شہرین نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا جو پوری رات کی جگار کے باوجود بھی خاصا تازہ دم لگ رہا تھا۔ چند ہفتوں پہلے تک وہ آغا جان، انصاری ہاؤس اور شہریار ماموں سے کس قدر متنفر تھا پھر اچانک ایسا کیا ہوا جو وہ اتنا بدل گیا تھا۔
اس کا یہ یوٹرن بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس نے راستہ بدلا ہے۔ وہ کہاں جانا چاہ رہا ہے؟ ہو نہ ہو اس نے کسی اور ہی منزل کا تعین کر لیا ہے؟
وہ کسی سمندر کی طرح گہرا تھا۔ محض ساحل سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شہرین نے لمبی سانس بھری اور توجہ ناشتے کی طرف کرلی۔
پھر چاہے یہ وہ اقرار چچا سے بزنس کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ اسے جو بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دماغ سے کرنا ہے۔ یہ اس نے تہیہ کر رکھا تھا۔
سرفراز کے بھائی کی فرم جوائن کر کے وہ سرفراز کی نگاہ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔
بابر زمان کی واپسی تک اسے صبر سے کام لینا تھا۔ جب تک اسے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا اور اس تک پہنچنے کے لیے ''راہداری'' تلاش کرنا تھی۔ اور ان سب کاموں کے لیے اس کا ذہن بالکل صاف تھا۔

☆......☆......☆

اس بار شیرازی ولا میں کافی نئے مہمان دیکھنے کو ملے جو عکرمہ کے ننھیال کی طرف سے تھے۔ کچھ سدرہ کے میکے والے بھی تھے۔ روز ہی گھر میں ہلا گلا ہوتا۔
دُرِ مکنون کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اسے دادی کے کمرے میں سکون سے رہنے دیا جا رہا ہے۔ وہ دل سے خوش ہونا چاہتی تھی۔ مگر ماضی میں جو کچھ بیت گیا تھا۔ وہ اسے کسی طور خوشی و انبساط کے رنگ کشید نہ کرنے دیتا۔
اور اس ناکامی کی ایک بڑی وجہ سائرہ بیگم تھیں۔ جو گاہے بگاہے اس کے پاس آتیں اور کچھ نہ کچھ ایسا کہہ جاتیں کہ وہ تذبذب میں پڑ جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آصف نے واقعی ردا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے یا بقول عکرمہ کے محض ناراضی ہے ان دونوں کے مابین۔ مگر یہ معما بھی آخر حل ہو ہی گیا۔
صبح وہ برش کر کے واش روم سے نکلی تو دادی کے گلے سے لگی زار و قطار روتی سائرہ بیگم کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔
''ہائے اماں، یہ کیا ہو گیا۔ میری ردا کا گھر برباد ہو گیا۔ آصف نے اسے ایک طلاق بھیج دی ہے۔'' ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کی وجہ سے وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔
دادی کے لیے بھی بہت گہرا صدمہ تھا یہ مگر انہوں نے نہ جانے خود کو کیسے سنبھالا تھا۔ شاید جب چھوٹے بڑوں کے کندھوں پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگیں تو بڑوں کو از خود صبر کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔

''صبر بیٹا صبر...... ابھی اس نے صرف ایک طلاق دی ہے تم اللہ سے اچھی امید رکھو۔ ابھی رجوع کی گنجائش ہے۔''

''اور اگر اس نے تین ماہ کے اندر رجوع نہ کیا اماں۔ پھر کیا ہوگا۔ یوں بھی وہ کہاں ہے ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں۔'' سائرہ کے آنسوؤں سے اماں اور دُرِ مکنون کی حالت دگرگوں تھی۔

''کل تینوں طلاق لکھ بھیجے گا وہ۔ کیا کرلوں گی میں اپنی بچی کے لیے۔'' وہ تڑپ کر الگ ہوئیں ان سے۔ دُرِ مکنون نے انہیں بہت دکھ سے دیکھا تھا۔ کہاں تو اتنا غصہ تھیں وہ آصف پر۔ ردا کو اس سے رابطہ بحال کرنے کی فی الحال اجازت بھی نہیں دے رہی تھیں مگر اس ایک طلاق نے انہیں توڑ دیا تھا۔ جبکہ دادی کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

''اللہ سب کا وارث ہے بیٹا۔'' دادی کے ضعیف چہرے پر آنسو بہنے لگے تھے۔

''پر میری ردا کا کیا ہوگا اماں۔ اس نے تو شادی والے دن سے لے کر آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ سچ کہتے ہیں لوگ کہ بزرگ کے فیصلوں میں ہماری بھلائی چھپی ہوتی ہے۔ آپ نے ردا کے لیے کتنا اچھا ساتھی چنا تھا اماں۔ عکرمہ کتنا خوش رکھتا اسے۔ اس کا دل اور ظرف کتنا بڑا ہے مگر ردا نے جسے منتخب کیا، اپنا جیون ساتھی بنایا وہ کس قدر گھٹیا نکلا۔'' سائرہ ایک بار پھر سے رو پڑی تھیں۔ اماں ان کے عقب میں کھڑی دُرِ مکنون سے نظر چرا گئیں۔

''یہ سب قسمت کے کھیل ہیں بیٹا۔ ان پر ہمارا کوئی زور۔ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔'' انہوں نے بہو کو دوبارہ خود سے لگالیا اور آنسو پونچھتے ہوئے دلگیر لہجے میں بولیں۔ جس پر سائرہ نے ان کے کندھے سے سر اٹھایا تھا اور اپنے چہرے کو صاف کرتے ہوئے وہ اماں سے مخاطب ہوئیں۔

''ہاں مگر کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے ناں اماں۔ میں نے خود ہی اپنی نازوں پالی بچی کو ایسے رذیل شخص کے ہاتھوں میں دیا تھا۔ میں یہ کبھی بھول نہیں سکتی۔ کاش میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی۔ ابھی تو میری ردا نے ازدواجی زندگی کی کوئی خوشی دیکھی بھی نہیں تھی کہ یہ سب ہوگیا۔'' وہ ازحد دلگرفتہ تھیں۔

''مظفر یا ردا کو بتایا؟'' اماں نے انہیں بہت دکھ سے دیکھا اور پوچھا۔

''نہیں، گھر میں مہمان ہیں اور دوسرے مظفر کے بی پی کی وجہ سے میں نے یہ بات صرف آپ کو بتائی ہے۔ پلیز اپنے تک ہی رکھیے گا۔ ابھی ابھی پوسٹ آئی تھی جو میں نے ہی ریسیو کی ہے ردا کے بجائے۔ اچھا ہی ہوا کہ آج ردا گھر پر نہیں تھی۔'' اماں کے سوال پر انہوں نے بتایا تھا۔

''بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوگیا اماں۔ میری معصوم بچی پر طلاق کا دھبا لگ گیا۔ اب کون اپنائے گا اسے۔ عکرمہ جیسا کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں گے ہم۔'' خود کو سنبھالتے سنبھالتے وہ پھر آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

''اللہ مسبب الاسباب ہے سائرہ۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہمت کرو۔'' اس بار اماں سے برداشت نہیں ہوا تو وہ خود بھی رو پڑیں۔

''اب تو ہمت ہی کرنی ہے اماں اور ہمارے اختیار میں ہے بھی کیا۔'' گہری تاسف بھری سانس کھینچ کر وہ بولی تھیں۔

پھر کمرے سے جانے کو پلٹیں تو پیچھے کھڑی دُرِ مکنون سے یک دم سامنا ہوا جو مانند بتاں ساکت تھی۔

''قسمت نے ردا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت ہرٹ ہے۔ جب تم یہاں آئی تھیں تو اس گھر کے ہر فرد نے تمہیں خوش کرنے کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ آج ہم پر مشکل وقت آیا ہے اور اب تمہیں ردا کا خیال کرنا ہے۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ نرمی سے بولیں تو اماں سمیت دُرِ مکنون حیرت سے گرتے، گرتے بچی۔ آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے ان کے لہجے میں جیسے کوئی مطالبہ تھا۔ وہ متحیر سی رہ گئی۔ تاہم یہ سب دیکھنے کے لیے سائرہ رکی نہیں تھیں کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔

یہ نرم لہجہ اور اس میں کیا گیا مطالبہ۔ ''اب تمہیں رودا کا خیال کرنا ہے۔'' ذرِ مکنون کو سہما سا گیا ''کیا کرنا ہوگا اسے؟''

''میں ذرا عکرمہ کو دیکھوں آج اسے دیر سے جانا تھا۔ وہ ابھی گھر پر ہی ہے۔'' دادی اسے خیالات میں مستغرق دیکھ کر باہر کی طرف چل دیں۔

اسے یقین تھا کہ دادی یہ خبر عکرمہ تک ضرور پہنچائیں گی اور جو انہوں نے کچھ نہ بھی کہا تب بھی عکرمہ ان کے چہرے پر چھپے اس دکھ کو سیکنڈوں میں جان لے گا۔ ان دونوں کی اس ذہنی و قلبی ہم آہنگی سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اور عکرمہ کی زیرک نگاہی سے بھی۔

''یا اللہ! اب میں کیا کروں۔'' وہ تھکے، تھکے انداز میں کاؤچ پر ٹک گئی۔ سائرہ اس کے لیے سوچ اور تفکر کا سمندر چھوڑ گئی تھیں جس میں ابھرتے ڈوبتے وہ خود میں گم ہو چکی تھی۔

☆ ☆

''تو پھر تم نے شادی کے بارے میں کیا سوچا زاویار؟''

اس کا مطلوبہ پیسہ بینک میں جمع کرا کر بینک کارڈ وغیرہ اس کے حوالے کرنے کے بعد انہوں نے اس سے سوال کیا تھا۔

اور وہ جو پچھلے دو... اس سوچ پر مسلسل سوچتا رہا تھا۔ یک دم سرا ونچا کر کے انہیں دیکھنے لگا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے؟ حالانکہ آپ جانتے بھی ہیں کہ اب میں وہ زاویار نہیں رہا۔ وقت نے بہت بدل دیا ہے مجھے۔'' بظاہر میں طنز تھا مگر... سوال تھا۔

''وقت سب کو بدل دیتا ہے اور یہ تبدیلی ہی اصل میں زندگی ہے زاویار۔''

''بشرطیکہ مثبت ہو۔'' اس کے لہجے میں تھکان تھی۔

''منفی کو مثبت بنانا تو پھر انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے نال زاویار۔ اور یہ کوشش صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ ہر شخص اپنی زندگی میں آگے بڑھ رہا ہے۔ تو پھر تم ایسا کیوں نہیں کرنا چاہتے۔'' ... کے ذریعے انہیں ذرِ مکنون کی شادی کی خبر مل چکی تھی۔

وہ ان کا مطمحِ نظر پا گیا تھا۔ بلا ارادہ نظروں کا رخ بدلا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ارمانوں کا خون اس کی سرخ آنکھوں سے جھلکے اور آغا جان کی نگاہ میں آ جائے۔ مگر سامنے کھڑا وجود بھی وقت کے سیلِ رواں میں بہہ کر یہاں آیا تھا۔ وہ اسے دکھی دیکھ کر رنجیدہ ہو گئے۔

''گناہوں اور احساسِ جرم کا بوجھ اٹھا کر چلنا بہت مشکل ہے آغا جان۔ جو بے گناہ ہے، معصوم ہے، اس کا حق ہے کہ وہ آگے بڑھے اور نصیب سے ملنے والی خوشیوں کو گلے لگا لے۔ مگر جس نے دوسروں سے جینے کی خواہش تک چھین لی ہو۔ اسے اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کا اور مسرتیں حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' وہ بولا تو یوں لگا جیسے کرب اور اذیت کے صحرا سے برہنہ پا گزر رہا ہو۔

''غلطی اور گناہ کا سرزد ہو جانا تو بشریت ہے زاویار بیٹا۔ مگر اس کے بعد اعترافِ گناہ کرنا، پشیمان ہونا اور تائب ہو جانا۔ درحقیقت یہ چیزیں انسان کو ولیوں کے درجے تک لے جاتی ہیں۔'' وہ اسے سمجھانے کی سعی کرنے لگے تھے۔

''جب حضرت موسیٰؑ سے انجانے میں، غصے کی وجہ سے ایک شخص کا قتل ہوا تو انہوں نے اللہ کی جناب میں توبہ کی تھی۔ قتل کوئی معمولی گناہ نہیں ہوتا۔ کبیرہ گناہ ہے یہ۔ اس کی بھی معافی مل گئی تھی انہیں۔ انجانے میں ہونے والی لغزش کو اللہ معاف فرما دیتا ہے بیٹا۔''

''موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے آغا جان۔''

''ہاں مگر جب ان سے قتل ہوا اس وقت انہیں نبوت نہیں ملی تھی مگر انہوں نے سچے دل سے اپنے گناہ کو مانا، توبہ کی، معافی مانگی تو اللہ نے ان کے لیے زمین کشادہ کر دی۔ اور اس واقعے کے کم از کم آٹھ سے دس سال بعد انہیں نبوت عطا ہوئی۔''

آغا جان اس کے ذہن میں لگی گرہ کھولنا چاہتے تھے۔ ان کی بات پر ایک ثانیے کے لیے وہ خوش ہوا مگر اگلے لمحے اس کی آنکھوں میں مایوسی اتری تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ میرے گناہ کو اللہ معاف کر سکتا ہے آغا جان مگر جسے جل جل مارا گیا۔ جس کی رگ، رگ سے رس رس کر خون نکلا۔ جو لمحہ لمحہ جی بھر مری اور پھر جینے پر مجبور کی گئی۔ وہ کیسے معاف کرے اپنے قاتل کو۔ دُرِ مکنون کیوں در گزر کرے میرا گناہ۔'' اب وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر رہا تھا۔

''اسے برباد کر ڈالا ہے میں نے آغا جان۔ اس کے فادر کو اسے بازیاب کرانے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی ماما نے اس کے غم میں جان دے دی۔''

انہیں لگا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

''ایک نہیں تین، تین لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا میں نے صرف ایک اپنی جان بچانے کو۔'' اس کے چہرے پر کرب ہی کرب درج تھا۔

آغا جان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتے تھے بیٹا۔ اگر تم ان بدمعاشوں سے لڑتے تو کیا وہ تمہیں زندہ چھوڑ دیتے؟''

''ہاں مگر کم از کم اس شرمناک، بے غیرتی سے بھری زندگی گزارنے کے لیے اور دُرِ مکنون کو زندہ لاش بنا دیکھنے کے لیے زندہ تو نہ رہتا میں۔ یہ احساسِ جرم تو نہ ہوتا مجھے کہ میں نے اسے جیتے جی قبر میں اتارا ہے۔'' اس کا گلا رندھ رہا تھا۔

''میں نے اسے دیکھا ہے آغا جان۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ تنہا کر دیا ہے میں نے اسے۔ در بدر کر دیا ہے۔ سوتیلے رشتوں کی کچھار میں لا پھینکا ہے اسے۔ اس کی اِک اِک سانس بددعا بن کر لگتی ہے مجھے۔ بہت برا کیا میں نے اس کے ساتھ۔'' کہتے، کہتے اس نے یک دم ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ آغا جان کو احساس تھا کہ وہ خود پر بہت کنٹرول کر رہا ہے۔ سخت جذباتی ہیجان نے اس کی قوتِ گویائی پر اثر ڈالا تھا۔

''سچ کہتے ہو تم۔ ہم سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے۔'' آغا جان نے طویل سانس بھر کر انتہائی تاسف سے کہا تو اس نے بے ساختہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''آپ نے تو جو کیا ''اپنوں'' کو بچانے کی خاطر کیا آغا جان جبکہ میں نے صرف ''اپنے'' لیے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میری زندگی قرض ہے اس کا۔ جسے میں اپنی آخری سانسیں دے کر بھی اتار نہیں سکتا۔'' اس کی روح کی تھکن اور سانسوں کی جلن اس کے لفظوں سے عیاں تھی۔

آغا جان نے شدید احساسِ بے بسی میں گھر کر اسے نگاہوں کے حصار میں لیا۔

''کیا یہ محض احساسِ جرم ہے زاویار...... یا؟'' ان کا استفہامیہ فقرہ اسے لمحے بھر کے لیے ساکت کر گیا تھا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی گونجتی رہی جسے بالآخر زاویار کے قدموں کی چاپ نے توڑا۔

وہ تھکے، تھکے انداز میں چلتا ان کا کمرا چھوڑ گیا تھا۔ اور اپنے پیچھے کئی سوالیہ نشان بھی۔

☆......☆......

''آج اگر صوفیہ زندہ ہوتی تو میں اس سے عکرمہ کو مانگ لیتی۔''

''اب تمہیں رو کا خیال کرنا ہے۔''

ان جملوں کی گونج نے اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں کچھ اس طرح لے رکھا تھا کہ اس کی راتوں کی نینداور دن کا چین اڑ گیا تھا۔
پچھلی دو راتوں سے وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی۔ اسی لیے آج سرِ شام ہی اسے نیند نے آلیا۔ اور یہ نینداسے خوابوں کی وادی میں لے گئی۔ بہت عجیب سا خواب تھا جو وہ دیکھ رہی تھیں۔ سائرہ بہت رو، رو کر صوفیہ سے کچھ مانگ رہی تھیں۔
''کبھی میں نے تمہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین ہے آج تم مجھے ناامید نہیں کرو گی صوفیہ۔'' بہت عاجزی اور یقین تھا ان کے لہجے میں۔
اور پھر اس نے دیکھا صوفیہ نے سائرہ کے کندھے کو نرمی سے تھپکا تھا اور ڈرائنگ روم کے ہاتھ سے کچھ لے کر سائرہ کی جانب بڑھا رہی تھیں کہ یک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔
''یا اللہ!'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
کمرے میں اندھیرا تھا۔ ساتھ ہی دادی سو رہی تھیں۔
''اُف یہ خواب تھا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپتے ہوئے سوچا۔
''کیا واقعی ماما انکار نہ کرتیں میمی خالہ کو؟ اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو کیا یہی جواب ہوتا ان کا جو ابھی میں نے خواب میں دیکھا؟'' اس کے اندر سوال جواب چلنے لگے تھے۔
''تو کیا مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے؟ کیا مجھے شادی سے انکار کر دینا چاہیے؟'' وہ اٹھ کر کمرے میں دبے پاؤں ٹہلنے لگی تھی۔
پھر کھڑکی کے پاس آ کر پردہ کھسکا کر باہر جھانکا۔
اسٹریٹ لیمپس کی روشنی میں خالی روڈ چمک رہی تھی۔ آس پاس کے گھر مکینوں کی طرح نیند میں اونگھتے محسوس ہو رہے تھے کہ اچانک اس کی نظر نیچے لان پر پڑی۔ اتنی رات گئے لان چیئر پر اکیلی بیٹی سائرہ شیرازی کو دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی۔
''میمی۔'' لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی کہ یک دم اسے اپنا دل، دکھ اور رنج سے بھرتا محسوس ہوا۔ ردا کی فکر نے انہیں کس قدر پریشان کر رکھا تھا۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ عکرمہ سے اس نے بات کر لی تھی اور اس کا جواب بھی سن لیا تھا۔ جبکہ زوہا، مظفر انکل اور طاہرہ آنٹی سے کچھ کہنے کا جب بھی وہ سوچتی ان کے چہروں پہ جھلکتی خوشی اسے روک دیتی۔ ردا کے مسئلے کے باوجود دادی اور مظفر انکل دونوں عکرمہ کی خوشی میں خوش تھے۔
اس نے ایک بار دادی سے آصف کے بارے میں سوال کیا بھی تھا انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ جس ایڈریس سے آصف کا لیٹر آیا تھا۔ عکرمہ اس ایڈریس پر جا کر پتا کرنے والا ہے۔ شاید اسی طرح آصف کے ٹھکانے کے بارے میں کچھ علم ہو سکے۔
دادی کی بات پر وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھی مگر اتنی رات کو بائل برش کے درخت تلے کرسی پر بیٹھی سائرہ شیرازی کو دیکھ کر اس کا سارا سکون ایک بار پھر رخصت ہو گیا تھا۔

......☆......☆......

پرانے سرکل کے لوگوں سے اس نے پھر سے رابطہ بحال کر لیا تھا۔ لاہور اس کا آبائی شہر تھا۔ یہاں واپسی پر جہاں بہت سی تلخ یادوں نے اس کا دامن کھینچا۔ وہیں اسکول، کالج اور انسٹی ٹیوٹ کے حسین دن اور خوب صورت ساتھی بھی اسے یاد آنے لگے تھے۔

اس میں کچھ حصہ سرفراز کا بھی تھا۔ جس نے اس کے یہاں پہنچنے سے قبل ہی یہاں کے سرکل کو اس کی واپسی سے مطلع کر دیا تھا۔ اور وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے زاویار اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جانتا تھا مگر اس بار اس نے اپنے ذہن کو مکمل طور پر یکسو کر لیا تھا اور اپنی منزل کی طرف جانے والے راستے پر چلنے سے اب اسے کوئی بھٹکا نہیں سکتا تھا۔ اس کی توجہ کا ارتکاز بدلنا گویا کسی کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ البتہ لوگوں سے قطع تعلقی کی پرانی روش کو بدلتے ہوئے وہ سب سے ملا اور حقیقتاً خوش بھی ہوا۔ آفس کے بعد وہ دوبارہ جم چلا جاتا یا پرانے دوستوں کی طرف نکل جاتا۔ فی الحال اسے بابر زمان کی واپسی کا انتظار تھا۔ اور اس سے پہلے وہ کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسری طرف جوں جوں دُرِ مکنون کی شادی کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا۔ مکنون کا اصرار بڑھنے لگا تھا۔ جتنا وہ دُرِ مکنون کی شادی میں جانے کے لیے بے قرار اور منتظر تھی۔ اسی قدر زاویار کو اس ذکر سے وحشت ہوتی۔

اِدھر آغا جان کی خاموش نظریں اسے سوال کرتی محسوس ہوتیں۔ میمونہ پھوپی اب دھیرے، دھیرے رختِ سفر باندھنے لگی تھیں۔ غالباً گھر والوں کو اس کی خاموشی نے مایوس کر دیا تھا۔

اسے کبھی خود پر تو کبھی گھر والوں پر ترس آتا۔ مگر یوں لگتا جیسے تمام تر ہمدردی کے باوجود اس کے دل پر دھرا گلیشیر پگھلنے والا نہیں۔

دن اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا روٹین سیٹ کر لیا تھا کہ اچانک زندگی میں ناخوشگوار ہلچل مچ گئی۔

''زوی، آغا جان کی کنڈیشن ٹھیک نہیں۔ ہم انہیں کارڈیک سینٹر لے آئے ہیں۔ پلیز جلدی پہنچو۔'' اقرار چچا کا میسج اسے اس وقت ملا جب وہ جم سے باہر نکل رہا تھا۔ گھنٹا بھر پہلے یہ میسج کیا گیا تھا۔

کچھ کہا تھا اس کے وجدان نے۔ اسے یک دم گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ آغا جان اور اسپتال؟ بہت عجیب لگا تھا یہ پڑھ کر۔

اس نے بچپن سے لے کر آج تک آغا جان کو کبھی اسپتال جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کے چست اور صحت مند تھے۔ ان کے کھانے پینے کے اوقات مقرر تھے۔ سبزیوں اور دالوں کے وہ شائق تھے۔ بہت سادہ غذا تھی ان کی۔ یہی وجہ تھی کہ صحت کے معاملے میں وہ بڑے خوش نصیب رہے تھے اور آج پہلی مرتبہ اسپتال لے جائے گئے تھے۔ وہ خطرناک اسپیڈ پر کار دوڑا کر کارڈیک سینٹر پہنچا تو وہاں سب کو موجود پایا۔

''آغا جان کو اسٹروک آیا ہے۔''

ابرار چچا اسے ریسپشن کے پاس ہی مل گئے تھے۔ ان کی دی ہوئی اطلاع پر اسے دھچکا لگا تھا۔

''واٹ...... مگر آغا جان کو تو کبھی ہارٹ پرابلم نہیں رہی۔ پھر اچانک یہ کیسے ہو گیا؟'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

''اچانک نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ہارٹ پرابلم کا شکار ہیں۔ اور پچھلے ایک ماہ سے تو ڈاکٹر نے دو بار میڈیسن چینج کی ہیں ان کی مگر انہوں نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔'' ابرار چچا بہت فکر مند تھے۔

زاویار کو یاد آیا پچھلے ماہ جب وہ کراچی اس سے ملنے عاصمہ لاج آئے تھے اور اس کی بدسلوکی کے باعث بنا کچھ کھائے پیے گھر سے چلے گئے تھے۔ تب اس کے بعد بھی وہ بیمار پڑ گئے تھے۔ اور انہیں لاہور کی سیٹ کینسل کرانی پڑی تھی۔ اسے یک دم شرمندگی اور احساسِ جرم نے آلیا۔

''اس وقت کہاں ہیں؟''

''آئی سی یو میں ہیں۔''

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟''

''critical condition ہے۔'' وہ ان کے ساتھ بات کرتا باقی سب کے پاس پہنچا تو صنوبر اور میمونہ پھوپی کو روتے دیکھا۔
عینی دوڑ کر اس کے گلے آ لگی تھی۔ جبکہ شہرین ایک طرف چپ چاپ بیٹھی بس تسبیح کے دانے گھمائے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی اشک جاری تھے۔
''بھائی، آغا جان ٹھیک ہو جائیں گے ناں۔''
''ان شاء اللہ۔ حوصلہ رکھو۔'' اس کا اپنا دل واہموں میں گھر رہا تھا مگر اسے عینی کو حوصلہ دینا تھا۔
آغا جان اس کے لیے کیا تھے یہ اسے آج پتا چل رہا تھا۔ عاصمہ کے جانے کے بعد جب شہریار صاحب اپنی دوسری بیگم اور نئی زندگی میں مصروف ہوتے چلے گئے۔ تب یہ آغا جان ہی تھے جنہوں نے اسے سہارا دیا تھا۔ کتنی ہی راتیں وہ ان کے بستر میں سویا تھا۔ ان کے سینے سے لگ کر رویا تھا۔ اس کی کامیابی، اس کی خوشیاں اور اس کے دکھ آغا جان نے ہی بانٹے تھے اس سے۔
شہریار صاحب کو نئی بیوی کے ساتھ دیکھنے کے بعد اس نے ان سے مخاطب ہونا چھوڑ دیا تھا۔ عاصمہ سے بھی اس کی بات نہیں کرائی جاتی تھی۔
ایسے میں آغا جان، اقرار چچا اور صنوبر پھوپی اسے سنبھالتے تھے۔ تاہم جب صنوبر اپنے شہر لوٹ جاتیں تو پیچھے آغا جان اسے سنبھالتے۔ اقرار چچا کی شادی اور بچوں کے بعد وہ اپنے خول میں کچھ اور سمٹ گیا۔ اور یوں اس کے اور آغا جان کے مابین ہم آہنگی اور محبت مزید مضبوط ہوتی چلی گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ذرِ مکنون کے ساتھ ہوئے حادثے کی اطلاع اس نے آغا جان کو ہی دی تھی اور ان سے مدد مانگی تھی۔
مگر جب انہوں نے اسے مایوس کیا تو وہ ٹوٹ گیا تھا۔ ناراض ہو گیا تھا اور انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
وجہ یہی تھی کہ آغا جان نے بچپن سے لے کر جوانی تک اسے کبھی کسی بات کے لیے نہ نہیں کہا تھا۔ منع نہیں کیا تھا۔ اس کے ناجائز مطالبے بھی انہوں نے ہمیشہ مانے تھے۔ حتیٰ کہ اس نے خاندانی کاروبار چلانے کے لیے انکار کر دیا اور MS کرنا چاہا تو شہریار صاحب کی ناراضی کے باوجود آغا جان نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو آغا جان اس کے لیے بیک وقت ماں باپ اور دوست سبھی کچھ تھے۔ اور آج وہ یہ دوست کھونے کے خوف میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔
''آپ کو ہر صورت ٹھیک ہونا ہے آغا جان۔ یقین کریں مجھے اب کوئی شکایت نہیں رہی ہے آپ سے۔ آپ نے جو کیا اپنوں کے لیے کیا۔ میرے لیے کیا۔ آپ کی وہ محبت جسے میں نے بے حسی سمجھا۔ آج پہچان گیا ہوں میں اسے۔ پلیز کم بیک۔ مجھے ضرورت ہے آپ کی۔'' آئی سی یو کی دیوار سے پشت لگائے وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب تھا۔ جو بہت سی مشینوں میں گھرے بستر پر آنکھیں موندے لیٹے تھے۔
ذرِ مکنون کے بعد آغا جان کی جدائی وہ جھیل نہیں سکے گا۔ اتنا معلوم تھا اسے۔
''بی بریو۔ کچھ نہیں ہوگا آغا جان کو۔'' شہریار صاحب نے اس کے کندھے کو چھو کر نرمی سے کہا تو وہ بلا ارادہ ان کے سینے سے لگ گیا۔ درحقیقت اس وقت اسے ڈھارس کی شدید ضرورت تھی۔

......☆......☆......

گھر میں رونق میلا بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ سب کی مصروفیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ عکرمہ سے ایک بار پھر بات کر سکے مگر اس کا موقع کسی صورت نہ ملا۔ دوپہر جب وہ انسٹی ٹیوٹ سے لوٹتا تو لنچ کے بعد طاہرہ، ذرِ مکنون کو اپنے ساتھ لے جاتیں اور جب وہ واپس آتی تو عکرمہ گھر پر موجود نہ ہوتا۔

شروع میں اس نے سمجھا کہ وہ محض ایک درس کی محفل ہے۔ مگر دوسرے دن کے اختتام پر اسے احساس ہوا کہ وہ ایک طرح کی میرج کاؤنسلنگ ہے۔

سورۂ بقرہ، سورۂ نسا، سورۂ طلاق، سورۂ نور سمیت سورۂ احزاب کی وہ تمام آیات جو عورتوں کے حقوق و فرائض، نکاح و طلاق اور رشتۂ ازدواج کے باہمی توازن سے متعلق تھیں۔ بہت تفصیل کے ساتھ ان کی تفسیر اور تشریح کی جاتی تھی۔ سیرت طیبہ سے بھی استفادہ کیا جاتا۔ عورت کے صحیح مقام اور گھر کے ادارے میں اس کے کردار کو کس خوب صورتی سے رب تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے بیان... کیا تھا۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ یہ خاص درس طاہرہ بانو کے کہنے پر رکھے گئے تھے۔

''اب دیکھو ناں۔ ہم نماز پڑھنا سیکھتے ہیں۔ حج کے مناسک ادا کرنا سیکھتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی فرم سے لے کر بڑے سے بڑے انسٹی ٹیوٹ کو چلانے حتیٰ کہ معمولی سے کمپیوٹر اور کار کو آپریٹ کرنے کے لیے باقاعدہ تربیت لیتے ہیں۔ تو پھر سوچو۔ گھر جیسا ادارہ چلانے کے لیے کیا ہمیں زائد کوشش نہیں کرنی چاہیے۔''

واپسی پر وہ اس کے سوال کے جواب میں کہنے لگی تھیں۔

''کیا اتنا عظیم کام بنا تربیت اور بغیر سمجھ کے کیا جاسکتا ہے؟ تمہیں پتا ہے کہ شیطان اپنے چیلوں کو سب سے زیادہ کس بات پر شاباشی دیتا ہے؟ کسے اپنے نزدیک بٹھاتا ہے؟'' سگنل پر کار روکتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے کی طرف رخ پھیرا تھا۔

''اسے، جو شوہر اور بیوی میں پھوٹ ڈالے اور لڑائی کرائے۔ کیونکہ جب گھر کا ادارہ کمزور ہوگا تو معاشرے میں فساد برپا ہوگا۔ جو ابلیس کی ابنِ آدم کے خلاف اولین کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم

کتاب میں ہمیں واضح ہدایت اور متوازن تقسیم سکھا دی ہے۔''

کاروبارہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

''مرد کو قوام یعنی provider اور protector بنایا ہے تو عورت کو گھر کا نظام چلانے کے لیے ایک الگ رول دیا گیا ہے۔ مرد کو بحیثیت شوہر ایک درجہ اوپر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے تو دوسری طرف عورت کو بحیثیت ماں...... باپ سے تین گنا زیادہ حق دیا گیا ہے۔ جبکہ انسان ہونے کے ناتے دونوں میں سے افضل وہ ہے جو تقویٰ میں زیادہ ہے۔ تعزیرِ اسلام کا مطالعہ کر کے دیکھو۔ مرد و عورت میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ مرد کے اعمال کی جزا عورت سے زیادہ ہے بلکہ اخلاص اور تقویٰ کی بنیاد پر سب کے اعمال کی پرکھ کی جائے گی۔ یہ بنیادِ اسلام ہے۔'' طاہرہ کا انداز مشفق اور مدلل تھا۔ وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

''یقین کرو دُرّی۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ مسلم عورت احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ جس کے حقوق اور تکریم کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے کتنی عظیم آیات اتاریں۔'' وہ تاسف سے کہہ رہی تھیں۔

''وجہ ہے ہماری لاعلمی اور قرآن کی طرف سے پیٹھ موڑ جانا۔ اول تو کم ہی لوگ قرآن کو ترجمے سے پڑھتے ہیں یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو چند ایسا کرنے کی زحمت کر بھی لیں تو عربی زبان کے مزاج اور وسعت سے ناواقفیت اور آیات کے سیاق و سباق اور نزول کی وجوہات اور اس وقت کے حالات و واقعات سے لاعلمی کے باعث محض لفظی ترجمہ پڑھ کر کلام اللہ کے اصل اور صحیح مطالب تک نہیں پہنچ پاتے۔ مقامِ افسوس ہے کہ ہم دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انگریزی اور فرنچ تو بچپن سے سیکھنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ مگر جس زبان میں کلام اللہ ہے۔ وہ کلام جو ہمارے دین اور ہمارے لیے اللہ کے متعین کردہ ضابطۂ حیات کی تشریح ہے۔ اس کی زبان یعنی عربی کے معاملے میں ہمارا یہ حال ہے کہ دن میں پانچ وقت پڑھی جانے والی نماز کی قرأت کے معنوں تک سے ہم میں سے زیادہ تر لوگ ناواقف ہیں۔ پورے قرآن کو سمجھ کر پڑھنا تو دور کی بات۔'' وہ بالکل درست کہہ رہی تھیں۔

''اور یہی وجہ ہے کہ ہم سیکولر شاؤ نزم اور رومین رائٹس جیسی اصطلاحات میں پھنس کر الجھ کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ کون سا سوال ایسا ہے جس کا جواب قرآن میں نہیں۔ قرآن پاک اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے۔ جس سے ہم نے منہ موڑ رکھا ہے۔ اور جب نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کی جاتی ہے، اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ:

''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور عطا کروں گا اور جو ناشکری کرو گے، میرا عذاب شدید ہے۔''

سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۷

''ہم نے قرآن کی، اس کے علم کی ناقدری کی ہے۔ لہٰذا نتیجتاً ہم معمولی سے معمولی مسئلے کے لیے بھی گھر سے باہر مفتی اور مولوی ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ مگر اپنے ہی گھر میں اونچے طاقوں پر مخملیں جزدانوں میں لپٹے رکھے قرآن سے استفادہ اور ہدایت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو انسان آنکھوں کی بینائی ہوتے ہوئے بھی دوسروں کا ہاتھ پکڑ کر چل رہا ہو۔ اس کی حالت پر سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کیا، کیا جا سکتا ہے۔''

طاہرہ کا مفصل تبصرہ اور تنقید ان کی دینی بصیرت اور امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر ان کے دکھ کی ترجمان تھی۔ اس نے انہیں رشک سے دیکھا جو اپنے اردگرد کے لوگوں کے لیے فکرمند تھیں۔ تمام مسلمانوں کے لیے پریشان تھیں۔

اس لمحے اسے خود سے شرم آئی کہ وہ بھی تو صرف اپنی دنیاوی مشکلات اور معاملات میں الجھی محض اپنے متعلق ہی سوچتی ہے۔ گویا اس کی سوچ اور فکر کا کینوس اتنا وسیع نہیں تھا۔ جتنا بحیثیت مسلمان ہونا چاہیے تھا۔

''مگر مجھے اپنی اس نئی جنریشن سے یعنی تم لوگوں سے بہت امید ہے دُرّی...... اور یقین ہے کہ جو غلطی ہم پچھلی

کئی نسلوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ وہ ہماری آنے والی اولاد انہیں دُہرائے گی ان شاءاللہ۔ اور اس سلسلے میں میڈیا کی efforts بھی کسی حد تک قابل تعریف ہے۔''

اس کی سوچ کے برعکس طاہرہ نے اس پر اس کی نسل پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا، وہ ضمیر پر پڑا بوجھ کچھ کم کر گیا۔ طاہرہ کی یہ خوبی اسے اپنا اسیر کر چکی تھی کہ وہ اس کی سوچ کا ارتکاز اس کی اپنی ذات سے ہٹا کر خالقِ حقیقی اور اس کی مخلوق کی طرف منتقل کر دیتی تھیں۔ جو اسے اپنے دکھ کو بھولنے میں بہت مدد دیتی تھی۔

''ہمارے یہاں طلاق کا ریشو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب ہے قرآن سے دوری اور دین اسلام کی اصل روح سے ناواقفیت۔ ہم جتنا وقت اور جس قدر محنت دنیاوی علوم کے حصول کے لیے صرف کرتے ہیں اگر اس سے آدھا ہم دین کا علم حاصل کرنے میں لگائیں تو یقین کرو۔ ہماری حالت قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں جیسی ہو جائے۔''

اس کے متفق ہو کر سر ہلانے پر وہ پھر سے گویا ہوئیں۔

''محض ایک عربی زبان کا سیکھنا ہم پر بھاری ہے۔ حالانکہ یہ زبان ہم سب کی زبان ہے۔ عالمِ ارواح میں ''عہدِ الست'' اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے اسی زبان میں ہی تو لیا تھا۔ اور پوچھا تھا۔

الست بربکم (ط)

''کیا نہیں ہوں میں تمہارا رب؟''

قالو بلیٰ شھدنا. (ج)

سب نے کہا تھا ہاں (تو ہی ہمارا رب ہے) ہم گواہی دیتے ہیں۔ (سورۂ اعراف آیت 172)

''قبر میں بھی اسی زبان میں سوال کریں گے منکر نکیر۔ اور جنت میں بھی یہی زبان بولی جائے گی تو کیوں نہیں ہم تھوڑی سی توجہ اس زبان پر بھی دے لیں۔ یقین کرو ورنہ اگر ہم عربی کو ٹھیک سے سمجھنے لگیں۔ بھلے بول نہ سکیں تب بھی بحیثیت مسلمان ہمارے بہت سے مذہبی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ پھر کسی مسلمان کو اپنے حقوق و فرائض سمجھنے کے لیے کسی سے فتوے اور مشورے نہیں لینے پڑیں گے۔ قرآن پاک ہی اصل علم ہے اور علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض کیا گیا ہے مگر اس کے لیے مستند اور باعمل عالم دین کی ضرورت یقیناً ہوتی ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اس درس میں لے کر جاتی ہوں۔''

وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

''ہاں مگر یہ نہ سمجھنا کہ یہ ساری نصیحتیں صرف تمہارے لیے ہیں۔ کیونکہ تم لڑکی ہو۔ شام میں مردوں کے لیے بھی درس ہوتا ہے۔ عکرمہ ولی کے ساتھ جاتا ہے وہاں۔'' وہ خاموشی سے انہیں سنے جا رہی تھی کہ انہوں نے اچانک شوخی سے کہا تھا۔

اب اسے سمجھ آیا کہ آج کل عکرمہ اسے گھر پر نظر کیوں نہیں آ رہا۔ پچھلے دنوں سے ولی اسے ساتھ گھسیٹ لے جاتا تھا۔ دو ہفتوں میں اس کی بھی شادی ہونے والی تھی۔

البتہ اسے قدرے حیرت ہوئی تھی جو طاہرہ بانو کی نگاہ سے چھپی نہ رہ سکی۔

''اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔ گھر بنانے کی ذمے داری محض لڑکی پر ہی تو نہیں ہوتی۔ اللہ نے مرد کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ رکھی ہے۔ شادی دو پہیوں کی گاڑی ہے۔ اس میں مرد و عورت دونوں کو ہی سمجھ بوجھ سے کام لینا ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں کو ہی اپنی، اپنی حیثیتوں، کردار اور فرائض کا درست اور لازمی علم ہونا چاہیے۔''

انہوں نے اس کے استفسار کیے بنا ہی جواب دے ڈالا تھا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا تھا۔ طاہرہ کی باتوں نے سوچ کے در وا کیے تھے۔
حسب سابق باہر بھاگتی دوڑتی ٹریفک پر نظر ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود اسے ہجوم سے ڈر لگتا تھا۔ پہچان لیے جانے کا دھڑکا ابھی تک لگا رہتا تھا۔

☆......☆......

آغا جان کی حالت تین دن بہت مخدوش رہی۔ جس کے باعث سب گھر والے اشکبار سجدے میں گرے دعائیں کرتے رہے۔ اس کے بعد کہیں جا کر چوتھے دن انہیں کچھ سنبھالا ملا۔ گو کہ حالت اب بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کیا جاتا مگر پہلے کی نسبت بہت فرق تھا۔
آج پورے پانچ دن بعد آغا جان سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ وہ بے تاب سا اندر آیا تھا۔ آغا جان اس وقت سینے تک کمبل اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔
''آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کسی کو کھو دینے کے ڈر سے یا کھو دینے کے بعد ہی ہمیں اس کی صحیح قدر محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات ہم پہلے کیوں نہیں جان جاتے۔''
وہ بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر آ بیٹھا اور ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا مگر وہ گہری نیند سوتے رہے۔
''جیسے دُرِ مکنون کو کھو دینے کے بعد اور آج آغا جان کو کھو دینے کے خوف نے مجھے بتایا کہ میرے لیے یہ دونوں ہستیاں کیا ہیں۔'' اس نے گہری سانس کھینچی۔
''عجیب طرح کی مماثلت ہے ان دونوں کے مابین۔ جس سال میں نے دُرِ مکنون کو کھویا اسی سال آغا جان سے بھی دور ہوا۔ جب دُرِ مکنون کو دوبارہ دیکھا تب ہی آغا جان سے بھی دوبارہ ملنا ہوا۔ اور آج جبکہ دُرِ مکنون مجھ سے دور جا رہی ہے۔ بلکہ جا چکی ہے۔ تو کیا آغا جان بھی......''
''آغا جان اب بہت بہتر ہیں زوی۔ حوصلہ رکھو۔'' صنوبر پھوپی نہ جانے کب اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر لکھے خوف کو گویا پڑھ لیا تھا انہوں نے۔ شفقت سے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا تو وہ سر ہلا کر آغا جان کی بند آنکھوں کے پپوٹوں کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کچھ ورد کرنے لگا تھا۔

☆......☆......

وقت کی تھال سے کچھ اور لمحوں کے سکے گرے اور یوں شادی میں صرف ایک دن رہ گیا۔
کل اس کا اور عکرمہ کا نکاح ہو جانا تھا۔ گویا دادی کے کمرے میں یہ اس کی آخری رات تھی۔ حسب معمول نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر دادی کی ہدایت پر وہ لیٹ گئی تھی۔
مہندی ایکسپرٹ نے ڈنر کے بعد اس کے ہاتھوں اور پیروں کو حسین بیل بوٹوں سے سجایا تھا۔ جس کے خشک ہوتے ہی دادی نے اسے آرام کرنے کی غرض سے لٹا دیا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ اپنے اندر اترتے سناٹے کو محسوس کر رہی تھی۔ گو کہ سدرہ اور رزوہا نے اسے بہت چھیڑا تھا، گدگدایا تھا۔ مگر درون ذات ایک نہ ٹوٹنے والا سناٹا تھا جیسے۔
''کل کیا ہوگا؟ وہ کس طرح اس نئے رشتے کو قبول کرے گی؟ کیونکر نبھائے گی؟ عکرمہ کو کیسے فیس کرے گی؟'' لاتعداد سوالات بگولوں کے مانند ذہن و دل پر چکرا رہے تھے۔ پھر ان کو سوچتے سوچتے وہ شاید غنودگی میں چلی گئی تھی کہ اچانک کسی کی باتوں کی آواز پر آنکھ کھل گئی۔
کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ وہ دائیں جانب کروٹ لیے لیٹی تھی۔ معاً اسے احساس ہوا کہ دادی اور مظفر انکل آپس میں بات کر رہے ہیں۔ ان کی دھیمی آوازیں جاگنے پر سماعت کا حصہ بنیں۔
''دعا کریں اماں کہ میرے بچے خوش رہیں۔ اب تو خوشی کے موقعوں سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔'' مظفر صاحب

کالرزیدہ خدشوں اور واہموں سے پُر لہجہ سنائی دیا۔

''تم فکر مت کرو میرے بچے۔ اللہ سب اچھا کرے گا۔ عکرمہ بہت سمجھ دار اور مہربان صفت ہے۔ وہ دُرِ مکنون کو سنبھال لے گا۔ ان شاء اللہ۔'' دادی کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا۔

''آپ صحیح کہتی ہیں اماں۔ عکرمہ بہت نیک بچہ ہے۔ بس ڈر لگتا ہے کہ کہیں میرے فیصلے سے اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ دعا کریں اماں کہ دُرِ مکنون اسے خوش رکھ سکے۔ نہیں تو میں بھائی جان کی روح کے آگے شرمسار ہو جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس قدر وضع دار ہے کہ کبھی کچھ ظاہر نہیں کرے گا۔'' مظفر صاحب ماں کے آگے بالکل بچہ بنے دل کھول کے بیٹھ گئے تھے۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا مظفر بیٹا تسلی رکھو۔ دُرِ مکنون بھی بہت سمجھدار اور معاملہ فہم ہے۔ اس نے خود اپنی رضا سے عکرمہ کے رشتے کو قبول کیا ہے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اس پر دباؤ نہیں ڈالا۔ یہ فیصلہ محض تمہارا نہیں۔ دُرِ مکنون نے بذاتِ خود سوچ سمجھ کر ہاں کی ہے۔'' انہوں نے مظفر صاحب کو اطمینان دلایا۔

''پھر ایسا کیوں ہے اماں کہ دُرِ مکنون مجھے بے چین لگتی ہے۔ جیسے وہ خوش نہیں ہے۔ گھبرائی ہوئی سی ہے۔''

''شادی سے پہلے ہر لڑکی اسی طرح فکر مند ہوتی ہے بیٹا۔ پھر صوفیہ اور زاہد میاں کی یادیں بھی تو ہیں۔ جو اسے اداس کر دیتی ہیں۔ اس خوشی کے موقع پر وہ اسے کیسے، کیسے نہ یاد آتے ہوں گے۔''

دادی کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ مظفر صاحب کو تسلی سی ہوئی۔

''لڑکیاں بڑی حساس ہوتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر انہیں ماں سے اپنے دل کی ہزاروں باتیں کرنی ہوتی ہیں۔ بہت سے خوف اور خدشے بتانے ہوتے ہیں۔ تسلی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ مگر دُرِ مکنون سے یہ سکھ تو نصیب نے چھین لیا ہے۔ کیا کریں سوائے کفِ افسوس ملنے کے۔'' دادی کے پُرسوز لہجے پر دُرِ مکنون کا دل گداز ہونے لگا تھا۔

''بس آگے اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے ہزاروں لاکھوں کروڑوں خوشیوں سے نوازے، آمین!'' وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

''ثم آمین۔'' مظفر صاحب نے صدقِ دل سے کہا تو دُرِ مکنون ان دونوں کی محبت اور خلوص پر جیسے پور پور بھیگ گئی۔

اسے اپنا روم، روم ان دونوں کی محبت میں مقروض محسوس ہوا تو بے اختیار دل سجدہ شکر بجا لایا۔ اور آنکھوں سے اشک بہہ نکلے۔ والدین کے نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی فکر کرنے والے اس کے لیے دعا کرنے والے کتنے لوگ تھے جن کے اخلاص پر اسے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ جلتے دل پر جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا تھا۔ ایک سکون سا رگ و پے میں اترتا محسوس کرتے ہوئے اس نے پلکیں موند لی تھیں۔

☆......☆......☆

''زوبی بھائی، کل نکاح ہے دُرِ مکنون کا۔ پلیز مجھے لے چلیں کراچی۔ دیکھیں ناں اب تو آغا جان کی کنڈیشن بھی stable ہے۔ وہ پرائیویٹ روم میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ پاپا سے اجازت مانگیں گے تو وہ منع نہیں کریں گے آپ کو۔ صرف چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ دوپہر کی فلائٹ سے چلیں گے اور رات کی فلائٹ سے واپسی۔'' عینی پورا دن اس کے گرد طواف کرتی رہی تھی۔ اسے مناتی رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کا دل لہو، لہو ہو رہا تھا۔ یہ لمحے اس پر کس قدر گراں تھے۔

''پاسبل نہیں ہے عینی۔ میں آغا جان کو اس وقت چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم طارق سے بات کر لو۔ اگر وہ لے جانے کو تیار ہے تو میں اجازت لے دوں گا تمہیں۔'' اس نے رسانیت سے سمجھایا تھا اسے۔ مگر وہ بھی زاویار کی ہی

بہن تھی۔ بس جیسے ضد تھی کہ جائے گی تو زاویار کے ساتھ ہی جائے گی۔
''ہرگز نہیں، میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ ڈزی آپ کی بھی تو اسٹوڈنٹ تھی زوی بھائی۔ اس کی زندگی کا اتنا اہم دن ہے۔ آپ کا بھی فرض بنتا ہے اسے دعائیں دیں۔ اس کی خوشی میں شامل ہوں۔ آخر کچھ تعلق تو آپ کا بھی رہا ہے اس سے۔''
''بالکل، میں صد فیصد متفق ہوں تم سے عینی۔'' عینی کے ضدی لہجے میں کہے گئے جملوں کی تائید شہرین نے کی تھی۔ جو نہ جانے کب وہاں چلی آئی تھی۔
''ٹیچر اسٹوڈنٹ کا تعلق تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ دل سے بہت قریب۔ ذہن کے بہت نزدیک..... کیوں زوی۔ سچ کہا ناں میں نے۔'' شوخی بھرا انداز تھا اس کا۔ زاویار کو مخاطب کیا تو اس نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔
"just stay out of it Sheri"
اس کا لہجہ سلگتا ہوا تھا۔ شہرین نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر جیسے اپنی مسکراہٹ روکی۔
''مگر زوی بھائی......''
''اسٹاپ اٹ عینی!'' عینی نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ یک دم وہ غصے میں دہاڑ اٹھا۔
''میں نے کہہ دیا ناں کہ میں نہیں جاؤں گا۔ سمجھ آئی کہ نہیں۔'' انگلی اٹھا کر انتہائی غیظ و غضب میں عینی سے کہا تو وہ سہم کر رہ گئی۔ اور بل تو شہرین بھی گئی۔ جس کے پاس سے وہ کسی آندھی طوفان کے مانند گزرا تھا۔
پھر پورا دن اس کا راوی کے کنارے گزرا۔ پانی میں ہر تھوڑی دیر بعد کنکر پھینکنے سے بننے والے گرداب کو دیکھتے ہوئے وہ خود سے لڑتا رہا تھا، پچھتاتا رہا تھا، خود کو کوستا رہا تھا، جھنجھلا رہا تھا اور شاید وہ یہی کرتا رہتا اگر شہریار صاحب کا میسج اسے ہوش نہ دلاتا۔
''زوی..... کہاں ہو تم؟ آغا جان کی طبیعت اچانک پھر خراب ہو گئی ہے وہ کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ پریشان ہیں تمہارے لیے۔ جلدی آجاؤ۔ وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔''
سورج ڈوب رہا تھا۔ اس پیغام کے ساتھ یک دم اس کا دل بھی ڈوبا تو وہ سب کچھ بھلا کر الٹے پاؤں بھاگ آیا۔
آغا جان کو پھر سے ICU میں شفٹ کیا جا چکا تھا۔ وہ پہنچا تو اسے اکیلے اندر جانے کی اجازت دی گئی۔
''میں آگیا ہوں آغا جان۔'' وہ لپک کر ان کے بیڈ کی طرف آیا تھا۔ اس کی آواز پر انہوں نے نقاہت بھرے انداز میں آنکھ کھولی اور پھر اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔
''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا زوی۔'' انہوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جسے اس نے بعجلت تھام لیا۔

☆......☆......☆

''نہ پہننے دیں آپ مجھے یہ جیولری۔ مگر یاد رکھیں اپنی شادی پر میں یہی سیٹ پہنوں گی۔''
صوفیہ کی بیسٹ فرینڈ کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ ساڑی کے ساتھ کوئی خوب صورت سا سیٹ پہننا چاہ رہی تھیں۔ اسی لیے وہ زیور لاکر سے نکلوا کر لائی تھیں۔ ان کا جڑاؤ گلوبند بہت بھاری تھا۔ جس کے ساتھ حسین لمبے آویزے تھے جو کندھوں تک آتے تھے۔ ڈرِ مکنون کی سالوں سے اس پر نظر تھی۔ آج بھی پہننے کی اجازت مانگی تو ڈانٹ پڑ گئی تھی۔ جس پر وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔
''اتنا بھاری سیٹ؟'' صوفیہ ہنسی تھیں۔
''جی اتنا بھاری سیٹ۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قطعیت سے کہا تھا۔
''جب تک تمہارا وقت آئے گا۔ اور بھی حسین سے حسین ڈیزائن آچکے ہوں گے مارکیٹ میں۔ تب تمہیں یہ

بہت اولڈ فیشن لگے گا۔''

''ہرگز نہیں، یہ مجھے کبھی پرانا نہیں لگے گا۔'' اس نے ایک جذب سے آویزوں کے نگینوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ صوفیہ اپنی ہنسی نہ روک سکی تھیں۔

''توبہ ہے کُرتی، تم زیورات کی کس قدر شوقین ہو۔ تمہاری شادی تو مجھے کسی سنار سے کرنی پڑے گی۔''

''سنار سے کیوں؟'' وہ ٹھنکی تھی۔ ''شادی میں کروں گی کسی ایسے دل والے بندے سے جو میرے لیے زیورات کا ڈھیر لگا دے گا۔ آپ دیکھیے گا اپنی شادی والے دن میرے پاس اتنی جیولری ہوگی کہ میرے لیے یہ چوائس کرنا مشکل ہوگا کہ کیا پہنوں۔'' اس نے لجائی ہوئی نظروں سے وائٹ گولڈ کے بریسلٹ کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسے یقین سے کہا کہ صوفیہ دل ہی دل میں ''ان شاء اللہ'' کہہ کر مسکرا دی تھیں۔

''چلو ٹھیک ہے۔ پھر اس دن میں بھی اپنی ساری جیولری تمہیں دے دوں گی۔'' جیولری باکس بند کرتے ہوئے انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا تو اس نے تشکیک بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''سوچ لیں، مکر تو نہ جائیں گی۔'' وہ گویا وعدہ لینے پر تلی تھی۔

''نہیں، بالکل نہیں مکروں گی۔ یہ سب کچھ تمہیں دے دوں گی۔ اپنے لیے بھی کچھ نہ رکھوں گی۔'' صوفیہ نے مسکراہٹ دبا کر گویا یقین دلایا تھا۔

''ماما کہاں ہیں آپ......؟'' بے آواز آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے تھے۔

پارلر جانے سے پہلے دادی اسے تمام جیولری نکال کر دے گئی تھیں۔ جس میں صوفیہ کے زیورات کے علاوہ مکرمہ کی والدہ اور دادی کی طرف سے بھی جیولری بھی تھی۔ ساتھ ہی عروسی جوڑے کے ساتھ لیے گئے سیٹ وغیرہ بھی تھے۔ اسے خود انتخاب کرنا تھا۔

''سچ کہا تھا آپ نے ماما۔ آپ نے اپنے لیے تو واقعی کچھ بھی نہیں رکھا۔'' باوجود کوشش کے آنکھوں سے بہتے اشک روکنے میں وہ بری طرح ناکام تھی۔

اتنے میں زوہا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

''اُف......بس کرو دری۔ مت روؤ اس طرح۔'' وہ لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔ ''پتا تھا مجھے کہ یہی ہوگا۔ اسی لیے منع بھی کیا تھا میں نے دادی کو کہ صوفیہ آنٹی کی کوئی چیز نہ دکھائیں آج تمہیں۔'' اسے خود سے لگاتے ہوئے وہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔

''ماما...... میری ماما۔'' زوہا کا اسے خود سے لگانا گویا سارے بند توڑ گیا۔ یکدم وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''بس کرو دری۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' زوہا کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئی تھیں۔ پیار سے سمجھایا۔ پھر پانی لا کر دیا۔

''سوچو ذرا۔ آج اگر صوفیہ آنٹی ہوتیں تو کیا تمہیں اس طرح روتا دیکھ کر خوش ہوتیں؟''

اس کے رخساروں پر سے آنسو صاف کرتے ہوئے زوہا نے اسے سمجھانے کے لیے نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا۔ جس پر دُرِ مکنون نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں ناں۔ کتنا دکھ ہوتا انہیں تمہیں ایسے اداس دیکھ کر...... تو پلیز خود کو کنٹرول کرو۔ آج تمہاری زندگی کا بہت حسین دن ہے۔ اس کی ابتدا آنسوؤں سے نہ کرو۔'' زوہا کچھ دیر اسے سمجھاتی رہی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ شادر لے کر بھاری دل کے ساتھ پارلر جانے کے لیے تیار تھی۔

☆......☆......☆

آغا جان کے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔
''آپ کیسے ہیں آغا جان؟'' لہجے میں تشویش اور خدشے بول رہے تھے۔
''اب تم آ گئے ہو تو خود کو اچھا محسوس کر رہا ہوں۔'' نقاہت کے باعث وہ بہت آہستگی سے بولے تھے۔
''آپ ٹھیک ہو جائیں گے آغا جان۔'' اس نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔
آغا جان نے ''ہوں'' کہہ کر لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تو وہ گھبرا سا گیا۔
''آغا جان۔'' بے ساختہ انہیں پکارا۔
''ہوں۔'' انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر ہولے سے مسکرا دیے۔
زاویار کے چہرے پر انہیں کھو دینے کا خوف صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔
اس نے اپنے پُرحدت ہاتھوں میں ان کا ضعیف ہاتھ جکڑ رکھا تھا۔
''زاویار۔'' انہوں نے اسے پکارا۔
''جی آغا جان۔'' وہ ہمہ تن گوش تھا۔
''ایسا لگتا ہے جیسے اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔'' وہ بہت رک، رک کر بول رہے تھے۔
زاویار کے لیے روح فرسا الفاظ تھے یہ۔ اس نے ان کے ہاتھ کو مزید بھینچ لیا۔
''ایسا کچھ نہیں ہوگا آغا جان۔ ابھی تو آپ کو میرے ساتھ بہت سا وقت گزارنا ہے۔ گزرے ساڑھے تین سال کا نقصان پورا کرنا ہے۔''
''تمہارا گھر بستے دیکھنا ہے۔ تمہارے بچے گودوں کھلانے ہیں۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے انہوں نے کچھ ایسی حسرت سے کہا کہ زاویار لب بستہ رہ گیا۔
کس قدر ارمان تھا انہیں اس کا گھر بستا دیکھنے کا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دل پر بوجھ سا آن گرا۔
''آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں آغا جان۔ پھر جیسے آپ کہیں گے میں ویسے ہی کروں گا۔''
جذبات اور پچھتاوے اس کے اندر گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔
بس یاد تھا تو محض یہ کہ سامنے صاحب فراش ہستی اس کے لیے والدین، دوست، غم خوار اور مربی سبھی کچھ ہے اور اسے مایوس کر کے وہ اندر سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔
''اور جو میں ٹھیک ہی نہ ہوا تو؟'' جلال انصاری کا لہجہ شکستہ تھا۔ زاویار کے اعصاب پر کوڑے کی طرح برسا ان کا استفہامیہ انداز۔
''کیا میں تمہاری خوشی دیکھنے کا ارمان دل میں لیے، لیے ہی چلا جاؤں گا؟'' وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ مایوسی چہرے سے مترشح تھی۔
''ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اس کا گلا رندھ رہا تھا مگر وہ بولے گیا۔ ''آپ بہت جلد گھر واپس چلیں گے میرے ساتھ۔ پھر جو خوشی چاہیں پوری کر لیجیے گا۔ انکار نہیں کروں گا۔''
''شادی سے بھی نہیں......'' قدرے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔
اس نے دیکھا اس کے اقرار نے ان کے چہرے کی زردی میں کیسی زندگی بھر دی تھی۔ وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے عجیب سی تھکن اندر اترتی محسوس کی۔
''سچ؟'' وہ جیسے بے یقین تھے۔
''اعتبار کریں میرا۔ قول دے رہا ہوں۔'' اس کا سنجیدہ لہجہ مضبوط مگر تھکن زدہ تھا۔

جلال انصاری نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں سچائی دھری تھی۔ اس نے نظر جھکائی نہ چرائی۔ کچھ تھا اس کے انداز اور سبھاؤ میں۔ جلال انصاری پُرسکون ہو کر مسکرا دیے۔ پھر کچھ لمحے اسے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد اچانک انہوں نے پوچھا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ یہ کام آج ہی انجام دے دیا جائے تو؟"

غیر متوقع سوال تھا۔ زاویار جہاں کا تہاں رہ گیا۔

"منع تو نہیں کرو گے؟" امید و بیم سے مزین لہجہ زاویار کی قوتِ گویائی کو جیسے سلب کر گیا۔ وہ گویا اس کا امتحان لے رہے تھے۔ جو اس نازک وقت میں جذبات کے ہاتھوں بری طرح مات کھا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا آغا جان کی محبت اور ان کو کھو دینے کا ڈر اس وقت اس کی ہر سوچ پر حاوی تھا۔ لیکن جو وہ کرنے کو کہہ رہے تھے آیا وہ ایسا کر سکے گا۔؟

اس نے اپنے اندر جھانکا۔

"آخر تم کب تک خود سے وابستہ لوگوں کو مایوس کرتے رہو گے؟ کب تک ان کی پلکوں سے خواب نوچ نوچ کر انہیں رت جگے بخشتے رہو گے زاویار انصاری؟ انہیں دکھ دیتے رہو گے؟ کیا تمہیں عزیز رکھنے کی سزا ہے یہ؟ کوئی بددعا ہو تم؟"

"میری طرف سے جبر نہیں ہے۔ دل کی آمادگی سے فیصلہ کرو تبھی اقرار کرنا۔" اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔ وہ بہت شفقت سے بولے تھے۔ لہجے کے خلوص نے اسے اسیر کر لیا۔

"میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں میرے بچے۔"

"اور میں آپ کو۔" اس نے ایک مغلوب کیفیت میں خود کو کہتے سنا تھا۔

☆ ☆

بیوٹیشن نے اس کی نوک پلک سنوارنے میں اپنی ساری مہارت استعمال کر ڈالی تھی۔ اس نے جب خود کو آئینے میں دیکھا تو خود بھی ساکت رہ گئی۔ وہ اس قدر حسین بھی لگ سکتی ہے اسے اندازہ نہیں تھا۔

اسکارلٹ اور پنک کنٹراسٹ کے حسین عروسی جوڑے میں وہ سر تا پیر کوئی شاہکار لگ رہی تھی۔ کانچ کی چوڑیاں، جڑاؤ کنگن، جیولری، میک اپ اور گریس فل جوڑے نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر ڈالا تھا۔

"ماشاء اللہ۔" سدرہ اسے تک کرنے آئی تھیں۔ دیکھا تو جیسے دنگ ہی رہ گئیں۔

"اُف۔ ڈز کشون تم تو مجھے کامپلیکسڈ اور عکرمہ کو دیوانہ کر دو گی۔ سچ میں آج اس بچارے کی خیر نہیں۔" شوخ لہجہ صداقت سے سرشار تھا۔

اسے احساس تھا کہ سدرہ نے ایک لفظ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

"ایک اس حسین چہرے کے علاوہ اور میرے پاس ہے بھی کیا؟ کاش میں ایک سیاہ فام بھدی عورت ہوتی مگر ماتھے پر یہ داغ نہ ہوتا۔" اس نے سوچا۔

"اونہوں، پھر وہی ناشکری۔" کسی نے اندر ہی اندر اسے جھڑکا تھا اس نے مڑی ہوئی پلکوں کی جھالر جھکالی۔ سدرہ کی ستائش و توصیف اس کے دل کے تار چھیڑ گئی تھی۔

اور پھر ہوٹل میں داخل ہوتے ہی گویا سب کی زبان پر اس کے حسن کا قصیدہ جاری ہو گیا تھا۔ اس کے اردگرد بہت شور قہقہے اور جھلملاہٹیں تھیں۔ جو اس کے اندر کے سکوت کو بار ہا چھکا جاتیں۔

طاہرہ آنٹی، دادی اور مظفر صاحب نے کچھ ایسی شفقت اور پیار سے اس کا استقبال کیا کہ اسے ماما اور بابا کی کمی کا دکھ ہلکا پڑتا محسوس ہوا تھا۔ ردا، زوہا اور زارا نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ سائرہ بیگم نے اسے دیکھا تو اپنی

جگہ جم سی گئیں۔ وہ ان کی توقع سے کہیں بڑھ کر خوب صورت لگ رہی تھی۔
"You are looking gorgeous زری۔ سچ میں نے آج تک اتنی حسین برائڈ نہیں دیکھی۔ عکرمہ کتنا لکی ہے۔" قارینہ صاف گوئی سے بے ساختہ کہہ گئی تھی۔ جس پر وہ بری طرح جھینپی۔
پھر سب لوگ مل کر اسے چھیڑتے رہے۔ تاہم اس رنگ و نور، شور و ہنگامے اور خوشی و انبساط نے اس کے دل پر چھائے سناٹے کی ضرب نہیں لگائی تھی۔ مگر جس وقت نکاح نامے پر دستخط کرنے کے لیے قلم اس کے حنائی ہاتھ میں تھمایا گیا اور "کیا تمہیں قبول ہے؟" کا سوال کیا گیا۔ اس کے اندر کی خاموشی ایک چھناکے سے ٹوٹی۔
بے اختیار اس کی نگاہ کسی کی تلاش میں بھٹکی تھی۔ اور پھر مظفر صاحب کے پہلو میں کھڑی سائرہ شیرازی کے سوگوار چہرے کو چھو کر ساتھ کھڑی ردا کے چہرے پر جا رکی۔
"کم آن زری say yes" ردا اسے اس طرح اپنی جانب گم صم نظروں سے دیکھتا پا کر یونہی مسکرا دی پھر ہولے سے اشارتاً کہا۔
"قبول ہے کہو زرمکنون بیٹا۔" طاہرہ اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ حلاوت سے بولیں تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر نظر مظفر صاحب کی طرف اٹھی۔
"کیا آپ کو قبول ہے؟" نکاح خواں کے ایک بار پھر سوال کرنے پر اس کا دل چاہا دھاڑیں مار، مار کر رونا شروع کر دے۔ اور کہے کہ وہ قبول کیے جانے کے لائق نہیں ہے مگر سامنے کھڑے شیرازی انکل نے اسے ایسا کچھ بھی نہ کہنے دیا۔
بلا ارادہ اور بے ساختہ اس کا سر اثبات میں ہلا تھا۔
اس نے دیکھا مظفر صاحب کا چہرہ جیسے خوشی اور مسرت سے جگمگا اٹھا تھا۔ انہوں نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا تو اسے اپنے سارے دکھ ماند پڑتے محسوس ہوئے۔ ایجاب و قبول کے بعد اس کے دستخط کرتے ہی کمرے میں خوشگوار سا شور اٹھ کھڑا ہوا۔
☆☆☆
"زوی نے ہاں کہہ دی۔"
یہ خبر نہیں۔ مژدۂ جانفزا تھا گویا۔ انصاری خاندان کا ہر شخص اس خبر سے متاثر ہوا۔
"کیا واقعی؟" ہر کوئی اپنی جگہ حیران تھا۔
"ہوں۔" صنوبر نے میمونہ بیگم کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر مسرت سے لبریز لہجے میں کہا تو ساتھ بیٹھی شہرین نے بے یقینی سے ان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ ماں اور خالہ کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ مگر متلاشی نظریں زاویار کو ڈھونڈنے میں ناکام رہیں۔
"مگر یہ معجزہ ہوا کیسے؟ وہ تو سو جان سے انکاری تھا۔" مسز شہریار نے نخوت سے سوال کیا تو صنوبر کے چہرے پر ناگواری اتر آئی۔
"انکاری نہیں تھا وہ۔ بس کیریئر بنانے کے لیے کچھ وقت درکار تھا اسے مگر اب آغا جان کی حالت اور صحت کے پیش نظر اس نے اپنے فیصلے کو تبدیل کر لیا ہے۔" صنوبر اور زاویار کا دفاع نہ کرتیں۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ جواباً مسز شہریار محض طنز سے مسکرائی کر رہ چھوڑ گئی تھیں۔
"مبارک ہو شیری آپی۔"
نینی بے ساختہ اس کے کندھے سے آ لگی تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔ اس کے ارد گرد سب چہرے خوشی سے معمور تھے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھا مگر ان کی آنکھیں بھی مسرت سے لبریز تھیں۔ اسے ان کی تو دلی

مراد بر آئی تھی۔

''مما...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے اسے اپنے کندھے سے لگایا تو اس نے گہری سانس بھر کر اُن کے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا ہوا میری جان؟'' میمونہ بیگم نے پیار سے اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

''پلیز...... میرے ساتھ میرے کمرے میں چلیں۔'' اس کا لہجہ پست اور آواز مدہم تھی۔

''مگر......''

''پلیز مما!'' اس کے ملتجی اصرار بھرے انداز پر میمونہ بیگم کو اس کے ساتھ آنا ہی پڑا۔

''یہ سب کیا ہے مما؟'' اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہی وہ تڑپ کر سوالیہ ہوئی تھی۔

''کیا مطلب کیا ہے بیٹا۔ میں سمجھی نہیں؟'' میمونہ نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

''یہ سب جو آپ نے اور میں نے ابھی سنا ہے کہ زوی راضی ہو گیا ہے۔''

''ہاں الحمدللہ! اللہ نے یہ وقت دکھایا۔ ہم جتنا شکر کریں کم ہے۔ آغا جان کو کتنا ارمان ہے زوی اور تمہاری شادی کا۔ شکر ہے کہ وہ راضی ہو گیا ہے۔'' میمونہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔

''تو کیا محض زوی کے راضی ہونے سے شادی ہو جائے گی ہماری؟'' ماں کے خاموش ہونے پر اس نے یک دم تڑخ کر سوال داغ دیا تھا۔

''کیا میری مرضی کی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ میں راضی ہوں یا نہیں۔'' اس کا سوال لمحے بھر کے لیے میمونہ بیگم کو لاجواب کر گیا۔

''کیا میں کوئی بھیڑ بکری ہوں کہ جو مجھے ساتھ لے جانے پر راضی ہو گیا اس کے ہاتھ میں میری رسی تھمادی جائے گی؟''

''کیا لڑکی کی کوئی مرضی کوئی رضا نہیں ہوتی۔ آغا جان نے زوی سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن میں؟ کیا مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا؟''

''ایسی بات نہیں بیٹا۔'' میمونہ درحقیقت بری طرح گڑبڑا گئی تھیں۔

زاویار کے انکار اور اب اقرار نے جیسے اس طرف دھیان دینے ہی نہیں دیا۔ یوں بھی ان کے خاندان میں یہ تمام فیصلے آج تک آغا جان نے ہی کیے تھے اور مرضی معلوم کرنے کی رسم خاص طور پر لڑکیوں کے لیے ابھی ان کے یہاں رواج نہیں پا سکی تھی۔

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتیں کہ زوی مجھ سے شادی کے لیے کبھی راضی نہیں تھا اور اب وہ یہ سب محض آغا جان کی خاطر کر رہا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے بیٹا۔ زوی تم سے نہیں، شادی سے انکاری تھا۔ وہ کراچی میں رہ کر اپنا آپ منوانا چاہتا تھا۔ آغا جان سے ناراضی کی وجہ سے اپنے آپ کو اتنا ماں ان سے دور رکھ کر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ ان کے بغیر بھی جی سکتا ہے۔ زندگی میں آگے بڑھ سکتا ہے۔'' میمونہ نرمی سے دفاعی انداز اختیار کر گئی تھیں۔

''تمہارے لیے بھی محض اسی لیے انکاری تھا وہ کہ تم آغا جان کی چوائس ہو۔''

''تو اب...... اب کیا ہو گیا ہے مما؟ میں آغا جان کی چوائس تو اب بھی ہوں ناں۔''

''ہاں مگر اب آغا جان اور زوی کے بیچ کی ناراضی ختم ہو چکی ہے شیری بیٹا۔ کیا تم نہیں جانتیں یہ بات۔''

''میں تو بہت کچھ جانتی ہوں مما مگر کاش آپ سے یہ سب کہہ سکتی۔'' ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ بلا ارادہ سوچنے لگی تھی۔

''دیکھو تم ریلیکس کرو۔ شاید یہ سب اچانک ہوگیا ہے۔ اس لیے تم نروس ہو رہی ہو۔ ہر لڑکی ایسے وقت میں تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔ but its natural تم فی الحال کمرے میں آرام کرو۔ میں آغا جان سے ملنے اسپتال جا رہی ہوں۔ وہیں جا کر سب تفصیل معلوم ہوگی۔ چلو۔ شاباش پریشان مت ہو۔'' انہوں نے اسے کسی چھوٹے بچے کی طرح پچکارا تھا۔ وہ حیرت سے ماں کی شکل دیکھتی رہ گئی اور وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی اسے تنہا چھوڑ گئیں۔

☆......☆......

قاضی صاحب کے ڈریسنگ روم سے باہر نکلتے ہی کتنے ہی لوگ ان کی تقلید میں باہر کی جانب قدم بڑھا گئے۔

''چلو بھی باقی سب بھی باہر نکلو۔ ذرا دیر خالہ، بھانجی بھی آپس میں کچھ کہہ سن لیں۔'' سائرہ بیگم نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا تو باقی سب متبسم سے باہر نکل گئے۔

''مبارک ہو تمہیں دُرِ مکنون۔ بہت مبارک ہو۔'' دروازہ بند کر کے اس کے قریب بیٹھتے ہی انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

کوئی حیرت سی حیرت تھی۔ دُرِ مکنون جو اس وقت یوں بھی حواس باختہ تھی..... گھبرائی، گھبرائی سی ان کے کندھے سے جا لگی تھی۔

''بالآخر تم نے ثابت کر ہی دیا کہ تم صوفیہ زاہد کی بیٹی ہو۔ اس صوفیہ کی جس نے آج سے کئی سال پہلے میرے حق پر ڈاکا مارا تھا۔''

اگلے لمحے انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے علیحدہ کیا تھا۔ ان کے لمس میں بھی گویا غصہ تھا..... تپش تھی۔ وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''جس نے میرا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا تھا اور ان کی ماں نے میری ماں کا گھر اور آج تم نے بھی وہی راہ اپنائی۔'' ان کی مدھم آواز والا آتشیں لہجہ اس کی سماعتیں جلا رہا تھا گویا۔

وہ بے یقینی کی کیفیت میں انہیں تکے جا رہی تھی۔

''کم از کم تمہیں تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جس گھر نے..... جس خالہ نے تمہیں پناہ دی اس کی بیٹی کا حق مار گئیں تم۔ صحیح کہا کسی نے ''اصل سے خطا نہیں اور کم نسل سے وفا نہیں۔'' خون تو آخر بولنے لگا ناں۔''

''مم..... مگر..... میں۔''

''شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ۔ تمہیں اچھی طرح پتا چل چکا تھا کہ میں، ردا اور عکرمہ کی شادی کرانا چاہتی تھی۔ پھر بھی تم نے عکرمہ کو اس شادی سے نہ روکا۔ حالانکہ مٹھی میں کر رکھا ہے تم نے اسے۔ ماں بھی بالکل ایسی ہی تھی تمہاری۔ نہ شکل نہ صورت مگر مردوں کو مٹھی میں کرنا خوب آتا تھا اسے۔ تو تم بھلا کیسے پیچھے رہتیں۔'' کئی دن بعد ایک بار پھر سائرہ بیگم کا تنفر الفاظ کا لبادہ اوڑھے اسے خاکستر کیے دے رہا تھا۔ پھر وہی طعنے اور رگوں کو چھیلتے تشنے۔

دُرِ مکنون کا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حال تھا۔ یک دم دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''مگر ایک بات یاد رکھنا دُرِ مکنون۔ میں ردا کی شادی عکرمہ سے کرا کے رہوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔'' یکلخت اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے انہوں نے گویا سیسہ اس کے کانوں میں پگھلایا تھا۔

اور وہ فقط ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

''بہت، بہت مبارک ہو میری جان۔'' دادی جان اندر داخل ہوئی تھیں۔ باہر نکاح کی رسم مکمل ہو گئی تھی۔ ان کے گلے لگتے ہی اس نے اپنے سارے آنسو پلکیں جھپک، جھپک کر پینے کی کوشش کی۔

''اللہ خوش و آباد رکھے۔ میرے عکرمہ کی زندگی میں بہار ہی بہار آجائے تمہارے دم سے۔'' دادی کے ارمان

لفظوں میں ڈھل رہے تھے۔
اور وہ بھی، یہی سی سوچے جا رہی تھی۔
''کیسے آئے گی بہار ان کی زندگی میں۔ میں بھلا کیا دے سکوں گی انہیں اور پھر بھی...... کتنا مایوس کیا میں نے انہیں۔ آخر میری ذات ہمیشہ ان کے لیے باعث تکلیف ہی کیوں ہے یا اللہ!''
اسے اپنی سانس رکی، رکی سی لگی۔
''کاش میں یہ سب ہونے سے روک پاتی۔ ایک بار کوشش کی بھی تھی میں نے مگر تیرے حکم کے آگے کس کی چلی ہے۔'' نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ پچھتاووں کا شکار ہونے لگی تھی۔
آج زندگی کے اہم ترین دن پر جب اسے خوش ہونا تھا۔ جب اسے اس نئے رشتے کو نبھانے کے عہد کرنے تھے خود سے وہ نہ جانے کیا، کیا سوچے جا رہی تھی۔

☆......☆......

''زوی، کیوں کر رہے ہو تم یہ سب...... آخر کیوں؟''
اقرار چچا نے اسے انصاری ہاؤس آرام کرنے اور فریش ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ ابھی وہ شاور لے کر نکلا ہی تھا کہ شیریں دستک دیے کر اندر چلی آئی تھی۔
کچھ دیر پہلے ہی عاصمہ سے بات کی تھی اس نے۔ جہاں وہ بیٹے کے لیے خوش تھیں وہیں بیٹے کے نکاح کے اس پُرمسرت اور اہم موقع پر وہاں موجود نہ ہونے کا بہت قلق ہوا ان کو۔ اور افسوس تو زاویار کو بھی تھا مگر اس وقت آغا جان کی علالت کے پیش نظر یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔ اس نے ماں کو سمجھایا تو وہ خاموش ہو رہیں۔ اس کی پریشانی کا اندازہ تھا ان کو وہ اسے مزید پریشان نہ کر سکیں۔
''او کے بیٹا خوش آباد رہو۔ میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' عاصمہ کے لہجے میں ملال تھا جسے محسوس کر کے اسے دل پر پڑا بوجھ اور بھی گراں لگا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں نکاح تھا اس کا۔ وہ پہلی فلائٹ لے کر بھی پہنچ نہیں پاتیں۔
اور اب شیریں سوال نامہ لیے حاضر تھی۔ زاویار نے آئینے میں ابھرتی اس کی شبیہ کو دیکھا۔ ہیئر برش چلاتا اس کا ہاتھ شیریں کے سوال پر ٹھٹک گیا جو بلا تمہید ہی شروع ہو گئی تھی۔
''شیری پلیز...... تم یہاں بیٹھو۔'' وہ اس کی جانب پلٹا تو لہجے میں ملائمت کے ساتھ ساتھ پشیمانی بھی تھی۔
''نہیں بیٹھنا مجھے۔'' ہمیشہ کی ہنستی مسکراتی شیریں اس وقت سخت برانگیختہ تھی۔ ''تم بس میرے سوال کا جواب دو۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔
''تم جانتی تو ہو کہ میں کیوں کر رہا ہوں ایسا۔''
''ہوں...... جانتی تو ہوں میں۔ مگر تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔'' شیریں کے لہجے میں دہک تھی۔
زاویار نے نہ سمجھنے والے انداز سے اسے دیکھا۔
''دیکھو شیری، آغا جان کی کنڈیشن (حالت) بہت کریٹیکل ہے۔ ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ اس وقت ہم انہیں ہر طرح کے صدمے سے دور...... انہیں خوش رکھیں۔''
''بس کیا یہی وجہ ہے زوی؟'' زاویار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے قدرے طنز سے سوال کیا تھا۔
زاویار نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف بغور دیکھا۔ جس کے چہرے پر ناگفتہ بہ سا تاثر تھا۔
''ہاں یہی وجہ ہے۔''
''آر یو شیور زوی...؟''

''ہاں بالکل۔''

زاویار اب کے متردد سا بولا تھا۔ لہجے میں الجھن تھی۔

''تو گویا تم یہ سب آغا جان کی محبت میں کر رہے ہو؟''

''تمہیں کوئی شک ہے اس میں؟''

''نہیں... بالکل نہیں۔ بلکہ تمہاری محبت کے بارے میں تو میں سو فیصد سے زیادہ پُر یقین ہوں۔'' تلخ سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ گویا تھی۔ زاویار کو اس کی آنکھوں میں غصہ، دکھ، تھکن اور حسد بیک وقت ساتھ دکھائی دیے... [illegible]

''مگر یہ دھوکا خود کو مت دو زوی۔ تم اس شادی پر اس لیے راضی نہیں ہوئے ہو کہ تمہیں آغا جان سے محبت ہے بلکہ یہ دُرِ مکنون کی محبت ہے جس نے تمہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔''

''شہرین...'' حیرت اور غصے سے وہ یک دم چیخ پڑا تھا۔

''[illegible] مت زوی۔ نہیں کر و اس حقیقت کو۔ سچ تو یہ ہے کہ دُرِ مکنون نے تمہارا ساتھ قبول نہیں کیا اور آج اس کے سامنے جارحیت... تو بھلا تم کیوں پیچھے رہتے۔ درحقیقت تم اسے جتانا چاہتے ہو کہ اگر وہ [illegible] بھلا کر کسی اور [illegible] سکتی ہے... تم بھی کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر سکتے ہو، ہے ناں۔'' اس [illegible] زیادہ بلند آواز [illegible] شہرین نے اسے یک دم چپ کرا دیا تھا۔

''but thats not fair... زندگی ہے کوئی شطرنج کا کھیل نہیں کہ کسی کو مات دینے کے لیے مجھے مہرہ [illegible] زندہ، جیتی جاگتی میرے بھی احساسات [illegible] میرا دل بھی [illegible] ہے۔'' یکلخت شہرین [illegible] آنسو [illegible] تھی۔

''شہرین پلیز...'' [illegible] کے انداز میں [illegible] کھیسیٹر جیسے دل کو کسی [illegible] نے چھوا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو... بیوی۔ اس تمام معاملے سے میرے بابا جنے سے دُرِ مکنون کا کوئی تعلق نہیں۔''

''مگر تم سے تو ہے ناں زوی۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ ماما اور نازو خالہ کے بہت چاہنے پر بھی میں نے خود انکار کیا تھا دُرِ مکنون کے لیے۔'' دل ہی دل میں وہ شہرین کے قیافوں پر حیران ہوتا بظاہر نرم لہجے میں بولا تھا۔ [illegible] بات [illegible] ایسا کرنے میں اسے سخت دقت کا سامنا تھا۔

سامنے کھڑی شہرین کی ٹٹولتی جائزہ لیتی گہری کچھ کہتی، سنتی نگاہیں اس کا حصار کیے ہوئے تھیں۔

''جانتی ہوں۔'' وہ پست لہجے میں بولی تھی۔ لہجہ کچھ سوچتا ہوا تھا۔

''تو پھر تم ان واہمات کو جھٹک دو شیری۔ اس وقت آغا جان کو ہماری ضرورت ہے۔'' اس کے پُرسوچ لہجے پر قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے زاویار نے اس کے دھیان کا رخ پھیرنے کی سعی کی۔

''یہ آغا جان کی زندگی اور موت کا سوال ہے شیری۔''

''تو کیا آغا جان کی زندگی کی خاطر مجھے قربان کر دیا جائے۔ کیا یہ چاہتے ہو تم؟ سب جانتے ہیں کہ تم میرے ساتھ زندگی گزارنا نہ پہلے چاہتے تھے اور نہ اب چاہتے ہو۔ محض آغا جان کی خاطر یہ گلے پڑا ڈھول کتنے دن بجاؤ گے زوی؟ میں تمہیں پسند نہیں ہوں۔'' شہرین نے صاف گوئی سے استفسار کیا تو وہ جھنجلا سا گیا۔

''تمہیں کیا الہام ہوا ہے کہ میں تم کو پسند نہیں کرتا یا میں نے کبھی کہا ایسا؟''

''ایسی باتیں کہی سنی نہیں جاتیں زوی۔ ایک لڑکی اپنے اوپر پڑنے والی ہر نگاہ کو پہچانتی ہے۔ دُرِ مکنون تمہاری زندگی میں ہوتی نہ ہوتی۔ میں آغا جان کی چوائس ہوتی نہ ہوتی۔ تم مجھے کبھی نہ چنتے زوی۔''

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا لائف پارٹنر خود چنیں۔ صدیوں سے یہ کام ہمارے بزرگ کرتے آ رہے ہیں۔ ارینج میرج کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔"

"ہاں گناہ نہیں ہے۔ مگر یہ ارینج میرج نہیں فورسڈ میرج ہے زوی زبردستی کا بندھن۔"

"تم ایک بار پھر غلط ہو شیری۔ مجھے کسی نے فورس نہیں کیا۔ آغا جان نے فیصلہ مجھ پر چھوڑا تھا۔ میں نے اپنے دل کی رضامندی سے ہاں کہی۔"

"کیونکہ تم ایموشنل ہو رہے ہو زوی۔ آغا جان کی جس خواہش کو آخری سمجھ کر تم پورا کرنے جا رہے ہو۔ قدم، قدم پر تمہیں پچھتاوے کا شکار بنائے گی۔ یہ ایک دو دن کی بات نہیں ہے زوی۔ پلیز جذبات کو ایک طرف رکھ کر سوچو۔"

"مجھے جو سوچنا تھا میں سوچ چکا شیری۔ مجھے انکار نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہیں انکار ہے تو کہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی اور کو۔" قطعیت سے کہہ کر زاویار نے ذہن میں در آنے والے اس اچانک خیال کو سوال کی شکل دی تو شہرین مرزا لمحے بھر کے لیے لب بستہ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

اور اسی لمحے دھڑ سے دروازہ کھلا تھا۔

"شیری آپی.....! آپ کو میمونہ پھپھو اور کامران انکل بلا رہے ہیں۔ پلیز جلدی آئیں۔" بینی افتاں و خیزاں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے گئی تو وہ عکس گہری نظروں سے زاویار کو دیکھتی اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے زاویار انصاری کے لیے استفسار چھوڑ گئی۔

"کیوں کر رہا ہوں میں ایسا۔ کیا واقعی آغا جان کے لیے یا....." اسے اپنا آپ کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆
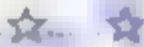
"کم آن ڈزی۔ اٹھو۔ سب دلہن کا ویٹ کر رہے ہیں ہال روم میں۔" زوہا اس دوران اندر آ گئی تھی اور پھر لڑکیوں کے جھرمٹ میں اسے ہال روم لے جایا گیا۔ باہر اسے کتنے ہی لوگوں کو فیس کرنا ہے۔ نجانے کتنی نظریں اس کے چہرے کو چھوئیں گی۔ جانی انجانی نظریں۔ جانے انجانے چہرے۔

"کہیں وہ پہچان تو نہیں لی جائے گی۔" اس بھیانک خیال کے ساتھ ہی اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ دل چاہا سر پر سیٹ کیا ہوا دوپٹا آگے کھینچ لے مگر وہ پنوں کے ذریعے فکس کر دیا گیا تھا۔

بال روم کے دروازے میں قدم رکھتے ہی اپنے سر کو مزید جھکا لیا تھا۔ مووی کی لائٹ چہرے کو روشن کرنے لگی۔

"سر اونچا کرو ڈزی۔ ایسے میں کس طرح مووی بناؤں گی تمہاری۔" سدرہ کی آواز پر اس نے بے ساختہ نظر اٹھائی تھی۔

سامنے سدرہ کسی پیشہ ور مووی میکر کی طرح کیمرا ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

اس کی نظر بال روم پر پڑی تو لمحے بھر کے لیے ٹھٹک سی گئی۔ ہال میں صرف خواتین موجود تھیں۔ بائیں جانب بنے پارٹیشن کی وجہ سے مرد حضرات نظروں سے اوجھل تھے۔ اس نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو یک دم پُرسکون محسوس کیا۔

"ریلیکس ہو جاؤ ڈزی۔ عکرمہ نے تمہارے مزاج کے مطابق یہ سارے انتظامات کرائے ہیں۔ مگر بڑا hard time دیا ہے اسے آج کچھ لوگوں نے۔ ہمارے کچھ ریلیٹوز واپس چلے گئے ہیں۔ انہیں پارٹیشن کروانا بالکل اچھا نہیں لگا۔"

اس کے شرارے کو تھامتے ہوئے اسے چلنے میں مدد دیتی زوہا نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو جہاں وہ خوش ہوئی وہیں مہمانوں کے لوٹ جانے کا سن کر اسے دلی افسوس ہوا۔

"ڈونٹ وری۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بس یہ دیکھو کہ تمہارے لیے تمہارے سرتاج دنیا سے لڑ سکتے ہیں۔" دوسری جانب ردا تھی۔ مسکرا کر اسے چھیڑا تو وہ بے ساختہ نظر چرا گئی۔ اسے ردا سے نظر ملاتے ہوئے شدید دقت کا سامنا تھا۔

اسٹیج پر تو گویا ساری ینگ پارٹی جمع تھی۔ عکرمہ بیگ شیروانی اور ڈارک میرون کلاہ میں بہت مختلف اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ یہ ڈریس دادی کی فرمائش پر سلوایا تھا اس نے۔

دُرِمکنون کی نگاہ اسٹیج کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے ایک لمحے کو اس کی طرف اٹھی تھی جو اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر دو قدم آگے آیا تھا۔ اور جب اوپر آنے کے لیے اس نے دُرِمکنون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ٹھٹک گئی۔

"کم آن ڈری۔ اب موصوف شوہر ہیں تمہارے۔ ہاتھ دو اپنا انہیں۔" سدرہ موؤی بناتے ہوئے بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی۔

سدرہ کے اس فقرے پر بقیہ لڑکیوں نے وہ شور ڈالا کہ اس نے اپنی طرف بڑھے عکرمہ کے ہاتھ کو تھامنے میں ہی عافیت جانی۔ اور ٹھیک اس لمحے ایک چبھتی ہوئی معاندانہ نگاہ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی۔

لاشعوری طور پر اس کی نظر اسٹیج کے ایک جانب کھڑی سائرہ بیگم کی طرف اٹھی تو یوں لگا جیسے کوئی برف اس کے اندر اتر رہی ہو۔

اس نگاہ میں غصہ بھی تھا اور بے بسی بھی۔ دکھ بھی تھا اور شکست بھی۔ دُرِمکنون کو اپنے دل پر منوں ٹنوں وزنی بوجھ دھرتا محسوس ہوا۔

"آخر میں کیوں ہمیشہ میمی خالہ کے لیے دکھ کا باعث بنتی ہوں۔ کیا میں انہیں کوئی خوشی نہیں دے سکتی؟" اس کے گرد شور برپا تھا۔ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، مبارک باد، جملے، پُرخلوص مسکراہٹیں۔ مگر اسے تو جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"جو خوشی انہیں تم سے چاہیے ہے دُرِمکنون۔ وہ کتنے ہی لوگوں کو خوش کر کے دینی ہوگی۔ تمہیں اس دنیا میں ملنے والے اس واحد رشتے سے اس محرم مرد سے دستبردار ہونا ہوگا۔ کیا کر سکو گی تم ایسا؟" سوال تھا کہ گرم پانی کا چھینٹا۔ اس نے ساتھ بیٹھے عکرمہ کی طرف دیکھا جو ابھی بھی اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

"بیٹھ گئی ہے وہ۔ اب تو اس کا ہاتھ چھوڑ دو عکرمہ۔" زوہا کی شوخی عروج پر تھی۔ لہجہ مجسم تھا۔

"یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تو نہیں تھاما ہے ڈیئر کزن۔" اسے اپنے ٹھنڈے ٹھار ہاتھ پر عکرمہ کی انگلیوں کی گرفت کا بے ساختہ احساس ہوا تھا۔ گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچا تھا اس نے۔

سامنے کھڑی سائرہ بیگم کی آتشیں نظریں اسے جھلسائے دے رہی تھیں۔ اس کی کیفیت یوں تھی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ پشیمانی سے چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ مگر حرکت کچھ ایسی بے ساختہ تھی کہ سب کے قہقہے ایک ساتھ ابھرے تھے۔

"لو جی۔ انہوں نے تو ابھی سے ہاتھ چھڑا لیا اور آپ زندگی بھر کی بات کر رہے تھے عکرمہ بھائی۔" آج ردا بھی شوخ ہو رہی تھی۔

دُرِمکنون نے چور نظروں سے ردا کے چہرے کو کھوجا تھا۔

"زندگی بھر کے ساتھ کے لیے ہاتھ کا ہاتھ میں ہونا نہیں دل کا دل سے جڑنا اہم ہوتا ہے بیٹا جی۔" طاہرہ آنٹی اس دوران نزدیک آ گئی تھیں۔ گمبھیر لہجے میں جواب دے کر عکرمہ کی جان خلاصی کرائی تو سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

فوٹوگرافی کے لیے سدرہ کی ایک کزن آئی ہوئی تھی جو آج کل پروفیشنل فوٹوگرافی سیکھ رہی تھی۔ اس کے کہنے سے رش کو کم کیا گیا اور پھر گروپس کی شکل میں تصویریں بننا شروع ہوئیں۔

"از اوری تھنگ اوکے؟" شریر ٹولہ ایک طرف ہٹا تو اسے عکرمہ کی مدھم آواز میں کیا گیا سوال سنائی دیا۔

جواباً وہ محض سر جھکا کر رہ گئی۔
پھر مووی کی چکا چوند اور کیمروں کی کلک کی آوازوں نے اسے مزید کچھ سوچنے نہ دیا۔ زوبا اور سدرہ کی ہدایات پر عمل کرتی وہ چہرے پر مسکراہٹ سجانے کی بھرپور سعی کرتے کرتے بالآخر تھکنے لگی تو عکرمہ کو ہی اس پر رحم آیا۔
''بس کریں بھابی۔ بہت بن گئی مووی اور اسنیپس پلیز اب ریلیکس ہونے دیں۔'' اس کی نظروں نے دُرِمکنون کے چہرے پر تھکن پڑھ لی تھی۔
''اوکے کائز۔ اب بریک کرتے ہیں۔'' سدرہ نے فی الحال کیمرا آف کیا۔
اس دوران [illegible] کی طرف چلا گیا تو سب اس کے گرد آ بیٹھے اور اب سیلفیز کا دور چلا۔ دُرِمکنون گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

☆......☆

''اچھے گھرانوں کی بیٹیاں والدین کی فرمانبردار ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے ماں باپ جو بھی فیصلے کرتے ہیں اس میں ان کی بہتری ہوتی ہے۔'' کامران مرزا کی عدالت میں میمونہ بیگم اسے تنہا چھوڑ گئی تھیں۔ باپ بیٹی کے درمیان ہمیشہ وہی پل کا کام دیتیں لیکن آج انہوں نے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔
وہ انہیں ڈبڈبائی آنکھوں سے جاتا دیکھتی رہ گئی مگر باپ کے آگے بولنے کی جسارت نہ کر سکی۔ اور اب جبکہ وہ بغیر کسی تمہید کے اسٹارٹ لے چکے تھے۔ وہ لب بستہ سی بیٹھی انہیں سن رہی تھی۔
''تمہاری اور زاویار کی شادی ماموں جان (آغا جان) کا خواب ہے۔ ہمیں بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ یہ وہ اعتماد ہے جو ہمیں ہمارے بزرگ پر ہے۔ زاویار بہت ہونہار اور شریف لڑکا ہے۔ ویل ایجوکیٹڈ اور ویل مینرڈ۔ شکل صورت اور شخصیت میں اس کے جوڑ کا کوئی نہیں خاندان میں۔''
''اس جیسا تو پوری دنیا میں کوئی نہیں پایا۔ مگر وہ چاند کے مانند ہے جس کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے ایک دن میں چکور کی طرح اپنے پر توڑ بیٹھوں گی۔'' اس نے سوچا۔
''اور سب سے بڑھ کر انصاری خاندان میں اس کی جو حیثیت ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ اس کی بیوی کو بھی وہی اہمیت ملے گی۔ کسی بھی لڑکی کے لیے ایسا پارٹنر ملنا گویا ہفت اقلیم کی دولت ملنے کے مترادف ہے۔''
کرنل کامران بیٹی کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے تمکنت سے کہے جا رہے تھے۔
''لہٰذا اس پرپوزل کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ تم سے اس لیے بھی نہیں پوچھا کہ زاویار تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ تم بچپن کے ساتھی ہو۔'' ان کا انداز دوٹوک تھا۔
''مگر تمہاری مما سے پتا چلا کہ تمہیں ہمارے اس رویّے سے شکایت ہوئی ہے۔ حالانکہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اس طرح سوچتی ہوگی۔'' ان کے حیرت کا اظہار کرنے پر وہ شرمندہ ہو گئی۔
''اِٹ از او کے بیٹا۔ اب میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔ سوچ کر جواب دو۔ میں تمہیں نہ ایموشنل بلیک میل کروں گا نہ فورس۔ اگر تم دل سے راضی نہیں تو ابھی وقت ہے منع کر سکتی ہو۔'' اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔
''آغا جان کی خواہش زاویار کی شادی کرنا ہے۔ اور اگر اس کے لیے تم راضی نہیں تو پھر اقرار یا ابرار کی بیٹیوں میں سے کسی اور کے لیے بات کرلوں گا میں۔'' کھٹ کر کے کوئی پتھر لگا تھا شیشۂ دل پر۔ کامران صاحب کی بات پر اس نے تڑپ کر سر اٹھایا تھا۔
''تمہیں خود پر جبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ الگ بات کہ اس رشتے میں تمہاری ماں کی اور میری دلی خوشی بھی شامل ہے۔''

پنجرے کا دروازہ کھول کر اس کے پر کتر دیے گئے تھے۔ سارے اختیار اسے سونپ کر بھی اسے پابند کر دیا گیا۔ اسے اپنی خوشی پوری کرنے کی آزادی دے کر بھی اپنی خواہش کی زنجیر سے باندھ لیا گیا۔

اس نے بلاارادہ باپ کی طرف دیکھا تھا۔ اسے لگا وہ ان کا مان کبھی نہیں توڑ سکے گی۔ نہ اپنے دل کے اس ارمان سے دستبردار ہو سکے گی۔

''بولو بیٹا۔ تمہارا جو بھی فیصلہ ہے ہمیں منظور ہے۔'' اس کی خاموشی پر وہ استفسار کر رہے تھے۔ اس کی اٹھی نظر جھک گئی۔

''کیا تمہاری اس خاموشی کو میں تمہاری رضامندی سمجھوں بیٹا؟'' کچھ دیر کمرے میں چپ کی چادر تنی رہی جسے کامران صاحب کی آواز نے ہی توڑا۔

''یہ تو طے ہے شہرین مرزا کہ تم کسی اور کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکو گی۔ تو پھر زوہی کے ساتھ رہ کر نا خوش ہونا ہی بہتر ہے۔ یہ ایسی نارسائی ہے جس میں کم از کم جدائی تو نہیں ہوگی۔'' دل نے چپکے سے مشورہ دیا تھا۔

باپ کے استفسار پر اس کا سر مزید جھک گیا۔ دل پر غلبہ پاتی باپ کی محبت نے اس کی زبان تالو سے جا لگائی۔

کامران صاحب اس کے سر جھکانے پر بردباری سے مسکرا دیے۔

''تمہاری منور خالہ تمہارے لیے ڈریس لے آئی ہیں۔ جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ شاباش۔''

وہ کہتے کہتے صوفے سے اٹھے تو وہ بھی ان کی تقلید میں کھڑی ہو گئی۔

''خوش رہو۔ آباد رہو۔'' اس کے سر کو شفقت سے تھپکتے، وہ اسے دعائیں دیتے کمرے سے نکلے ہی تھے کہ عینی اور شیبا وغیرہ نے یک دم دھاوا بول دیا۔ تب اندر شہرین کی رکی سانسیں جیسے بحال ہوئی تھیں۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی ہاں میں کتنے دلوں کی رضا چھپی تھی۔

''کانگریچولیشن شیری آپی۔ یو آر سچ آ سویٹ ہارٹ۔'' عینی اس کے گلے میں آلٹکی تھی۔

عینی کے پیچھے میمونہ اور منور بیگم بھی اندر داخل ہوئیں تو وہ ماں اور خالہ کی مسکراہٹوں پہ بلاارادہ نظروں کا زاویہ بدل گئی۔ دل کی دھڑکن عجیب سی سستی کا شکار محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر میں اس کے آگے بھی کھانا لا کر رکھا گیا تو عکرمہ کو بلوا لیا گیا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے خیال سے ہی ہولا گئی۔ ایک تو بھوک نہیں تھی اس پر میک اپ اور جیولری نے گویا جکڑ رکھا تھا۔

عکرمہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھا تو زرمکنون نے دیکھا۔ اس نے کلاہ اتار دیا تھا اور اب وہ خاصا ریلیکس نظر آ رہا تھا۔

اور ابھی پلیٹ اٹھا ہی رہا تھا کہ اس کا سیل بج اٹھا اور وہ کسی سے خوش گپیوں میں مصروف رہا اور اگلے لمحے اس نے موبائل اس کی جانب بڑھایا تھا۔

''عینی ہیں، آپ کو وش کرنا چاہ رہی ہیں۔''

اس نے رسانیت سے کہا تو زرمکنون کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں اتر آئیں۔

''ڈونٹ وری عینی ہی ہیں۔ پلیز بات کریں۔'' سیل فون کو mute کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کرتے ہوئے یقین دلایا تو زرمکنون کو سیل فون پکڑنا ہی پڑا۔

''السلام علیکم عینی۔'' اس کی مری مری آواز گواہ تھی کہ اس کے دل میں خدشے تھے۔

''وعلیکم السلام وری۔ بہت، بہت بلکہ بہت ہی بہت مبارک ہو میری پیاری سی دوست۔''

عینی کی چہکتی آواز نے اس کے اعصاب پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

عکرمہ نے اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ جس کا چہرہ اب پرسکون تھا۔

"آج کا دن بہت خوب صورت ہے دُرّی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے نہ آنے پر افسردہ ہو گی۔ مگر میں کسی طور تمہاری طرف نہیں آسکتی تھی اور معلوم ہے کیوں؟" عینی حسبِ سابق نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی۔

"آج زوی بھائی کی شادی ہے دُرّی شیری آپی کے ساتھ۔"

اس اچانک خبر نے ایک سیکنڈ کے لیے اس کے دل کی دھڑکن کو منتشر کیا۔

"آغا جان آئی سی یو میں ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ زوی بھائی اور شیری آپی کی شادی وہ اپنی آنکھوں سے ہوتی دیکھیں۔ تو آج چند گھنٹے کے نوٹس پر نکاح منعقد کیا جا رہا ہے۔ قاضی صاحب بس پہنچنے والے ہیں۔ اُف دُرّی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں میں کس قدر خوش ہوں۔ مگر یار ہال کا تو کچھ ہو ہی نہیں سکا۔ بس جلدی جلدی میں خود آپی کی شادی کے لیے جو کپڑے بنائے ہیں وہ پہن رہے ہیں ہم سب۔ جبکہ آپی کے لیے بازار سے ریڈی میڈ شرارہ سوٹ لے آئی ہیں منور پھوپی۔" عینی کی خوشی اور اس کی فکرات ہمیشہ کی طرح ویسی ہی تھیں۔

دُرِّ مکنون نے گہری سانس بھری۔

"بہت مبارک ہو تمہیں عینی۔ شیری آپی کو بھی میری جانب سے بہت مبارک باد دینا۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش و آباد رکھے۔"

اس کا لہجہ مدھم تھا۔

"اور زوی بھائی۔ ان کو تو تم بھول ہی گئیں۔ یاد ہے کتنا اچھا وقت گزرتا تھا ہمارا زوی بھائی کے ساتھ۔" عینی نے سادگی سے یاد دلایا۔

"ہاں انہیں بھی۔ آغا جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ اسے ماضی میں کھینچے لے جا رہی تھی مگر اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

"زوی بھائی کی ہاں سے جی اٹھے ہیں جیسے۔ بضد ہیں کہ انہیں آئی سی یو سے چند گھنٹوں کی چھٹی دی جائے۔ اُف دُرّی تمہیں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ زوی بھائی کے نکاح میں۔" اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عینی یک دم بہت ایکسائٹڈ ہو گئی تھی۔ اس کے آخری فقرے پر اس نے چند سیکنڈ کے لیے لب دانتوں تلے دبا لیے۔

"میرا نکاح ہو گیا ہے عینی۔" اور پھر جب بولی تو لہجے میں کچھ جتانے کا عنصر واضح تھا۔

ساتھ بیٹھے عکرمہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ جس کی نگاہیں خلا میں کسی کو کھوج رہی تھیں جیسے۔

"آئی ایم سوری دری۔ میرا مطلب تھا زوی بھائی کے نکاح کی تقریب میں۔ بہرحال یہ کتنا عجیب اتفاق ہے ناں دُرّی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم دونوں کی شادیاں ایک ہی دن ہوں گی۔ اللہ تم دونوں کو سکھی رکھے۔" وہ عینی ہی کیا جو شرمندہ ہو جائے۔ ہلکا سا قہقہہ لگا کر اس نے اپنی تصحیح کی اور پھر ایک دو باتیں کر کے اللہ حافظ کہہ دیا۔

اس نے چند گہری، گہری سانسیں لیں اور فون عکرمہ کی طرف بڑھا دیا۔ عکرمہ نے اسے بنظر غائر دیکھا اور پھر اس کی جانب پلیٹ بڑھا دی۔

"چلیں کھانا شروع کریں دُرِّ مکنون۔" دُرِّ مکنون نے چونک کر پلیٹ کی طرف دیکھا۔ جس میں گرلڈ فش اور بریانی تھی۔

"باؤلے ہو گئے ہو کیا عکرمہ۔ اتنا کھانا نہیں کھا سکے گی یہ۔ اس کا حلیہ دیکھا ہے تم نے۔" اس دوران زوہا ان کے پاس چلی آئی تھی۔ دُرِّ مکنون کی مشکل اس نے آسان کی۔

"کھانا نہیں کھائیں گی تو دوا کیسے لیں گی۔"

"خدا کے لیے عکرمہ۔ آج شادی ہے اس کی۔ لے لے گی دوا بھی۔" زوہا نے اسے گھور کر دوسری پلیٹ میں تھوڑی سی گرلڈ فش نکالی اور کانٹے کی مدد سے اسے کھلانے لگی۔

دادی کی فرمائش پر اسے نتھ پہنائی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے کھانا کھانا ایک معرکہ ہی تھا۔ جسے اس نے چٹکی سے پکڑ رکھا تھا۔ اسے محسوس ہوا اس کی ناک درد کر رہی تھی۔

''بس، مجھے درد ہو رہا ہے آپی۔'' آہستگی سے کہہ کر اس نے نتھ کو چھوڑ دیا تھا۔

''ہوں، ان فیکٹ تمہیں عادت نہیں ہے ناں۔'' زوہا نے اس سرخ پڑتی ناک کو دیکھ کر مزید کھلانے کا ارادہ ترک کیا۔

جس میں سے ہلکا، ہلکا خون رس رہا تھا۔

''عکرمہ پلیز ذرا ٹشو تو پکڑانا۔'' زوہا کے کہنے پر عکرمہ کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہوئی جو ساتھ بیٹھے معیز اور معاذ سے ہم کلام تھا۔

''کیا ہوا انہیں؟''

''کچھ نہیں۔ بس ذرا یہ نوز رنگ تھوڑا ہیوی ہے۔ اس لیے خون نکل رہا ہے۔'' زوہا ٹشو سے خون جذب کر رہی تھی۔ دُرِمکنون نے تکلیف کے باعث آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''تو ضرورت کیا ہے ایسی جیولری پہننے کی جو تکلیف دہ ہوں۔'' عکرمہ کے ماتھے پر شکن در آئی تھی۔

''مسٹر! آج شادی ہے دُری کی۔ دادی کی فرمائش تھی کہ اسے روایتی انداز سے سنوارا جائے۔ یوں بھی روز، روز تو نہیں آتا ناں یہ موقع۔ لہٰذا نتھ پہننا ضروری تھا اور ابھی تو ولیمے پر بھی پہننا ہے ایک بار اور۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے یہ سب کرنا۔ دُرِمکنون مجھے اس رنگ کے بغیر بھی قبول ہیں۔'' وہ یک دم بولا تھا۔ لہجے میں فکر تھا اور خفگی بھی۔

دُرِمکنون کے لیے اس کا یہ فقرہ کسی بھاری بوجھ سے کم نہ تھا۔

وہاں موجود سائرہ شیرازی کی نگاہوں سے نکلتی تنفر بھری شعاعیں اسے جھلسا رہی تھیں۔ جبکہ زوہا کا شوخ قہقہہ عکرمہ کو جھینپنے پر مجبور کر گیا تھا۔

☆......☆......

شیرازی ولا کی دہلیز پر قدم دھرتے ہوئے اسے بہت سے خیالات نے گھیر لیا تھا۔ آج سے ساڑھے تین سال پہلے وہ بہت مخدوش حالت میں یہاں لائی گئی تھی۔ کسی پتھر سے بھی بے سُول اس کا وجود ایک زندہ لاش کے مانند تھا۔

گزرے برسوں میں اس گھر کے مکینوں نے اسے محض روٹی، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات ہی فراہم نہ کی تھیں بلکہ عزت، محبت اور اعتماد کی دولت بھی دونوں ہاتھوں سے لٹائی تھی اس پر۔ اور ان کی اعلیٰ ظرفی محض یہاں پر آکر ہی ختم نہیں ہوگئی تھی۔ بلکہ آج انہوں نے اسے اس گھر کا مستقل مکین بھی بنا لیا تھا۔

چند گھنٹے پہلے جب وہ یہاں سے نکلی تھی اس وقت کے احساسات اس لمحے کس قدر بدل چکے تھے۔

یہی گھر تھا۔ یہی در و دیوار تھے اور یہی مکین تھے شیرازی ولا کے مگر اب اس کا رشتہ بدل چکا تھا۔ نکاح کے چند بولوں نے اس کی حیثیت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔

زارا، ردا اور زوہا اس کے گرد موجود تھیں۔

جبکہ عکرمہ، ولی اور اطہر کے ساتھ اس کی تقلید میں اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے دادی، طاہرہ آنٹی اور چہرے پر ناگواری کے تاثرات لیے سائرہ اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔

عبید، مظفر صاحب، سیف اور سعد بھی لاؤنج میں موجود تھے۔ فارینہ اور کچھ اور مہمان خواتین اس کے اندر داخل ہوتے ہی آگے بڑھ آئی تھیں۔ دادی کے کہنے پر اسے لاؤنج میں لا کر بٹھایا گیا۔ عکرمہ کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے وہ سائرہ بیگم کی چبھتی ہوئی، کاٹتی ہوئی نگاہوں کے باعث شدید اذیت کا شکار تھی۔ بار، بار ردا کے چہرے کو

دیکھتی اور افسردہ ہو جاتی۔

کافی دیر ہلا گلا اور خوش گپیوں کا دور چلا۔ اس دوران عکرمہ کے یاد دلانے پر دُرِ مکنون کو زبردستی کھانا کھلایا گیا۔

''تھوڑا سا کھا لو دُرّی۔ نہیں تو عکرمہ بھیّا سب کے سامنے کلاس لگانے سے گریز نہیں کرے گا۔ پہلے موصوف محض تمہارے استادِ محترم تھے اور اب شوہر نامدار کا عہدہ بھی مل گیا ہے انہیں۔ حکم چلانے کا قانونی اختیار ہے اب حضرت کے ہاتھ میں۔''

''اونہوں زوہا۔ تم میری مسز کو بہکانے کی کوششیں مت کرو۔ میں سب سن رہا ہوں۔'' بظاہر دلی سے باتوں میں مصروف وہ اس قدر غافل بھی نہیں تھا۔

''تو سن لو۔ میں ڈرتی ہوں تم سے۔ کیا دُرِ مکنون سمجھ رکھا ہے مجھے؟'' زوہا نے شوخی سے جواب دیا تھا۔

اس نے بمشکل چند لقمے کھائے اور پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

''چلو بیٹا۔ اب دلہن کو کمرے میں لے جاؤ۔ بہت تھکی ہوئی ہے۔'' وہ غائب دماغی سے بیٹھی سب کی خوش گپیاں سن رہی تھی۔ عکرمہ سب کی شوخیوں کی زد پر تھا ولی کے لطیفے بھی محفل کو زعفران زار کر رہے تھے کہ دادی نے حکم دے ڈالا۔ دُرِ مکنون نے گھبرا کر طاہرہ آنٹی کی طرف دیکھا تھا۔ جو اس سے نظر ملنے پر مسکرا دی تھیں۔

''ڈونٹ وری دُرّی۔ عکرمہ بہت اچھا انسان ہے۔ تمہیں اس سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' طاہرہ اس کے قریب آ کر سرگوشی میں بولیں تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''وہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا۔ ان شاء اللہ!''

''ہمیشہ کیا یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

''دُرِ مکنون خیال رکھنا ذرا۔ دوا لے لینا اپنی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اچانک آج ہی پھر کوئی فٹس پڑ جائے تمہیں۔ طاہرہ نے بہت محنت کی ہے تمہارے علاج پر۔ کہیں اسے مٹی میں نہ ملا دینا۔'' اس سے پہلے کہ وہ اوپر لے جائی جاتی۔ سائرہ بیگم نزدیک چلی آئی تھیں۔ بظاہر لگاوٹ اور فکرمندی سے کہی، درحقیقت وہ اسے ذلت کی اتھاہ گہرائی میں اتار گئی تھیں۔ اس نے اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرتی محسوس کیں۔

دادی اور طاہرہ بیگم کے سامنے شدید اہانت کے احساس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

''ارے نہیں سائرہ۔ ان شاء اللہ! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ دُرّی ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔'' ناگواری کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے طاہرہ بانو نے فوری جواب دیا تھا۔ ساتھ ہی دُرِ مکنون کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اسے احساسِ بے بسی سے نکالنے کی کوشش کی۔

''یہ ٹھیک رہے یہی بہتر ہے اماں۔ عکرمہ بہت اچھا ہے اس کی وجہ سے پریشان نہ ہو جائے کہیں بیچارہ۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میری بچی تو بہت قسمت والی ہے۔ عکرمہ کی تو زندگی سنور گئی ہے اسے پا کر۔'' دادی نے بھی اپنی رنجیدگی پر متانت کی ردا ڈالی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' سائرہ کے انداز میں پھنکار تھی جیسے۔ لہجہ طنزیہ تھا۔

''چلو ناں تم لوگ یہاں کیوں رک گئی ہو زوہا۔'' سدرہ نے کیمرا آن کر کے ہانک لگائی تو زوہا اور ردا اسے ساتھ لیے اوپر چلی آئیں۔

دُرِ مکنون کے قدم من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ سائرہ کے الفاظ کے تیر اسے چھلنی کر گئے۔ احساسِ کمتری نے اسے مکمل طور پر جکڑ لیا تھا۔ مستقبل اور خود سے وابستہ اس کی ہر امید جیسے تھپک، تھپک کر سلا دی گئی تھی۔

(جاری ہے)

خدا کی بستی

خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے حقیقت پر

مبنی ناہید سلطانہ اختر کی دلسوز تحریر

''آج تمہاری ثمینہ فرقان میرے آفس آئی تھیں۔'' میری بہن نے مجھے بتایا۔

''ثمینہ فرقان......'' میں چونکی۔ ''تمہارے آفس......'' میں نے تعجب سے کہا۔ ''کیوں......؟''

''میری ایک کولیگ سے ملنے......''

''تم سے بھی ملیں؟''

''ہاں...... تبھی تو مجھے پتا چلا کہ تم اور وہ کولیگز رہی ہو۔''

''خیریت تھی......؟''

''ہاں...... وہ جو میری کولیگ ہیں ناں وہ اور تمہاری ثمینہ کالج میں اکٹھی پڑھتی رہی ہیں۔ دوستی رہی ہے دونوں میں...... ثمینہ ان سے بڑی کھلی ملی ہی لگیں...... خاصی معقول خاتون لگتی ہیں...... مگر تھیں کچھ پریشان......''

''اچھا......'' مجھے ثمینہ کے پریشان ہونے کا سن کر قدرے حیرانی ہوئی کیونکہ ثمینہ کے ساتھ گزرے وقت

کے حوالے سے میں جانتی تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو چھوٹی، چھوٹی پریشانیوں کو ہنس کر اڑا دیتے ہیں اور بڑی پریشانیوں کو بھی اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتے۔

''پریشان کیوں تھیں؟''

''پتا نہیں، بس مجھے ایسا لگا..... جتنی دیر میں کلثوم میری کولیگ ان کی خاطر تواضع کا بندوبست کر کے واپس آئی ثمینہ اتنی دیر میرے پاس بیٹھیں۔ پھر دونوں چائے کے بعد کمرے سے باہر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے ثمینہ نے مجھ سے تمہارا موبائل نمبر بھی لیا۔''

''یہ کیسے پتا چلا کہ وہ اور میں کولیگز رہے ہیں؟''

''کلثوم نے مجھ سے ان کا تعارف کرایا تو بتایا کہ آپ کی بہن اور یہ کولیگز رہی ہیں۔''

''لوگ کہاں سے کہاں ٹکرا جاتے ہیں۔''

''تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ جاتے ہوئے سلام دینے کو کہا۔''

''وعلیکم السلام.....''

''گلہ کر رہی تھیں کہ آپا نے تو ایک دفعہ جانے کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا..... ویسے یار ہے یہ بڑی بے مروتی کہ تم جس راستے کو ایک مرتبہ چھوڑ دیتی ہو ادھر پلٹ کر نہیں جاتیں۔''

''مجھے پتھر کا بن جانے کا شوق نہیں۔''

''بے مروتی ہے یار.....''

''جو مرضی میں آئے کہو۔''

''میں تو پلٹ، پلٹ کر آشنا راستوں پر بلا سبب بھی جاتی ہوں۔''

''باوفا ہو اس لیے'' میں نے کہا۔

''دل پر نہ لے لینا مجھے بے مروت کی جگہ کوئی دوسرا لفظ سوجھا ہی نہیں۔''

''خاطر جمع رکھو دل پر لینے کو اور باتیں کم ہیں کیا۔''

''تھینکس.....''

''یو ویلکم.....'' میں مسکرا دی۔

ثمینہ فرقان کا ذکر ہم دونوں بہنوں کی باتوں میں تانویت اختیار کر گیا۔

☆☆☆

ثمینہ فرقان سے میری رفاقت محض چند برسوں کا قصہ تھی۔ میں ملازمت سے سبکدوشی کے نزدیک تھی اور ثمینہ فرقان ترقی پا کر نئی، نئی میرے مساوی منصب پر آئی تھی۔ ہماری عمروں میں کم و بیش بیس، بائیس سال کا فرق ضرور تھا۔ میری اور مجھ سے بعد والی نسلوں میں یہی فرق تھا کہ ہم زینے پر قدم بہ قدم آگے بڑھتے تھے۔ ہمارے بعد والی نسل جست لگا کر اوپر پہنچتی تھی۔ ثمینہ فرقان نے ملازمت کی ابتدا ہی اس گریڈ کی تھی جہاں میں اور مجھ جیسے سترہ، اٹھارہ سال نوکری کرنے کے بعد پہنچے تھے۔ لہٰذا ملازمت سے سبکدوشی سے چار، پانچ سال قبل میں جس منصب پر تھی ثمینہ فرقان سبکدوشی کی عمر سے ڈھائی دہائیوں سے بھی قبل اس منصب پر پہنچ چکی تھی۔ عمر کے اسی واضح تفاوت کے باعث ثمینہ نے مجھے احتراماً آپا کہنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کا آپا کہنا اچھا لگتا تھا۔

ثمینہ بھرپور شخصیت کی مالک تھی۔ خوش شکل، خوش لباس، خوش گپ اور نہایت دوست دار۔ اسے لوگوں سے تعلقات بنانے اور نبھانے کا ہنر آتا تھا۔ میرا انداز افسری عاجزانہ تھا، ثمینہ کا شاہانہ میں افسران اعلیٰ سے ضرورتاً بھی فاصلہ رکھتی۔ ثمینہ بلا ضرورت بھی راہ و رسم نبھاتی۔ میں دفتر کی جانب سے گاڑی کی سہولت ہونے کے باوجود عوامی بسوں میں سفر کر کے صرف اس فاصلے کے لیے دفتری گاڑی کی سہولت سے مستفید ہوتی جہاں تک عوامی بس دستیاب نہ ہوتی۔ ثمینہ فرقان اپنی ذاتی کار میں جسے ڈرائیور چلا رہا ہوتا اپنی جائے کار تک پہنچتی اور اسی میں واپس جاتی۔ ڈرائیور بھی دفتر کے نائب قاصدوں، مالی، چوکیداروں اور ڈرائیوروں سے گپ شپ کرنے لگتا بھی گاڑی میں اپنی نشست پر بیٹھے، بیٹھے خواب خرگوش کے مزے لینے لگتا۔ میں اسے دن بھر ثمینہ فرقان کے ساتھ نوکری بھگتاتے دیکھ کر ثمینہ کی ملازمت کے بارے میں سوچتی کہ نوکری ایسے بھی کی جاتی ہے۔ وہ نہایت فخر سے بتاتی کہ ملازمت اس کی ضرورت نہیں تھی

کبھی شوق تھا اب وقت گزاری کا بہانہ بن گیا تھا۔

ثمینہ شادی شدہ تھی۔ اس کی شادی کو کئی برس ہو چکے تھے مگر اولاد نہ تھی۔ شوہر ایسی ملازمت میں تھا۔ جو اسے گھر سے زیادہ تر دور رکھتی۔ بقول ثمینہ ملازمت کی ضرورت تو اس کے شوہر کو بھی نہ تھی مگر مسئلہ اس کا بھی وہی تھا کہ اسے وقت گزاری کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت تھی سو ثمینہ کی طرح وہ بلاضرورت نوکری کر رہا تھا۔ تین ہفتے نوکری پر رہتا تین ہفتے گھر پر چھٹی مناتا۔

دفتر کے ایک ساتھی نے جو ثمینہ کے خاندان سے اچھی طرح واقف تھا دفتر میں اس کی آمد کے بعد دیگر ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ایک جدی پشتی رئیس گھرانے کی فرد تھی۔ اس کی دو بہنیں اور تھیں ...... دونوں اس سے بڑی، سب سے بڑی بہن غیر شادی شدہ تھی۔ اس کا رشتہ خاندان ہی میں ہوا تھا۔ مگر اس کے منگیتر نے خاندان کی دوسری لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ تنازعہ اتنا بڑھا کہ برسوں پر محیط ہو گیا۔ ثمینہ کی بڑی بہن باپ کے گھر میں کنواری بیٹھی رہ گئی، ہنوز کنواری تھی۔ اور اب اس کی شادی کا باب گویا بند ہی ہو چکا تھا۔ مجھلی بہن کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی۔ سیدھا سادہ، ان پڑھ بندہ تھا۔ اس بہن کے ہاں شادی کے پندرہ، سولہ سال بعد ایک بیٹا ہوا تھا۔ ثمینہ کا ایک بھائی بھی تھا جو جوانی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ باپ نے ثمینہ اور اس کی بہنوں کے لیے اتنی میراث چھوڑی تھی جو ثمینہ اور اس کی بہنوں ہی نہیں اگلی نسلوں کے لیے بھی گرانقدر تھی۔ بیٹیوں کے لیے اس نے تولے کے حساب نہیں سیروں سونا چھوڑا تھا۔ گاؤں میں مربعوں زرعی اراضی تھی، حویلی تھی...... شہر میں بھی حویلی تھی جس میں وہ اور اس کی بڑی بہن اب رہتی تھیں۔ اس حویلی میں بیس سے زائد کمرے تھے اور اس کا احاطہ اتنا وسیع تھا کہ ایک وقت میں پچاسوں گاڑیاں اس حویلی کے احاطے میں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ تینوں بہنوں میں صرف ثمینہ پڑھی لکھی تھی۔ اور بقول ثمینہ اس نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ان سے لڑ جھگڑ کر تعلیم حاصل کی تھی۔

اس کی شادی بھی والدین کی مرضی کے خلاف اس کی اپنی پسند سے ایک غیر خاندان میں ہوئی تھی جو امارت میں اس کے باپ کے خاندان کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ ثمینہ کا شوہر فرقان انجینئر تھا۔ اس کی ملازمت کی نوعیت اسے تین ہفتے جائے ملازمت پر رکھتی تین ہفتے وہ گھر میں رہتا پھر اپنی جائے ملازمت پر واپس چلا جاتا۔ کبھی اس دوران میں ضرور تبدیلی بھی ہو جاتی...... ثمینہ کو اس کے باپ کی طرف سے ملے ورثے کے بعد ملازمت کی ضرورت نہ ثمینہ کو تھی نہ فرقان کو مگر پھر بھی دونوں ملازمت کر رہے تھے...... ثمینہ وقت گزاری کے لیے اور فرقان شاید اپنی بیوی کے ٹکڑوں پر پڑنے سے بچنے کے لیے...... دونوں بہر حال خوش تھے۔ ان کی زندگی میں سوائے اولاد کے کوئی اور کمی نہ تھی۔

دوپہر کو جب دفتر میں کھانے اور نماز کا وقفہ ہوتا تو ثمینہ اکثر میرے ساتھ آ بیٹھتی اور اپنے گھر، شوہر، بہنوں اور دفتری امور کی باتیں کرنے لگتی۔ اس کی بڑی بن بیاہی بہن جسے وہ بڑی باجی کہا کرتی تھی آبائی حویلی میں اس کے ساتھ ہی رہتی تھی اور جملہ امور خانہ داری کی وہی نگراں و منتظم تھیں۔ گھر میں ایک نہیں چار نوکر تھے۔ گھر کی صفائی ستھرائی، میلے برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی اور استری کے لیے ایک عورت، گھر کا سودا سلف لانے، باغیچے پودوں کی کاٹ چھانٹ اور آنے جانے والوں کے لیے صدر دروازے پر ڈیوٹی بھگتانے کے لیے اسی عورت کا شوہر، خانساماں اور ڈرائیور جو صبح سویرے آتا، رات کو اپنے گھر جاتا۔ بقول ثمینہ بڑی باجی کی موجودگی۔ اس کے لیے ایسی غیر معمولی نعمت تھی کہ اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی مہمان خانے میں رہتی تھی جہاں اسے ہر سہولت ہر راحت بن مانگے ملتی۔ اس کا کہنا تھا وہ اپنے گھر میں کھانے کی میز پر مہمانوں کی طرح بیٹھتی تھی۔ اسے اٹھ کر پانی گلاس میں انڈیلنے کی ضرورت نہ تھی۔ حد یہ تھی کہ درزی کو اس کے کپڑے سینے کے لیے دیے جاتے تو بڑی باجی ہی درزی کو اس کا ماپ اور ڈیزائننگ بتاتی تھیں۔ اس کا شوہر گھر آتا تو اس کے

کھانے اور آرام کا خیال بھی بڑی باجی ہی رکھتی تھیں.....ثمینہ کا کہنا تھا بڑی باجی اس سے اور اس کے شوہر سے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں اور وہ دونوں بھی بڑی باجی کا ماں کی طرح احترام کرتے تھے۔

ثمینہ کی دوسری بہن آبائی گاؤں میں بیاہی گئی تھی۔ اس کا شوہر بقول ثمینہ سیدھا سادہ ان پڑھ بندہ تھا۔ اپنی زمینداری تھی۔ [illegible] کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بھی سیدھی سادی عورت تھی بلکہ ثمینہ کے مطابق اس کا آئی کیو لیول بہت کم تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو شادی کے طویل عرصے بعد پیدا ہوا تھا۔ ثمینہ [illegible] دو تین ماہ بعد باقی دو بہنوں سے ملنے کے لیے [illegible] آتی [illegible] عشرہ رہ کر [illegible] اللہ لوگ تھے۔ بہن جب اپنی بڑی باجی [illegible] سے اور اس کے شوہر اور بچے کو کافی [illegible] تھیں۔ ثمینہ کو اپنے اکلوتے بھانجے سے بہت محبت تھی۔

ثمینہ کو تحفے تحائف دینے کا ویسے بھی بہت شوق تھا.....دفتر کے ساتھیوں اور اعلیٰ افسران کو کسی نہ کسی بہانے تحائف دیتی رہتی۔ کبھی گاؤں سے آئی کوئی سوغات، کسی کو سالگرہ کا تحفہ، کسی کی ترقی پر مبارک باد کے ساتھ مٹھائی یا کیک، اپنے شوہر کے ساتھ حج پر گئی تو سفرِ حج سے واپسی پر اس نے دفتر کے معمولی سے معمولی اہلکار کو بھی کھجور، آبِ زم زم، تسبیح، جانماز، مردوں کو ٹوپی اور عورتوں کے اسکارف پر مشتمل تبرکات کا پیکٹ فرداً فرداً تقسیم کیا۔

ثمینہ اکثر اپنی بہنوں اور شوہر کی باتیں مجھ سے کرتی۔ شوہر سے اسے بہت محبت تھی اور بقول اس کے شوہر بھی اس پر جان چھڑکتا تھا۔ بیوی کے آرام کا اسے اتنا خیال رہتا تھا کہ اس نے ہدایت کر رکھی تھی کہ جس دن ڈرائیور کسی وجہ سے چھٹی پر ہو وہ بھی دفتر نہ جائے۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں ثمینہ کا رُلنا اسے گوارا نہ تھا۔ وہ نہ صرف اپنی بڑی باجی بلکہ شوہر کی جانب سے ناز و نعم کی اس حد تک عادی تھی کہ دفتر میں بھی بسا اوقات وہ ساتھیوں کی جانب سے بھی اسی ناز و نعم کی توقع رکھتی تھی۔ آئے دن اسے باس سے شارٹ لیو کی ضرورت پڑ جاتی۔

''سر جی ! آج طبیعت اچھی نہیں ہے، میں جلدی گھر چلی جاؤں۔''

''سر جی ! چھوٹی باجی گاؤں سے آئی ہیں... آپ کے لیے شہد اور مکھن لائی تھیں، آج تو میں بھول گئی۔ کل ان شاء اللہ لے کر آؤں گی۔ سر! باجی کو شاپنگ کے لیے لے جانا ہے..... دس بجے چلی جاؤں'' ثمینہ کا اس طرح سے مراعات یافتہ ہونا دفتر کے ساتھیوں کو اکثر گراں گزرتا مگر چپ رہتے کیونکہ باس کو تحفے تحائف دینے سے وہ ان کی منظورِ نظر بن چکی تھی۔ برا مجھے بھی لگتا مگر میں جس معاشرے کی فرد تھی، وہاں یہی سب کچھ عام تھا۔ گڈی چڑھ جانے والوں کی گڈی چڑھی رہتی اور زمین پر کھڑے بے مایہ لوگ حسرت سے دیکھتے، تلملاتے مگر کچھ نہ کر سکتے۔

میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئی۔ ثمینہ فرقان کی ریٹائرمنٹ میں ابھی برسوں باقی تھے.....حسبِ عادت میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا... پیچھے پلٹ کر دیکھنا میری خو نہیں تھی۔ میرے زمانہ طالب علمی میں جب میری ہم جماعت لڑکیاں پرچہ دینے کے بعد امتحان کے کمرے سے باہر آ کر اپنے جوابات کی پڑتال کر کے کوئی خوش کوئی افسردہ ہو رہی ہوتی تھی۔ مجھے اگلے پرچے کی فکر ستا رہی ہوتی تھی۔ ویسے بھی کوئی تعلق کیسا ہی گہرا کتنا ہی گرمجوش کیوں نہ ہو وقت گزرنے کے ساتھ اس گرمجوشی میں پہلے کی سی حدت نہیں رہتی لہٰذا پلٹ کر دیکھنے سے دوسروں کو آزمائش اور خود کو دکھ میں ڈالنے سے فائدہ.....

بہت عرصے بعد بہن سے مجھے ثمینہ کی خبر ملی تو مجھے کچھ اچنبھا نہ لگا۔ دنیا بہت وسیع سہی مگر اتنی بھی نہیں کہ آشنائی کا کوئی سرا ہی ہاتھ نہ لگے۔

☆☆☆

اسی شام قطعاً غیر متوقع طور پر ثمینہ کا فون آ گیا۔

''کیسی ہیں آپا.....؟''

''الحمدللہ بالکل ٹھیک...... تم سناؤ......''

''کیا سناؤں آپا...... بڑے صدموں سے گزری ہوں۔''

''کیا ہوا؟'' میں چونکی۔

''چھوٹی باجی، اس کا خاوند اور بچے ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ پہلے اس کا بیٹا حویلی کے پرانے کنویں میں گر کر مر گیا......''

''اوہ مائی گاڈ......'' میرے منہ سے بے ساختہ کلمہ افسوس نکلا۔

''پھر آپا اس کے غم میں چھوٹی باجی بیمار ہو گئیں۔ بیماری بستر سے لگ گئیں۔ لیٹی ہوئی بس چھت کو گھورتی رہتی تھیں۔ کبھی رونے لگتیں، کبھی خلا میں گھورتے ہوئے کہتیں۔ بی بو آ رہا ہے، نام تو ان کے بیٹے کا مرتضیٰ تھا پیار سے بی بو کہتے تھے۔ چھوٹی باجی ڈیڑھ دو ماہ بیمار رہیں، میرے شوہر نے انکل اپنے ایک جاننے والے ڈاکٹر کو دکھایا، اسی کی دوا لے رہی تھیں۔ ایک روز سوئیں تو سوئی ہی رہ گئیں...... جاگیں ہی نہیں۔''

''بہت افسوس ہوا ثمینہ......''

''چھوٹی باجی کی موت کا صدمہ بڑی باجی کے دل کو ایسا لگا کہ وہ بھی بیمار پڑ گئیں۔ اتنی بیمار تو نہیں تھیں کہ ان کے مر جانے کا اندیشہ ہوتا۔ وہ بھی مر گئیں۔''

''اوہو...... بہت افسوسناک ثمینہ......'' میں واقعی صدمے میں تھی۔

''بس آپا...... کیا بتاؤں۔ میری تو دنیا ہی اجڑ گئی...... چھوٹی باجی میری دوست تھی۔ اس سے میں اپنے دل کی ہر بات شیئر کر لیتی تھی...... اور بڑی باجی تو میری ماں جیسی تھیں......'' ثمینہ رونے لگی۔

''مجھے اندازہ ہے ثمینہ کہ تم اپنی بہنوں سے کتنی محبت کرتی تھیں۔''

''محبت......'' اس نے کہا۔ ''وہ میری زندگی تھیں آپا...... میری امی تو جب میں اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی اس وقت مر گئی تھیں۔ میری بہنوں نے ہی مجھے پالا پوسا۔ ماں کی محبت دی، ان کے بعد میرا زندہ رہنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ کبھی، کبھی تو سوچتی ہوں سلیپنگ پلز کھا کر ہمیشہ کے لیے سو جاؤں۔''

''نہیں ثمینہ ایسی باتیں نہیں سوچتے...... وقت بہت بڑا مرہم ہے تمہیں آہستہ، آہستہ قرار آ جائے گا۔''

''بہت اکیلی ہو گئی ہوں آپا......''

''اپنا خیال رکھو......''

''میرا خیال رکھنے والی تو گئیں......''

''تمہارے ہسبنڈ......؟''

''کیا بتاؤں آپا......'' اس نے توقف کیا۔ ''مجھے ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''کیوں؟'' میں چونکی۔

''تمام وقت سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے ہیں...... جاب سے لمبی چھٹی لے رکھی ہے۔ تمام وقت گھر میں ہی ہوتے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے جاب چھوڑ دو، میں نے کہا آفس جاتی ہوں تو میرا دھیان بٹ جاتا ہے...... گھر میں رہوں گی تو سوچ، سوچ کر ہی مر جاؤں گی۔ دوسری بات یہ کہ پنشن والی جاب ہے اتنے سال گزر گئے تو اب کیوں چھوڑ دوں۔''

''ٹھیک بات ہے......'' میں نے تائید کی۔

''پھر کہنے لگے لمبی چھٹی لے لو...... میں نے انکار کر دیا...... اب یہ حال ہے کہ آفس کے سوا مجھے کہیں اور اکیلے نہیں جانے دیتے...... جہاں جاؤں ساتھ جاتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے ناں ثمینہ...... تمہارا اتنا خیال ہے تمہارے شوہر کو......'' میں نے کہا۔

''نہیں آپا، یہ خیال والی بات نہیں......''

''تو پھر......؟''

''گھر میں جو نوکر ہیں میں ان سے بھی بات کروں تو ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں...... جس کمرے میں جاؤں میرے پیچھے، پیچھے ہوتے ہیں...... ڈرائیور کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میری اجازت کے بغیر تم میڈم کو آفس کے علاوہ اور کہیں نہیں لے جاؤ گے۔ ان کا بس چلے تو آفس میں بھی کرسی ڈال کر میرے برابر میں بیٹھیں۔ آج آپ کی بہن کے آفس جا کر اپنی پرانی

دوست سے ملنے کا موقع بھی اس لیے مل گیا کہ ان کے آفس سے کال آئی تھی کہ فیلڈ پر ایمرجنسی تھی، ان کی ضرورت تھی...... جا نہیں رہے تھے مگر آفس والوں نے کہا آپ کی شرائط ملازمت میں یہ شق بھی شامل ہے کہ رخصت کے دوران کسی ایمرجنسی میں آپ کو بلایا جا سکتا ہے...... شاید دو تین دن انہیں فیلڈ پر ہی رہنا پڑے۔ صبح سے اب تک کئی مرتبہ فون کر چکے ہیں...... کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو......؟ تمہارے پاس کون ہے؟ آج میری ملازمہ کہہ رہی تھی...... بی بی! اب تو مجھے بھی صاحب سے خوف آنے لگا ہے...... اور مجھے تو آتا ہی ہے آپا......"

"لیکن کیوں ثمینہ...... شوہر سے خوف کیوں؟" مجھے حیرانی ہوئی۔

"آپا...... ابو کی جائداد کی وارث ہم تین بہنیں اور چھوٹی باجی کا بچہ ہی تو تھا...... سوائے میرے سب ختم ہوگئے اور ہمارے ابو اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے...... آپا یقین کریں جب آپ اور میں آفس میں اکٹھے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے تو میں آپ سے اپنے شوہر کی جھوٹی تعریفیں کیا کرتی تھی، وہ میرے ساتھ کبھی بھی مخلص نہیں رہے۔ ان کی نظر ہمیشہ میرے پیسوں اور ابو کے چھوڑے ہوئے ورثے پر رہی...... اب بھی ایسا ہی ہے۔ وہ غیر عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھتے ہیں اور دوسری عورتوں کی تصویریں اپنے فون میں مجھے دکھا کر فخریہ کہتے ہیں...... "یہ سب مجھ پر مرتی ہیں......" میں نے یہ بات آج آپ کو بتائی ہے یا پھر اپنی اس دوست کو جس سے میں آج بہت عرصے بعد ملنے گئی تھی۔ اس کا شوہر وکیل ہے۔ میں اس سے مشورہ کرنا چاہتی تھی کہ ایسی صورت میں جب مجھے اپنے شوہر سے خوف محسوس ہونے لگا ہے اور میں اس سے اپنی جان بھی نہیں چھڑا سکتی، مجھے کیا کرنا چاہیے مگر بدقسمتی سے میری دوست کا شوہر ان دنوں ملک سے باہر ہے۔"

"تم اپنے ہسبینڈ سے جان کیوں نہیں چھڑا لیتیں...... اگر وہ اسی قسم کا آدمی ہے تو گھر تو تمہارا ہے، دھکے دے کر نکال کر باہر کروا دے......" میں نے کہا۔

"بعض باتیں کہہ دینا آسان ہوتی ہیں آپا...... میں یورپ یا امریکا میں رہنے والی عورت نہیں ہوں جسے شوہر کو گھر سے دھکے دے کر نکالنا آسان ہو۔ برسوں پہلے میں نے ایک بار اپنے شوہر سے کہا تھا...... مجھے چھوڑ کر آپ اپنی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کرلیں جس سے آپ کو اولاد بھی مل سکے...... پتا ہے اس نے کیا کہا......"

"کیا؟" میں پوچھنے پر مجبور ہوئی۔

"کہنے لگا...... میں وہ بیوقوف نہیں جو ہر روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کسی عام سی مرغی کے لیے ذبح کردوں......" مجھے آج بھی یاد ہے آپا کہ اس نے میری ٹھوڑی اپنے پتھر جیسے سخت ہاتھ میں دبوچ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے دانت پیس کر کہا تھا...... "آج کے بعد دوبارہ ایسی بات کی تو تمہارے پرخچے اڑا دوں گا......" وہ پل بھر کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "ہم مشرقی عورتیں بہت بے بس، بہت کمزور ہوتی ہیں آپا...... میرے تو آگے پیچھے بھی کوئی نہیں۔"

"تو پھر......؟" میں فقط دو الفاظ ہی بول سکی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"اب......؟" میں جسے لغت کے ہزار با الفاظ بامعنی ازبر تھے میرا ذخیرۂ الفاظ ساکت کر فقط ایک لفظ ادا کیا۔

"انتظار......" اس کے اس ایک لفظ میں دنیا جہان کا کرب سمٹا ہوا تھا۔

"کیسا انتظار......؟"

"ہاں آپا...... اپنے انجام کا انتظار......" اس نے توقف کیا پھر نہایت دل گرفتہ لہجہ میں بولی۔ "ہم عورتیں اتنی بے بس کیوں ہوتی ہیں آپا......"

"میں تو تمہیں ہمیشہ بہت دلیر اور بااختیار سمجھا کرتی تھی...... آفس میں ہماری کولیگز بھی تم پر شک کیا کرتی تھیں۔"

وہ دھیرے سے ہنسی...... کھوکھلی ہنسی...... پھر بولی۔

"انہیں کیا معلوم ثمینہ کتنی بزدل اور کتنی بے بس

ہے..... آپا ساری زندگی یوں ہی ڈرتی رہی ہوں اپنے
ہمسفر سے جیسے بلی سے چڑیا......" اس نے ایک ٹھنڈی
سانس بھری۔ "آپا آج آپ سے بات کر کے دل کا
بوجھ ہلکا لگا..... کال ختم ہونے کے بعد آپ کا نمبر کال
لاگ سے ڈیلیٹ کرنا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اب فرقان میری ایک ایک کال بھی
چیک کرتے ہیں..... کس نے مجھے فون کیا اور میں نے
کسے کیا۔"

"ثمینہ کوئی رشتے دار تو ہوں گے تمہارے
انہیں بتاؤ یہ سب کچھ......" میں نے مشورہ دیا۔ مجھے
ثمینہ سے انتہائی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

"آپا وہ سب گاؤں میں ہیں..... سیدھے
سادے لوگ..... ابو کو بہت شوق تھا شہر میں حویلی
بنانے کا..... اور میں بیوقوف تھی جو فرقان کے ساتھ
پھنس گئی۔ فرقان کا بڑا رعب ہے میرے رشتے داروں
پر..... ڈرتے ہیں اس سے کہ بڑا افسر ہے۔ ویسے بھی
آج کون کسی کی پرابلم میں الجھنا پسند کرتا ہے..... رشتے
داروں کو بتانا فضول ہے۔"

"بہت سے ادارے ہیں ایسے جو غیر محفوظ عورتوں کو
تحفظ دیتے ہیں..... تم کسی ادارے سے رابطہ کرو۔"

"ڈر لگتا ہے آپا..... گھر سے بھی جاؤں گی۔"

"پھر......؟"

"بہت شکریہ آپا کہ آپ نے اتنی دیر میرا دکھڑا
سنا..... دعاؤں میں یاد رکھیے گا..... اور ہاں کسی سے ان
باتوں کا تذکرہ مت کیجیے گا..... بات اڑ کر کہیں سے
کہیں جا پہنچتی ہے۔"

"فکر مت کرو......" میں سمجھ گئی کہ وہ چاہتی تھی
میں اپنی بہن سے بھی تذکرہ نہ کروں۔

کئی دن مجھے رہ رہ کر ثمینہ کا خیال آ آ کر ستاتا
رہا پھر زندگی کی روا روی میں میرے دل سے اس کا
خیال محو ہو گیا۔

☆☆☆

ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے بہن نے مجھے بتایا۔
"وہ تمہاری ثمینہ فرقان مر گئیں......"

"تمہیں کس نے بتایا؟" میں نے ہڑبڑا کر بہن
کو دیکھا۔

"میری ایک کولیگ نے جس سے ثمینہ ملنے آتی
تھیں۔"

"کب ہوئی ڈیتھ؟"

"پچھلے ہفتے......"

"کیسے؟" کیا ہوا تھا اسے؟ کیا بیمار تھی......؟ یا کچھ
اور......؟" میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کیے۔

"یہ نہیں معلوم لیکن میری کولیگ بتا رہی تھی کہ اس
کے شوہر نے بیماری کے دوران کسی کو اس کے قریب
پھٹکنے نہیں دیا..... دوا دارو، کھانا پینا سب اپنے ہاتھ میں
لے رکھا تھا۔ گھر کے ملازموں کو بھی اس سے بات
کرنے کی اجازت نہ تھی۔"

مجھے ثمینہ، اس کی بہنوں اور بھانجے کی اموات
کے ذمے دار کو پہچاننے میں کوئی شائبہ نہ رہا..... ثمینہ
کے باپ کے خاندان کی آخری وارث بھی چلی
گئی تھی۔ مجھے اس کے الفاظ یاد آنے لگے۔ "اپنی باری
کا انتظار......"

"مجھے شوکت صدیقی کے معرکۃ الآرا ناول "خدا
کی بستی" کا ڈائیلاگ یاد آیا۔ زن، زر، زمین خدا کی
بستی میں یہی تین عناصر تو فتنہ ہیں۔

خدا جانے زمین پر بسی خدا کی اس بستی میں کتنی
عورتیں ثمینہ کی سی بے بسی کی موت مرتی ہوں گی
ان مردوں کے ہاتھوں جو بظاہر ان کے شریک
حیات ہوتے ہیں..... کیا عجب کہ ایسی عورتوں کی
روحیں بال کھولے، سینہ کوبی کرتی خدا کی بستی میں
بین کرتی پھرتی ہوں اور اپنے قاتل کو پہچانتے
ہوئے بھی اپنی بے بسی کے ہاتھوں مجبور تجاہلِ
عارفانہ سے کہتی ہوں..... ہم کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو
تلاش کریں۔

ناولٹ

وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا

شیریں حیدر

تیسرا حصہ

اپنے اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر مسلسل دستک کی آواز سے میں چونک کر جاگی تھی مگر سر کو تکیے کے نیچے دبا لیا کہ کانوں میں کوئی آواز نہ آئے۔ مگر دستک کیوں دے رہا تھا کوئی؟ میں نے سوچا۔ غالباً بجلی بند تھی جو گھنٹی بجانے کے بجائے دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر رک کر دوبارہ شروع ہو جانے والی دستک کی آواز سن کر بھی میں کسلمندی سے پڑی رہی تھی۔ میں ایسی سست کبھی تو نہیں تھی مگر اس وقت اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ کون ہو سکتا ہے اس وقت؟ لیٹے، لیٹے ہی سوچا تھا۔ کام والی ہو گی، چلو خود ہی دروازہ کھٹکھٹا کر تھک کر چلی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ فیصل ہو، دل میں سوچا مگر وہ اس وقت کیوں میرے گھر کا دروازہ پیٹے...... فیصل ہوتا تو جواب نہ ملنے پر فون کر لیتا، ان دونوں کے علاوہ اس گھر کے دروازے پر اور کوئی دستک نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی ڈیلیوری والا یا کوئی پوسٹ مگر اس وقت؟ وقت بھی جانے کیا ہوا تھا؟ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اپنے چور، چور بدن کی کرچیاں سمیٹ کر انہیں بستر سے اٹھا سکوں۔ دوسرا دن ہو گیا تھا کہ میں ٹوٹے پھوٹے انداز سے جاگ رہی تھی، سو بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔

اس دوران اسپتال بھی نہیں گئی تھی، کال کر کے کہہ دیا تھا کہ طبیعت ناساز تھی۔ اصل میں تو دل ناساز تھا اور دماغ بیمار۔ پریشانی میرے چہرے پر نمایاں ہوتی اور میں ایسی حالت میں اپنے ساتھیوں کی نظر میں

نہیں آنا چاہتی تھی۔ ان سب کے ساتھ ساتھوں کا ساتھ
تھا۔ فوراً جان جاتے کہ میں کسی بات پر انتہائی پریشان
تھی۔ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ کیا میں اتنی کم
مایا تھی، مایا نام کیا صرف میرا نام ہی تھا؟ وہی مایا تھی
میں، جس کے ساتھ مہتاب نے محبت اور وفاداری کے
جھوٹے وعدے کیے تھے اور اپنی چاہت بھری باتوں
سے مجھے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا مگر حقیقت کیا
تھی؟ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتی تھی
کہ اللہ نے میری صورت کے ساتھ میری قسمت بھی
خوب صورت بنائی تھی۔ مگر میری اصلیت، وقعت اور
حقیقت گزری رات کو، مجھے ان چند تصویروں نے
سمجھائی تھی جو فیصل نے اپنے فون سے مجھے بھیجی تھیں۔
اس نے بتایا تھا، مگر میں نے یقین نہیں کیا تھا، اسی
لیے اس نے وہ تصویریں بھیجی تھیں۔ کاش وہ مجھے اس
دھوکے سے نہ نکالتا... مجھے وہ تصویریں نہ بھیجتا اور
مجھے اپنے خیالوں کی مصنوعی جنت میں رہنے دیتا۔
میں نے وہ تصویریں اپنے فون پر ایک بار نہیں بار
بار... دیکھی تھیں کہ کہیں میری نظر کا دھوکا تو نہیں
آنسوؤں کی دھند سے دھندلا جاتیں تو آنکھوں کو
صاف کر کے پھر دیکھتی کہ کسی نے دشمنی میں تو ایسا نہیں
کیا، زوم zoom کر کے بھی دیکھی تھیں کہ کوئی فوٹو
شاپ کی گئی تصویر تو نہیں تھیں، فوٹو شاپ کی توجیہ بھی
پیش کی جا سکتی تھی مگر کوئی ایسا کیوں کرے گا؟ مہتاب
کے پاس وہاں میرے ساتھ گزارنے کے لیے وقت نہ
تھا اور تو اور وہ مجھے ملے بغیر ہی واپس کراچی چلا گیا تھا۔
اس کے علاوہ وہ خود تو میں اپنے خفیہ کیمروں کی مدد سے،
اس کے کراچی والے فلیٹ میں ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی،
وہ سب تو فوٹو شاپ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے تو لاشعور
میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ میں یوں اسے اس کے گھر میں
کیمروں کی مدد سے چیک کر سکتی تھی، نہ ہی ان کیمروں

کو لگاتے وقت میرے ذہن میں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں تھا کہ میں ان کی مدد سے مہتاب کی چوریاں پکڑوں گی۔ میں نے تو وہ کیمرے شرارتاً لگائے تھے کہ ان کی مدد سے مہتاب سے چھیڑ چھاڑ کیا کروں گی کہ مجھے غیب کی آنکھ سے نظر آرہا ہے کہ وہ کیا کررہا تھا۔ مگر اب میرے لیے وہ صرف کیمرے نہیں تھے بلکہ مہتاب کی اصلیت جاننے کے آلات بن گئے تھے۔ اس سے بات کرتے ہوئے میں اسے دیکھ بھی پاتی تھی اور میں جانتی تھی کہ جس وقت وہ فون پر میرے ساتھ اداسی کے مکالمات بول رہا ہوتا تھا تو اس وقت بھی اس کا پہلو خالی نہیں ہوتا تھا۔

اپنی بے وقعتی سے زیادہ جو بات رلاتی رہی تھی وہ یہ تھی کہ ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ کیا کررہا تھا اور میں اس کی زندگی میں اور اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی انجان تھی، کیسی بیوقوف تھی میں اور اس پر اندھے اعتماد نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ میرے دل میں ابھی تک اس کے لیے محبت کا وہی اتھاہ سمندر موجزن تھا۔ میں اب بھی بار بار سوچ رہی تھی کہ اس میں کوئی سازش نہ ہو، فیصل کہیں کوئی منصوبہ نہ بنا رہا ہو کہ ہم دونوں کے درمیان فاصلے پیدا کردے۔ ”مگر اس سے اسے کیا فائدہ ہوگا؟“ خود ہی سوچا۔ ”اس کی کہی ہوئی کچھ ذومعنی باتیں۔“ دماغ نے سوال کیا۔ ”اس کی عادت ہی ایسی ہے۔“ خود ہی جواب دیا۔ ”وہ تو اچھا ہے اور شریف بھی مگر اس کے اردگرد جو عورتیں ہوتی ہیں، ان کی شرافت مشکوک ہوتی ہے۔“ میں نے خود کو تسلی دی۔

شمالی علاقہ جات...... جہاں قدرتی حسن جا بجا بکھرا ہوا تھا اور وہاں کی صاف ہوا۔ دل اور روح کو تازہ کرتی تھی۔ وہاں کا ان چھوا حسن دماغ میں سرور اور رومانیت بھرتا تھا، میں اپنے وفد کے ساتھ، جہاں جاتی اور جو خوب صورت منظر دیکھتی تو میرے دل میں پہلا خیال یہی آتا تھا کہ کاش یہاں مہتاب میرے ساتھ ہوتا۔ وفد کے لوگ کام سے زیادہ اس علاقے کے حسن کو اپنے کیمروں اور اپنی آنکھوں سے سمیٹنے میں مصروف تھے۔ میں یہی منصوبے بناتی کہ فارغ ہوکر میں اور مہتاب ان نظاروں سے اکٹھے محظوظ ہوں گے۔ لیکن وہ ان خوب صورت مناظر کی خوب صورتی سے میرے ساتھ لطف اندوز کیا ہوتا...... الٹا وہ وہاں دن بھر کی ”مصروفیت“ کے بعد، میرے پہلو میں صرف خراٹے لینے کے لیے آتا تھا۔ جب بھی آتا تو اس کے پاس معذرت کے لیے ایک ہی جواز ہوتا تھا کہ وہ بے حد مصروف رہا، اتنا کہ جہاں میری سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

فیصل کے فون سے بھیجی جانے والی، ان تصاویر میں بہت سی لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو وہاں کی مقامی تھیں اور فلم میں انہیں چھوٹے، چھوٹے سین کے لیے کاسٹ کیا گیا تھا۔ شاید انہیں خواہ مخواہ میں اس نے فلم میں ڈال لیا تھا کہ اسی بہانے ان سے ملاقات رہتی۔ یوں تو شاید وہ اسے لفٹ نہ کرواتیں مگر فلم میں کام کرنے کا چارا ڈال کر اس نے انہیں اپنی طرف مائل کرلیا تھا۔ ان احمقوں کو تو علم بھی نہ ہوتا کہ جو اداکاری وہ ان سے کروا رہا تھا وہ سب بیکار تھی، وہ تو انہیں دانہ ڈال رہا تھا۔ وہ سین یا تو سرے سے فلمائے ہی نہیں گئے ہوں گے یا اگر فلمائے بھی گئے ہوں گے تو وہ فلم کے فائنل اسٹیج پر غیر ضروری سمجھ کر کاٹ دیے جائیں گے۔

مہتاب کی فلم کے لیے ان کے انتخاب کی وجہ ان کا وہ حسن تھا جس پر سے میرے جیسی طرح دار عورت کی نظر بھی نہ ہٹتی تھی تو بھلا مہتاب کس کھیت کی مولی تھا...... وہ ایک مرد تھا، بھونرے جیسا اور اس کا دل تو یوں بھی اس کی ہتھیلی پر ہی دھرا رہتا...... فلم اس کے لیے ایک اچھا بہانہ تھا، اپنے ساتھ کے اسٹاف کو مطمئن کرنے اور ان لڑکیوں کو خوش کرکے ان کی قربت حاصل کرنے کے لیے اگر ان کے کچھ سین فلما بھی لیتا تو فلم کی فائنل ایڈیٹنگ میں وہ سارے مناظر اور چہرے غائب کردیے جاتے۔

☆☆☆

اس کی حرکتیں سنتی اور دیکھتی تو سوچتی کہ میں بھی تو اتنے عرصے سے اپنی مجبوریوں میں بندھی، اس بڑے

شہر میں تنہا رہ رہی تھی...... اس کے بغیر رہ رہی تھی، کیا میری جذباتی ضروریات نہیں تھیں؟ تو کیا میں اس کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہوئی تھی؟ اگر میں اس کی وفادار تھی تو اس کا ضمیر کیوں ملاوٹ زدہ تھا؟ تنہا عورت، بیوہ ہو، طلاق یافتہ، کنواری یا بیاہی ہوئی، مردوں کے معاشرے میں اسے ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے تنہا دیکھ کر مردوں کو اس پر ترس یا ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ ان کے اندر کا درندہ جاگتا ہے۔ وہ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کی نظر میں اکیلی عورت زیادہ آسان شکار ہوتی ہے مگر میں تنہا ہو کر بھی خود کو مضبوط رکھے ہوئے تھی۔ جگہ جگہ مردوں سے واسطہ پڑتا تھا، ان بجز مردوں [illegible] ...... [illegible] بات کرے وہ سمجھتا تھا ...... [illegible] اٹھا سکتا ہے۔ مگر کسی کی جرأت کہ وہ میرے ساتھ ایک حد سے آگے بڑھ کر بات کر سکتا۔

میں خود کو اپنے دل و دماغ کو [illegible] مہتاب کی ملکیت سمجھتی تھی۔ میں نے اپنے گرد ایک نادیدہ حصار قائم کر رکھا تھا کہ کبھی کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر ہما کو تو دور کی بات، اس کی موجودگی میں کسی دوسری لڑکی کو بھی ہراساں کر سکے، خواہ وہ کوئی جونیئر ڈاکٹر ہو، تربیت حاصل کرنے والی یا ہسپتال میں کوئی اور کام کرنے والی، اگرچہ وہ آیا یا جمعدارنی ہی کیوں نہ ہو۔ عمر میں، میں سب سے بڑی نہ تھی مگر میری شخصیت میں کچھ ایسا دبدبہ تھا کہ خواہ وہ کوئی سینئر یا جونیئر ڈاکٹر ہو، ٹرینی، نرس یا آیا، مجھ سے ہر کوئی ڈر کر اور احترام سے بات کرتے تھے۔ میں ہر کسی سے فاصلہ رکھتی تھی اور ہر کسی کو اس کی حد فاصل پر رکھتی تھی۔

لاہور میں امی جان کی بیماری کے دوران [illegible] گزارنے کا [illegible]

مشقت بھری دوڑ میں فیصل یزدانی اور بلال سے تعلق بنا جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ امی جان کے انتقال کے بعد یک دم مجھے لگا کہ میں بھری دنیا میں تنہا ہو گئی ہوں۔ مہتاب اپنے کاموں میں مصروف سے مصروف تر ہوتا جا رہا تھا اور میں تنہا سے تنہا۔ فیصل کی زندگی کی ٹریجڈی اور بلال کی بیماری اور محرومی نے ہمارے درمیان سے تکلف اور فاصلوں کی دیوار کو پاٹ دیا تھا، وہ مجھے اس شہر کی تنہائی میں دوسراہٹ کا احساس دلاتے تھے۔ ہمسائیگی کے تعلق کے باعث ہمارے درمیان سلام دعا سے بڑھ کر رابطہ قائم ہو گیا تھا، غیر محسوس طور پر تکلف اور فاصلے کم ہو گئے تھے۔

فیصل یزدانی کے اور میرے بیچ جو فاصلے کم ہوئے تھے تو اس کی میری تنہائی کے احساس کے علاوہ بھی کوئی وجوہات تھیں۔ پہلے تو مہتاب نے ہی کہا کہ میں اس سے سلام دعا سے زیادہ رابطہ رکھوں اور مراسم بڑھاؤں کہ وہ اس کے لیے کام کا آدمی تھا کیونکہ مہتاب کو اپنی پچھلی فلم کی شوٹ کے دوران، اپنی [illegible] کے اقدام میں ملوث کر دیا گیا، وہ [illegible] اس کے قریب ترین ساتھیوں نے ہی اس کے خلاف گواہی دی [illegible] کے لیے اس وقت کوئی اور سہارا نہ تھا کہ وہ [illegible] سے بچ سکے۔ ایسے میں فیصل ہی تھا کہ جس نے ان دو ساتھیوں کو ورغلا کر یا جانے کس طریقے سے مہتاب کے حق میں بیان دینے پر راضی کیا تھا۔ ان کا تعلق بھی فلمی دنیا سے ہی تھا اور فیصل یزدانی کا معتبر حوالہ اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ مہتاب کی مخالفت میں اپنے بیان سے دستبردار ہو جائیں۔ انہوں نے فیصل کی درخواست اور دوستی کا مان رکھتے ہوئے مہتاب کے حق میں گواہی دے دی تھی اور مہتاب بچ گیا تھا۔ اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد [illegible] اور [illegible] ضرورت کے ساتھ [illegible] شامل ہو گیا تھا۔ مجھے فیصل سے زیادہ اس کے معصوم بے ماں کے

بچے پر ترس آتا تھا۔ اتنی سی عمر میں اس نے اپنی ماں کو کھویا تھا، میں اس سے پچیس سال سے بھی زیادہ عمر کی تھی اور اپنی ماں کو اس عمر میں کھو کر بھی زیاں کے اس احساس میں مبتلا تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی اور تکیہ بھگو دیتی تھی۔ بلال کے ساتھ اسی ہمدردی کا جذبہ تھا کہ ہمارے درمیان سے اول روز والا کھچاؤ، آہستہ آہستہ دور ہو گیا تھا۔ بلال سے دوستی کے باوجود مجھے احساس تھا کہ مجھے فیصل سے ہر ممکن فاصلہ رکھنا چاہیے، اسے ایک حد تک ہی خود سے بے تکلف ہونے دینا چاہیے تھا اور میں کسی حد تک اس پابندی کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ اگرچہ وہ جلد بے تکلف ہو جانے والا آدمی تھا مگر میں ذرا تکلف کا برتاؤ روا رکھتی تا کہ وہ بھی حد میں رہے، اکثر میں اس کی بہت سی ذومعنی باتوں کو نظر انداز کر دیتی۔

اپنی اسی عادت کے باعث، اگر وہ مذاق یا ہنسی میں کوئی بات ایسی کرتا جو مجھے ناگوار گزرتی تھی تو میں اسی وقت اسے سرزنش بھی کرتی اور وہ فوراً معافی مانگ لیتا، معذرت کرتا کہ اس نے ایسی بات کی۔ اس کی بے تکلفی کی بری عادت کئی بار اسے میرے اور بلال کے سامنے شرمندہ کرواتی تھی۔ جب بھی وہ مہتاب کے حوالے سے کوئی منفی بات کرتا تھا، خواہ وہ کسی مستند حوالے سے ہی کیوں نہ ہوتیں یا افواہیں تو میں اسے فوراً تنبیہ کرتی، اس موضوع پر میں نہ کچھ سننا چاہتی تھی اور نہ مجھے اس پر یقین ہوتا۔ میں سوچتی تھی کہ وہ ایسی باتیں اس لیے کرتا ہے کہ وہ مہتاب سے حسد کرتا ہے مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سب تو وہ میری ہمدردی میں کرتا تھا مگر۔ اسے میرے ساتھ ہمدردی کیوں تھی آخر؟ اور میں یہ کیوں سوچتی تھی کہ وہ مہتاب سے حسد کرتا ہے؟ کیا اسے مہتاب کی کامیابیوں سے حسد ہو سکتا تھا یا مہتاب کے پاس میرے جیسی شریک زندگی کا ہونا دوسروں کو اس سے حسد میں مبتلا کر سکتا تھا؟

☆☆☆

''تمہارا دماغ درست ہے ماہا؟'' دروازہ کھولا تو سامنے کھڑا تھا، غصے سے بھرا ہوا، لال سرخ چہرہ، صرف منہ سے کف نکلنے کی کسر باقی تھی۔ ''میں نے تمہیں اتنی بار کال کی اور تم نے فون نہیں اٹھایا، گھر کا اور نہ موبائل...... تم ٹھیک تو ہو؟ جانے اتنے سے وقت میں میں نے کیا کچھ نہیں سوچ ڈالا......'' سلام نہ دعا، وہ برس رہا تھا اور میں ششدر کھڑی تھی۔

فوراً دائیں بائیں دیکھا، کہیں کوئی میری یوں بے عزتی ہوتے ہوئے تو نہیں دیکھ رہا۔ ایک لفظ بھی بولنے سے پہلے میں نے دروازے کے بیچ میں سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا تا کہ اس سے زیادہ وہ غصہ دروازے پر کھڑے ہو کر نہ جھاڑے، اسی جگہ سے دوسرے فلیٹ کا داخلی راستہ اور باقی مالوں کے لیے سیڑھیوں کی راہداری بھی تھی۔

پہلے ہی میں نے بڑی مشکل سے خود کو کھینچ کر بستر سے نکال کر دروازہ کھولا تھا کیونکہ دستک کے بعد، اب گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ فیصل ہو گا، تھوڑی دیر تک گھنٹی بجائے گا اور پھر مایوس ہو کر چلا جائے گا۔ بمجبوراً میں نے بستر سے خود کو گھسیٹ کر نکالا، جلدی سے غسل خانے میں جا کر منہ پر پانی کے دو چار چھپاکے مارے اور لباس تبدیل کیا۔ میرے غسل خانے میں ہونے کے دوران بھی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور میں دل ہی دل میں فیصل کو کتنی ہی صلواتیں سنا چکی تھی کہ وہ گھنٹی بجانا بند کیوں نہیں کر رہا۔ میرے خیال میں اتنا ڈھیٹ وہی ہو سکتا تھا، میں اس پر دل ہی دل میں بہت غصہ ہو رہی تھی اور اس سے قبل کہ دروازہ کھولتے ہی میں غصے سے اس پر برس پڑتی، وہ مجھ پر برس پڑا تھا، اور وہ فیصل نہیں ...... مہتاب تھا۔

''کب؟'' بمشکل میں نے منہ سے ایک لفظ نکالا تھا۔ اس کے برسنے سے میں گھبرا گئی تھی، مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا کہوں اسے۔ ''کب کی تھی تم نے کال؟'' میں نے ہکلا کر سوال کیا۔

''اور کہاں ہے وہ تمہارا ہمسایہ...... وہ نشئی، فیصل یزدانی؟ جانے کیا نشہ کر کے گھر میں گھسا سو رہا ہے یا کہیں غائب ہو گیا ہے کہ کل سے اس کا فون بھی مسلسل

آف ہے۔ کوئی اور طریقہ بھی نہیں تھا میرے پاس یہ جاننے کا کہ آخر تمہیں ہوا کیا ہے، زندہ بھی ہو کہ نہیں۔'' وہ غصے میں چلا رہا تھا۔ ''پریشانی میں پہلی فلائٹ لے کر پہنچا ہوں کہ کہیں تمہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔''

''مجھے زندہ دیکھ کر افسوس تو ہوا ہوگا ناں تمہیں؟'' میں نے اپنی لال انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''یہ کس قسم کی بکواس ہے؟'' وہ غرایا۔ ''کیا میں اتنی دور سے یوں ایمرجنسی میں، تمہاری اس طرح کی بکواس سننے آیا ہوں؟'' میری ہلکی سی بڑبڑاہٹ بھی اس نے سن لی تھی۔

''تم تو میری آخری رسوم ادا کرنے کا سوچ کر آئے ہو گے ناں مہتاب....'' میں نے طنز سے ہنس کر کہا۔ ''اور یہاں ایک زندہ سلامت کھڑی ہوں۔'' میں نے سسک کر کہا۔ ''مجھے مار دیا ہے تم نے مہتاب، میں پھر بھی زندہ ہوں۔'' سوچ کر رہ گئی، کہہ نہ سکی۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے بھی پی رکھی ہے یا کوئی اور نشہ کر رکھا ہے۔'' اس نے مجھے دروازے کے بیچ میں سے ہٹا کر میرے پیچھے دروازہ بند کیا اور مجھے ہولے سے جھنجوڑا۔ میں ایک طرف تو اس بات پر پریشان تھی کہ کوئی اور ہمسایہ ہمارے بیچ یوں تکرار سن نہ لے اور دوسری طرف وہ گھر کے اندر آیا تھا تو میں دروازے کے بیچ کھڑی رہ گئی تھی۔

''تمہیں لگتا ہے کہ میں مدہوش ہو رہی ہوں.... اصل میں اب میں ہوش میں آ رہی ہوں مہتاب۔ اب تک میں فریب کے جس نشے میں تھی، اس سے مجھے ارد گرد کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا، میری بصارت کی حد تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ تمہارے ساتھ اور محبت کے احساس نے مجھے کچھ سوچنے ہی نہیں دیا تھا مگر اب میں سمجھ رہی ہوں کہ مرد عورت کو کس کس طرح فریب دیتا ہے۔''

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی میرے خلاف بہکا رہا ہے، میری جان۔'' اس نے فوراً اپنے لہجے کو ٹھنڈا کیا اور میرے گرد اپنی بانہوں کا حلقہ بنایا۔ ''تم نے مجھے پریشان کر دیا جان مہتاب، اگر دل اداس تھا تو مجھے کہتیں، میں سر کے بل آ جاتا۔'' وہ پھر چارا ڈال رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس کی شمالی علاقہ جات کی کارروائیوں کی قابل اعتراض تصاویر سوشل میڈیا پر گردش میں تھیں تو کیونکر ممکن تھا کہ اس کی بصارت تک نہ پہنچی ہوں۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ میں نے اس کی وہ قابل اعتراض تصاویر سوشل میڈیا پر دیکھ لی ہیں اور اسی بات پر میں بپھری ہوئی تھی۔ وہ اب بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی جھوٹی تاویل پیش کرے گا، کوئی بودی سی بات کہہ کر اپنی صفائی دے گا اور سارا معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے موہن جوداڑو میں قتل ہونے والی اس کی فلم کے مرکزی کردار کے بارے میں، اس کی ان باتوں پر یقین کر کے کیا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ جس وقت اس لڑکی کا قتل ہوا تو وہ میرے پاس لاہور میں تھا اور یہ کہ اس طرح کے چھوٹے موٹے کردار کرنے والی لڑکیاں توجہ کا مرکز بننے کے لیے ہر طرح کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔

وہ من گھڑت، بودی کہانی جو اس نے مجھے اور فیصل کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے سنائی تھی، مجھے اس پر یقین تو کیا ہوتا، الٹا اس پر شک پختہ ہو گیا تھا مگر میں نے اس سے جرح کی نہ ہی فیصل کے سامنے ایسی بات کی کہ اس کی کہانی جھوٹ کا پلندہ تھی۔ مہتاب کے بارے میں فیصل یا کوئی بھی اور کوئی منفی بات کرے، یہ میں برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی اور اگر دل سے یقین ہوتا بھی تھا کہ فیصل، مہتاب کے بارے میں درست بات کر رہا ہے تو میں اپنے آپ کو جھوٹے بہلاوے دیتی اور اسے مزید کوئی بات کرنے سے روک دیتی، اسے جھٹلاتی۔ کہتی کہ یہ سب غلط بیانی ہے۔ فیصل بھی زیادہ بحث نہیں کرتا تھا، وہ جانتا تھا کہ میں عورتوں کی اس قسم میں سے ہوں جو مرد اور وہ بھی شوہر کو ہر ممکن چند غلطیوں کا مارجن دے دیتی ہے۔ وہ جہاں سے کچھ سنتی

یاد رکھتا تھا، اسے مجھ تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا، باقی میں یقین نہ کروں یا بے یقینی کی اداکاری کروں تو اس سے فیصل کو کوئی غرض نہیں تھی۔

''میں خود بھی اتنی عقل رکھتی ہوں مہتاب، کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں کہ کوئی کچھ بھی کہہ دے اور میں من و عن مان لوں...... اور پھر یہ بتاؤ کہ مجھے کون اور کیوں بہکائے گا تمہارے خلاف۔'' میں نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ ''کسی کو تمہارے اور میرے بیچ اختلافات پیدا کر کے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟''

''تو پھر تم اتنی بد اعتماد کیوں ہو رہی ہو میری جان؟ مجھے تو یہی لگتا ہے کسی شر پسند سے تمہاری اور میری بے انتہا محبت برداشت نہیں ہوئی۔'' اس نے خمار آلود لہجہ بنایا۔

''ہونہہ...... بے انتہا محبت......'' میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھ کر ہنکارا بھرا۔

''تم ٹھیک تو ہو مایا، میرا مطلب ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے، آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہیں۔'' اس نے بات کا رخ بدلا، مجھے پکڑ کر لاؤنج میں صوفے پر بٹھایا۔ ''فون کہاں پر ہے تمہارا، آخر میری کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہی تھیں تم؟'' اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''وہ میرا فون...... پتا نہیں کہاں ہے۔'' میں نے اپنی آواز کو آہستہ رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ مصالحت بھری آواز میں بات کر رہا تھا۔ میں اس سے کھل کر ساری باتیں تو کرنا چاہتی تھی مگر لڑائی کا موڈ نہیں تھا۔ ہمارے بیچ سے اعتماد اس طرح نکل گیا تھا جس طرح غبارے میں سے ہوا مگر میں اس پر ابھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، اسے ڈھیل دے کر مجھے ابھی اس معاملے کو کچھ عرصہ اور دیکھنا تھا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ میرے پاس اس وقت تک اس کے خلاف جو ثبوت تھے، وہ وہی تھے جو مجھے فیصل نے فراہم کیے تھے۔ فیصل تو یوں بھی اس کے حساب و کتاب میں اچھا آدمی نہیں تھا، اس کے خیال میں وہ بات کا بتنگڑ بنا لیتا تھا اور اس کی کہی گئی کسی بھی بات کی...... اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ ایسا کہتے ہوئے وہ فیصل کے اس احسان کو بھول جاتا جو اس نے اس کے ساتھ کیا تھا۔

مجھے خود بھی فیصل کے بارے میں کبھی یقین ہوتا اور کبھی شبہ کہ وہ لکھاری ہے، لفظوں کا کھلاڑی ہے اور بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا ماہر بھی۔ اس کی کہی ہوئی باتوں پر ایک لمحہ یقین آتا تو اگلا ہی پل اسے مشکوک کر دیتا۔ مہتاب کو سوشل میڈیا کا حوالہ دیتی تو اس کے پاس رٹا رٹایا جواب ہوتا کہ سوشل، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا تو ایسی افواہوں پر ہی چلتا ہے۔ انہیں تو سیدھی سی بات کو مسالے لگا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ہوتا ہے، اسی سے ان کی روزی روٹی چلتی ہے۔

''کیا بات ہے مایا...... کیا پچھلے آٹھ گھنٹوں سے تم نے اپنا فون ہی چیک نہیں کیا؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ''فون ٹھیک تو ہے تمہارا...... کہیں چوری تو نہیں ہو گیا؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ مجھے وہیں بیٹھا چھوڑ کر وہ کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹا تو میرا فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''بیڈ کے نیچے گرا ہوا تھا۔'' شاید غنودگی میں میرے ہاتھ سے فون چھوٹ کر بیڈ کے نیچے گرا ہوگا اور جب میں کسی وقت بستر سے اٹھی ہوں گی تو میرے ہی پاؤں کی ٹھوکر سے وہ کھسک کر بیڈ کے نیچے چلا گیا ہوگا۔ میں اس کے ہاتھ میں اپنا فون دیکھ کر گھبرا گئی۔

''یہ تو آف ہے......'' اس نے فون سیدھا کیا اور کہا اگر وہ فون آن کرتا تو جان جاتا کہ میں نے کیوں فون بند کر رکھا تھا۔ وہ ایپ جس پر میں اسے دیکھتی تھی اور فیصل کی بھجوائی گئیں وہ تصاویر جو میں جاگتے، سوتے اور روتے ہوئے دیکھ رہی تھی، فون کے آن ہوتے ہی وہ اسکرین پر ظاہر ہو جاتیں۔ میں گھبرا گئی، اس کے ہاتھ سے فون چھیننے کو دل چاہا، وہ فون کو آن کر رہا تھا۔

''اس کی بیٹری تو بالکل ڈیڈ ہے...... میں چارجنگ پر لگا دیتا ہوں۔''

''مجھے دے دو میرا فون مہتاب...... میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں۔'' میں نے جلدی سے اٹھ کر اس کی

طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ناراض ہو کیا مجھ سے کسی بات پر؟'' اس نے میرا فون مجھے تھمایا، مجھے کندھے سے پکڑ کر واپس بٹھایا اور خود بھی میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے سوال میں پیار کا ایسا رنگ گھلا ہوا تھا، لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی طرح مجھ سے بے وفائی کر سکتا تھا۔

''نہیں......'' میں نے کہہ کر گہری سانس لی۔

''خود سے ناراض ہوں میں مہتاب......'' میں نے ہولے سے کہا۔

''یوں تو نہ کہو زندگی۔'' اس نے ڈائیلاگ بولا۔ ''میرے پاس جینے کو کیا جواز رہ جائے گا؟''

''کمی دائمی تو میرا مقدر ہے مہتاب، میرے پاس کوئی جواز نہیں رہے گا جینے کا، تمہارے پاس تو میرے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ ہٹایا اور ذرا سا فاصلے پر ہو کر بیٹھ گئی۔

''ان سب باتوں اور اس اکھڑے لہجے کا کیا مطلب؟'' وہ مجھ سے یوں بے رخی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ ''کس طرح کی باتیں کر رہی ہو، آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں مایا؟ کیسے عام عورتوں جیسی سوچ ہو گئی ہے تمہاری۔'' وہ چڑ گیا تھا۔ ''کیا بات ہے تمہارے دل و دماغ میں میرے خلاف کون زہر بھر رہا ہے؟''

''کون ہو گا ایسا جو میرے دماغ میں تمہارے خلاف زہر بھرے گا؟ اور کیوں بھرے گا؟'' میں نے بھی غصے سے کہا۔ ''اور تم کیا سمجھتے ہو، میں بے دماغ ہوں، میرے پاس شعور نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟'' میں دہاڑی۔ ''میری اپنی چھٹی حس مجھے میرے شوہر کے بارے میں خبردار نہیں کر سکتی اور مجھے تمہارے بارے میں اچھا یا برا صرف دوسروں سے ہی علم ہو سکتا ہے؟'' میری آواز بلند ہو رہی تھی۔

''اور عورت عام ہو یا خاص، اسے اپنے شوہر سے باز پرس کرنے کا پورا حق ہوتا ہے، اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں عام عورتوں کی طرح سوچ رہی ہوں تو تم بھی عام مردوں کی طرح حرکتیں کرنا چھوڑ دو، تمہیں میں نے اپنے دل میں اور اپنی زندگی میں بڑا خاص مقام دیا ہے، اگر یوں عامیانہ حرکتیں کرو گے تو مجھ سے کسی بہتر سوچ اور عمل کی توقع نہ کرنا۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے اندر کون بول رہا ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر اپنی علمیت بگھاری۔

''میرے اندر کون بولے گا، اگر میرے اندر میرے علاوہ کوئی بول سکتا ہے تو وہ تم ہو کہ مہتاب، کوئی اور نہیں۔''

''تمہیں یہ سب اناپ شناپ، اس طرح کے الفاظ اور سوچیں، یہ ذلیل فیصل ہی بتاتا ہے، جانتا ہوں میں۔'' وہ میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرا فیصل سے کوئی ایسا تعلق اور ناتا نہیں ہے مہتاب اور نہ ہی اس کی یا کسی اور کی ایسی جرأت کہ وہ میرے ساتھ تمہارے بارے میں کوئی منفی بات کرے اور یہ کہ میں اس کی حوصلہ افزائی کروں یا اس کی بات سنوں بھی...... یہ سب کرنے میں فیصل کا کیا مفاد ہے، وہ کیوں مجھے تمہارے خلاف ورغلائے گا؟''

''اس کا کیا مفاد ہے، یہ بات یا تم جانتی ہو یا پھر وہ۔'' وہ غصے سے کہہ کر اٹھا اور لاؤنج سے کچن کی طرف گیا۔ ''چائے لو گی تم؟'' اگلے ہی لمحے اس کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا۔ ایسے ہی رنگ اور لہجے بدلتا تھا وہ۔

''نہیں......'' میں نے فوراً کہا، حالانکہ دل چاہ رہا تھا۔

''پی لو میری جان، مجھے لگتا ہے کہ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔'' اس نے کچن کیبنٹ سے دو کپ نکالے۔ ''چائے پی کر چلتے ہیں کسی اچھی سی جگہ سے ناشتا کرنے۔'' وہ میرا دھیان ادھر ادھر بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''چائے کے ساتھ کیا لو گی؟'' میں خاموش رہی، میری خاموشی کو وہ میری رضامندی سمجھا تھا۔ ''تو پھر کہاں چلیں ناشتا کرنے؟''

''میں بس چائے کے ساتھ دو بسکٹ لوں گی۔ لاہور میں اس وقت ناشتے کا وقت ختم ہو چکا ہے، تمہیں کراچی میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔'' میں نے بعد

کوشش مصالحانہ انداز اختیار کیا تھا، لہجے میں نرمی پیدا کی تھی کہ ابھی میرے پاس ناکافی ثبوت تھے۔

"چلو پھر جیسی تمہاری مرضی...... دن کا کھانا یا رات کا باہر کھائیں گے، جو تم چاہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "باقی وقت ہم گھر پر گزاریں گے، صرف میں اور تم، بہت عرصے سے ایسی رومان بھری تنہائی نہیں ملی۔"

میں اس کے جواب میں مسکرا بھی نہ سکی تھی۔

"میں آتی ہوں ابھی۔" وہ چائے بنا رہا تھا۔

میں اسے کہہ کر اٹھی، کمرے میں جا کر فون چیک کیا، تھوڑا سا چارج ہو گیا تھا۔ اس پر مہتاب کی پچاسوں کالیں تھیں اور ان گنت پیغامات۔ میں غالباً دس، بارہ گھنٹے تک غصے بھری مدہوشی کے عالم میں رہی تھی۔ اس کا غصہ بجا تھا، فون کی آواز بھی میں نے بند کر رکھی تھی، نہ سو رہی ہوتی تب بھی نہ جان پاتی کہ وہ کالیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پیغامات کو کھولا، فکر مندی سے بھرے ہوئے پیغامات تھے۔ "میرے کپ میں ابھی چائے نہیں ڈالنی، میں چند منٹ میں آتی ہوں۔" مہتاب آیا تھا تو جانے کتنے دن یہاں رہتا، کسی وقت جو میرا فون اس کے ہاتھ میں آ جاتا اور وہ چیک کر لیتا تو۔ یہی سوچ کر میں نے اسے آواز دے کر بتایا کہ میں تھوڑی دیر تک تیار ہو جاتی ہوں۔

فون لے کر غسل خانے میں گئی، کموڈ کے ڈھکن کو بند کیا اور اس پر بیٹھ کر پہلے جلدی سے فیصل کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر اپنے ای میل ایڈریس پر خود کو ای میل کیں اور اس کے بعد فیصل کی اور اپنی chat کو ڈیلیٹ کر دیا۔ اپنے فون سے اپنی ای میل سے بھی سائن آؤٹ کیا۔ خفیہ کیمروں والی ایپ کو games کے فولڈر میں آخری خانے میں ڈالا اور اس فولڈر پر احتیاطاً پاس ورڈ بھی لگا دیا تھا۔ اس کے بعد منہ پر پانی کے چند چھپاکے مار کر ہلکی سی لپ اسٹک لگائی تا کہ باتھ روم میں دیر لگانے کا کوئی جواز تو ہو، اس سے زیادہ اس وقت تیار ہونے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ لباس تبدیل کیا اور باہر نکل کر اپنا فون لا کر میں نے ٹی وی لاؤنج کی سینٹر ٹیبل پر رکھ کر دوبارہ چارجنگ پر لگا دیا تا کہ مہتاب کو شک نہ ہو کہ میرے فون میں کچھ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اس کی پہرہ داری کروں۔

"سوری مہتاب، فون کی چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے اس کی آواز بھی میں نے سونے کے لیے بند کر دی تھی۔ سر میں درد کے باعث نیند نہیں آ رہی تھی تو میں نے نیند کی گولی کھالی تھی، اسی لیے میں نے تمہاری بہت سی کالیں مس کیں اور پیغامات بھی چیک نہیں کیے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ندامت سے کہا۔

"مسئلہ کیا ہے جان؟" وہ ٹرے میں چائے اور بسکٹ رکھ کر لایا تھا۔

"وہی مائیگرین۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "دو دن سے مسلسل چل رہا تھا۔"

"تمہیں کسی ڈاکٹر سے اس سلسلے میں مشورہ کر کے باقاعدگی سے دوا لینے کی ضرورت ہے مایا..... یوں اپنی صحت سے غفلت اور بے پروائی اچھی نہیں۔" اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "اور اب میں تمہیں یہاں تنہا بھی نہیں چھوڑنے والا، جانے اکیلے میں میرے بارے میں کیا اناپ شناپ سوچتی رہتی ہو۔"

میرے دل سے اس کے خلاف کدورت ہوا ہونے لگی اور مجھے واقعی فیصل پر شک ہونے لگا تھا، اس کی نیت میں کھوٹ نظر آنے لگا۔ آخر فیصل یزدانی، مہتاب سے حسد کیوں کرتا تھا، میرے اور مہتاب کے درمیان فاصلے پیدا کر کے، وہ کیا حاصل کرنا چاہتا تھا...؟ میں نے خود سے سوال کیا۔

☆☆☆

"ارے بھئی، یہاں تو بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔" مہتاب کو دیکھ کر وہ چہک کر بولا تھا۔ گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"کب آئے آپ جناب؟"

"آج ہی آیا ہوں میں۔" مہتاب نے اس سے مصافحہ کیا۔ "میں تو آیا ہی ہوں مگر تمہارے فون کو کیا ہوا فیصل یزدانی، میں نے کل شام کے بعد سے اتنی

کالیں کیں مگر تمہارا فون مسلسل بند آ رہا تھا۔“

”زہے نصیب...... سی ایم صاحب نے مجھے کالیں کیں، خیریت تھی جناب؟“ وہ بشاشت سے بولا۔

”مایا کا فون بند آ رہا تھا تو......“

”ڈاکٹر مایا کا فون بند تھا، میرا فون بند تھا تو آپ نے کہیں ایسا تو نہیں سوچا کہ ہم دونوں نے ایکا کر کے اپنے فون بند کر دیے ہیں تاکہ آپ ڈاکٹر مایا سے رابطہ نہ کر سکیں۔“ وہ ہنس کر بولا تھا۔ ”اچھا ہوا کہ میرے فون کو ایروپلین موڈ پر لگا کر بلال اپنی گیم کھیل رہا تھا اور آپ کا رابطہ نہ ہوا تو آپ خود ہی آ گئے...... پچھلی دفعہ بھی نہ مل سکے حالانکہ ڈاکٹر مایا نے مجھے بتایا بھی تھا کہ آپ خاص طور پر مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے۔“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں، مجھے جلدی اور سیدھا واپس کراچی جانا پڑ گیا۔“

”وہ آپ کا مقدمہ ختم ہوا کہ ابھی تک آپ ضمانت پر ہی ہیں؟“ فیصل کے سوال سے میں چونکی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ابھی تک وہ ضمانت پر باہر تھا۔

”بس ایک آدھ پیشیوں میں فیصلہ ہو جائے گا... تمہیں تو علم ہے کہ قانونی معاملات میں ہمارے ہاں کیا پیچیدگیاں ہیں اور پھر وکیلوں کی روزی روٹی بھی تو ہمیں ہی عدالتوں کے چکر لگوا کر بنتی ہے ناں!“ مہتاب نے فوراً بات کا جواب دیا۔ ”چلیں...... پھر ملتے ہیں، ابھی تو میں یہیں ہوں چند دن۔“

ہم لوگ دوپہر کا کھانا باہر کھا کر وہیں سے فلم دیکھنے چلے گئے تھے...... یہ خیال مہتاب کو اچانک آیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر ایک مال میں چلے گئے اور تھوڑی دیر گھوم پھر کر واپس لوٹے تو رات کا کھانا ہم نے پیک کروا لیا تھا۔ تھوڑی سی جو خریداری کی تھی وہ مہتاب کے پاس تھی اور کھانے والے لفافے میرے پاس تھے۔ مہتاب نے سامان کے لفافے بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے اس سے مصافحہ کیا تھا۔ ”مایا، ذرا جلدی سے دروازہ تو کھولو، کافی وزن اٹھا رکھا ہے میں نے۔“ مہتاب نے اسے بے رخی دکھانے کو کہا تھا شاید۔

”لائیں میں مدد کر دوں آپ کی۔“ فیصل نے فوراً مدد کی پیشکش کی۔

”اپنے اور اپنی بیوی کے بوجھ میں خود اٹھا سکتا ہوں یار...... بہت شکریہ، جہاں مدد کی ضرورت پڑی، میں تمہیں ہی آواز دوں گا۔“ مہتاب نے عام سے لہجے میں بہت ذو معنی بات کی تھی، میں نے محسوس کیا تھا اور فیصل تو یوں بھی لفظوں کا کھلاڑی تھا۔

”ڈاکٹر مایا تو بہت مضبوط خاتون ہیں، اپنے بوجھ خود ہی اٹھا لیتی ہیں اور یوں بھی اللہ تعالیٰ ہر شخص پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے۔ جتنا کہ وہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ ہم انسان خود ہی اپنے بوجھ بڑھا لیتے ہیں۔“

”کبھی تم اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ پر گئے ہوتے تو تمہیں علم ہوتا کہ عورتیں کتنا فالتو بوجھ اپنے شوہروں پر ڈال دیتی ہیں... اتنا کہ جتنا ان میں اٹھانے کی سکت بھی نہیں ہوتی۔“ وہ رکا، آنکھ مار کر فیصل کی طرف دیکھا۔ ”اور تمہیں تو علم ہو گا کہ تمہاری ہمسائی، یعنی کہ میری بیوی تو ویسے بھی heavy maintenance والی عورت ہے......“ جانے ایسی فضول سی بات مہتاب نے اس سے کیوں کہی تھی۔

”مہتاب......“ میں نے احتجاج کیا، دروازہ میں نے کھول دیا تھا۔

”سوری یار، مذاق کر رہا تھا۔“ وہ سامان اٹھا کر اندر کی طرف بڑھا۔

”ویسے بھی جناب، میں آپ کا نمبر اپنے فون میں محفوظ کرنا بھول گیا تھا اور کسی انجان نمبر سے آئی کال میں نہیں اٹینڈ کرتا اور آپ جیسے شخص سے تو کال...... بلکہ اتنی کالوں کی امید ہی نہیں کر سکتا۔ معذرت خواہ ہوں مگر اب آپ کا نمبر محفوظ کر لوں گا، آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔“ اس نے رسان سے کہا۔ ”اور اپنی ان ہمسائی سے تو میری اپنی ملاقات اور رابطہ کئی کئی دن نہیں ہوتا، اگر آپ سے بات ہو بھی جاتی تو میں ان کے بارے میں آپ کو کیا بتا سکتا تھا۔“ فیصل نے غلط بیانی کی تھی مگر میں اسے ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔

”اوکے برادر، ملتے ہیں پھر کسی وقت۔“

’’ضرور جناب......‘‘ دروازہ بند کرتے وقت میں نے باہر دیکھا، وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں کیا تھا، مجھے سمجھ میں ہی نہ آیا۔ میں نے دروازہ بند کیا، مجھے یاد آیا کہ وہ تہمیں باہر سے آ رہا تھا اور تنہا تھا، وہ تنہا کیوں تھا؟ میں نے سوچا۔ ’’بلال کہاں تھا اس وقت، وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں تھا؟‘‘ اس خیال کو دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر نہ کر سکی۔

’’بلال کہاں ہے؟ وہ آپ کے ساتھ نہیں تھا۔‘‘ مہتاب کھانے کے بعد غسل خانے گیا تھا۔ اس کی سونے سے پہلے غسل لینے کی عادت تھی، میں نے اس وقت فیصل کو پیغام بھیجا۔

’’وہ [illegible] تھا [illegible] رہی تھی [illegible] آپ سے [illegible] ایم صاحب [illegible] کے [illegible] لیے [illegible]‘‘

’’[illegible] مہتاب [illegible] کی [illegible] آپ مجھے بتاتے [illegible] کے ذرا سے بچے کی [illegible] ون کی [illegible] مہتاب کے اس کے بارے میں مثبتی خیالات جانتے ہوئے بھی میں نے اسے پیغام بھیجا۔ اس نے جواب میں دوا کا نام بھیجا۔ ’’اچھی ہے یہ دوا، ابھی مگر اس سے بہتر یہ دوا ہے۔‘‘ میں نے اسے ایک اور دوا کا نام لکھ کر بھیجا۔ ’’بچوں کے استعمال کی بنیادی دوائیں گھر پر رکھا کریں... الٹیاں رک گئی ہیں اس کی یا اگر ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں دیکھ لوں؟‘‘ میں نے خلوص سے پیشکش کی۔

’’نہیں، اس کی ضرورت نہیں، وہ اب پہلے سے کافی بہتر ہے، آپ کی پیشکش کا بہت شکریہ۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’جو دوا آپ نے بتائی ہے، وہ بھی لے [illegible] گا اور آئندہ کے لیے اس کے لیے بچوں کی صحت [illegible] عادی مسائل کے لیے دوائیں گھر پر رکھوں گا۔‘‘

’’لیکن ان دواؤں کی اختتامی تاریخ کا بھی [illegible] ہیں، یہ مقرر کی ہوئی مدت... دوائیں [illegible] بغیر استعمال کے ختم ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ہم اسے چیک کیے بغیر استعمال کر لیتے ہیں تو اس کے نتائج... خطرناک ہو سکتے ہیں۔‘‘

’’جی، ضرور‘‘ اس کا جواب آیا۔ ’’ایسا ہی کروں گا میں۔‘‘

’’آپ نے مہتاب کے سامنے جھوٹ کیوں بولا؟‘‘ میں نے سوال بھیجا۔

’’ابھی آپ نہیں سمجھیں گی، بعد میں بتاؤں گا۔ کچھ جھوٹ مصلحت کے لیے ہوتے ہیں اور میرے اس مصلحت والے جھوٹ سے کسی کا نقصان نہیں ہوا۔‘‘

’’شب بخیر۔‘‘ میں نے اسے پیغام بھیجا۔

’’شب بخیر! آپ کی ایم صاحب کو بتائیں، بلال کی فکر نہ کریں۔‘‘ اس نے پیغام لکھ کر بھیجا تھا۔

بول کر کہا ہوتا تو واضح ہوتا مگر اس کے پیغام میں سے بھی کچھ بین السطور محسوس ہوا تھا۔ کیا فیصل مہتاب سے حسد محسوس کر رہا تھا، وہ بھی میرے اور اس کے [illegible] اور بھرے تعلق کے حوالے سے، ایک لمحے [illegible] کسی بھی لمحے غسل خانے [illegible] بھیجے اور اس کے [illegible] نکل آتے تو [illegible] فقط سوچ کر رہ [illegible] کہ اس کے یوں کہنے کا کیا مطلب تھا۔ [illegible] وقت نہ تھا، اپنے فون سے میں نے اس کے [illegible] ہونے والی ساری بات چیت ڈیلیٹ کر دی۔

☆☆☆

مہتاب نے میرے ساتھ چار بھرپور دن رات گزارے تھے [illegible] ہم بہت گھومے پھرے تھے، سیر سپاٹے کیے، شاپنگ اور ہوٹلوں میں کھانا کھایا، نہر کے کنارے گھنٹوں پیدل چلے تھے، اکٹھے بیٹھ کر فلمیں دیکھیں اور کافی کے ساتھ پرانا... کلاسیکل میوزک سنا۔ اپنی پرانی یادوں میں کھو کر ایک دوسرے کی قربت کو محسوس کیا تھا۔ میں نے اس سے بہت خوف [illegible]

دسوسے مٹ گئے تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے اب بھی پہلے کی طرح مخلص تھا۔ اب بھی مجھے اتنا ہی پیار کرتا تھا اور اس کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور عورت نہ تھی۔ اس سے منسلک ہر خبر اور سوشل میڈیا پر ساری افواہیں، جھوٹ کا پلندا تھیں اور وہ کسی قسم کی منفی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں مصروف نہ تھا......

اس نے کہا اور میں نے بھی مان لیا کہ سوشل میڈیا کو لوگ اپنے منفی ارادوں کے لیے بطور ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔ یہی یقین دلایا تھا مجھے مہتاب نے نہ صرف زبانی، بلکہ عملی طور پر بھی، اس نے کہہ کر نہیں بلکہ عملی طور پر بھی بتایا تھا کہ وہ ابھی تک مجھ سے اسی طرح پیار کرتا تھا جیسے وہ مجھے یونیورسٹی کے زمانے میں کرتا تھا۔ اس نے مجھے بار، بار کہا تھا کہ میں اس کی پہلی، اکلوتی اور آخری محبت تھی اور اس کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی لڑکی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتی تھی، جہاں پر میں تھی اور یہ کہ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کا کاروبار چلتا ہی کامیاب اور مشہور شخصیات کے بارے میں چٹخارے دار خبریں اور سنسنی پھیلا کر ہے۔

''باہر آؤ ماہا۔'' اس کی کال آئی تھی۔ لگ بھگ دو گھنٹے پہلے وہ گھر سے کسی کام کا کہہ کر گیا تھا اور اب گھر کے باہر کھڑا کال کر کے مجھے باہر بلا رہا تھا۔ میں نے اسے اندر آنے کو کہا کیونکہ میں اس کے لیے کچھ خاص پکانے میں مصروف تھی۔ اس نے اصرار کیا کہ میں ہی باہر آؤں۔ میں باہر نکلی تو اس نے ایک خوب صورت ربن بندھا، چھوٹا سا ڈبا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے اس ڈبے کو پکڑ لیا مگر کچھ نہ سمجھی، میں نے اسے اندر آنے کو کہا تو اس نے مجھے وہیں کھڑے رہنے کو کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے ڈبے پر لپٹا ہوا ربن کھولتے ہوئے اس سے سوال کیا، اس نے کھول کر دیکھنے کو کہا۔ میں نے کھولا تو اس میں ایک چابی تھی، میں نے اسے حیرت بھری سوالیہ نظر سے دیکھا تو اس نے ڈبے میں سے چابی اٹھا کر، ڈرائیو وے کی طرف اشارہ کیا۔ ''مہتاب، اس کی کیا ضرورت تھی؟''

میں نے اپنی ڈرائیو وے پر چمچماتی ہوئی نئی اور بڑی مہنگی گاڑی دیکھ کر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

''واہ بھئی، ضرورت کیوں نہیں تھی، بی ایم کی بیوی ہو اور اوپر سے نامور ڈاکٹر مایا بھی اور گاڑی اتنی پرانی سی۔'' اس نے مجھے اپنے ساتھ لگالیا۔

''خواہ مخواہ میں اتنا خرچہ۔ اچھی خاصی تو چلتی ہے میری گاڑی مہتاب۔''

''اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی جان مہتاب۔'' اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ''گاڑی آچکی ہے اور تمہاری پرانی گاڑی جا چکی ہے، اب بحث بیکار ہے۔'' چابی اس نے میری طرف بڑھائی۔

''ایسی بات مہتاب...... مجھے وہ گاڑی بہت پسند تھی، میں اس کے ساتھ بہت خوش تھی، تم نئی گاڑی لینے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتے۔ میں بھی جہاں، جہاں مجھے گاڑی چلانا اور پارک کرنا ہوتی ہے اس کے لیے وہ گاڑی سائز میں بالکل مناسب ہے۔'' میں نے چابی نہیں پکڑی۔

''ٹھیک ہے......'' اس نے چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔ ''میں تمہیں وہی گاڑی واپس منگوا دیتا ہوں۔'' وہ منہ پھلا کر واپس گھر کی طرف چلا تو میں اس کے پیچھے لپکی۔

''اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے مہتاب؟'' میں نے اندر جا کر اسے پکڑ کر روکا۔

''ناراض نہ ہوں تو اور کیا کروں...... بجائے میرے تحفے کی قدر کرنے، میرا شکریہ ادا کرنے اور اپنی نئی گاڑی میں بٹھا کر مجھے سیر کروانے کے الٹا تم نے میرا اچھا خاصا موڈ خراب کر دیا ہے۔''

''سوری۔'' میں نے ہاتھ باندھے۔ ''مگر کیوں لی تم نے اتنی مہنگی گاڑی میرے لیے؟''

''کیونکہ میں تمہیں حد سے زیادہ پیار کرتا ہوں میری جان۔'' اس نے وارفتگی سے کہا تو میرا دل اس کی طرف سے صاف ہوگیا۔

''میں ذرا چینج کر لوں، اچھی طرح تیار ہو جاؤں...... اس کے بعد میں تمہیں اپنی گاڑی میں سیر کرواتی ہوں اور کہیں اچھا سا کھانا بھی کھلاتی ہوں۔'' میں نے اسے منانے کو کہا۔

''یہ ہوئی ناں بات۔'' وہ کھل گیا، اتنی سی بات سے اس کا موڈ ٹھیک ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''ارے ...... تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ تم نے میری گاڑی بیچ دی ہے؟'' کھانا کھا کر واپس لوٹے تھے اور میری گاڑی ڈرائیو وے پر کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔

''اس بات پر میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟''

''مگر گاڑی تو یہ کھڑی ہے میری۔'' میں نے سامنے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''تم نے جلد بازی میں غور نہیں کیا کہ تمہاری ''سابقہ'' گاڑی فیصل یزدانی کی سائڈ کی ڈرائیو وے پر ہے۔'' اس نے کہا تو میں بھی۔ میری گاڑی اس کی ڈرائیو وے پر کھڑی تھی اور اس کی پرانی سی کھٹارا کار وہاں سے غائب تھی۔ تو گویا اس نے مہتاب سے میری گاڑی خرید لی تھی۔ ''اچھا ہے ناں، اسی بہانے تمہیں اپنی پرانی گاڑی بھی یاد نہیں ستائے گی اور کبھی جی چاہا تو یزدانی سے مستعار لے کر اپنا چھوٹی گاڑی چلانے کا شوق بھی پورا کر لینا۔'' اس پر ہم دونوں کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

''اچھا۔'' میں نے اچھا کو لمبا سا کھینچ کر کہا۔ ''اور جو یزدانی کا دل اچھی اور بڑی گاڑی چلانے کو چاہا تو؟''

''اس کا دل اچھی گاڑی کو چلانے کو چاہے تو لازم نہیں کہ اس کے دل کی ساری مانی جائیں...... تم اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیر کروا سکتی ہو، جس کا اسٹیئرنگ کنٹرول اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتیں۔''

''میں بھلا کیوں، اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیر کروانے لگی۔'' میں نے فوراً ناگواری سے کہا۔ جیسے میرا اس سے کوئی ایسا تعلق واسطہ نہ تھا کہ وہ میری گاڑی میں بیٹھے۔ حالانکہ بلال کی سالگرہ کی تیاری کے دنوں میں کئی بار ایسا ہوا تھا کہ ہمیں کچھ خریدنے کو جانا ہوتا تھا تو

ہم اکٹھے ہی میری گاڑی میں جاتے تھے۔ ہاں بلال میرے ساتھ بیٹھتا تھا اور فیصل پچھلی سیٹ پر مگر میں یہ بھی مہتاب کو نہیں بتا سکتی تھی۔ میرے دل میں چور تو نہ تھا مگر مجھے علم تھا کہ مہتاب کو سن کر اچھا نہیں لگے گا۔ ''میرے دل میں چور تھا کیا؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

☆☆☆

''نئی گاڑی مبارک ہو ڈاکٹر ماہا۔'' میں تیار ہو کر نکلی تھی اور اسی سے وہ بھی باہر نکلا تھا۔

''آپ کو بھی گاڑی مبارک ہو۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''نئی تو نہیں کہہ سکتی۔'' دل میں خیال آیا کہ اس سے پوچھوں کہ اسے مہتاب نے کتنے میں میری گاڑی فروخت کی تھی مگر خود کو روک لیا۔

''کوئی بات نہیں..... میرے لیے نئی جیسی ہی ہے، میری پہلی گاڑی سے تو بہت بہتر ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''بلال کیسا ہے اب؟'' میں نے سوال کیا۔

''بالکل ٹھیک ہے، اسکول گیا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''بلال بہت کمزور ہے، اپنی عمر کے لحاظ سے اس کی قوت مدافعت بھی بہت کم ہے۔ آپ اس کا خیال رکھا کریں بالخصوص اس کے کھانے پینے کا۔ کوئی ملٹی وٹامن بھی دیا کریں اسے، باہر کا کھانا ہرگز نہ کھلایا کریں اور چیک کریں کہ اسکول میں بھی کچھ الا بلا نہ خرید کر کھاتا ہو۔''

''بہت شکریہ آپ کی بلال کے لیے فکرمندی کا..... مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس نہ تو باہر کھانے کے علاوہ کوئی چارہ ہے اور نہ ہی میں بلال کو منع کر سکتا ہوں کہ وہ الا بلا نہ خرید کر کھایا کرے۔ میں اسے لنچ بریک کے لیے جو رقم دیتا ہوں اس سے وہ اسکول کی کینٹین سے ہی لے کر کچھ کھاتا ہے۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے اور اس کے لیے آپ کو تجویز بھی دی تھی، کوثنا اتنا اچھا کھانا پکاتی ہے، آپ کے سارے مسائل حل ہو جاتے۔'' میں نے موقع جان کر پھر اسے یاد دلایا تھا۔ اسے یہ پیشکش بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں یا میری کام والی اس سلسلے میں مدد کر دے گی کیونکہ میرا اپنا کھانے پینے کا معمول بے قاعدہ تھا۔ کام والی اگر اس کے ہاں کھانا بھی پکانا شروع کر دیتی تو میرے کام سے جاتی، یہ نیکی اور ہمدردی مجھے مہنگی پڑ جاتی۔

''ہاں یہ تو ہے، اس سے شادی کر لوں تو نہ صرف میرے بلکہ آپ کے بھی سارے مسائل حل ہو جاتے مگر..... دل نہیں مانتا۔'' اس نے مسکرا کر کہا، اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا تھا۔

''ہا میں..... آپ کے کوثنا سے شادی کرنے سے میرے مسائل کا حل ہونا چہ معنی دارد؟''

''چلتا ہوں..... دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''آج کل ایک نئے پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں، اس کے لیے کچھ مواد ڈھونڈ رہا تھا۔'' وہ مجھے صاف ٹال رہا تھا۔

''کیا ہے آپ کا نیا پراجیکٹ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سوری، اس وقت دیر ہو رہی ہے، بعد میں بات ہوگی..... '' اس نے کہا اور چل دیا۔ ''ہاں جب آپ اپنی نئی گاڑی کی خوشی میں پارٹی دیں گی تو اس وقت بات ہو گی۔'' اس نے مڑ کر کہا اور ہنس کر چل دیا۔

''پارٹی تو آپ کی گاڑی کی بھی بنتی ہے.....''

''سو تو ہے.....'' اس نے جواباً مسکراہٹ پھینکی اور میری گاڑی، سوری..... میری نہیں، اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ اپنی پرانی اور محبوب گاڑی کو اپنی نظروں کے سامنے کسی اور کا ہوتے ہوئے دیکھنا کتنا مشکل تھا، مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک دن پہلے ہی تو میں اپنے گھر سے نکلی تھی اور بے دھیانی میں اسی پرانی گاڑی کے پاس جا کر کھڑی ہو کر اس کے دروازے کا ہینڈل پکڑا ہی تھا کہ یاد آ گیا کہ اب وہ میری نہیں، فیصل کی گاڑی تھی۔

☆☆☆

میں نے اپنی میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پلاسٹک سرجری کی فیلڈ کو دنیا کے تت نئے رجحانات کے پیش نظر منتخب کیا تھا۔ ہمارے ملک میں اس فیلڈ میں بہت کم خواتین تھیں سو میں نے اس کا انتخاب کیا۔

پلاسٹک سرجری میں جو کچھ جدید طب میں کیا جا رہا تھا، اسے سن اور دیکھ کر میں بہت متاثر ہوتی تھی اور میرا... خواب بھی اپنے ملک میں پلاسٹک سرجری میں اسی طرح کے انقلابات لانے کا تھا مگر مجھے علم نہیں تھا کہ ہمارے ہاں زمینی حقائق بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں آنے والے زیادہ تر کیس پیدائشی طور پر کٹے ہوئے ہونٹوں والے بچوں کے ہوتے تھے، ان کے والدین کو یقین ہوتا تھا کہ وہ چاند گرہن یا سورج گرہن کے اثرات کے باعث کٹ جاتے ہیں۔ کسی حادثے کے باعث کسی عضو کا کٹ جانا یا کسی تیز دھار آلے کے استعمال کے دوران ہاتھ یا انگلی کا کٹ جانا، ان کیسوں میں دیہات میں چارا کاٹنے والی مشینوں کے غیر محتاط استعمال یا شہروں میں تیز دھار پودے کاٹنے والی مشینوں کے استعمال کے باعث ہوتا تھا۔ کسی بیماری یا شدید گرمی میں کھلے میں کام کرنے کے باعث، سورج کی براہ راست تپش پہنچنے کے باعث جلد کا بدنما ہو جانا، جل جانے کے باعث جسم کے کسی حصے سے جلد کا ختم ہو جانا اور گھروں میں ہونے والے وہ حادثات جن میں چولھے پھٹنے سے بنت حوا جلتی ہے، اور وہ بنت حوا ہمیشہ گھر کی بہو ہوتی ہے۔ ان سب سے زیادہ ان عورتوں کے کیس آتے تھے جن کے خوب صورت چہروں پر حیوانیت اور بربریت کی انتہا تک پہنچ کر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔

ان میں سے زیادہ تر شیطان صفت مرد، ان خوب صورت لڑکیوں کے چہرے تیزاب سے جھلسا دیتے ہیں، جن کی پیش قدمیوں کو یہ لڑکیاں روک دیتی ہیں؛ انہیں ناپسندیدگی کی سند دے دیتی ہیں یا جن لڑکیوں کے گھروں سے ان مردوں کے رشتے سے کسی بھی وجہ سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے تو اُن کی مردانگی کی توہین ہوتی ہے۔ کیا اس معاشرے میں انکار کا حق صرف مرد کو حاصل ہے؟ وہ کہاں سے دوسروں کے فیصلوں پر بھی قادر ہونے لگے ہیں، جہاں سے رشتے سے انکار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے مگر اس سے مردوں کی انا پر جو چوٹ لگتی ہے وہ ان کا دماغی توازن درہم برہم کر دیتی ہے اور وہ اس آخری اور ناقابلِ تلافی حد تک چلے جاتے ہیں، ہمارا واسطہ دن رات ایسے ہی کیسز سے رہتا ہے۔

چند دن قبل ہمارے پاس اپنی نوعیت کا پہلا کیس آیا تھا، کسی لڑکی کے چہرے پر اسی طرح رشتے سے انکار پر تیزاب پھینک دیا گیا تھا، وہ ہمارے پاس زیر علاج تھی۔ اس لڑکی کے رشتے داروں نے کافی کوشش کی کہ اس لڑکے کے خلاف مقدمہ درج کیا جائے مگر لڑکے والے اثر رسوخ والے لوگ تھے، انہوں نے لڑکی کے غریب خاندان کی ایک نہ چلنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس فرسودہ نظام کے خلاف علم بغاوت کرتے ہوئے اس زیر علاج لڑکی کی اس سے دو سال چھوٹی بہن نے خود ہی اپنے ننھے ذہن سے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے اس لڑکے کو کسی طرح پیغام بھیج کر کہیں تنہا بلوایا، جس نے اس کی بہن کے خوب صورت چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے ہمیشہ کے لیے ایسی بدنمائی دے دی تھی۔ وہ اسے سزا بھی تو اس نے اسے کسی اور کے قابل بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی چھوٹی بہن کی طرف سے پیغام ملنے پر بہت خوش ہوا [illegible] چھوٹی تو دوستی پر تیار ہے۔ وہ خوشی خوشی اس لڑکی کی طرف سے مقرر کردہ، شہر سے باہر ویران سی جگہ پر دیے گئے وقت پر چلا گیا۔ وہاں وہ لڑکی تنہا اس کی منتظر تھی۔ وہ اس سے چار لگاوٹ کی باتیں کیں کہ اسے اعتبار ہو جائے اور دونوں کے بیچ کا فاصلہ کم ہو جائے۔ وہ کسی غلطی کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد، جونہی وہ سرمستی میں اس کے قریب ہوا، اپنی چادر کے اندر سے نکال کر لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بڑی سی بوتل کا ڈھکن کھولا اور وہ بوتل اس کے اوپر الٹ دی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ اس کا کیا حشر ہوا، اس کے اپنے گھر والوں کو بھی نہیں علم ہوا کہ لڑکی گھر سے کہیں گئی تھی۔

لڑکے کو بھی شدید جھلسے ہوئے چہرے، گردن اور

کندھوں کے ساتھ ہمارے پاس ہی لایا گیا تھا۔ اس کی زبان اور دونوں آنکھیں بھی شدید متاثر تھیں۔ لڑکے والوں کو تو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ یہ کام لڑکی کے خاندان میں سے ہی کسی نے کیا ہوگا کیونکہ انہیں اپنے لڑکے کے کارنامے کا علم تو تھا ہی مگر اثر رسوخ کے باعث انہوں نے اپنے پردوں پر پانی نہ پڑنے دیا تھا۔ لڑکا بولنے یا دیکھنے کے قابل ہوتا تو بتا سکتا مگر بتا بھی دیتا تو وہ پولیس کو کیا کہتے کہ کیوں اس لڑکی کے خاندان میں سے کسی نے ان کے بیٹے پر تیزاب پھینکا تھا، اس سے ان کے اپنے لڑکے کا جرم بے نقاب ہو جاتا۔ اس کہانی کا دوسرا پہلو مجھے اسی لڑکی نے بتایا تھا جو ہمارے پاس زیر علاج تھی۔ اس نے مجھ پر اعتماد کر کے بتایا تھا۔ اگرچہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے اس مریض کو دیکھ کر بھی دکھ ہوا تھا مگر دل میں ایک کمینی سی خوشی بھی تھی، دل چاہتا تھا کہ اس خبر کو عام کیا جائے تاکہ اس کے بعد کسی لڑکی کا چہرہ مسخ کرنے سے پہلے مجرمانہ ذہنیت کے لڑکے سو بار سوچیں کہ ایسا ان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

ہم چونکہ ہر وقت اس نوعیت کے کیسز کے ساتھ نبرد آزما رہتے تھے اسی لیے عالمی طور پر ہمارے ہاں کے اور ہمارے ہمسایہ ملکوں کے ڈاکٹروں کو اس نوعیت کے تیزاب سے جلے ہوئے مریضوں کے علاج کرنے کی فیلڈ میں ماہر مانا جاتا ہے۔ ایسے مریضوں کے علاج کا عرصہ بہت طویل اور صبر آزما ہوتا ہے، مریض نفسیاتی طور پر بالکل ہارا ہوا ہوتا ہے اور ہم کوشش کرتے ہیں کہ اسے کہیں سے آئینہ بھی میسر نہ ہو کہ اپنا چہرہ دیکھ کر انہیں ہسٹریا کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ ان کے اپنے ہی جسم کے صحت مند حصوں کی جلد سے ٹکڑے کاٹ کر اس کے چہرے اور جسم کے نمایاں حصوں پر گرافٹنگ کی جاتی ہے، اس میں بہت وقت اور مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس تمام مہارت کے باوجود آج تک کوئی ایسا کیس نہیں ہوا کہ جس میں مریض یا مریضہ کو اپنی اصل شکل واپس مل سکی ہو۔ درجنوں آپریشنوں کے بعد بھی چہرہ بمشکل اس قابل ہوتا ہے کہ اسے شناخت کیا جا سکے، اس کی پہلے جیسی خوب صورتی نہیں لوٹائی جا سکتی۔

ہمارے ملک کے ڈاکٹرز چونکہ ہمہ وقت اس نوعیت کے کیسوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اس لیے ہمارے پاس مغربی ممالک سے اس نوعیت کے کیسز کی اسٹڈی کے لیے چند ماہرین امراض جلد کا ایک گروپ چند ہفتوں کی ورکشاپ کے لیے آ رہا تھا۔ ڈاکٹر رابعہ ہماری سب سے ماہر اور سینئر ڈاکٹر تھیں اور ان دنوں ہم چند ڈاکٹروں کی راہنمائی کے لیے تربیتی کلاسیں لے رہے تھے تاکہ ہم اپنے وہ لیکچرز ان کی روشنی میں تیار کر سکیں جو ہمیں ان مہمان ڈاکٹروں کو دینا تھے۔ اس کے لیے ہم سب ان کے ساتھ دن میں دو گھنٹے کے لیے لیکچر ہال میں جمع ہو جاتے، اس روز بھی ہم وہیں جمع تھے، ڈاکٹر رابعہ ابھی نہیں پہنچی تھیں، ہم خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''ڈاکٹر عفت نہیں نظر آ رہیں..... آج چار پانچ دن سے میں ان کی غیر حاضری محسوس کر رہی ہوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''عدت کی وجہ سے.....'' ڈاکٹر آنسہ نے ہولے سے جواب دیا تھا۔

''ایک تو آپ [illegible] کا زمی اردو بولتی ہیں ڈاکٹر آنسہ کہ آپ نے عفت کو عدت کہا تو میں [illegible] کہ آپ نے عدت کہا ہے۔'' میں نے [illegible] سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر آنسہ کو ہنس کر کہا۔

''اردو کا زمی نہیں ہوتی، ثقیل ہوتی ہے ڈاکٹر بابا..... اور میں نے حدت نہیں کہا، عدت ہی کہا ہے۔'' اس نے کہا تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''عدت تو سمجھتی ہیں ناں آپ؟''

''ڈاکٹر عفت..... ڈاکٹر عفت اور عدت؟'' میں حیران تھی۔ ''وہ کیوں عدت پر ہیں، اوہو، یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے..... کیا ان کے شوہر خدانخواستہ..... کیا ہوا ان کے شوہر کو، بیمار تو نہیں تھے، اچھے خاصے تو تھے؟'' میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

کیسا پیار کرنے والا شوہر تھا اس کا، اکثر ڈاکٹر عفت ان کے وارفتگی بھرے پیغامات ہمیں پڑھ، پڑھ

کر سناتی اور ہنستی۔ میں اسے منع بھی کرتی کہ میاں بیوی کے بیچ کے معاملات کی اس طرح تشہیر نہ کیا کرے۔ اس پر وہ ہنستی اور ذرا بھی شرمندہ نہ ہوتی، اس کی دلیل ہوتی تھی کہ اس کا شوہر بھی رتی اور بھی ماشہ جیسی شخصیت تھا، منہ پر ہوتا تو اس کے منہ سے ایک لفظ پیار کا نہ نکلتا تھا اور جب وہ سامنے نہیں ہوتی تھی تو اس کا پیار امڈا پڑتا تھا۔

''مجھے اس کے اس طرح کے پیغامات پڑھ کر خوف آتا ہے ڈاکٹر مایا۔'' اس نے ایک بار کہا تھا جب صرف میں اور وہ تھے۔ میں نے حیرت سے اس کی وجہ پوچھی۔ ''مرد جب عام معمول سے ہٹ کر بیوی کو توجہ دینے لگے ناں، اس سے پیار کا اظہار کرنے لگے تو یہ خوشی کی نہیں بلکہ خطرے کی علامت ہے۔'' اس نے کہا تھا۔ ''جب اس کے دل میں چور ہوتا ہے تو وہ اپنی بیوی کے گرد فریب کا جال بُنتا ہے اور اسے اس مکر کے جال میں پھنساتا ہے۔''

''شوہر زندہ ہے اس کا۔'' آنسہ نے بتایا۔

''تو پھر عدت......؟ میرا مطلب ہے۔'' مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا پوچھوں۔

''طلاق دے دی ہے اس کے شوہر نے اسے۔''

''کیا......؟'' میری حیرت کو زبان ملی تو چیخ نما آواز نکل گئی۔ ''مگر کیوں؟'' میں ہکلائی۔ ''وہ تو اتنا پیار کرتا تھا اس سے۔''

''اس نے کئی سالوں سے، عفت سے چھپ کر دوسری شادی کر رکھی تھی، عفت سے بچہ نہ ہونے کے باعث...... اپنی خفیہ شادی والی بیوی کو اس نے اس کے میکے میں ہی رکھا ہوا تھا۔ اب اس کی دوسری بیوی سے بچہ پیدا ہونے والا ہے تو اس کے میکے والوں نے اس کے شوہر سے کہا کہ ان کے محلے کے لوگوں نے سوال کرنا شروع کر دیے کہ ان کی گھر بیٹھی بیٹی کا بچہ کہاں سے ہونے والا ہو گیا ہے۔ اس پر عفت کے شوہر نے آئیں بائیں شائیں کی کہ ابھی تک وہ عفت کو بتا نہیں سکا کہ اس نے بچے کی خاطر دوسری شادی کر رکھی ہے۔

وہ عورت پہلے تو اسے مجبور کرتی رہی کہ اپنی بیوی کو جلد بتائے اور اسے اپنے گھر لے کر جائے اور جب اس نے ایسا نہیں کیا اور بچہ اس کے میکے میں ہی پیدا ہو گیا تو اس بچے کو لے کر وہ شوہر کے گھر آ گئی اور اس پر ڈاکٹر عفت نے خوب ہنگامہ کیا...... آخرکار اس کے انتہائی پیار کرنے والے شوہر نے اسے......''

''لعنت ہے ایسے مردوں پر۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''صرف اولاد نہ ہونا کیا عورت کا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد شوہر کو ہر قسم کی دھوکا دہی اور فریب کی اجازت مل جاتی ہے؟ کر لیتا شادی بچے کی خاطر مگر اتنی پیاری اور پڑھی لکھی بیوی کو جاہل عورتوں کی طرح دھوکے میں رکھا۔'' مجھے ڈاکٹر عفت پر ترس آ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا شوہر سامنے ہوتا تو...... مگر کیا کر لیتی میں اس کا؟ میں نے سر جھٹک کر اس بات کو اپنے سر پر سوار ہونے سے روکا۔ ڈاکٹر رابعہ کلاس میں داخل ہوئیں تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے لیکچر کے دوران بھی میں ڈاکٹر عفت کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ صرف اسی کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے بارے میں بھی کہ اگر میرے ہاں بھی بچہ نہ ہوا اور مہتاب......!

☆☆☆

''آپ گھر پر ہی ہیں؟'' میں نے فیصل کو پیغام بھیجا تھا۔

''ہاں، ہوں تو گھر پر مگر ذرا مصروف ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، آپ مصروف رہیں، مجھے بلال سے ملنے کے لیے آنا ہے ویسے بھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ سے بھی کام ہے مگر اس پر بعد میں بات کریں گے۔''

''بلال کا ٹیوٹر آیا ہوا ہے، ایک ڈیڑھ گھنٹے میں چلا جائے گا، اگر آپ اتنا انتظار کر سکتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسے بھیج دیتا ہوں۔'' اس کا جواب آیا تھا۔

''نہیں کوئی جلدی نہیں، میں دو گھنٹے کے بعد آجاؤں گی۔''

"گریٹ۔ تب تک تو میں بھی فارغ ہو جاؤں گا۔" اس کا پیغام آیا۔

"میں نے آپ کو بتایا ہے کہ مجھے بلال سے کام ہے۔" میں نے اسے خوش فہمی سے نکالا۔

"شام کو میری گاڑی کی خوشی کی پارٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے میری بات کو نظر انداز کر کے پیغام بھیجا۔

"پہلے میری پارٹی ہوگی اس کے بعد دیکھیں گے۔"

"جیسی جناب کی مرضی۔" اس کے پیغام کے بعد ایک اسمائلی۔ پیغام آیا۔

☆☆☆

جب تک میں مہتاب سے بات کر رہی ہوں۔ [illegible] بعد اتنا کا پیغام بھیج کر میں نے دل میں سوچا اور اس کی کال ملانے سے پہلے میں نے کیمرے والی ایپ آن کر لی تھی [illegible] تھا۔ باری، باری سب کیمرے چیک کر لیے تھے۔ وہ گھر پر نہیں نظر آ رہا تھا۔ کافی بار گھنٹی بجنے کے بعد اس نے فون اٹھایا تھا، اس کی آواز کافی خمار آلود تھی۔

"مہتاب تم سو رہے تھے کیا؟" سلام دعا کے بعد میں نے سوال کیا۔

"نہیں...... ذرا مصروف ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔ اب اس کی آواز سنبھل گئی تھی۔

"کہاں مصروف ہو؟" میں نے لگاوٹ سے سوال کیا۔ "کسی فلم کا سیٹ ہے یا کوئی اور مصروفیت؟"

"نہیں، میں گھر پر ہی ہوں...... کوئی اسپانسر آئے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ میٹنگ ہے۔" اس کے کہنے پر میں نے پھر سارے کیمرے باری، باری تبدیل کر کے دیکھے کہ کہیں کوئی کیمرا مس نہ گیا ہو اور وہ مجھے نظر نہ آ رہا ہو۔ سب کیمرے تو اپنی، اپنی جگہ پر تھے مگر وہ اپنی جگہ پر نہ تھا اور نہ صرف منظر سے غائب تھا بلکہ وہ چٹا سفید جھوٹ بول رہا تھا۔

"شکر ہے کہ تم گھر پر ہو......"

"کیوں، کیا میں پہلے کبھی گھر پر نہیں ہوتا جو تم نے میرے گھر پر ہونے پر شکر ادا کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"کم ہی ہوتے ہو تم گھر پر۔"

"اتنا آوارہ تو نہیں ہوں میں مایا۔" وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسا تھا۔

"میں اس وقت بہت پریشان ہوں مہتاب"

"کیا پریشانی ہے جان مہتاب"

"یاد ہے تمہیں کہ پچھلی دفعہ جب میں کراچی آئی تھی تو تمہاری فلم کے پریمیئر پر میں نے اپنا ڈائمنڈ ایک سیٹ پہنا تھا، اب اس سیٹ کا ایک ٹاپس نہیں میرے جیولری باکس میں، اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں، پلیز ذرا بیڈ کی دونوں سائڈ ٹیبل اور لاؤنج چیک کر کے بتا دینا۔" مجھے اس سے بات کرتے یہ ترکیب سوجھی کہ میں اسے ٹیسٹ کروں۔

"اس وقت تو میٹنگ میں مصروف ہوں یار ابھی فوری چیک نہیں کر سکتا۔" اس نے جواباً کہا "ایک گھنٹے تک ان لوگوں سے فارغ ہو جاؤں گا، اس کے بعد [illegible] چیک کر لوں گا۔"

"ایک [illegible] بہت [illegible] ہے، مجھے پہلے ہی [illegible] ہو رہی ہے۔" میں نے لہجے کو اداس کرتے کہا۔ "میں ایک گھنٹا [illegible] کر کے مر جاؤں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتی ہو جان...... اچھا مجھے چند منٹ دے دو، میں ان لوگوں کو فارغ کر دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں کیمرے بدل، بدل کر دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں ہولڈ کر رہی ہوں۔"

"فون بند کر دو جان، میں دوبارہ کال کر کے بتا دوں گا تمہیں......" اس نے جیل وجت کی۔

"نہیں مہتاب جانی، تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنی پریشان ہوں، میں فون پر ہولڈ کر کے ہی انتظار کر رہی ہوں۔" میں نے فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا اور ایپ کے ذریعے اسے دیکھنے کی منتظر تھی۔ دو منٹ میں ہی وہ باہر سے اپنے فلیٹ کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا، اس

نے جاگنگ والے پاجامے پر بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کا جھوٹ ثابت ہو گیا تھا، میں سمجھی تھی کہ وہ گھر میں کسی ایسی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے جو میرے کیمروں کی زد میں نہیں ہے لیکن وہ ابھی داخلی دروازے سے اندر آیا تھا۔ وہ تو بڑا ٹپ ٹاپ رہنے والا بندہ تھا، گھر پر بھی ہر وقت اچھے حلیے میں ہوتا تھا، اس لباس اور حلیے میں وہ گھر سے باہر کہاں اور کیونکر جا سکتا تھا، ایسی کیا ایمرجنسی تھی کہ اسے سونے کے لباس میں گھر سے نکلنا پڑا تھا۔

''وہاں تو نہیں ہے...... میں نے بیڈ روم کے علاوہ، لاؤنج، کچن، باتھ روم اور ڈریسر کے سارے دراز بھی چیک کر لیے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ مجھے اس کے جواب کا پہلے سے علم تھا، میں اسے یہ سب کرتے ہوئے کیمروں کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور ٹاپس ملتا بھی کیونکر، وہ ٹاپس تو میرے پاس تھا۔

''اچھا، سوری تمہیں زحمت دی، شاید میرے ہی سامان میں کہیں ہو گا......'' میں نے پریشانی والے لہجے میں کہا۔ ''میٹنگ ختم ہو گئی تمہاری؟'' میں نے لہجہ بدل کر سوال کیا۔

''نہیں...... ابھی بیٹھے ہیں سب لاؤنج میں۔ کچھ وقت لگے گا ابھی، میں میٹنگ سے فارغ ہو کر تمہیں کال کرتا ہوں۔'' کہتے، کہتے وہ دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔ ''بائے جان۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرا سارا جسم سن ہو گیا تھا، وہ مجھے کتنا بڑا دھوکا دے رہا تھا، جھوٹ بول رہا تھا مگر کیوں؟ اتنی جلدی اور اس حلیے میں وہ کہاں سے آیا تھا اور چند منٹوں میں واپس کہاں اور کیوں گیا تھا...... اس کے لیے مجھ جیسی عورت کو کسی راکٹ سائنس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا اس کی میٹنگ وہاں چل رہی تھی؟ میں نے سوچا مگر خود ہی سوال کیا کہ کیا میٹنگ اس حلیے میں ہوتی ہے؟

☆☆☆

''آپ آ جائیں، بلال کے ٹیوٹر چلے گئے ہیں اور میں بھی فارغ ہوں۔'' فیصل کا پیغام آیا تھا۔

''سوری فیصل، میرے سر میں درد ہو رہا ہے پھر کبھی سہی۔'' میں نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا۔

''اوہو۔ بلال تو آپ کے آنے کا سن کر ہمیشہ کی طرح بہت خوش ہوا تھا اور باہر جانے کو تیار بیٹھا ہے۔'' اس کے پیغام کے ساتھ اداس چہرے کا اسٹکر آیا تھا۔

''سوری فیصل...... اس سے میری طرف سے معذرت کر لیں۔'' میں نے پھر پیغام بھیجا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

''آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں ڈاکٹر مایا۔'' دروازے پر گھنٹی بجی تھی، دروازہ کھولنے پر فریم میں اس کا چہرہ سجا نظر آیا۔

''میں خود بھی ڈاکٹر ہوں فیصل صاحب اور جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' میں نے کوشش کی کہ لہجہ تلخ نہ ہو۔

''شاید باہر نکلنے سے آپ کی حالت بہتر ہو جائے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کچھ اور نہ سہی، بلال کی خوشی کی خاطر اور اپنی تبدیلی آب و ہوا کے لیے......''

''میں تھوڑی دیر آرام کرتی ہوں پھر بہتر محسوس کیا تو بتاؤں گی، بلال کو مایوس کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے اسے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

پانی پیا، اس کے بعد اپنے لیے ایک کپ چائے بنا لی، ایک بسکٹ پلیٹ میں کپ کے ساتھ رکھا اور ایک سکون آور دوا کی گولی۔ چائے پی کر اور دوا کھا کر بھی دل کی بے چینی کم نہیں ہو رہی تھی۔ بار، بار خیال آتا رہا کہ مہتاب کسی عورت کے ساتھ ہی ہو گا، تو کیا وہ عورت گھر سے اتنی قریب ہے کہ...... خیال کوبیتا کی طرف جاتا بھی تو میں جھٹک دیتی، اسے مہتاب بہن کہتا تھا۔ وہ بھی ایک عام شکل صورت کی عورت تھی، میرے ساتھ اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا اور پھر وہ ایسی احسان فراموش بھی نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر میں کوئی اور عورت ہو۔ سوچتی اور الجھتی جا رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی کوبیتا کے گھر میں کوئی میٹنگ ہو رہی ہو...... یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہاں فقط وہ اور کوبیتا ہوں مگر کچھ ایسا ویسا نہ ہو، وہ کسی نئی

فلم کے مکالموں کے بارے میں میٹنگ کر رہے ہوں۔
میں نے مثبت سوچتے ہوئے، صوفے پر ہی لیٹ کر گہری سانس لیے اور سوچنے لگی کہ کیا کروں۔ بالآخر اٹھی کہ شاور لے کر تیار ہو جاؤں۔

شاور کے دوران بھی یہ خیال دماغ سے گیا نہیں ...... یہ فیصل شاید کویتا کے بارے میں کچھ جانتا ہے، اس نے کئی بار اشاروں کنایوں اور بات چیت میں ایسا کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے جو کہ مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ کویتا کے بارے میں ایسی منفی رائے کیوں رکھتا ہے...... اس سے کسی وقت پوچھوں گی، شاید کھل کر کچھ بتا دے۔

☆☆☆

"آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے مایا؟" فیصل نے ہولے سے پوچھا تھا۔ بلال اپنے کھانے کے انتظار میں ریسٹورنٹ میں دیوار پر آویزاں ٹیلی ویژن اسکرین پر نظریں جمائے کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔

"ہوں؟" میں اپنے خیالات سے چونک گئی تھی۔

"کچھ پوچھا آپ نے؟" مجھے صرف یہ اندازہ ہوا تھا کہ اس نے مجھے ڈاکٹر مایا نہیں، صرف مایا کہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کیا کہا تھا، وہ میں واقعی نہیں سن سکی تھی۔

"آپ ذہنی طور پر یہاں نہیں ہیں۔" اس نے سوال کیا۔ "پریشان ہیں، کیا بات ہے؟"

"ہوں......" میں نے سینے کی گہرائی سے سانس کھینچی۔ "کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں آپ کے چہرے کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہ سر درد کس وجہ سے ہے۔"

"آپ کو میرا چہرہ پڑھنا کب سے آ گیا ہے؟" میں نے درشتی سے کہا۔ "اور کیوں؟"

"ہم ہمسائے بھی ہیں مایا اور دوست بھی۔"

"میں اس پر یقین نہیں رکھتی، ہم صرف ہمسائے ہیں۔"

"کسی کی خوشی میں خوش ہونے والا اور تکلیف میں پریشان ہونے والا، فقط ہمسایہ نہیں ہوتا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور ہر دوستی منفی تعلق کی علامت نہیں ہوتی۔"

"سو تو ہے......" کھانا آ گیا تھا، ویٹر نے ہمارے سامنے کھانا لگا دیا تھا۔ "کھانا کھائیں۔ بلال بیٹا، آپ بھی ٹی وی دیکھنا بند کریں اور کھانا کھائیں۔"

"بات نانا اچھی طرح آتا ہے آپ کو۔" وہ ہنستا تھا۔

"کچھ بات ہے ہی نہیں تو میں ٹالوں گی کیا۔"

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا، بلال کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہم بار بار ہنس دیتے تھے۔ سوچا بھی کہ اس سے پوچھوں مگر ظاہر ہے کہ اس ماحول میں اور بالخصوص بلال کے سامنے تو اس طرح کی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی، اشارے، کنایے میں، نہ کھل کر۔

"بلال آپ سے بہت محبت کرتا ہے، آپ کا احترام بھی کرتا ہے اور آپ کے سامنے بہترین آداب کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ جب آپ سے ملاقات ہونی ہو تو اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے سب سے بہترین کپڑے پہنے۔" فیصل بتا رہا تھا۔

آجاؤ

لوگ کہتے ہیں
کہ
بہار آئی ہے
پر مجھے تو
چاروں اور پت جھڑ کا
اور
جدائیوں کا موسم نظر آتا ہے
اس لیے
میرا دل ہر دم
یہی کہتا ہے
کہ
تم آؤ تو
بہار آ جائے
دل بے قرار کو
اسی لیے قرار آ جائے

مرسلہ: نصیرہ آصف خان ملتان

"پاپا...... جھوٹ نہ بولیں، آپ کو بھی یہی فکر ہوتی ہے کہ مایا آنٹی کے ساتھ باہر جانا ہے تو سب سے اچھے کپڑے پہنتے ہیں، ٹھیک طرح استری کر کے اور اچھا سا پرفیوم لگا کے...... آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آپ کتنی پریکٹس کرتے ہیں مایا آنٹی سے باتیں کرنے کی۔" اس کی مداخلت اور معصومانہ بیان سے میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"نہیں مایا آنٹی، میں گھر پر جا کر کھا لوں گا......" وہ اٹھ گیا اور میری طرف آیا۔ "تھینک یو۔" میرے قریب آ کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ "سوری، بچے اپ والے منہ سے آپ کو پپی نہیں دے سکتا۔"

"بلال......" فیصل نے اسے تنبیہ کی تھی، میں مسکرا دی۔

☆☆☆

"بچے، من کے سچے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"چپ کر کے کھانا کھاؤ، شیطان کے چیلے۔" فیصل نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے گھرکا۔

"مایا آنٹی کہتی ہیں، بچوں کو شیطان نہیں کہنا چاہیے کیونکہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی سب سے پیاری چیز ہیں۔"

"بالکل درست کہا بلال نے......" میں نے ہنس کر اس کی تائید کی۔

"او کے بابا، معاف کر دو یار، اب جلدی سے اور دھیان سے کھانا کھاؤ۔"

"اگر آپ کے خیال میں بچے اتنی ہی اچھی چیز ہیں تو آپ کے بچے کیوں نہیں ہیں مایا آنٹی؟" اس کے سوال نے مجھے لاجواب کر دیا تھا، مجھے اپنے چہرہ شرمندگی سے تپتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری مایا۔" فیصل نے فوراً کہا تھا۔ "بیوقوف ہے، اسے نہیں پتا کہ کیا بات کرنی چاہیے اور کیا نہیں۔"

"کوئی بات نہیں، آپ زیادہ معذرت نہ کریں، مجھے علم ہے کہ وہ بچہ ہے اور معصوم ہے۔"

"کھانا جلدی ختم کریں بلال...... آپ کو علم ہے کہ مایا آنٹی کے سر میں درد تھا اور وہ صرف آپ کی وجہ سے آئی ہیں۔" اس نے بلال کو گھرکا۔

"بس اب مزید بھوک نہیں ہے پاپا، میرا کھانا پیک کروا لیں۔" اس نے فیصل کے لہجے کی درشتی کو محسوس کر لیا تھا اور کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

"آپ کھانا ختم کر لیں بلال، ہم انتظار کر لیتے ہیں بیٹا۔" میں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔

"آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے فیصل؟" میں نے اسے پیغام بھیجا تو جواب میں اس کی کال آ گئی۔

"ابھی، اس وقت؟" اس نے سوال کیا۔ "خیریت ہے مایا......؟" اس نے گھبرا کر بغیر سلام دعا کے کہا۔

"ہوں...... خیریت؟" میں نے جواب میں لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"اتنی رات گئے آپ کا پیغام، بیپ سے میری آنکھ کھلی اور پیغام پڑھ کر میں پریشان ہی ہو گیا۔" اس کا لہجہ نیند اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"سوسوری......" میں نے وقت دیکھا اور شرمندہ ہو گئی، صبح کے تین بج رہے تھے، میں اس وقت تک جاگ رہی تھی اور کروٹیں بدل رہی تھی۔ "مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کیا وقت ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ ابھی تک سوئی ہی نہیں؟" اس کے سوال میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سوتے میں کسی وجہ سے آنکھ کھل گئی ہو......"

"آپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ اب تک جاگتی رہی ہیں، کیا بات ہے مایا، کیوں نیند نہیں آ رہی؟"

"ہوں......" میں نے گہری سانس لی۔ "بس ایسے ہی ایک چھوٹی سی بات کی پریشانی تھی۔"

"ابھی ملنا چاہتی ہیں آپ؟" اس نے سوال کیا۔ "میں آ جاؤں؟"

"ارے نہیں، ہرگز نہیں...... کسی بھی وقت جب آپ فارغ ہوں، تنہا ہوں۔" میں نے جواباً کہا۔ "کوئی ایمرجنسی نہیں۔" مجھے رات کے اس پہر اس کے

اپنے گھر آنے کے تصور سے ہی پھریری سی آ گئی۔

"آپ کا رات بھر جاگنا اور پریشانی میں یوں پیغام بھیجنا، یہ ایمرجنسی ہی ہے مایا۔ اس وقت نہ سہی، میں سویرے، سویرے۔" کسی خیال کے تحت وہ رکا۔ "آج اسکول سے چھٹی ہے، میں بلال کو کرانے کلاس میں چھوڑنے کے بعد واپس آپ کی طرف آؤں گا۔ ایک گھنٹا ہوگا ہمارے پاس اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت ممکن ہے مجھے کوئی اچھا سا ناشتا بھی مل جائے، آپ سے ملاقات کے بعد میں بلال کو لینے چلا جاؤں گا۔"

اس کے لہجے میں بشاشت تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے ریلیکس کرنے کو جان بوجھ کر ایسا کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے..... اس کے بعد یوں بھی میری کام والی آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ میری بھی چھٹی تھی اور فیصل کا تو اپنا کام تھا سو وہ چھٹی کرے یا نہ کرے، اس کی مرضی۔

"اب آپ کوشش کریں کہ تھوڑا سا سو لیں۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

اس سے بات کرنے کے بعد بھی میں دیر تک جاگتی رہی تھی۔

صبح کی چہل پہل اور باہر کی آوازوں سے خود ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ سات بج رہے تھے، شاید دو تین گھنٹے نیند کی ہوگی۔ کسلمندی سے بستر سے اٹھی، نیند پوری نہ ہونے کے باعث سر درد بھی شروع ہو گیا تھا۔ ابھی مجھے جلدی سے کوئی ناشتا بھی بنانا تھا، کہا تو فیصل نے مذاق سے تھا مگر کچھ آداب میزبانی بھی ہوتے ہیں، یوں بھی میں نے تو ناشتا کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

"مجھے....." کچھ کہتے، کہتے میں رک گئی۔ "مجھے مہتاب کی طرف سے عجیب سی پریشانی... بلکہ الجھن ہے۔" بمشکل میں نے اپنا فقرہ پورا کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ میرا اس کے بارے میں احساس غلط ہو، مجھے لگا کہ کسی سے بات کرلوں گی تو شاید کوئی مشورہ مل جائے گا، کوئی بہتر توجیح۔"

اس سے بات کرتے ہوئے مجھے انتہائی تکلیف بھی ہو رہی تھی کہ میں اپنے اور مہتاب کے رشتے کا بھرم کھو رہی تھی مگر دنیا میں اس کے سوا میرے پاس اور کون تھا، جس سے میں بات کرتی۔ ماں باپ رہے نہیں تھے، بھائیوں اور بھابیوں سے سوائے گھر اور والدین کی دولت کی تقسیم کے، کسی مسئلے پر نہ بات ہوتی تھی اور نہ ہی میرے اور ان کے بیچ ایسا تعلق تھا کہ ان سے دل کی بات کہہ سکتی۔ اس نے کہا تھا کہ ہم دوست ہیں تو میں نے اسے فوراً جھٹلا دیا تھا مگر حقیقت یہی تھی کہ مجھے اس کے سوا اپنا کوئی ایسا ہمدرد نظر نہیں آتا تھا جس سے میں اپنے مسئلے کے بارے میں بات کرتی۔

پچھلے چند دنوں میں مہتاب نے صبح شام کالیں اور محبت بھرے پیغامات بھیجنا شروع کر دیے تھے اور اس کے یوں اچانک محبت بھرے پیغامات اور کالوں کے جواب میں جب میں کیمرا آن کر کے چیک کرتی تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں بتا رہا ہوتا تھا، وہ جھوٹ ثابت ہو رہا ہوتا تھا۔ کبھی کہتا کہ گھر پر ہوں اور کیمرا کہہ رہا ہوتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں۔ کبھی کہتا کہ گھر پر نہیں تو اس وقت وہ گھر پہ ہوتا تھا اور تنہا بھی نہیں ہوتا تھا۔ کوئی نہ کوئی گھر میں اس کے ساتھ ہوتا تھا..... عموماً لڑکیاں..... کبھی کبھار کوئی لڑکا بھی نظر آتا تھا۔

اس کی یوں اچانک اور وافر کالوں نے ویسے بھی میرے کان کھڑے کر دیے تھے۔ بقول ڈاکٹر عفت کہ جب مرد کے دل میں چور ہوتا ہے تو وہ بیویوں کو زیادہ لفٹ دینا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کو شک نہ ہو۔ نہ صرف ڈاکٹر عفت کا ایسا کہنا تھا بلکہ ان کے شوہر نے اس کے ان الفاظ کو مستند کر دیا تھا۔

"چلیں آپ نے کہا تو میں نے خود کو معتبر سمجھ لیا، آپ کسی سے بھی بات کر لیتیں تو آپ کو کوئی مشورہ مل جاتا، بقول آپ کے۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے مجھے دوستی کے قابل سمجھا اور سوچا کہ کسی دوست سے دل کی بات کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، دوست سے کوئی مخلصانہ مشورہ مل جاتا ہے مگر کسی "کوئی" کی

حیثیت سے ہی سہی، آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔''
''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے فوراً کہا۔
''آپ بھی جانتے ہیں کہ میں آپ سے بہت سی ایسی باتیں بہ آسانی کہہ لیتی ہوں جو کہ میں کسی اور سے شاید نہ کہہ سکوں...... اور آپ کی بہت سی باتیں سن بھی لیتی ہوں جو کہ میں شاید کسی اور سے نہ سن سکوں...... بس ایک دوست کا لفظ مجھے عورت اور مرد کے بیچ اچھا نہیں محسوس ہوتا۔'' میں نے وضاحت دی۔
''کیا پریشانی ہے؟'' میری بات کے جواب میں اس نے سوال کیا۔ ''سی ایم صاحب کی صحت کا کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' اس نے اپنی پلیٹ میں سلائس اور آملیٹ رکھتے ہوئے رک کر میری طرف دیکھا۔
''اصل میں اس پریشانی میں مجھے......'' میں رکی، آواز بھرا گئی۔ ''مبتلا بھی آپ نے ہی کیا ہے۔'' میری آنکھیں لبریز ہونے لگیں، میں نے رخ پھیر لیا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح کہوں کہ کم سے کم برا لگا ہو۔
''میں نے؟'' حیرت سے اس نے اپنا سینڈوچ پلیٹ میں رکھ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''میں نے آپ کو پریشانی میں مبتلا کیا ہے؟'' اس کی آواز تھوڑی بلند ہو گئی تھی۔ ''میں نے کیا، کیا ہے؟''
''آپ پہلے ناشتا کریں پلیز۔'' میں نے آنکھوں کے گوشوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر صاف کیا۔ ''بعد میں بات کرتے ہیں۔''
''میں اس طرح ناشتا نہیں کر سکتا مایا کہ آپ کی آنکھوں کے کٹوروں میں آنسو بھرے ہوئے ہوں اور بند توڑنے کو تیار بیٹھے ہوں، مزید یہ کہ آپ کہہ رہی ہوں کہ جس پریشانی نے آپ کو رونے پر مجبور کر دیا ہے اس کا ذمے دار میں ہوں، آپ اپنے مسئلے کے لیے مجھے قصوروار قرار دے رہی ہوں۔'' اس نے رسان سے کہا، اس کی تشبیہات اور استعارے، لکھاریوں کے پاس الفاظ اور تشبیہات کی کوئی کمی تو نہیں ہوتی۔
''سوری فیصل صاحب۔'' میں نے اپنے حلق میں بہنے والے آنسوؤں کے گولے کو نگلا۔ ''آپ پہلے ناشتا کر لیں پھر بات کرتے ہیں۔''
''اتنا وقت نہیں ہے مایا، نہ ہی میں یہاں صرف ناشتا کرنے آیا ہوا ہوں۔ رات کے جس پہر پریشانی کے عالم میں آپ نے مجھے کال کی، وہ پریشانی اس طرح نظر انداز کرنے والی ہرگز نہیں کہ میں اسے بھول کر ناشتے میں مگن ہو جاؤں۔'' وہ رکا۔ ''بہرحال آپ بات کریں ساتھ، ساتھ میں ناشتا کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا سینڈوچ اٹھایا۔ میں نے چائے کا کپ بنا کر اسے تھمایا، اپنے لیے بھی چائے بنا کر میں نے اپنے سامنے رکھ لی۔
''مہتاب مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔'' میں نے ادھوری سی بات کی۔
''کس سلسلے میں جھوٹ بول رہا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''کہیں گاڑی والی بات کو لے کر کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''
''کون سی گاڑی؟'' میں نے اس کے سوال کے جواب میں اسے دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔
''اچھا چلیں چھوڑیں پھر... اگر گاڑی خرید و فروخت کے سلسلے میں ہونے والی ڈیل کی بابت آپ کو علم نہیں...... آپ بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے؟''
''پہلے آپ بتائیں کہ گاڑی والی کیا بات ہے؟'' میں نے اصرار کیا۔ اس کی ادھوری بات نے میرے اندر تجسس پیدا کر دیا تھا۔
''کچھ ایسا خاص نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں سمجھا کہ آپ کو معلوم ہوگا، سی ایم صاحب نے بتایا ہوگا، اصل میں میں نے آپ والی گاڑی خریدی ہے اور اس کی قیمت میرے بجٹ سے زیادہ تھی تو... میں نے اپنی گاڑی بیچ کر اس گاڑی کی قیمت کا کچھ حصہ سی ایم صاحب کو ادا کیا ہے جو سی ایم صاحب نے مجھے بیچی ہے۔ کافی رقم کم تھی تو انہوں نے سخاوت اور دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، مجھے کہا کہ میں ان کی اگلی فلم کے آئیڈیا کے لیے کہانی لکھ دوں اور اس کہانی کے عوضانے کے طور پر گاڑی کی بقایا قیمت ادا ہو جائے

گی۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا......'' میں نے کہا۔ ''اگرچہ مہتاب نے مجھے یہ سب کچھ نہیں بتایا مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی نے گاڑی بیچی اور آپ نے خریدی ہے، آپ سے وہ کس طرح ڈیل کرتا ہے وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ آپ سے رقم لے یا اس کے عوض کہانی، اس سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں۔''

''اچھا تو پھر کیا مسئلہ ہے؟'' اس کا ناشتا ختم ہو چکا تھا۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے کہ کیا جھوٹ بول رہے ہیں وہ آپ کے ساتھ اور کیوں...... اس کے بارے میں آپ کو کیوں یقین ہے؟'' چائے کا سپ لے کر اس نے سوال کیا۔ ''اور اس میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس سے منسلک آپ کی پریشانی میں میرا قصور کس طرح ہے؟''

''ایک، ایک کر کے سوال کریں فیصل صاحب۔'' میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ اندر اتنا درد تھا کہ مسکراہٹ بھی لبوں تک نہیں پہنچ پائی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ سی ایم صاحب آپ کو cheat کر رہے ہیں؟'' اس نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

''ہوں...... کیا؟'' اس کے سوال نے مجھے ایک دم بوکھلا دیا تھا، ایسا درست اندازہ لگانے لگا اور اتنا براہ راست وہ ایسا پوچھ لے گا، یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ ''ایسا کیوں سوچا آپ نے، کس بات سے ایسا لگا آپ کو؟''

''کیونکہ یہی وہ واحد بات ہے جس میں آپ مجھے قصوروار کہہ سکتی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا، اگر وہ ایسا کر رہا ہو تو میں آپ کو قصوروار کیوں سمجھوں گی، کیا آپ اسے ایسا کرنے کو کہیں گے؟'' میں نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔

''کیونکہ میں نے اس کی ایسی مصروفیات کی بابت آپ کو بتایا تھا اور سوشل میڈیا پر گردش کرنے والی شمالی علاقہ جات والی تصاویر اور کچھ خبریں، آپ کو دکھائی تھیں اور بتایا تھا کہ کس طرح وہ اپنی کاسٹ کی لڑکیوں کے ساتھ......''

''نہیں، نہیں...... صرف وہ بات نہیں ہے فیصل صاحب۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''تو؟'' وہ چونکا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست ہے، یہی بات ہے جو کہ آپ کو پریشان کر رہی ہے؟''

''آپ کے بتانے کے علاوہ، میں اور ذرائع سے بھی جان گئی ہوں کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔'' میں نے جی کڑا کر کے بات مکمل کی تھی۔

''اور ذرائع؟ کہیں آپ کی اس دوست، کوبتا نے تو نہیں بتایا آپ کو؟'' کہتے ہوئے وہ سنجیدہ تھا مگر اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ ''وہی، جس کے ساتھ آپ میری شادی کروانا چاہتی تھیں...... بلکہ اب بھی چاہتی ہیں۔''

''ہونہہ کوبتا مجھے کیا [illegible]ے گی۔'' میں روانی سے بول گئی۔ ''وہ تو خود۔''

''وہ تو خود کیا؟'' اس نے سوال کیا۔

''پتا نہیں فیصل صاحب، مجھے یہ سب باتیں آپ سے کہنا بھی چاہئیں کہ نہیں۔ میاں بیوی کے بیچ کی باتیں کسی سے کہنا کتنا بڑا گناہ ہے، جانتی ہوں مگر اب بوجھ دل پر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ مجھے کسی سے اس کے بارے میں کہنا تو نہیں چاہیے مگر یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کس سے بات کروں آپ کے سوا؟''

''میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے مایا کہ آپ نے مجھے اس دوستی اور اعتماد کے قابل سمجھا، جسے آپ دوستی کا نام بھی نہیں دینا چاہتیں۔'' اس کے لہجے میں تشکر تھا۔ ''آپ بے فکر ہو کر کہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، نہ میرا اس دنیا میں کوئی رشتہ ہے نہ دوست۔ آپ کو دوست سمجھا تھا تو آپ نے بھی فقط ہمسایہ کہہ کر اس حق سے محروم کر دیا۔ آپ کی کہی ہوئی بات میں کسی کو بتاؤں گا نہ سوشل میڈیا پر اس کی تشہیر کروں گا۔ آپ کھل کر بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے، یہ سمجھیں کہ آپ اپنے دل کا راز کنویں میں پھینک رہی ہیں۔''

''اگر کنویں میں ہی پھینکنا ہے تو کیا فائدہ ہوا، میں تو چاہتی تھی کہ مجھے کوئی مخلصانہ مشورہ دیتے آپ۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کہہ دینے سے آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا، کنویں میں پھینک دینے سے یہ مراد نہیں کہ میں آپ کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دوں گا، اس کا مطلب ہے کہ اس کنویں میں سے کوئی بات کہیں باہر نہیں نکلے گی۔ کوئی آپ کو یہ نہیں کہے گا کہ آپ یا سی ایم صاحب کے بارے میں کوئی بات فیصل یزدانی نے اس سے کہی ہے۔ ہاں، اگر کوئی حل یا مشورہ مجھ ناچیز کے پاس ہوا تو ضرور دوں گا۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سعادت مندی سے کہا۔

''شکریہ فیصل صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ سے بات کرنے میں اعتبار کر سکتی ہوں کہ میرا راز آپ مشتہر نہیں کریں گے۔''

''میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے.....'' اس نے فوراً کہا۔ ''ہاں، جب ہم کوئی دوستانہ بات کر رہے ہوں تو یہ صاحب کا تکلف اچھا معلوم نہیں ہوتا۔''

''عادت نہیں ہے مجھے ایسی بے تکلفی کی، کسی کے ساتھ بھی نہیں۔''

''چلیں بتائیں، کیا بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے، کیسے شک ہوا ہے آپ کو کہ سی ایم صاحب کہیں خدانخواستہ آپ کو دھوکا دے رہے ہیں؟''

''مجھے شک نہیں ہوا ہے، پورا یقین ہے... میں نے کہیں سے سنا نہیں ہے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''کیا یہاں پر سی ایم صاحب نے......؟''

''میں کراچی کی بات کر رہی ہوں، اس شہر کی، جہاں وہ رہ رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ وہاں پر ایسی حرکتوں میں مشغول ہے کہ جو ہمارے رشتے میں دراڑ ڈال رہی ہیں۔''

''وہاں کے بارے میں کون آپ کو ان کے بارے میں خبریں دے رہا ہے، کیا آپ کی کوئی کولیگ آپ کو بتاتی ہے یا سی ایم صاحب کی وڈیوز بنا کر بھیجی ہے جو آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں کو بتا نہیں۔'' میں بے خیالی سے بڑبڑائی۔

''وہ تو شاید اسی تالاب کی گندی مچھلی ہے......''

''تو پھر اور کون ہے، ملکی دنیا کا کوئی فرد؟ ممکن ہے کہ کوئی ایسا فرد آپ کو ان سے متنفر کرنے کی کوشش کر رہا ہو، جس کا آپ دونوں میں اختلاف پیدا کرنے میں کوئی مفاد ہو۔ شاید بات ایسی اور اتنی بڑی نہ ہو جتنی آپ کو بتائی گئی ہو، اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو، ذرا سی بات ہو اور اسے بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا ہو کسی نے۔ ہم رائی کا پربت بنانے کے بھی تو ماہر ہیں۔'' اس نے وضاحت پیش کی۔

''مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا فیصل، کم نہ بڑھا چڑھا کر، نہ رائی نہ پربت...... میں یہ سب کچھ خود دیکھتی ہوں، ہر روز، صبح شام۔'' میں اسے جلدی میں فیصل کہہ گئی تھی۔ ''اپنی ان دو آنکھوں سے۔''

''آپ یہاں ہیں لاہور میں اور وہ کراچی میں، کیا آپ خواب میں یہ سب کچھ دیکھتی ہیں، اسے اپنی آنکھوں سے ہر وقت دیکھنا کیسے ممکن ہے، صبح شام؟'' اس کے سوال میں حیرت تھی اور اس کی نظر میں شک کہ شاید میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں، میں الوژن کا شکار تھی یا میں پاگل تھی۔

''اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں...... میرا مطلب ہے کہ اپنی آنکھوں سے، ان کیمروں کی مدد سے جو آپ نے مجھے منگوا کر دیے تھے۔'' میں نے رک کر گہری سانس لی۔ ''اسی لیے کہا کہ یہ سب آپ کا قصور ہے۔'' میری بات کے ردعمل میں اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ڈاکٹر مایا کی آنکھیں آگے کیا، کیا دیکھیں گی...... یہ سب اور بہت کچھ جاننے کے لیے پڑھیے مارچ میں اس خوب صورت ناولٹ کی چوتھی اور آخری قسط

اِک کسک

سیما بنت عاصم

نیلم نے کہیں پڑھا تھا۔ ”اگر محبت کو امر کرنا ہے تو اس شخص سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤ جسے چاہت کی آخری حدوں تک چاہا ہے۔“ یہ ان وقتوں کی بات تھی جب وہ کالج گرل تھی۔ زندگی کو اس کے درست معنوں میں اس نے پرکھا ہی کب تھا۔ البتہ محبت کا ہر پہلو اسے خلیل جبران کی بدولت ازبر تھا۔ محبت کے کئی پہلو ہیں اور خلیل جبران محبت میں زندہ ہے۔ محبت کا ہر پہلو جبران کے لفظوں میں عیاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ محبت کے جذبے سے آشنائی بہت آگے جا کر ہوئی...... تب اس کے خواب بڑے دلکش تھے۔ ایک آرام دہ، پُرآسائش زندگی اور ایک آئیڈیل جیون ساتھی...... مگر گزرتے وقت نے اسے بتایا کہ خواب، خواہش اور تقدیر میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے۔ زندگی کو ہم حسبِ منشا نہیں گزار سکتے...... گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ انسان کا معیار، ترجیحات، خواہشات اور یہ وہ وقت تھا جب زندگی اچھی طرح اس پر اپنے معنی و مفہوم آشکار کر چکی تھی۔ وقت کی دھوپ سر پر آن ٹھہری تھی۔ اس وقت بھی نیلم کا خیال تھا

کہ محبت تو بس لفظوں میں ہوتی ہے...... مگر پھر اسے واقعی محبت ہوگئی۔

نیلم کی شادی سے زیادہ اس کی رضامندی گھر بھر کے لیے ایک گمبھیر مسئلہ تھی۔ اس نے جیون ساتھی کے نام پر جو آئیڈیل تراش رکھا تھا اس سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ مگر پھر بات محبت پر آن ٹھہری۔ سمجھو کہ پتھر میں جونک لگ گئی۔ عام حالات میں اگر اس کے لیے مڈل ایج مگر با حیثیت چار بچوں کے باپ کا پروپوزل آتا تو وہ بہ یک جنبش ابرو رد کر دیتی ۔ مگر یہ جہانزیب تھا جسے نیلم نے دل کی شدت و گہرائی کے ساتھ چاہا تھا۔ وہ اس کی اب تک کی زندگی کا پہلا عشق تھا۔ اس کے بغیر نیلم کو اپنی زندگی ادھوری اور بے معنی لگنے لگی تھی۔

کبھی کبھی جہانزیب اسے آفس سے پک کرتا، وہ کچھ وقت کینٹین میں ساتھ گزارتے اور پھر جدا ہو جاتے ۔ تب نیلم کے لیے ان ہی لمحات میں زندگی تھی۔ جہانزیب کی دل و ذہن کو منجمد کر دینے والی محبت نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ انہی وقتوں میں اس کی کولیگ عافیہ مرتضیٰ نے یوں ہی چلتے پھرتے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

''ارے بھئی اس بے نام مسافت کا کوئی انت بھی ہے؟'' نیلم کی زندگی عافیہ کے سامنے کھلی کتاب تھی۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے پرکھا تھا۔ دنیا کے لیے اس کا تجزیہ درست ہی ہوتا سو وہ نیلم کو ہر طرح سے سمجھاتی تھی۔ اب بھی نیلم سوچ میں پڑ گئی ...... واقعی اس بے نام مسافت کا حاصل آخر کیا تھا۔ اس موضوع پر تو کبھی کچھ کہا، سنا ہی نہ گیا تھا۔ شومئی قسمت ان ہی دنوں واصف کا رشتہ آیا تھا۔ واصف ایک مقامی کالج میں اکنامکس پڑھاتا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں ...... جدید طرز پر تعمیر شدہ بنگلا، نیو ماڈل کار اور مناسب سیلری تھی مگر نیلم کی ہر سوچ جہانزیب سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔ دل کسی اور کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ شاید وہ پروپوزل بھی رد کر دیتی مگر عافیہ نے کہا۔ ''یہ نیلم کے لیے گولڈن چانس ہے اگر اس نے اس چانس کو مس کر دیا تو بقیہ زندگی انتظار ہی میں گزرے گی...... واصف سے بہتر رشتہ اب اسے نہیں مل سکتا اور نیلم کا دل کہتا، وہ بھراس جا پر خاک ہو جائے جہاں جہانزیب کے قدم پڑتے ہیں۔ یہ عافیہ بھی جانتی تھی۔ تبھی کہا۔

''ارے بھئی اگر وہ کچھ نہیں کہتے تو تم ہی ان سے کہو کہ تمہیں اپنانے کی کوئی راہ نکالیں۔'' یہ بات نیلم کے دل کو لگی...... اور پھر یہیں آکر جہانزیب نے اپنی سابقہ زندگی کی پرتیں کھولی تھیں۔

''میں گاؤں سے شہر آیا تو میرے پاس صرف خواب، خواہشیں اور ڈگریاں تھیں یا پھر میری محبت جو صرف اوائل عمری کی جذباتیت تھی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا قدموں تلے اور نظریں بلندیوں پر سفر کرتی ہیں۔ ایک ہی جست میں آسمان تک جا پہنچنے کی لگن مگر یہ فیصلہ وقت اور قسمت کے ہاتھ ہوتا ہے ...... بہت جلد میں تھک کر ہار گیا۔ بار، بار کی ناکامی...... لیکن اس ناکامی نے مجھے بتایا کہ زندگی کے تلخ حقائق خوابوں اور خواہش کی دنیا سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ من پسند ساتھی کی رفاقت صرف لمحاتی خوشی تو دے سکتی ہے۔ شہر آکر میں نے اک نئی دنیا دیکھی تھی۔ تم یقین کرو کہ میں نے گیارہ سال اچھی نوکری کے لیے ٹھوکریں کھائیں اور ان سالوں میں میرا ایک، ایک خواب ٹوٹ گیا اور میں نے جان لیا کہ زندگی کی اصل حقیقت آسودگی ہے۔ محبت تو بس اک خواب ہے...... سو محبت ہاری میں نے اخبار کے اشتہار پر ایک مال دار عورت سے شادی کر لی۔ سمجھو خود کو کیش کروا لیا...... وہ محبت اب بھی میرے اندر ہے۔ مگر میرے لیے زیادہ اہم یہ ہے کہ میری زندگی بظاہر آسودہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سکون اب بھی مجھے میسر نہیں ...... تو شاید یہ میری محبت کی بددعا ہے سو میں خود کو اس سزا کا اہل سمجھتا ہوں۔ اور یہ تو طے ہے کہ سکون انسان کے اندر نہ ہو تو پھر کہیں نہیں ملتا...... مگر تم جیسی لڑکی کو یہ کہنا فضول ہے ...... کہ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔''

اتنا تو نیلم بھی جانتی تھی...... جہانزیب اپنے بیوی بچوں کے دباؤ میں رہتا ہے۔ اپنی مضبوط حیثیت کے باعث اس کی بیوی نے ہمیشہ اس پر حکومت کی تھی۔ پھر اولاد نے بھی اسے وہی مقام دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا تھا...... اور یہ ہی ہوتا ہے۔

اولاد قد برابر ہو جائے تو مرد کمزور پڑ جاتا ہے۔ اور جب جہاں زیب نے کہا۔

''میں نے تمہیں دل کی تمام شدت و گہرائی سے چاہا ہے لیکن میں تمہیں اپنا نہیں سکتا...... یہ میری مجبوری ہے تم شادی کرلو...... تم دیکھنا، تم بہت جلد بھول جاؤ گی کہ تم نے کسی کو چاہا تھا۔'' نیلم کو لگا جیسے اب تک کا سفر لا حاصل تھا...... یہ نیلم کی جہاں زیب سے آخری ملاقات تھی اور پھر نیلم نے اس محبت کا باب بند کردیا۔ زندگی جہاں زیب کی اپنی تھی، اس لیے فیصلے کا اختیار بھی اسے خود حاصل تھا مگر محبت کو مصلحت کی نذر کردینا بھی محبت کا ایک پہلو ہے...... جبران نے کہا۔ ''تم جسے چاہو اسے آزاد چھوڑ دو...... اگر وہ لوٹ آئے تو وہ تمہارا...... اور اگر نہ لوٹے تو سمجھ لینا کہ وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔'' ایک وقت تھا کہ جبران اسے ازبر تھا...... اب وہ وقت نہیں رہا تھا...... مگر جبران آج بھی اس کے اندر تھا...... اور شاید ایسے ہی وقتوں کے لیے جبران ہی نے کہا تھا۔

''اس خوشی سے دور رہو جو کل کو غم کی کائنات بن کر دکھ دے......'' سو نیلم نے بھی اس درد سری میں پڑے بغیر کہ واصف نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تھی۔ اس سے شادی کے لیے عندیہ دے دیا...... جب وہ نہیں تو کوئی بھی سہی...... گویا......

something is better then nothing

☆☆☆

ایک اور جگہ جبران نے کہا...... ''کس قدر نادان ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ محبت مدتوں ساتھ رہنے سہنے اور مسلسل دوستی کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ حقیقی محبت دو روحوں کے باہمی ملاپ کے ایک لمحے میں مکمل نہ ہو تو...... پھر اس کی تکمیل ایک سال میں ہو سکتی ہے، نہ ہی ایک صدی میں۔'' شاید نیلم اپنی سابقہ محبت پر دھول ڈال ہی دیتی اگر واصف نے اسے چاہت کا کوئی خاص احساس بخشا ہوتا۔ واصف سے شادی اس کے لیے کوئی خوشگوار تجربہ نہیں...... ایک خاموش سمجھوتا تھا۔ مگر وہ خود کے لیے اور آنے والی نئی زندگی کے لیے پُر امید ضرور تھی۔ اس نے نئی زندگی کے لیے کوئی بڑے، بڑے خواب نہیں دیکھے تھے ہاں مگر چاہت کی تمنا ضرور تھی۔ واصف، ایک بھرپور جیون ساتھی تھا مگر اس کے ساتھ میں چاہت کی مٹھاس محبت کا رچاؤ یا حدت نہ تھی۔ بس جیسے اس کی زندگی میں ہر چیز ایک روٹین کے تحت تھی۔ ایک بیوی کی سی ہوگئی۔ واصف کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا...... گی بندھی زندگی ایک روٹین کے تحت گزارتا...... کم بولتا، گھر میں ہوتا بھی تو اپنے میں گم...... اپنے مشاغل میں مصروف...... شگفتگی و لطافت تو جیسے اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی...... کبھی، کبھی نیلم سوچتی یہ کیسا آدمی ہے جو کبھی چڑتا نہیں...... غصہ، ضد یا اختلاف نہیں کرتا...... جھیل کے ٹھہرے پانیوں کا سا جامد رویہ...... جس میں نرمی و ٹھنڈک تھی...... اور نیلم نے بہت جلد اس کے مزاج کو پرکھ کر اس سے سمجھوتا کرلیا۔

کبھی اس نے زندگی کے لیے بڑے خواب دیکھے تھے۔ یہ اور بات کہ پورا ایک بھی نہیں ہو سکا تھا۔ شاید اسی لیے کسی دانشور نے کہا ہے کہ خواب دیکھیے ضرور دیکھیے...... مگر یہ یاد رکھیے کہ قسمت کو آپ کے خوابوں سے کوئی سروکار نہیں...... سو اس نے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیے تھے۔ وہ شادی کے اولین دن تھے جب اس کا دل چاہتا وہ واصف سے بہت کچھ شیئر کرے، وہ لانگ ڈرائیو یا واک پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آپس میں باتیں کرتے دور نکل جائیں...... مگر اب اس نے واصف کے مزاج سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ کچھ چیزیں انسان کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں اور کچھ سے وہ از خود اپنے آپ کو دستبردار کرلیتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی بات تھی۔ ان کی رفاقت ایک دوسرے کے لیے بوجھ نہ تھی...... اور نیلم کے لیے یہی کافی تھا۔

☆☆☆

اس نے سنا تھا کہ عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی۔ یہاں معاملہ الٹ تھا۔ اس کے شوہر واصف کے دل میں اب بھی اپنی پہلی اور آخری محبت

نازنین کی یادگار دیا جاتا تھا۔ اس کا ادراک نیلم کو اس روز ہوا جب واصف کی اسٹڈی سے متصل حجرے سے مقفل اسٹوڈیو کے دروازے کی چابی اس کے ہاتھ لگی۔ وہ شادی کے ابتدائی دن تھے۔ نیلم معمول کے کام نمٹا کر واصف کی اسٹڈی میں نئی و پرانی کتابیں کھنگالتی یا کسی بھٹکی ہوئی روح کے مانند بنگلے میں یہاں سے وہاں چکراتی پھرتی۔ اسے یہ جانتے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے کہ واصف کے مزاج میں آرٹ رچا بسا تھا...... آرٹ سے وابستہ ہر شے سے اسے لگاؤ تھا۔ فن مصوری سے لے کر بانسری کی تان تک۔ ایک روز نیلم نے واصف کے ذاتی سامان میں پرانی بانسری بھی دیکھی اور تبھی اسے پتا لگا واصف کو بانسری کی مدھر دل میں اتر جانے والی لے سے عشق تھا۔ بانسری کی دھنیں اسے تسکین دیتیں۔ اس کی ہارڈ کے ڈیش بورڈ تک میں بانسری کی دھنوں سے بھرپور البم اور میوزیکل کلیکشن تھے۔ نیلم اب جان چکی تھی کہ واصف کے اندر اس کا ماضی...... اس کی سابقہ محبت اب بھی سانس لیتی ہے۔ اور جبران نے ہی تو کہا۔ ”جو لوگ خاموشی سے ہر بات برداشت کر لیتے ہیں۔ ان کے بارے میں طے ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہے۔“ نیلم اس کا ماضی کھنگال رہی تھی۔ اور اسی سے عقب سے آ کر واصف نے اسے جالیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ... واصف منکر ہوگا مگر یہ واصف تھا۔ اس نے بہت سادگی سے اعتراف بھی کر لیا کہ نازنین اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ جیسے کچھ چیزیں نادیدہ ہونے کے بعد باوجود ساتھ، ساتھ چلتی ہیں۔ اس کے لیے نازنین کی محبت بھی ایسا ہی ایک الیوژن تھی۔ اسی اسٹوڈیو میں واصف کے مشاق و ہنرمند ہاتھوں کی تخلیقات کے درمیان نازنین کا پورٹریٹ اتنا واضح اور جامع تھا جیسے ابھی وہ بول ہی پڑے گی اور وہ سنگی مجسمہ جسے واصف نے نازنین کا نام دیا تھا۔ وہ واقعی نازنین تھی...... سنگ مرمر سے تراشا ہوا ایک حسین و دلکش پیکر جس میں اسی اسٹوڈیو میں آویزاں نازنین کے پورٹریٹ کی شبیہ واضح ہو کر جھلملا رہی تھی۔ واصف کے خیال میں نازنین ایک سرپھری اور سرکش لڑکی تھی جس نے واصف کے دل سے کسی کھلونے کی طرح کھیل کر اسے توڑ دیا تھا...... وہ اب بھی ماضی کے گزرے لمحات میں زندہ تھا مگر کبھی کسی کو اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ وہ کیسے کہتا اور کس سے کہتا کہ اس کے اندر تو نازنین کے نقوش اب بھی منجمد ہیں جو وقت کی دھول سے دھندلا ضرور گئے تھے مگر مٹ نہ سکے۔ اس کی زندگی میں بظاہر وہ کہیں نہ تھی مگر آج تک نازنین کی محبت اس کے دل میں زندہ و جاوید تھی۔ واصف نے اسی رات بانسری کی لے پر مشہور زمانہ گیت اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں...... سنایا تو بانسری پر مشاقی سے تحرک اس کی انگلیاں مضطرب سی تھیں۔ وہ ایک جذب سے آنکھیں بند کیے بانسری لبوں سے لگائے اس اداس اور غمگین کر دینے والے گیت کی تان اٹھا رہا تھا تو اس کا چہرہ اس کے اندرونی کرب کا غماز تھا۔

بانسری کی تان پر رقص کرتی گہری، چاند اور دل میں اتر جانے والی اداسی بیڈروم میں چکرانے لگی تھی اور ان ہی لمحات نے نیلم پر منکشف کیا تھا کہ واصف کے دل میں اب بھی نازنین کی محبت زندہ و جاوید تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ نازنین کون تھی...... اور پھر کیا واصف جیسے لوگ بھی محبت کر سکتے ہیں؟

مگر یہ واصف تھا جو کبھی کھل کر نہ دیتا تھا...... اس ناکام محبت کے پس منظر میں کیا اسرار تھا۔ یہ نیلم بھی نہ جان پاتی...... اگر آگے جا کر اس حقیقت کے اسرار در تہ اس پر منکشف نہ ہوتے چلے جاتے۔

☆☆☆

وہ ایک سرراہ ملاقات تھی جس نے واصف اور نازنین کو یکجا کیا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی، واصف کے اعتراف کے بعد سے اب تک نازنین، نیلم کے حواسوں پر سوار تھی۔ اور اسی ہفتے عرصہ بعد اتفاقاً نازنین اور واصف کا ٹاکرا ہوا تھا۔ نازنین کی بابت بتاتے ہوئے واصف کا لہجہ لرز رہا تھا۔

''تم اگر اسے دیکھو تو خالق کی صناعی پر اش، اش کرو اٹھو...... وہ آج بھی اتنی ہی حسین ہے، جتنی سالوں پہلے تھی۔ وقت تو لگتا ہے اسے بس چھو کر گزرا ہے...... میں بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آئندہ زندگی میں کبھی وہ مجھ سے مل بھی سکے گی۔'' نیلم دم بخود رہ گئی تھی۔

اگلی شام وہ یزدانی ہاؤس میں مدعو تھے، واصف نے اپنی کار یزدانی ہاؤس کے سامنے ایک درخت تلے پارک کی تھی۔

وہ ایک دیو قامت صدر دروازہ تھا۔ جس کی ریلنگوں میں سالوں کی مٹی پڑی تھی۔ سیاہ رنگ اپنی تازگی کھو چکا تھا...... بڑے پاپا کے نام کی نیم پلیٹ دھندلی پڑ چکی تھی۔ یزدانی ہاؤس میں قدم رکھتے ہی واصف کی نظروں میں وقت کی دھول چبھنے لگی تھی۔ ایک سال، دو سال، دس سال، جانے کتنے سال گزر گئے تھے۔ وہ تو اب یزدانی ہاؤس کو جاتا راستہ بھی بھول بیٹھا تھا۔

سامنے اندر کو جاتی بجری کی روش لان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ لان اپنی تازگی و آب و تاب کھو چکا تھا۔ کبھی یہاں چار سو نظروں کو تراوٹ بخشتا سبزہ پھیلا نظر آتا تھا۔ اب وہ منظر گم ہو چکا تھا۔ جا بجا سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے' اونچی، اونچی خودرو گھاس اپنی ناقدری پر نوحہ کناں تھی۔ اوائل سرما کی خنکی زدہ یہاں سے وہاں تک بکھری تھی۔

دور، دور تک پھیلا انتشار و بے ترتیبی...... بے توجہی و بے نیازی یزدانی ہاؤس کے مکینوں کا وتیرہ کبھی نہ تھی۔ صبح نور کے تڑکے جاگنے والے بڑے پاپا جاگنگ کے بعد سارے لان پر گراس مشین پھیرتے تھے جانے کہاں، کہاں سے خوش وضع پودے اور اعلیٰ النسل پرندے منگواتے تھے اب پام اور سرو کے اونچے، اونچے درخت تلے لان کی عقبی دیوار سے لگا بڑا سا پنجرہ ویران تھا۔ اچھلتی، پھدکتی چڑیوں کی چہچہاہٹ جانے کب گم ہو گئی تھی۔

صدر دروازے سے اندر جاتے راستے میں سرخ بجری کی روش عبور کرتے واصف کی نظریں یہاں سے وہاں تک سفر کر رہی تھیں۔ اور ماضی کے کتنے گم گشتہ لمحات تازہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اک عجیب سی کیفیت مزاج پر حاوی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ساتھ چلتی نیلم بھی دم بخود تھی۔ وہ واصف کے اسٹوڈیو میں اس کے ہاتھ سے بنی پینٹنگز اور لینڈ اسکیپ میں یزدانی ہاؤس کے مناظر نہ دیکھ چکی ہوتی تو شاید بار ہا قدم ٹھٹکتے مگر یہاں سب کچھ تصاویر جیسا تھا۔ شناسا اور اپنا، اپنا سا...... کچھ بھی تو اجنبی نہ تھا مگر واصف کو نیلم فراموش ہو گئی تھی۔ ہر قدم پہ وہی مناظر اور اس سے جڑی یادیں...... احساسات۔ بائیں جانب چند قدم پر چوں چوں کرتا بڑا...... جھولا...... جو بڑے پاپا نے نازنین کی فرمائش پر منگوایا تھا۔ بارش کے موسموں میں کن من پھوار پڑتی تو سارا لان نکھر جاتا۔ نازنین اسی جھولے پر بیٹھی لمبی، لمبی پینگیں لیتی اور بڑے سارے کچن میں ماسی کیا خوب مزیدار پکوڑے اتارتی تھی۔ لان کے داہنی جانب سوکھا تالاب جس کا کائی زدہ پانی ٹھہر کر سوکھ گیا تھا کبھی اس تالاب کے وسط میں سفید براق فوارہ تھا، اس فوارے کا تسلسل سے ابلتا رواں پانی جانے کب ٹھہر گیا تھا۔ اسے یاد تھا انہال نے تالاب کے اطراف لوہے کی کانٹوں بھری باڑھ میں ست رنگے برقی قمقمے جڑ رکھے تھے۔ فوارے سے پھوٹتی آبی لڑیوں پر رنگین روشنیاں پڑتیں تو فضا میں رنگ برنگے موتی سے بکھر جاتے، اسی تالاب کنارے رنگین چھتری تلے بید کی کرسیوں کے درمیان رکھی سینٹر ٹیبل پر شام کی چائے یا شطرنج کی بازی لگتی۔ وہیں کہیں اسٹیچو آف لبرٹی جیسا کوئی مجسمہ بھی نصب تھا۔ اب جس کے نقش بگڑ چکے تھے۔

اوائل سرما کی ڈھلتی شاموں کی تمام تر خنکی وجود میں سنسناہٹ دوڑا رہی تھی۔ اور یاد کے کئی لمحات آس پاس چکرا رہے تھے۔ کبھی یہاں زندگی تھی، اب دور، دور تک سناٹا، ویرانی اور اجاڑ پن تھا۔ لان کا وہ گوشہ ویران ہو چکا تھا جہاں کسی درخت کے تنے پر واصف نے اپنے اور نازنین کے ناموں کے ابتدائی حروف ابھارے تھے۔ کئی خوشگوار لمحے تھے جب واصف'

نازنین کو ٹیوشن دیتا تھا۔ جہاں موسم رنگ بدلتے تھے۔ وہیں ان کا عشق پروان چڑھتا تھا۔ گرما کی دھوپ دیر سے ڈھلتی وہ بید کی کرسیاں اٹھا کر پام اور سرو کے درختوں تلے رکھ لیتے۔

ہاکر شام کا اخبار اچھال کر جاتا تو سیدھا واصف کی گود میں آکر گرتا.... کبھی پٹ سے اس کے منہ پر آکر لگتا تو نازنین لبوں پر اپنے دودھیا ہاتھ رکھ کر ہنستی۔ لاکھ اس کو دکھایا جاتا کہ گیٹ پر ایک جگہ بنی ہوئی ہے مگر.... واصف جھنجلا جاتا کبھی خود بھی ہنس دیتا۔ واصف چند قدم بڑھا کر ہنسی کے جیسے قریب ٹھہر گیا۔ ایک سال، دو سال، جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اور لگتا تھا کہ کل کی ہی بات ہے۔ جیسے ... کا کوئی ... کھل اٹھا تھا۔ ہنسی کے کئی لمحات زندہ ہو کر سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

"تم ایک ... لڑکی ہو، مجھے نہیں لگتا کہ تم ایف اے میں ... ہو سکو گی...." ہنسی کے ... لمحات سے ایک بازگشت گونجی تھی۔

"اُف! یہ اکنامکس کی موٹی موٹی کتابیں میرے سر میں درد کر دیتی ہیں۔"

"پڑھائی چور، پاسنگ مارکس لے کر اگلی سیڑھی چڑھتی ہو، شرم نہیں آتی؟"

وہ سچ مچ پڑھائی چور تھی۔ پڑھائی کے نام پر سوتی بن جاتی۔ اچھلتی، کودتی بھاگ جاتی یا صاف کہہ دیتی...."میرا موڈ نہیں ہے"، تب اسے یاد دلانا پڑتا۔

"پڑھو گی نہیں تو پوزیشن کیسے آئے گی، بھول گئیں.... اسپورٹس کار کا انعام....؟" اور وہ جھٹ، پٹ مان جاتی۔ بڑے پاپا نے اس سے پوزیشن کا وعدہ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ پاسنگ مارکس لے کر پاس ہوتی اور پھر روتی۔ ایسے ہی لمحات میں واصف نے اس کی نوٹ بک میں لکھا تھا۔

"though you stumble off never be down cast,try and try again, you will win at last" مگر وہ دو جمع دو سے بڑھ کر فیشن کی رسیا تھی۔ لمبی، لمبی مخروطی انگلیاں کیوٹیکس سے سجی رہتیں۔ شرٹ کا سائز فیشن کے مطابق بدلتا رہتا، مزاج میں ہٹیلا پن، پیسے والوں کی بے فکری اور رویے میں استحقاق وحاکمیت.....

"جب میں نے کہہ دیا تو بس کہہ دیا...." اسے بحث یا انکار پسند ہی نہیں تھا۔ اور ان کے درمیان عمر کا فاصلہ کم تھا تو استاد شاگرد کا رشتہ بنا ہی نہیں تھا۔ ایک بار واصف کے کالج میں فیئر ویل پارٹی تھی اور اس نے تن کر کھٹ سے انکار کر دیا۔

"تم نہیں جاؤ گے"

"واہ، اچھی زبردستی ہے..... اتنی اچھی گیدرنگ مس کروں؟"

"ہاں، کیونکہ کل تمہیں میرے ساتھ فارم سبمٹ کروانے یونیورسٹی جانا ہے، کل لاسٹ ڈیٹ ہے۔"

واصف جانتا تھا، وہ ہر کام وقت پڑنے پر ہی کیا کرتی ہے، ورنہ کمرا بند کیے مزے سے سوئی رہتی ہے اور اس وقت واصف کے لیے اس کی بات سے مفر یا ایک پل کی دوری بھی ناممکنات میں تھی۔ اور ابھی چھوٹی، چھوٹی باتوں نے درمیان محبت کس سے آن ٹھہری کہ پتا ہی نہیں چل سکا۔ ایک بار اس نے کہا۔

"تم میری زندگی ہو...."

نازنین کی جلترنگ جیسی ہنسی گونجی تو جیسے فضا بھی کھلکھلا اٹھی۔

"تمہاری ہنسی کتنی خوب صورت ہے۔ جیسے مدھم مدھم رس کی پھوار...." اگلے ہی پل واصف مبہوت ہو گیا تھا۔

"اور کیا میں خوب صورت نہیں ہوں....؟"

نازنین کی شربتی سحر خیز آنکھوں میں شرارت امڈ آئی۔

"تم خوب صورت ہو، جبھی تو ہنسی خوب صورت ہے۔"

"واہ! یہ عجیب لاجک ہے۔"

"کبھی خود کو میری نظروں سے دیکھو تو تمہیں پتا چلے کہ تم کائنات کی حسین ترین لڑکی ہو۔"

"تم باتیں بہت مشکل کرتے ہو۔"

"محترمہ یہ بھی ایک آرٹ ہے۔"

کے یہ الفاظ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے تھے اور اسے اب بھی یاد تھا، اس روز وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رویا تھا۔ اگرچہ کافی وقت بے یقینی کے حصار میں گزرا۔ جیسے اچانک وہ عقب سے کہیں آ کر اس کے کندھے سے جھول جائے گی اور کہے گی۔

''آئی واز جسٹ کڈنگ ڈیئر...... تم سیریس ہو گئے؟'' واصف کی نظروں میں گزرے وقت کی یادیں کرچیاں چبھونے لگیں۔ کسی نے اسے اٹھا کر سالوں پیچھے پھینک دیا تھا۔ وہ یک دم ہی حال کی دنیا میں واپس آیا تھا۔ اور پھر نیلم اور واصف سرخ بجری کی روش ... عبور کرتے برآمدے تک آئے تھے۔ چند سیڑھیاں طے کر کے برآمدے کا چکنا شفاف شطرنج کے خانوں سا موزیک کا فرش اپنی چمک دمک کھو بیٹھا تھا۔ محرابی دیواروں تلے جھکتے ماربل کے چمکتے دمکتے ستونوں کا اجلا پن ماند پڑ گیا تھا۔ انہی محرابی دیواروں سے بندھی چق کی ڈوری کھینچی جاتی تو ڈھیر ساری دھول سر پر آ گرتی۔ داہنی جانب سیمنٹ کی جالیوں کے اس پار زندگی کے آثار تھے۔ دوسری جانب قطار سے رکھے گروٹن کے بڑے، بڑے چتوں والے ماربل کے گملوں کی مٹی کو سنگریزوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سامنے آبنوسی دروازہ منتظر سا دوا تھا۔ یہیں آ کر مکینوں کو متوجہ کرنے کے لیے اطلاعی گھنٹی بجانی پڑتی۔ برآمدے کا جالی دار دروازہ کھول کر پہلے لاؤنج پڑتا تھا۔ واصف اور نیلم نے ایک ساتھ اندر قدم رکھے تھے اور جیسے کسی نے جادوئی چھڑی گھما کر اسے سالوں پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔

سب کچھ وہیں کا وہیں اور جوں کا توں تھا۔ ہر چیز پر وقت کی دھول پڑ گئی تھی۔ مگر لگتا تھا جیسے وقت گزر کر بھی نہ گزرا ہو...... لاؤنج میں یہاں سے وہاں تک سبز مخملیں نظروں کو ٹھنڈک دیتا گہرا سبز کارپٹ وسط میں دبیز ایرانی قالیچہ...... چھت کے وسط میں جھولتا تاریک فانوس، داہنی دیوار پر گھڑیال کے پنڈولم کی جگہ ڈانسنگ چینی گڑیا کی... کمر ادھر اُدھر لچکتی تھی۔ کارنس پر سجے بلوریں ایش ٹرے میں پورا گلستان آباد تھا۔ اور یہ سب ان دنوں کی سوغاتیں تھیں۔ جب بڑے بھائی جی نے اِک عرصہ ایران میں گزارہ تھا۔ سامنے ماں جی اور بڑے پاپا کے دو الگ، الگ کمرے تھے، ماں جی کو اس وقت بھی دنیا سے کٹ کر رہنا گوارا نہ تھا۔ برابر والے کمرے میں بڑے پاپا اسٹڈی کرتے یا گراموفون پر سدا بہار گیت سنتے۔ ان کی شخصیت میں بڑا دبدبہ تھا، ڈائننگ کی بڑی ساری چیئر سنبھالتے تو یزدانی ہاؤس کے دیگر مکینوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ لیفٹیننٹ کرنل ریٹائر ہوئے تھے اور دم آخر روٹین لائف پر قائم رہے۔

داہنی جانب اٹالین کچن اور اس کے برابر اوپر منزل کو جانے والے زینے کے اختتام پر گھر بھر کے لیے کمرے ہی کمرے تھے، بائیں جانب ڈرائنگ روم، لاؤنج کے اختتام پر باہر کو جاتا لاؤنج کا دوسرا دروازہ...... باہر گیلری میں کھلتا تھا اسی لاؤنج کی ایک جانب بڑے پاپا کی پالتو مینا کا سنہری پنجرہ...... جو اپنی زبان میں میٹھی میٹھی باتیں کرتی ...... واصف انہی لمحات کے ٹرانس میں تھا جب یہاں زندگی کوکتی تھی۔ یک دم جی چاہا کہ وقت کی چرخی الٹی گھوم جائے۔ سب کچھ پہلے کی طرح اجلا، نکھرا اور صاف و شفاف ہو جائے۔ کیا وقت تھا جب یزدانی ہاؤس میں چہکاریں گونجتی تھیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہاں سے وہاں تک زندگی، رونقیں اور چہل پہل تھی۔

لاؤنج میں رکھے کارنس پر پڑے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو بجتی چلی جاتی...... سنتا کون تھا اور ان ہی در و دیوار پر اب اداسی بال کھولے سو رہی تھی۔ نیم تاریکی میں لپٹا خاموش و دبیز سناٹا...... ایک، ایک کر کے سب گم ہو گئے۔ ساری چہکاریں ماند پڑ گئیں۔ پھر دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں...... لاؤنج کے دوسری جانب کھلتے دروازے سے دو نفوس کی آمد اور واصف کے اسٹوڈیو میں سجے مجسمے میں جیسے جان پڑ گئی۔

لاؤنج کے پچھلے دروازے سے سفید چکن کے بے داغ لباس میں گھنی پلکوں اور ساحر آنکھوں والی حسینہ...... اجڑے، بکھرے حلیے میں چہرے پر وحشت

کے آثار لیے نیم پاگل شخص کی چیخیں پکڑے اسے قابو کرنے کو، کوشاں اس کے پیچھے تھی۔

"عالم، اسٹاپ...... اسٹاپ عالم...." ایک مدھم سُریلی آواز ابھری تھی۔ اور فضا میں گھنٹیاں سی بجتی چلی گئیں۔ وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا واصف اور نیلم کے قریب سے گزرتا چلا گیا تھا اور وہی سرو قد حسینہ اس کے تعاقب میں اسے وارن کرتی چلی۔

"یہ نازنین ہے۔" واصف نہ بھی کہتا تو نیلم سمجھ گئی تھی۔ سرتاپا چاندنی میں ڈوبا وجود، دودھیا رنگت، شربتی سی آنکھیں، ریشم کے تاروں جیسے سنہری اور زرد بال، ہری گھنی بھویں اور خم دار پلکیں...... کائنات کا سارا حسن جیسے اس کی شخصیت میں سمٹ آیا تھا۔ نیلم ایک نظر میں اس سے مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے منظر سے نکل جانے کے بعد ماحول میں اندھیرا سا اندھیرا رہ گیا تھا۔ پھر منظر بدلا...... سفید جھک بالوں اور دلکش نین نقش والی ضعیف خاتون آسمانی ہاؤس گاؤن میں ملبوس وہیل چیئر چلاتی آ رہی تھیں۔

نیلم کی چشم تصور میں بے ساختہ نانی جیسی کا مرکزی کردار ابھرا تھا۔

"کون آیا ہے؟" انہوں نے آنکھیں چندھیا کر ہاتھ کا چھجا بنایا۔ "واصف......" ان کے لہجے میں ممتا جیسی... رلاہٹ تھی۔ "واصف ہو ناں...... اور یہ تمہاری دلہن......"

"ماں جی......" اگلے ہی پل واصف تڑپ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھے۔

ماں جی نے جھریوں بھرا لرزتا ہاتھ ان کے سر پر آ ٹھہرا۔

"ایک نہ دو، جانے کتنے برس گزر گئے، میں تو اب شمار بھی بھول گئی۔ کیا وقت تھا کہ یزدانی ہاؤس میں آوازیں اور چہکاریں گونجتی تھیں...... کبھی یہاں زندگی کوکتی تھی۔ سب کچھ کھو گیا...... بکھر گیا...... یزدانی ہاؤس اجاڑ، ویران ہو گیا۔ جانے یہ کسی کی بددعا ہے کہ ہماری بدنصیبی......" ان کا دھیما لہجہ گلوگیر تھا۔ واصف نے ان کی گود میں منہ چھپا لیا۔

"مجھے آپ کے ہاتھ کا پان کھانا ہے ماں جی...... یہ ہے ناں آپ اپنی ڈال کر دیا کرتی تھیں...... اور ہاں...... رنی حسینہ بھی یاد ہے ناں آپ کو...... مجھے یقین ہے اب میں آپ سے جیت سکتا ہوں۔"

ان کی میڈ نے عقب سے آ کر ان کی وہیل چیئر تھامی تھی اور وہ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔ پھر ماں جی یزدانی ہاؤس کے مکینوں اور ان سے وابستہ یادیں اور یادگاریں کھنگالتے ہوئے نیلم کو سب سے متعارف کرواتی رہیں۔

"کبھی یہاں زندگی رقص کرتی تھی۔ میرے بچوں کی چہکاریں تھیں ایک، ایک کر کے سب چلے گئے یزدانی ہاؤس...... کھنڈر بن گیا...... تب ایک روز میں نے اپنے ہاتھوں سے پنجروں میں قید پرندوں کو آزاد کر دیا۔" ماں جی کی آنکھوں میں ڈھلتی شام کی ساری سرخی اتر آئی تھی۔ ماں جی کی تمام اولادیں اعلیٰ عہدوں

زندگی

☆ زندگی کو ضروریات میں رکھو، خواہشات کی طرف مت لے جاؤ کیونکہ ضروریات فقیروں کی بھی پوری ہوتی ہیں اور خواہشات بادشاہوں کی بھی باقی رہ جاتی ہیں۔

☆ زندگی میں ہمارے ساتھ چلنے والا ہر شخص اس لیے نہیں ہوتا کہ ہم ٹھوکر کھا کر گریں اور وہ ہمیں سنبھال لے۔ ہاتھ تھام کر گرنے سے پہلے یا بازو کھینچ کر گرنے کے بعد بعض لوگ زندگی کے اس سفر میں ہمارے ساتھ صرف یہ دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں کہ ہم کب، کہاں اور کیسے گرتے ہیں۔ لگنے والی ٹھوکر ہمارے گھٹنوں کو زخمی کرتی ہے یا ہاتھوں کو...... خاک ہمارے چہرے کو گندا کرتی ہے یا کپڑوں کو۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

پر قائز بیرون ملک مقیم تھیں۔ مگر یزدانی ہاؤس سے ان
کی گزری عمر کی یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں کے چپے،
چپے سے انہیں محبت تھی۔ وہ اس کے قرب و جوار میں
دفن ہونا چاہتی تھیں۔

نازنین اس بار لوازمات سے بھری ٹرالی سمیت
آئی تھی۔ اور جیسے منظر میں ایک بار پھر جان پڑ گئی۔ یک
دم سارا ماحول جگمگا اٹھا تھا۔ نیلم نے دیکھا...... وہ واقعی
نازنین تھی۔ کائنات کی شاید سب سے حسین لڑکی......
سنگ مرمر سے تراشا ہوا دلکش پیکر...... جس میں خود کو گم
کر دینے والی جاذبیت تھی۔ نازنین سراپا ماں جی کی
شبیہ تھی۔ وہی مطلق نین نقش، خال و خد وہی بڑی، بڑی
ساحر آنکھیں، گھنیرے کھلے بالوں اور سفید بے داغ
لباس میں وہ کوئی اداس اپسرا محسوس ہو رہی تھی۔ نیلم
نے ایک نظر میں جانچ لیا۔ عمر کی شام ڈھل رہی تھی۔ کمر
پر بہتے سنہری آبشار میں جا بجا سرخ لہریں
تھیں...... ماحول میں اوائل سرما کی خنکی ٹھہری ہوئی
تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو میڈ نے آ کر لاؤنج کی وسط
میں جھولتا فانوس اور دیواروں میں نصب چھوٹے،
چھوٹے آرائشی لیمپوں میں لگے بلبوں کو روشن کر دیا۔

چار سو جگمگاہٹ پھیل گئی۔ سافٹ ڈرنک کے
سپ لیتے ہوئے واصف کی نظریں اٹھی تھیں۔ ڈرائنگ
روم کی مغربی دیوار پر گیلری کی جانب کھلتی کھڑکی کے
اوپر واصف کے ہاتھ سے بنی پینٹنگ اب بھی آویزاں
تھی۔ وہ پینٹنگ نہیں، اِک یادگار تھی یا کوئی ٹھہرا ہوا
خواب لمحہ...... جسے واصف نے رنگوں میں ڈھال دیا
تھا۔ ہیروں کا نازک سا تاج سر پر سجائے، سیاہ لبادے
میں وہ کوئی نو عمر پرنسس تھی۔ جس کے لبوں پر مدھم
مسکراہٹ تھی۔ اگر سالوں پیچھے سفر کیا جائے تو اس
پرنسس میں نازنین کے نین نقش ابھرتے تھے۔ ایک
گھٹنے کو زمین پر ٹکائے اطالوی انداز میں جھکا پرنس اس
کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا تھا۔ پرنس کا چہرہ غیر نمایاں
تھا۔ مگر وہ واصف تھا گویا مونا لیزا کا تخلیق کار خود مونا
لیزا میں چھپا تھا۔

صاف ستھرے آبنوس کی لکڑی اور سفید نائلو سے
آراستہ جگمگاتے کچن کا منظر ڈرائنگ روم سے واضح
تھا۔ نوجوان میڈ کی پھرتیاں قابلِ دید تھیں اس نے ڈنر
کی تیاری میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ میوزیکل البم کی
تصاویر ختم ہونے پر ڈنر لگنے کی نوید منتظر تھی۔ اتنا کچھ اجڑ
اور بکھر جانے کے بعد بھی یزدانی ہاؤس کا طور طریقہ اور
رکھ رکھاؤ سلامت تھا۔

وہ لمحات بہت خوابناک سے تھے۔ ماحول میں
جادو سا تیر رہا تھا۔ بیضوی جہازی سائز ڈائننگ ٹیبل
کے وسط میں شمع دانوں میں جلتی مدھم روشنی میں نازنین
اداس، خاموش اور مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔ واصف
اس سے کہنا چاہتا کہ تم اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہو
جتنی سالوں پہلے تھیں۔ کیا تم اب بھی کمرا بند کر کے
سونے کی عادی ہو اور یہ کہ...... سنو تمہاری آنکھوں
میں آج بھی وہی سحر ہے مگر اس کی شخصیت میں اب
ٹھہراؤ اور تدبر آ گیا تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا تھا جب
درمیان میں صرف ایک سینٹر ٹیبل ہوتی تھی۔ اور یزدانی
ہاؤس کا چپا، چپا ان کی محبت کا گواہ تھا۔ انہی وقتوں میں
ڈائننگ ٹیبل کے سفید پوش کی کناروں پر سہ رنگی نفیس و
حسین کڑھائی ماں جی نے خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔
سفید براق کلف دار نیپکین سرخ و سفید مہکتے گلابوں کا
دستہ کرسٹل کے نفیس و نازک گلدان میں نازنین نے
اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ گولڈن کناری والی نفیس سفید
کراکری ترتیب وار سجی تھی۔ سلاد کے پتوں سے آراستہ
پلیٹیں اور سرخ و سبز اشرفیوں سے سجی مٹھاس کے ڈونگے
میڈ بید کی چھوٹی سی ٹوکری میں چیک دار پوش میں لپٹے
تل کے گرم نان رکھ کر گئی تو چاندی کی منقش قابوں کے
ڈھکن اٹھتے ہی ڈائننگ لاؤنج میں اشتہا انگیز خوشبو
چکرانے لگی تھی۔ اور کچھ دیر بعد فضا میں صرف گولڈن
کٹلری کا شور رہ گیا۔

میڈ نے ماں جی کو چکن کارن سوپ میں سلائس
بھگو کر کھلایا تھا۔ پھر واصف کی آمد کی خوشی میں ایک
کباب چکھنے کی بھی اجازت مل گئی۔ نازنین نے ماں جی

کے معمولات کا بڑا سخت شیڈول ترتیب دے رکھا تھا، کھانے پینے میں بھی تمام ممنوعہ چیزوں پر کڑا پہرہ اور پابندی تھی۔ ڈنر تمام ہونے تک ماحول میں صرف خاموشی چکراتی رہی تھی۔

نازنین کو آج بھی یاد تھا۔ واصف دودھ والی چائے کے بجائے قہوے میں لیموں نچوڑ کر پیتا ہے۔ ڈنر کے بعد وہ لیمن ٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نازنین ایک ٹرے میں کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ تکلف سیمنٹ کی جالیوں کے اس پار زنجیروں سے بندھے نیم دیوانہ شخص کے لیے تھا۔ میڈ ڈائننگ ٹیبل سمیٹنے لگی اور واصف عقب سے بے جی کی چیئر تھام کر انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔ میڈ نے بے جی کے سامنے چاندی کا بڑا سا گول منقش پاندان رکھ دیا۔ وہ سب کے لیے خوشبودار گلوریاں بنا رہی تھیں اور واصف ان کی نظر بچا کر چپکے سے نکل گیا۔ پھر جب وہ لاؤنج کے ایک گوشے میں دیوار پر لگی پیتل کی بڑی ساری گول طشتری، جس پر زمانہ قدیم کے شاہی دربار کا کوئی منقش منظر ٹھہرا ہوا تھا، پر نظریں جمائے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ فضا میں سگریٹ کا گاڑھا مہکتا دھواں پھیل رہا تھا۔ جب اچانک نازنین جیسے کوئی جنگ لڑ کر لوٹی تھی۔ واصف نے گڑبڑا کر دونوں ہاتھوں سے دھواں منتشر کیا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ماں جی نیلم کو دیوانے کی بابت بتا رہی تھیں۔

''شاہ عالم ایک روایتی جاگیردار تھا۔ جدی پشتی رئیس، جو چاہتا ہر قیمت پر حاصل کر کے چھوڑتا...... جانے اس نے نازنین کو کہاں دیکھا تھا۔ مگر وہ سیدھی راہ سے اسے نہیں اپنا سکتا تھا۔ یہ وہ خود بھی جانتا تھا۔ ایک روز اس نے راہ چلتے نازنین پر ہاتھ ڈال دیا پھر کچھ وقت بعد اسے چھوڑ بھی دیا۔ اس کے بعد نازنین کا دعوے دار بن کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس نازنین سے نکاح کے جعلی کاغذات تھے۔ تب تک اس واقعے کی اتنی دھول اڑ چکی تھی کہ نازنین کو اسی کے سنگ بیاہ دینے میں یزدانی ہاؤس کی ناموس کی بقا تھی اور شاید یہی اس کا مقصد تھا۔ مگر شاہ عالم جیسے لوگ رب کے خوف سے.... بے نیاز ہوتے ہیں، دنیا کچھ بھی کہے مگر میں شاہ عالم کی آج کی حالت کو رب کی پکڑ سمجھتی ہوں......'' نازنین کی آمد پر ماں جی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

پھر لاؤنج میں بے جی اور واصف کے درمیان تاش کی بازی جمی تو وہ دونوں لان میں نکل آئیں جہاں ایک قطار سے لوہے کی لمبی، لمبی راڈ پر لگی پیتل کی گولڈن چھتناریوں میں نصب مدھم نیلگوں لائٹس جگمگا اٹھی تھیں۔ یہاں سے وہاں تک نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نازنین نے سبز مخملیں گھاس کے ساتھ چلتی منڈیر پر چپلیں اتاریں تو نیلم نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ پھر وہ دیر تک نرم مخملیں گھاس پر شبنمی سبزے کی تراوت خود میں اتارتی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہیں۔ سوکھے پتے ان کے پیروں تلے چرمراتے رہے تھے اور وہ جو نیلم کا خیال تھا کہ نازنین کوئی تنک چڑھی، بد دماغ سی لڑکی ہوگی، کسی کونے کھدرے میں منہ چھپا کر پڑ گیا۔ فضا میں خنکی سی اتر آئی تھی۔ لان کے نیم تاریک ماحول میں ایک خوابناک طلسم پھیلا ہوا تھا۔ دور کہیں سفیدے کی باڑھ میں جھینگر گاتے، گاہے بول اٹھتے تو جیسے زندگی کا احساس جاگ اٹھتا۔ پھر وہی سناٹا کہ سرو اور پام کے اونچے، اونچے درختوں تلے لگی بینچ پر نازنین کے ہمراہ بیٹھ کر بالآخر نیلم کہہ اٹھی۔

''دنیا میں ہر چیز تھوڑی بہت کوشش سے مل سکتی ہے۔ لیکن گہری اور سچی محبت صرف اور صرف قسمت سے ملتی ہے۔ آپ کو نہیں لگتا کہ واصف کی شفاف محبت گنوا کر آپ نے زندگی کا سب سے بڑا خسارہ خریدا تھا؟''

نازنین نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ کچھ خسارے قسمت میں درج ہوتے ہیں اور کچھ انسان اپنے ہاتھوں سے لکھتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی خسارہ ہے مگر ہر محبت کا انجام ملن نہیں۔ کبھی، کبھی اپنے ہی ہاتھوں محبت، مصلحت کو دان کرنی پڑتی ہے۔ کبھی، کبھی کوئی چھوٹی سی بات کسی بڑے فیصلے کا محرک بن جاتی ہے۔ واصف اس وقت

ٹیوشنز پڑھا کے اپنی پڑھائی کا خرچ اٹھاتا تھا۔ اس وقت اس کے پاس صرف خواب تھے.. یا ٹیلنٹ اور ملک میں ٹیلنٹ کیا بھاؤ بکتا ہے تمہیں بتانے کی ضرورت تو نہیں......''

''آپ انتظار بھی تو کرسکتی تھیں؟''

''اسے خود کو اسٹیبلش کرنے میں وقت درکار تھا۔ ایک جوان خوب صورت لڑکی کہاں تک رشتے رد کرتی......اور کتنا انتظار کرتی۔ دو سال، چار سال بالآخر مجھے ہارنا ہی تھا......سو میں نے دستبرداری کا فیصلہ کرلیا۔''

''کیا آپ کو نہیں لگتا ہے کہ اس طرح آپ نے خود اپنے ساتھ بھی زیادتی کی تھی؟'' نازنین نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''تم نہیں جانتیں، ہم دونوں کے مابین اسٹیٹس کی دیوار تھی۔ یزدانی ہاؤس کے مکین اس سے محبت تو کرسکتے تھے اسے اپنا نہیں سکتے تھے۔ واصف آسمان کو چھو کر بھی آجاتا تو اس پر مڈل کلاس کا ٹھپا تھا۔ واصف مجھے بھگا کرلے جاسکتا تھا، سیدھی راہ سے اپنا نہیں سکتا تھا اور جب میں نے اس حقیقت کا ادراک پالیا بھی سے گریز کی راہ اپنائی۔''

''مصلحتوں میں دل شکنی پہلی بار ہی ہے، محبت میں اعتماد اولین شرط ہے۔ جب آپ محبت کی مسافت میں ہم قدم تھیں تو دستبرداری کا فیصلہ تنہا کیوں؟''

''اس وقت واصف میری مجبوریوں سے سمجھوتا کر بھی جاتا تو اس کے دل میں میری محبت کا دیا جلتے ہی رہنا تھا۔ مجھے اس محبت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔ میں اس سے اسے روٹھ کرتی تو وہ ہمیشہ میرا منتظر یا میرے تعاقب میں رہتا یا پھر خود کو فنا کرلیتا۔ محبت سے دستبرداری اتنی سہل نہیں ہوتی۔ مجھ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا۔''

''کیونکہ آپ خود بھی آج تک واصف کی محبت میں گرفتار ہیں...... ہے ناں......'' نیلم نے بروقت نازنین کا جملہ پکڑا تھا۔ وہ گڑبڑا گئی......اگلے ہی پل اس کا ہاتھ تھام کر نظریں چرائی تھیں۔

''جانے بھی دو، گئے وقتوں کی راکھ کرید کر کیا حاصل......؟ خنکی بڑھ رہی ہے، اندر چلتے ہیں۔'' نیلم کے ہاتھ میں نازنین کے گداز ہاتھ کا لمس نم ہو چلا تھا۔ مگر وہ اس لمحے پر گرفت رکھ کر نازنین سے سچ اگلوانا چاہتی تھی۔

''آپ بچ رہی ہیں نازنین۔'' اس بار...... رعب حسن سے ایک پل نیلم کی زبان ذرا لڑکھڑا گئی تھی۔

''سچ تو یہ ہے کہ آپ آج بھی واصف سے اتنی ہی گہری اور شدید محبت کرتی ہیں۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ نازنین کی کلائی پر اس کی گرفت سخت پڑگئی۔ وہ ہار کر سنگی بینچ پر ڈھیر ہوگئی۔

''تم نے ٹھیک جانا، یہ محبت اب بھی اک داغ کی صورت میرے اندر موجود ہے، ایسا داغ جو بس کسک دیتا ہے، اذیت نہیں......واصف کی محبت کی شدت و گہرائی نے ہمیشہ مجھے اسیر رکھا پھر شاہ عالم تک اس کی آنچ کیسے نہ پہنچتی......میری زندگی کا اصل آزار یہ رہا کہ جسے چاہا اسے پا نہیں سکی اور جسے پایا اس کی چاہت سے محروم......شاید یہ واصف کی بددعا یا اس سے زیادتی کا صلہ تھا۔ میں اس کی دلآزاری پر بھی خود کو معاف نہ کرسکی۔ ہاں، تم نے ٹھیک جانا......میں آج بھی اس محبت پر قائم ہوں...... شاہ عالم بھی میرے اندر چھپی اس محبت کو پا گیا تھا۔ اسی لیے بھی میری محبت نہ پاسکا۔ اور نہ ہی مجھ پر بھروسا کرسکا۔ پھر اس کی پابندیوں نے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ اس جیسے لوگ کیا جانیں، محبت کو حاصل کرلینا خوش بختی نہیں......محبت کو پالینا محبت کی جیت ہے، من پسند ساتھی کی رفاقت صرف لمحاتی خوشی دے سکتی ہے۔ کوئی آپ سے قریب ہو لیکن آپ کا اپنا نہ ہو، یہ انسان کی شکست ہے اور شکست اس کی چڑ تھی۔ اس نے کبھی شکست کی اذیت اٹھائی ہی نہیں تھی۔ وہ ساری دنیا کو ٹھوکر پر رکھتا تھا۔ اس شکست نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری خوب صورتی اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ اس نے میرے وجود کو سگریٹ سے داغا اور سوئیوں

سے چھیدا تک تھا۔" نیلم لرز کر رہ گئی۔

"وہ اِک نفسیاتی مریض تھا پھر یہ مرض پاگل پن بن گیا۔ جانے یہ اس کے جنون کی انتہا تھی یا رب کی پکڑ......" اس نے اک ٹھنڈی سانس لی، یک دم ماحول پر چھایا سناٹا اور دبیز ہوتا چلا گیا تھا۔ فضا میں یہاں سے وہاں تک اِک گہری خاموشی ٹھہر گئی۔ اندر لاؤنج کی دیوار پر نصب گھڑیال نے گیارہ بجائے تو نازنین بے چین ہو گئی تھیں۔

"دس بج گئے ماں جی کی دوا کا وقت ہو گیا، اندر چلیں؟"

نیلم نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"اپنی زندگی وار کر کے آپ خود کو نظر انداز کر رہی تھیں۔ کیا کبھی ایک لمحہ بھی آپ نے خود کے لیے سوچا ہے؟"

"میں نے اپنی زندگی کی کتاب سے خود اپنی ہی ذات کا ورق پھاڑ دیا ہے۔ کبھی تم ماں جی کو غور سے دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ ان جیسے لوگ حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں مگر وقت نے انہیں تو زنگر رکھ دیا ہے۔ وہ خود کے لیے اتنی بے فکر ہیں کہ مہلت بھی پانی کے ہمراہ ان کی ہتھیلی پر رکھنی پڑتی ہے، سمجھو، میری زندگی وہیل چیئر کے ان پہیوں کے گھماؤ میں پھنس کر رہ گئی ہے۔"

"آپ اس بار جھوٹ بول رہی ہیں نازنین......"

نیلم نے اپنے لہجہ لرزتا محسوس کیا۔

"زندگی ایک بار ملتی ہے، اسے بھی سمجھوتے کی نذر کر دینا خود کے ساتھ ناانصافی ہے۔ آپ بہت آسانی سے شاہ عالم سے چھٹکارا پا سکتی ہیں پھر کیوں خود کو اذیت دے رہی ہیں؟"

"بات چھوٹی سہی مگر گہری ہے، جو لمحہ کسی کی یاد میں گزر جائے ضائع نہیں ہوتا، یہ میں نہیں ......اِک معروف قلم کار کہتا ہے۔ محبت کا فلسفہ بہت سیدھا سا ہے، محبت مرد کے لیے ایک لمحہ اور عورت کے لیے ساری حیات ہے اور مجھے بھی اپنے اندر چھپی اس شفاف و گہری محبت کے دیے کو سدا روشن رکھنا ہے، اس نیم پاگل شوہر کے نام کا ٹھپا مجھے ہمیشہ میری محبت کے نام رکھے گا...... ہو سکے تو یہ بات واصف کو مت بتانا......" نیلم ساکت رہ گئی تھی۔ محبت کی الجھی گتھی میں چھپا ان کہا اسرار اسے دم بخود کر گیا تھا۔ کئی لمحے جامد خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"کافی وقت ہو گیا، اب اندر چلتے ہیں۔" نازنین میکانکی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تو نیلم نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کے قدموں میں خفیف سی لرزش تھی۔

☆☆☆

لوٹنے کے وہ شانت سے تھے۔ نازنین انہیں برآمدے تک چھوڑنے آئی تھی۔ برآمدے میں مدھم روشنی تھی۔ چھتوں میں نصب چھوٹے، چھوٹے بلبوں میں جان پڑ گئی تھی۔

"دلآزاری کا جرم بڑا ہوتا ہے۔" نیم تاریکی میں اس کے عنابی کیوٹکس سے سجے دو دودھیا ہاتھ واصف کے سامنے جڑ گئے تھے۔ "گر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" واصف کی نظروں میں عہدِ گزشتہ کی سی یاد نے کرب اٹھایا تھا۔ نازنین کے جڑے ہاتھوں میں لرزش اور ساحر آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی تہ تھی۔ یاد کے نہاں گوشے میں عرصے سے کرلاتے اضطراب کے کسی سلگتے احساس پر جیسے چھینٹے پڑ گئے تھے۔ واصف بے ساختہ دو قدم بڑھا تھا۔ پھر اس نے جڑے ہاتھ کھول کر پلٹا اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتا یز دانی ہاؤس سے نکلتا چلا گیا۔ واصف کے دل سے اپنی تحقیر کا کانٹا نکل گیا تھا۔ اس پریم کہانی میں چھپے ان کہے اسرار کا سرا اب صرف نیلم کے ہاتھ تھا۔ جس پر پردہ پڑا رہنے ہی میں عافیت تھی۔ محبت کو مصلحت کی نذر کر دینا بھی تو عظمت ہے۔

ان دونوں کے دلوں میں اس گم گشتہ یاد کا دیا اب بھی جلتا تھا۔

محبت مختصر ہو پھر بھی
عمر لگتی ہے بھلانے میں

اس نے فرنٹ سیٹ سنبھال کر واصف کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا۔ کار کے پُرسکون ماحول میں بانسری کی دُھن ایک بار پھر مدھم سُر بکھیرنے لگی۔

❁❁❁

مکمل ناول

گلابی پھول اور نیلا پانی

مدیحہ شاہد

استقلال اسٹریٹ پر گہما گہمی اور رونق تھی۔ وہ استنبول کی مشہور و معروف جگہ تھی، صاف شفاف سڑکیں، منظم راستے، دل کو چھو جانے والے نظارے کہ انسان اس سڑک پر چلتے ہوئے اردگرد کی خوب صورتی میں کھو سا جاتا۔

چودھویں کی رات تھی اور ہر طرف روشنیاں جگمگا رہی تھیں، وہ دونوں لڑکیاں ہنستی مسکراتی، بے انتہا خوشی کے انداز میں اردگرد کے نظارے دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ وہ جس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں وہ یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ اس لیے وہ رات کے کھانے کے بعد پیدل ہی وہاں سے ٹاکسم اسکوائر تک آ گئی تھیں۔ وہاں مختلف برانڈز کی دکانیں تھیں، انہوں نے گھومتے ہوئے وہاں سے خوب شاپنگ کی۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ ہم لوگ ترکی کی سڑکوں پر گھوم پھر رہے ہیں اور استنبول کے خوب صورت نظارے دیکھ رہے ہیں۔'' ضویا نے ایک دکان سے باہر آتے ہوئے ایکسائٹڈ ہو کر کہا۔

''خواہشیں یوں بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں.... وسائل ہوں یا نہ ہوں مگر خواہشات کے خزانے بڑھے

رہتے ہیں۔ میں نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ہم یہاں کی سڑکوں پر گھوم رہے ہوں گے اور تاکسم اسکوائر کی دکانوں سے شاپنگ کر رہے ہوں گے۔''
میرب نے آئس کریم خریدتے ہوئے جوش و خروش بھرے انداز میں کہا۔ شہرۂ آفاق تاکسم اسکوائر کے گرد روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ چاندنی رات میں سارے منظر اور بھی اجلے نظر آ رہے تھے۔

''اس شہر کی خوب صورتی میں ایک انوکھا چارم ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے عہد میں تعمیر کی گئی عمارتیں اور محلات یہاں کا تاریخی اثاثہ ہیں۔ اسی لیے تو یہاں ہر موسم میں سیاحوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ میں نے تو جب سے جاب شروع کی تھی اس وقت ہی سوچ لیا تھا کہ ہر مہینے پیسے جمع کرتی رہوں گی اور پھر ترکی کی سیر کے لیے ضرور جاؤں گی۔'' ضویا نے مگن سے انداز میں کہا۔ وہ دونوں یونہی باتیں کرتے ہوئے ذرا آگے تک آئیں تو دفعتاً ٹھہر گئیں۔

سڑک کے کنارے سرخ و سپید رنگت اور سنہری بالوں والا ایک نوجوان مگن سے انداز میں گٹار بجاتے ہوئے کوئی ترکش گیت گا رہا تھا۔ اس کی گمبھیر آواز اتنی خوب صورت اور سحر انگیز تھی کہ سڑک پر چلتے لوگ بے ساختہ رک جاتے۔ ایسی آواز جسے سن کر صحرا سے گزرتے کارواں بے اختیار ٹھہر جاتے۔ وہ بے حد پروفیشنل انداز میں گٹار بجا رہا تھا۔ مدھر موسیقی کی دُھن بہت سحر انگیز اور دلفریب تھی۔ اس کی آواز میں ایک انوکھی سی کھنک تھی جس نے ان دونوں کے قدموں کو زنجیر کر دیا۔ وہ بھی سڑک کے کنارے رک کر اس کا گیت سننے لگیں۔

''کتنا خوب صورت گیت ہے اور اس شخص کی آواز بھی کتنی خوب صورت ہے۔ کتنے سُر میں گا رہا ہے۔ گو کہ ہم اس گیت کے الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے مگر پھر بھی اس گیت نے جیسے ہمیں مسمرائز کر دیا ہے۔''
میرب نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا پھر اس نے ذرا آگے آ کر استنبول کی ایک یادگار کے طور پر اس شخص کی ویڈیو بھی بنالی۔ اس کی آواز دل کو چھو لینے والی تھی اور سُر اور تال کا ردھم بھی خوب صورت تھا۔ سڑک پر چلتے لوگ اس گیت کو سنتے ہوئے بے ساختہ رک رہے تھے۔
''اور یہ بندہ ہے بھی کتنا ہینڈسم..... شاید کوئی اسٹریٹ آرٹسٹ ہے اور یہ تو بہ آسانی کسی فلم اور ڈرامے کا ہیرو بھی بن سکتا ہے ویسے ترکش لوگ کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔'' ضویا نے مگن سے انداز میں گیت گاتے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بے ساختہ کہا۔ وہ بے حد خوش شکل دراز قد اور خوبرو نوجوان تھا اور اس انداز میں گیت گا رہا تھا کہ دیکھنے والے کچھ لمحوں کے لیے اپنا تاثر ہو کر رہ جاتے۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز منظر تھا۔ اس کے پاس لوہے کا ایک ڈبا بھی رکھا ہوا تھا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ اس کا گیت سنتے ہوئے اس ڈبے میں کچھ پیسے ڈالتے جاتے وہ کوئی منجھا ہوا گلوکار تھا یا کوئی اسٹریٹ آرٹسٹ۔ باہر کے ممالک میں ایسے بہت سے فنکار سیاحتی مقامات پر اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی گلوکاری کرتے تو کبھی جادوئی کمالات دکھا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر لیتے ہیں اور لوگ اپنی خوشی سے انہیں کچھ پیسے بھی دیتے جاتے ہیں۔
وہ دونوں آہستگی سے چلتے ہوئے قریب آ گئیں۔ میرب نے پرس میں جھانکا، اس نے چونکہ شاپنگ کر لی تھی اس لیے اس کے پاس ترکش کرنسی ختم ہو گئی تھی۔ وہ سارے پیسے اپنے ساتھ نہیں لے کر آئی تھی۔ اس نے پرس کی چھوٹی جیب میں دیکھا، ہزار روپے کا پاکستانی نوٹ پڑا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے وہی نوٹ اس ڈبے میں ڈال دیا۔

اس لمحے اس لڑکے نے اچانک اس کی طرف دیکھا۔ ایک پل کے لیے اس کی نظریں اس سے ملیں۔ اس کی روشن چمکتی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر تھا جس نے اسے چونکا یا تھا۔ وہ نگاہ غیر معمولی تھی۔ وہ اسے

دیکھتے ہوئے مدھم انداز میں مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جس میں اجنبیت اور شناسائی کا ملا جلا سا تاثر تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ اس کی نگاہ میں کوئی ایسی بات تھی جسے وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ بس ایک لمحے کی ہی بات تھی اور اسے احساس ہوا جیسے وہ لمحہ انمول تھا۔ اس لمحے کا لمس اس نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ وہ نوجوان بھی گٹار بجاتے ہوئے رکا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑی پرپل رنگ کی لانگ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس آئس کریم کھاتی اس لڑکی کو دیکھ کر وہ بھی چونکا تھا۔ وہ یوں کھڑی تھی جیسے پتھر کا مجسمہ ہو کر رہ گئی ہے۔ یک دم ضوبیا نے اس کا شانہ ہلایا۔

"گیارہ بج رہے ہیں چلو ہوٹل چلیں...... صبح سویرے ہم نے کیپاڈوکیا کے لیے نکلنا ہے۔" ضوبیا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

گٹار بجانے والے شخص نے سر کو جنبش دیتے ہوئے بڑی توجہ سے ان کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی یہ جملہ سنا ضرور تھا۔

وہ کسی خیال سے چونکی پھر اس نے نظریں چرا لیں۔

"ہاں چلو......" اس نے پلٹتے ہوئے کہا وہ ابھی تک اس لمحے کے زیر اثر تھی۔

"نہ جانے کیوں وہ شخص بہت غور سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔" ضوبیا کو بھی اس کے انداز پر حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں، مجھے بھی وہ کچھ پراسرار سا بندہ لگا ہے۔ اس کی آواز میں انوکھی سی کھنک تھی جو سننے والوں کو بے اختیار چونکا دیتی ہے اور اس کی نظروں میں بھی پُراسرار سا تاثر تھا۔" میرب نے مدھم مگر پُرسوچ انداز میں کہا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے مین روڈ کی طرف آ گئیں۔

"کچھ لوگ ایسی پُرکشش شخصیت کے حامل ہوتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر چونک جاتے ہیں...... خیر ہماری تقسیم اسکوائر تک کی واک اچھی رہی......" ضوبیا مسکراتے ہوئے بولی۔

میرب خاموشی سے چلتی رہی۔ اسے بار، بار اس شخص کی نگاہ یاد آتی۔ وہ لمحہ جیسے اس کے دل میں کہیں نقش ہو گیا تھا۔ ایسا تو اس کے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی کیفیات اور خیالات پر خود حیران تھی۔

وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے ہوٹل تک آ گئیں۔ کمرے میں آ کر اس نے سامان رکھا تو لاہور سے خالہ کا فون آ گیا۔

"جی السلام علیکم خالہ!" اس نے فون سنتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام کیسی ہو میرب......؟ استنبول کیسا لگا؟ ٹرپ تو اچھا گزر رہا ہے ناں......!" خالہ کی آواز میں فکرمندی تھی۔

"استنبول بہت خوب صورت ہے خالہ، ہم سب بہت انجوائے کر رہے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"ہر چیز کا خیال رکھنا، پاسپورٹ، ویزا، ٹکٹ سنبھال کر رکھنا، کسی چیز میں بے پروائی نہ کرنا۔ پردیس کا معاملہ ہے، اپنے سامان کی خود حفاظت کرنا اور زیادہ پیسے خرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ پاکستان میں مل جاتا ہے۔" انہوں نے تاکید کی۔

"جی خالہ! مجھے پتا ہے، آپ تو جانتی ہیں کہ میں بالکل بے پروا نہیں ہوں......" اسے ان کی یہ فکریں بے معنی لگیں۔ یک دم مینا نے ان کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"آپی! میری جا کلیٹس اور میک اپ ضرور لے کر آیئے گا۔" اس نے کئی بار کی گئی فرمائش کو ایک بار پھر دہرایا۔

"اور میری ٹی شرٹس بھی۔" عقب سے روحی کی بھی آواز آئی۔

"ہاں مجھے یاد ہے، میں ابھی کچھ دیر پہلے بازار گئی تھی۔ تم لوگوں کے لیے ساری شاپنگ کر لی ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خشک پھلوں والی چائے بھی لے آنا سنا ہے کہ یہ چائے وہاں کی خاص سوغات ہے۔'' خالہ کی آواز آئی۔ وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ یک دم ایک کرخت چنگھاڑ سنائی دی۔

''سارے خاندان میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں کہ ارمغان کی ماں نے شادی سے انکار کیا تو لڑکی سیر سپاٹے کرنے ترکی چلی گئی۔ تمہارے خاندان والوں کے مزاج اور ریت، رواج کی تو مجھے کبھی سمجھ ہی نہیں آسکی۔'' خالو اپنے مخصوص طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں بولے تھے۔

چند لمحوں کے لیے میرب ساکت رہ گئی۔ اس کے اندر گویا کوئی زلزلہ آیا تھا۔ چند لمحوں پہلے والی ساری ایکسائٹمنٹ دھواں بن کر اڑ گئی۔

''آواز کٹ رہی ہے، سگنل نہیں آرہے شاید۔'' مینا نے ڈری سہمی اور جھینپی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ موبائل ہاتھ میں تھامے یونہی ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ وہ انہی تلخ یادوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے نیلے سمندر کے کنارے آباد اس خوب صورت شہر میں آئی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔

''خالو کی تو عادت ہی ایسی ہے۔'' اس نے زبردستی خود کو بہلایا۔ خالو کی بدمزاجی اور تلخ مزاجی سے ہر کوئی واقف تھا۔ یہ تو اس کی خالہ کا ہی حوصلہ تھا کہ انہوں نے اتنے سال ان کے ساتھ صبر سے گزر لیے۔ وہ خالو کی تلخ باتوں کو سوچ کر اپنا ٹرپ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ارمغان!'' نہ جانے آج کیوں اسے یہ نام اجنبی سا لگا تھا۔ وہ اس نام کو... بھول جانا چاہتی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس نام کو سن کر آنسو بہانے لگتی مگر اب تو جیسے ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کے خیالوں کے پردے پر یک دم گٹار بجانے والے خوبرو نوجوان کا عکس جگمگانے لگا۔ خالو کی نفرت اور ارمغان کی بزدلی کا دکھ پس منظر میں چلے گئے۔

اسے ایک شخص کی نگاہ یاد رہی...... اس ایک نگاہ میں جیسے پوری داستان رقم تھی۔ اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ لوگ کپاڈوکیا کے لیے روانہ ہوئے جو عجیب و غریب پہاڑوں اور پُراسرار غاروں کا شہر تھا۔ وادی گوریم اک حیرت انگیز وادی تھی جسے محبت کی وادی بھی کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر ڈرائیونگ کرنا بھی بڑی مہارت کا کام تھا۔ یہ نوک دار اور تکونی پہاڑوں والی پُراسرار اور انوکھی وادی تھی جہاں کے راستے چیری بلاسم کے ہلکے گلابی رنگ کے پھولوں سے بھرے ہوتے تھے۔

بس سے اتر کر وہ لوگ گائڈ سرخان کے پیچھے چلتے ہوئے حیرت سے چاروں طرف دیکھتے جا رہے تھے۔ دور، دور تک پُراسرار پہاڑ نظر آرہے تھے جن میں کشش کے ساتھ ہیبت بھی تھی۔ سرخان گروپ کے آگے چلتے ہوئے بلند آواز میں بتاتا جا رہا تھا۔

''پہاڑوں میں بنے یہ غار صدیوں پرانے ہیں۔ ان غاروں میں لوگ دشمنوں سے چھپ کر پناہ لیا کرتے تھے۔ یہ پہاڑ fairy chimneys کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے ایسا لینڈ اسکیپ دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔'' سرخان سفید رنگ کی چھتری تھامے معلومات فراہم کرنے میں مصروف تھا۔ ہلکی دھوپ میں نرم سی تمازت تھی۔

''یہ کتنی پُراسرار جگہ ہے، یوں لگ رہا ہے جیسے ہم کسی انوکھی بستی میں آگئے ہیں۔ دور سے دیکھنے والوں کو یہ مٹی کے پہاڑ لگتے ہیں جبکہ یہ تو سخت پتھریلے اور نوک دار پہاڑ ہیں۔'' اس کے ساتھ چلتی ضویا نے کندھے پر لٹکے بیگ میں سے کیمرا نکالتے ہوئے کہا۔

پہاڑوں میں واقع غار کے دہانے پر اندر جانے کا راستہ تھا۔ لوگ جوق در جوق غار کے اندر جا رہے تھے۔ میرب ہلکے گلابی رنگ کے پھولوں سے بھرے

ہوئے چیری بلاسم کے خوب صورت درخت کے پاس ٹھہر گئی۔

"میں claustrophobia (تنگ جگہوں کا خوف) کا شکار ہوں اس لیے میں غار کے اندر نہیں جاسکوں گی...... تم لوگ جاؤ، میں یہیں پر تم لوگوں کا انتظار کرلوں گی۔" وہ اپنا ہیٹ ٹھیک کرتے ہوئے متامل انداز میں بولی۔

پہاڑوں کی تصویریں بناتی ضویا کیمرے کا لینس فوکس کرتے ہوئے چونکی۔ گروپ کے لوگ سرخان کے پیچھے پہاڑ پر بنی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بلندی کی طرف جارہے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے، چلو اس چیری بلاسم کے درخت کے نیچے کھڑی ہوجاؤ...... میں تمہاری تصویر بناتی ہوں...... ہیٹ کو ترچھے انداز میں تھام لو، دیکھنا یہ ایک شاہکار تصویر ہوگی۔" ضویا نے کسی ماہر فوٹو گرافر کے سے انداز میں کہا۔ میرب مسکرائی اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پھولوں سے بھرے درخت تلے کھڑی ہوگئی۔ ذرا دور بلندی پر ایک غار کے دہانے پر کھڑے ہوئے اس خوبرو اجنبی نے اس کی طرف بڑی توجہ سے دیکھا۔

وہ سیاہ بالوں اور سنہری رنگت والی خوش شکل لڑکی تھی جو نیلے رنگ کی پیروں کو چھوتی میکسی میں ملبوس تھی اور سر پر جامنی رنگ کے ربن والا آف وہائٹ ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں سفید سینڈلز تھے اور کاندھے پر سفید پرس لٹکا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی، ایسی کہ جس پر انسان کی نظر پڑتے ہی ٹھہر جاتی۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا...... اس کی نظر بھی ٹھہر گئی تھی اور دل بھی...... اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اس کے ساتھ بھی پہلی نظر کی محبت جیسا حادثہ ہوسکتا ہے۔ وہ وہیں کھڑا پلکیں جھپکائے بغیر بڑی توجہ اور محویت کے ساتھ اس منظر کو دیکھتا رہا۔

وہ کسی کلاسک انگلش فلم کی ہیروئن کی طرح گلابی پھولوں سے لدے چیری بلاسم کے درخت کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ یقیناً شاندار تصویریں ہوں گی...... دوسری لڑکی سیاہ جینز اور گرے شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی فوٹو گرافی کا شوق اور مہارت اس کے انداز سے ظاہر تھی۔

مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے سیاح وادی میں آتے جارہے تھے۔ وہ اس طرف دیکھتے ہوئے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستگی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا۔

اس لڑکی کا گروپ اور اس کی سہیلی بلند پہاڑوں میں واقع غاروں کی طرف جاچکے تھے اور وہ لڑکی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے اب سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔

وہ چینی باشندوں کے قافلے کے پیچھے چلتے ہوئے پتھریلی سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس سے گزرا تو وہ اسے دیکھ کر بری طرح چونکی۔

وہ اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے جان گیا کہ وہ بھی اسے پہچان چکی ہے اور یہ بات حیرت انگیز تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے زیرلب مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ششدر انداز میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ وہی تھا۔

استقلال اسٹریٹ پر گٹار بجاتے ہوئے گیت گانے والا خوبرو نوجوان جس کی خوب صورت اور گمبھیر آواز نے کل رات سڑک پر چلنے والے لوگوں کو مسحور کردیا تھا۔ وہ گٹار بجاتے ہوئے اسے دیکھ کر چونکا تھا۔ وہ اس کی نظروں کے طلسم کو بھلا کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کی نظریں سورج بن کر اس کے دل کی زمین پر اتری تھیں...... وہ لمحہ جیسے اس کے دل کے کسی کونے میں ستارہ بن کر چمکا تھا۔ مگر آج وہ بالکل مختلف حلیے میں تھا۔

نیلی جینز پر سفید شرٹ پہنے، بھورے بالوں کو سلیقے سے بنائے وہ استقلال اسٹریٹ والے سنگر سے بالکل مختلف لگ رہا تھا مگر وہ اسے پہچان چکی تھی۔ وہی وجاہت جس نے اسے چونکایا تھا۔ وہی تیکھے نقوش اور پرکشش خدوخال، خوب صورت بولتی آنکھیں، ویسا ہی

دراز قد...... اس کے پاس اس کے گانے کی ویڈیو بھی موجود تھی۔ اس نے فوراً موبائل میں وہ ویڈیو دیکھی۔

''ہاں یہ وہی تو ہے۔ صرف حلیے کا فرق تھا۔''

وہ جس انداز سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر آگے بڑھا تھا اس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بھی اسے پہچان چکا ہے۔ استقلال اسٹریٹ پر ایک ہجوم دیکھنے کے باوجود بھی وہ اسے یاد تھی۔

وہ کتنی دیر تک حیرت کے عالم میں وہیں بیٹھی رہی۔ وہ جیسے کسی حیرت کدے کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکی تھی، وہ سمجھ نہ پائی کہ اس شخص کو بہروپ بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔

پھر کچھ دیر بعد ضویا ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کے پاس آئی تو اس نے مدھم مگر پُرجوش انداز میں اس سے اس بات کا ذکر کیا۔

''تمہیں پتا ہے کہ میں نے یہاں ابھی جس لڑکے کو دیکھا تھا جو استقلال اسٹریٹ پہ کنارے بیٹھے ہوئے گیت گا رہا تھا مگر آج اس کا حلیہ یکسر مختلف تھا...... بال بھی الگ اسٹائل میں سنورے ہوئے تھے مگر میں نے پھر بھی اسے پہچان لیا۔'' اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ضویا نے بے ساختہ کندھے اچکائے۔

''کیا پتا ہے کہ اسے نئے، نئے گیٹ اپ اپنانے کا شوق ہو یہ بھی تو ایک طرح کا ایڈونچر ہی ہوتا ہے ناں۔ بہت سے لوگوں کو ایسا کرنے ہوتا ہے ویسے اب کہاں ہے وہ......؟'' اس نے مڑ کر دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

راستوں پر دھوپ پڑ رہی تھی اور سامنے نظر آنے والی سڑک چیری بلاسم کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔

''وہ اس طرف چینی سیاحوں کے گروپ کے پیچھے گیا ہے۔'' اس نے پہاڑوں کے اطراف بنے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں تو وہ بھی ہماری طرح سیر و تفریح کی غرض سے آیا ہوگا۔ دیکھو گروپ کے سب لوگ آئس کریم کھانے کے لیے کینٹین ایریا کی طرف جا رہے ہیں وہاں ترکی کی مشہور و معروف آئس کریم ملتی ہے چلو ہم بھی وہاں چلتے ہیں۔'' ضویا نے گلے میں کیمرا لٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ پرس اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے ہم قدم ہو کر چلنے لگی۔

دھوپ کے باوجود وہاں تیز ہوا تھی اور موسم خوشگوار تھا۔ چیری بلاسم کے گلابی پھولوں سے بھرے راستوں پر سنہری اجالے چمک رہے تھے اور پُراسرار پہاڑوں کے نظاروں میں انجانی اور انوکھی کشش تھی۔ آس پاس کے راستوں پر مختلف قسم کے حلیوں والے سیاح گزرتے جا رہے تھے۔

ضویا فوٹوگرافی کے جوہر دکھاتے ہوئے خوب صورت نظاروں کی تصویریں بناتی جا رہی تھی۔

''صبح سویرے اس وادی پر Hot Air balloons (ہوا میں اڑنے والے غبارے) اڑتے نظر آتے ہیں اور وہ منظر بہت ہی دلفریب لگتا ہے۔ یہ غبارے پیراشوٹ کی طرح ہوتے ہیں جن کے نیچے ٹوکری یا باسکٹ لگے ہوتے ہیں اور جن میں ایک وقت میں آٹھ سے دس افراد سوار ہو سکتے ہیں۔ اور اس سیر کا دورانیہ تقریباً ایک گھنٹے کا ہوتا ہے۔'' ضویا اسے بتا رہی تھی۔

''مجھے بھی بالٹ ائیر بیلون میں بیٹھنے کا شوق تھا مگر اس کا ٹکٹ کافی مہنگا ہے اس لیے میں نے اس کا خیال دل سے نکال دیا...... میں نے سوچا کہ پردیس میں کفایت شعاری سے ہی کام لینا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں......'' میرب دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی تو ضویا بے ساختہ ہنسی۔

''تمہارا ڈریس دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا کہ تمہیں کفایت شعاری کا شوق ہے۔ دیکھو...... لوگ مڑ، مڑ کر تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ اس انوکھی اور پُراسرار وادی میں نیلی میکسی پر سفید ہیٹ پہنے یہ لڑکی کون ہے...... مجھے تو تم Pride and Prejudice کی الزبتھ لگ رہی ہو......'' ایک مشہور انگریزی ناول جین آسٹن کے کیریکٹر کا حوالہ دیا۔ ضویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ نوٹ کر رہی تھی کہ پاس سے گزرتے لوگ میرب کو

ستائشی نظروں سے دیکھتے جارہے ہیں۔
''بعض دفعہ ہم اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کہانیوں جیسے روپ اپنا لیتے ہیں، راز کی بات یہ ہے کہ یہ میکسی عام سے کپڑے کی ہے جو میں نے بارہ سو روپے کا لیا تھا اور اس پر ستر روپے والی سلور لیس لگوائی۔ انٹر نیٹ سے میکسی کے ڈیزائن کی تصویر نکال کر درزن کو دی اور اس نے اس میکسی کی پانچ سو روپے سلائی لی، میں اپنے سب کپڑے خود ہی ڈیزائن کرتی ہوں...... تھوڑی محنت کرنی پڑتی ہے مگر کم خرچ میں بہت خوب صورت ڈیزائن کے کپڑے تیار ہو جاتے ہیں اور یہ ہیٹ میں نے پچھلے سال مری سے لیا تھا۔'' اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ ایک اہم راز پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ جس سے اس کی بھرپور کفایت اور تخلیقی صلاحیتیں بھی ظاہر ہو گئیں۔

''کیا واقعی......؟'' ضوبا بری طرح چونکی۔

''ویسے اتنی ذہین لڑکی کو...... claustrophobia کا مسئلہ کیوں ہے؟ یہ پرابلم تو ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جن لوگوں کے ساتھ کوئی نفسیاتی یا ذہنی حادثہ پیش آیا ہو۔'' وہ میرب کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ ایک سائیکالوجسٹ تھی اور اسپیشل ایجوکیشن کے ادارے میں جاب کرتی تھی۔ اس کے لیے لوگوں کی شخصیت کو پرکھنے اور جانچنے کا پیمانہ مختلف تھا۔

میرب کے چہرے کا رنگ یک دم بدل گیا اور قدموں کی رفتار وفتا سست پڑ گئی۔ اسے چہرے پڑھنے والے لوگوں سے خوف آتا تھا۔

''آئس کریم کی دکان آ گئی۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بات بدلتے ہوئے بولی۔

اپنی آواز کے خوف کو اس نے مصنوعی ایکسائٹمنٹ میں چھپالیا۔ بات بدل چکی تھی اور ماحول بھی۔

وہ دونوں آئس کریم والے کے پاس آ گئیں جو سفید رنگت اور بھورے بالوں والا خوش مزاج نوجوان تھا جس نے سفید شرٹ پر سنہری رنگ کے تلے کے کام والی سرخ رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ شاید یہ اس علاقے کا روایتی لباس تھا۔

وہاں کی آئس کریم مختلف اور سینڈوچ کی طرح تھی۔ دو بڑے بسکٹ سلائز کے درمیان آئس کریم بھری گئی تھی۔

وہ آئس کریم لے کر پلٹی تو بے ساختہ ٹھہر گئی۔ وہی اجنبی مسکراتے ہوئے سامنے سے آرہا تھا۔ اس کے قریب آ کر ذرا رکا۔ دونوں کی نظریں ملیں، وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دل آویزی سے مسکرایا۔ اس کے انداز میں اجنبیت نہیں تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ آہستگی سے اس کے قریب سے گزر کر آئس کریم کے کاؤنٹر تک چلا گیا۔

وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی رہی۔ اس کی نگاہ کے کسی اشارے نے اسے پتھر کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ ضوبا نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے گویا اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو وہ چونکی۔

''دیکھو...... وہی بندہ! جو ابھی ہمارے پاس سے گزر کر گیا ہے ناں سفید شرٹ والا...... یہ وہی ہے جو استقلال اسٹریٹ پر گٹار بجاتے ہوئے گانا گارہا تھا۔ دیکھو ذرا آج کتنے مختلف حلیے میں یہاں آیا ہے۔'' میرب نے ضوبا کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پھر اس کے چہرے کا تاثر یک دم بدلا۔

''یہ وہ بندہ نہیں ہے میرب......'' اس کے جملے نے اسے ساکت کر دیا۔ وہ حیران تھی کہ ضوبا جیسی ذہین لڑکی اس شخص کو پہچان کیوں نہیں پارہی۔

''یہ وہی ہے ضوبا...... میں نے اسے پہچان لیا ہے۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ مگر ضوبا کا ردعمل اس کے لیے خلاف توقع تھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ نیلی آنکھوں اور سنہرے لمبے بالوں والا لڑکا تھا۔ جو شاید کوئی اسٹریٹ آرٹسٹ تھا اور یہ بھوری آنکھوں اور چھوٹے کٹے بھورے بالوں والا بندہ ہے جو یقیناً کوئی سیاح ہے۔ یہ محض تمہارا الوژن (illussion) ہے کہ

تمہیں ہر بندہ اس سنگر جیسا لگ رہا ہے۔'' ضویا نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

وہ اس بات پر ششدر رہ گئی۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ ضویا کو کس طرح سے قائل کرلے۔ ضویا کو بھی اندازہ ہورہا تھا کہ pride and prejudice کی الزبتھ جیسی نظر آنے والی یہ لڑکی بہت سی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی مسائل کا شکار تھی جنہیں وہ دنیا سے چھپانا بھی چاہتی تھی۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ ایک خوش باش اور خوشحال لڑکی لگتی تھی۔ ساکت کھڑی میرب نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔

وہ آئس کریم والا [illegible] کے پاس کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا [illegible] نظروں کے ارتکاز میں تو جہ تھی۔

[illegible]

''ویسے آئس کریم [illegible] ترکش ڈراموں میں اکثر لوگوں کو [illegible] کھاتے دیکھا ہے۔''

ضویا اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی بات سنتی رہی پھر وہ خاموشی سے بس میں آکر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی [illegible] ہے۔ وہ بار بار [illegible] اور الجھ جاتی۔ نہ جانے وہ بندہ اس کے اعصاب پر کیوں سوار ہو گیا تھا۔ اسے اس کی نظریں یاد آئیں۔ گہری پُر اسرار کچھ کہتی ہوئیں۔ کوئی انجانا پیغام دیتی ہوئی..... وہ نظریں ستاتی کو چھپا [illegible] کر دیتی تھیں اجنبیت میں بھی شناسائی تھی اور صدیوں میں رابطے تھے۔ اس شخص کے خیال کی ڈور کہیں نہ کہیں اس کے دل سے بندھ گئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی۔

☆☆☆

کپاڈوکیا میں ایک دن گزارنے کے بعد وہ لوگ قونیہ روانہ ہوئے۔ قونیہ ترکی کا تاریخی شہر ہے اور اسے مولانا رومی کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ قونیہ کی پُرسکون فضا میں باتیں کرتی خاموشی نمایاں تھی اور وہاں کے ماحول میں تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے..... مولانا رومی کے مزار کے باہر سیاحوں کا رش تھا۔ سبز مینار والی مسجد کے پاس شفاف پانی کے فوارے بہ رہے تھے۔ یہاں موجود whirling dervish ساری دنیا میں مشہور تھے۔

مولانا رومی کا مزار دیکھنے کے بعد ان لوگوں نے قریبی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، ترکی کے مشہور ڈونر کباب، پنیر کے نان، سبزیوں کا سلاد اور دہی کی لسی۔ میرب کو کباب اور پنیر کے نان اتنے پسند آئے کہ اس نے ساتھ لے جانے کے لیے بھی پیک کروا لیے۔

کھانے کے بعد جب وہ لوگ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو ضویا نے اس سے کہا۔

''مجھے کسی نے بتایا ہے کہ یہاں پر سائیکل رینٹ پر ملتی ہے۔ سلیمیہ مسجد کے پاس وسیع احاطہ ہے جہاں لوگ سائیکل چلاتے ہیں اور وہاں ہر قسم کی ٹریفک کا داخلہ منع ہے۔ یہاں ہمارے پاس دو گھنٹوں کا ٹائم ہے [illegible] جہاں شاپنگ کے [illegible] [illegible] آتی ہوں [illegible]

وہ وہیں ٹھہر گئی۔

سلیمیہ مسجد کے بلند میناروں پر دھوپ پھیلی تھی۔ اس مسجد کو سلطنت عثمانیہ کے سلطان سلیم (دوم) نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ عالیشان مسجد فن تعمیر کا اعلیٰ شاہکار تھی۔ اس کے ساتھ ایک وسیع احاطہ تھا جہاں سیاحوں کی چہل پہل تھی۔ وہ یونہی آہستگی سے چلتے ہوئے ذرا آگے تک آگئی۔

ایک بھورے بالوں والی گیارہ بارہ سالہ بچی اس کے پاس آکر رک گئی۔ وہ پرانے سے سیاہ کرتے اور سیاہ پینٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا عکس اور آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ وہ بچی اس سے ذرا ہٹ کر کھڑی غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مختلف

حلیوں والے سیاحوں کے جھرمٹ میں میرون پھولوں والی شلوار قمیص پر میرون دوپٹا اوڑھے یہ لڑکی اسے سب میں منفرد لگی تھی۔

میرب نے ٹھٹک کر اس بچی کو دیکھا تو وہ دو قدم آگے آئی اور اداس آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔

"I am Syrian" (میرا تعلق (ملک) شام سے ہے)

ایک جملے میں اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اس تعارف میں پہچان اور شناخت تھی اور ایک اداس سا فخر بھی تھا۔

"Syrians are so beautiful"

میرب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ بچی اس جملے کو سنتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی مگر میرب کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک اداس مسکراہٹ تھی۔ اس کے چہرے پر بچپن میں دیکھے گئے دکھوں کا عکس واضح نظر آ رہا تھا۔

میرب نے ہاتھ میں تھاما کھانے کا پیکٹ اس بچی کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے ذرا جھجک کر تھام لیا۔ اس کے چہرے پر چھایا افسردگی کا عکس معدوم ہوا اور یک دم خوشی کے رنگ جگمگانے لگے۔

میرب نے اردگرد دیکھا۔ احاطے میں بہت سے شامی بچے کھیل رہے تھے جو شام کو مہاجر کیمپ سے یہاں آ جایا کرتے تھے۔

''سیلفی.....'' اس نے پرس میں سے موبائل نکالا۔ کچھ اشارے ایسے ہوتے ہیں جو دنیا کے ہر خطے کے لوگوں کو بہ آسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

اردگرد کھیلتے شامی بچے ایکسائٹڈ انداز میں اس کے پاس چلے آئے۔ اک رونق سی لگ گئی۔

ایک تصویر میں خوشی کا لمحہ تھا۔ بچے ہنستے مسکراتے ہوئے اک اجنبی سیاح لڑکی کے ساتھ تصویریں بنواتے لگے۔ میرب نے پرس میں سے چاکلیٹ کے پیکٹ نکالے جو اس نے راستے سے خریدے تھے اور

سب بچوں میں بانٹ دیے۔ وہ ان بچوں کے چہروں کی معصوم مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔

کوئی مدھم چاپ کی آواز کے ساتھ اس کے قریب آکر رکا تھا۔

"the kind fairy" (نیک دل پری)

اس نے اپنی پشت پر کسی کو کہتے سنا...... نہ جانے کیوں اس کا دل زور سے دھڑکا۔ مردانہ گمبھیر اور ساکت کردینے والی آواز کو سنتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ وہی تھا...... روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتا ہوا۔ بچے بے تابی سے اس کی طرف لپکے...... انہوں نے اسے گرم جوشی سے سلام کیا پھر اس سے لپٹ گئے۔ وہ اُن کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے وہیں کھڑی رہی...... وہ بھول گئی کہ اسے سائیکل چلانی تھی اور ضویا اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس شخص نے بچوں سے اجنبی زبان میں بات کرتے ہوئے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ بچے...... فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف بھاگتے ہوئے چلے گئے۔

پھر وہ اس کے عین سامنے آن کھڑا ہوا...... نیلی جینز پر نیلی ٹی شرٹ پہنے وہ کیژوکیا والے حلیے ہی میں نظر آرہا تھا۔ وہ بے حد شاندار شخصیت کا حامل تھا۔ دراز قد، وجیہہ، خوبرو، اس کی وجاہت میں دلکشی تھی۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں روشنی سی چمکی تھی اور یہ روشنی سامنے کھڑی لڑکی کے دل تک بھی پہنچی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟ امید ہے کہ استنبول سے قونیہ تک کا سفر اچھا گزرا ہوگا۔''

اس نے پہلی باضابطہ گفتگو کی تھی...... وہ اپنی جگہ دم بخود رہ گئی، وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے پاس آکر کبھی کوئی بات کرے گا اور وہ بھی شستہ اردو میں۔

''آپ کو اردو آتی ہے؟'' اس نے حیرت بھری آواز میں کہا۔

وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دلکشی سے مسکرایا۔

''ہاں، دراصل میری والدہ ٹرکش اور میرے والد پاکستانی تھے۔ میں بچپن میں پاکستان آتا جاتا رہا ہوں۔ میرا سارا ددھیال پاکستان میں ہی ہے۔ اس لیے مجھے اردو آتی ہے۔ جب میرے والدین میں علیحدگی ہوئی تو میں سترہ برس کا تھا۔ پھر میں اور میری والدہ مستقل ترکی میں ہی سیٹلڈ ہو گئے۔'' اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اردو میں کہا۔

اس کی کہانی کسی حد تک اس کی اپنی زندگی سے ملتی تھی۔ والدین کی علیحدگی، خاندانی سیاستیں، سازشیں اور خاموش بکھرتے... وہ ان سب چیزوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے ہی تو یہاں آئی تھی۔ اس نے بے ساختہ پلکیں جھپکائیں۔

''اچھا... تو آپ بھی پاکستانی ہیں...... میں نے آپ کو استنبول میں بھی دیکھا تھا۔ چودھویں کی رات کو استقلال اسٹریٹ پر گٹار بجاتے ہوئے اور ٹرکش گیت گاتے ہوئے وہ آپ ہی تھے ناں......؟'' اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا دل کی بات بالآخر زبان پر آہی گئی۔ وہ یوں مسکرایا جیسے وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے یہ بات ضرور پوچھے گی۔

''میں کوئی پروفیشنل سنگر نہیں ہوں مگر مجھے گلوکاری کا شوق ہے جب میں کالج میں تھا تو شوقیہ گاتا تھا اور میوزک کلاسز لیتا تھا اسٹریٹ آرٹسٹ کے طور پر گیت گاتے ہوئے میں شامی مہاجر بچوں کے لیے ڈونیشن جمع کرتا ہوں پھر ویک اینڈ پر میں قونیہ آتا ہوں اور مہاجر کیمپ میں امداد دیتا ہوں اور ان بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ ان بچوں نے اپنے بچپن میں جنگوں اور غریب الوطنی کے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ یہ دکھ تو جوانوں کو بوڑھا کر دیتے ہیں۔ میں ان بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر میں یہ چاہتا تھا کہ مجھے سنگر کے روپ میں

کوئی نہ پہچانے اور میں اس کوشش میں کامیاب بھی رہا مگر تم نے مجھے پہچان لیا..... حیرت انگیز.....'' وہ دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ تکلف کی دیوار گراتے ہوئے آپ سے تم پر آ گیا۔ وہ اس بے تکلفی، اپنائیت اور حد درجہ اعتماد پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ وہ اس سے یوں بات کر رہا تھا جیسے ان کے بیچ برسوں کی شناسائی ہو۔ میرب نے بھی اس کا یہ انداز دیکھ کر اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔

''خوشی ہوئی سن کر کہ آپ ان بچوں کے لیے اتنا کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کی بات سن کر اس کے دل میں اس کے لیے عزت اور احترام پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اسے بلندی پر کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ باضمیر اور دردمند دل رکھنے والا شخص تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت انسان ہماری ذمے داری ہے کہ اپنے اردگرد بسنے والے مستحق لوگوں کی مدد کریں۔ استنبول میں سیاحوں کا رش ہوتا ہے اور وہاں اسٹریٹ سنگرز کا اسکوپ بھی ہے جب تم نے ڈونیشن بکس میں پاکستانی کرنسی کا نوٹ ڈالا تھا تو میں اسی وقت جان گیا تھا کہ تم پاکستانی ہو.....'' اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔ وہ زیرک نگاہ تھا۔

میرب نے بے ساختہ پلکیں جھپکیں۔

''میرب.....'' یک دم سائیکل چلاتے ہوئے ضوبیا نے ذرا فاصلے سے آواز دی۔ میرب جیسے کسی ٹرانس سے باہر آئی۔

''میری دوست آ گئی ہے۔ میں چلتی ہوں.....'' اس نے گردن موڑ کر سائیکل پر سوار ضوبیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کا کب تک یہاں رکنے کا پروگرام ہے؟'' میرب کو ایک قدم پیچھے ہٹتے دیکھ کر اس نے فوراً پوچھا..... وہ اپنے لہجے کی بے تابی کو چھپا نہیں پایا۔

''کل ہم لوگ انقرہ جا رہے ہیں۔'' بیچ راستے میں کیے جانے والے یہ سوال جواب مختصر مگر بامعانی تھے۔ ان کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں بلکہ دل کے کونے سے بھی جڑا تھا۔

''انقرہ میں کس جگہ ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

میرب نے ہوٹل کا نام بتایا تو اس نے ہولے سے سر کو جنبش دی اور دھیرے سے مسکرا دیا۔ وہ ضوبیا کے پاس آ گئی جو اسے حیرت اور تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ شخص تم سے کیا بات کر رہا تھا؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''یونہی..... میں شامی بچوں کے ساتھ تصویر بنا رہی تھی کہ یہ وہاں آ گیا، میں نے اسے اردو میں بات کرتے دیکھا تو حیران رہ گئی..... یہ وہی شخص ہے جسے ہم نے استنبول میں گٹار بجاتے اور گیت گاتے دیکھا تھا اور مجھے یہ مختلف حلیے میں کہاں نظر آیا تھا..... اصل میں اسٹریٹ آرٹسٹ کا گیٹ اپ اپنا کر شامی بچوں کے لیے ڈونیشن جمع کرتا ہے اور ویک اینڈ پر تو نیہ آ کر ان بچوں کی امداد کرتا ہے اور بچوں کو پڑھاتا بھی ہے۔'' اس نے جوش و خروش بھرے انداز میں اسے سب بتایا۔

''کیا واقعی.....؟'' ضوبیا بھی یہ سن کر حیران رہ گئی۔

''ہاں..... وہ اسی بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کی ماں ٹرکش ہے اور اس کے والد کا تعلق پاکستان سے ہے۔'' اس نے مزید بتایا۔

''حیرت ہے کہ تم نے اسے اس گیٹ اپ میں پہچان لیا۔ میں تو اسے بالکل پہچان نہیں پائی تھی۔ کیا نام ہے اس شخص کا؟'' ضوبیا ہولے سے سائیکل کا پیڈل چلاتے ہوئے بولی۔ میرب ایک لمحے کے لیے ٹھہری..... اسے اپنی غائب دماغی اور بے پروائی پر افسوس بھی ہوا۔

"نام تو میں نے اس کا پوچھا ہی نہیں...... اور نہ اس نے میرا نام پوچھا۔" وہ سادگی سے بولی تو ضوبیا بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"نام پوچھا نہیں اور اتنی باتیں کرلیں...... مطلب کہ تعارف ہوا نہیں اور کہانی پہلے سن لی...... واہ میرب صاحبہ...... ! بہت خوب، اچھا خیر چلو سائیکل چلاتے ہیں...... بڑی مشکل سے یہ سائیکل ڈھونڈ کے لائی ہوں...... گروپ کی سب خواتین سڑک کے پار نظر آتی دکانوں کی طرف چلی گئی ہیں...... سنا ہے کہ یہاں کے رنگین پیالے بہت مشہور ہیں۔ سائیکل چلانے کے بعد ہم بھی وہاں جائیں گے۔"

ضوبیا نے کہا۔

اس نے اس کی بات سنتے ہوئے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ وہ بھی سوچتی رہی کہ اس نے اس کا نام نہ پوچھ کر غلطی کی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر سائیکل چلاتی رہیں...... پھر تھوڑی بہت شاپنگ کی اور شام کے بعد وہ لوگ ہوٹل آگئے۔ وہ مسلسل اس خوبرو اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے اس کے پاس آکر خود بات شروع کی تھی جس کا مطلب تھا کہ اسے بھی اس سے رابطے کی خواہش تھی۔

وہ منظر بار بار اس کے ذہن کی اسکرین پر ری وائنڈ ہوتا رہتا۔ وہ اس کے مقابل کھڑا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مخاطب تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک تھی جس کی روشنی نے اس کے دل کو خیرہ کر دیا تھا کہ اس کے دل کی سرزمین پر ہر طرف اجالے اتر آئے تھے۔

وہ گمبھیر ساحرانہ آواز اسے اپنے دل پر دستک دیتی محسوس ہوتی۔ اس کی وجاہت کا عکس اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ وہ اس کا خیال ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی اور ناکام ہوتی۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ شخص اس کے اعصاب پر کیوں سوار ہو گیا تھا۔ ٹھیک ہے کہ وہ بے حد ہینڈسم بندہ تھا مگر اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے کبھی خوبرو آدمی نہیں دیکھے تھے مگر اس شخص کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ وہ مقناطیس کی طرح کھنچی چلی جاتی اور اسے اپنا دل بے بس ہوتا محسوس ہوتا۔

پھر وہ اسے انقرہ کی سڑکوں پر نظر آیا۔ وہ بھلی اسٹریٹ بازار کی ایک دکان سے باہر نکلی تو وہ سامنے سے چلا آرہا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں ضرور آئے گا۔ اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ گئی۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتے ہوئے اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے قریب آکر ٹھہر گیا تھا۔ انقرہ کا موسم ابر آلود اور خنک تھا۔ آسمان پر تیرتے بادل کسی وقت بھی برسنے کو تیار تھے۔

اس کی مسکراتی ہوئی نگاہیں سامنے کھڑی لڑکی پر ٹھہر گئیں...... نیلی جینز پر براؤن کوٹ پہنے بالوں کی پونی بنائے وہ لڑکی ہاتھوں میں شاپر اٹھائے سامنے سے چلی آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس لڑکی کے چہرے پر قوس قزح کے جو رنگ اترے تھے وہ اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ رنگوں کی یہ بہار دونوں طرف اتری تھی۔

"خوب شاپنگ ہوئی؟" وہ اس کے ہاتھوں میں تھامے شاپنگ بیگز دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں بے تکلفی سے بولا۔

وہ مسکرائی تو اس کی نگاہ اس کے دائیں گال پر پڑتے ڈمپل پر ٹھہر گئی۔

"ہاں، میں نے اپنے رشتے داروں کے لیے کافی شاپنگ کی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"پاکستان کی کچھ روایات مجھے بہت پسند ہیں۔" وہ اپنائیت بھرے انداز میں بولا پھر ذرا رکا۔

"کافی پئیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے گویا اس سے پوچھا۔ اس کے انداز میں اصرار تھا۔

"کافی......؟" وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے مسکرایا پھر اس نے دائیں جانب نظر آتے کیفے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ مصری کیفے یہاں کا بہترین کیفے ہے۔ یہاں کے سوپ بہت مشہور ہیں تو کچھ دیر کے لیے یہیں

بیٹھ جاتے ہیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر تفصیلاً بات ہی نہیں ہو سکتی، میں تمہارا سامان اٹھا لیتا ہوں۔'' وہ دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے ذرا آگے آیا اور اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے شاپر لے لیے۔۔۔۔۔ اخلاقیات کا تقاضا بھی یہی تھا سو وہ اسے منع بھی نہیں کر سکی۔

''میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔۔۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

وہ اس کے سوال پر محظوظ ہوا۔

''میرا نام آبان ہے۔'' وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔۔۔ بھاری گمبھیر مسحور کن آواز جس کی بازگشت وہ خوابوں میں سنا کرتی تھی۔

''اور میں۔۔۔'' وہ کچھ کہنے لگی تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی بول پڑا۔

''میرب۔۔۔'' وہ اس کا نام جانتا تھا۔ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ بے خبر اور وہ باخبر تھا۔

''تمہاری سہیلی اسی نام سے تمہیں بلا رہی تھی ناں۔۔۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔

''ہاں۔۔۔'' وہ بے ساختہ مسکرائی۔ وہ بہترین قوتِ مشاہدہ کا حامل تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی اور فضا میں خنکی بڑھ گئی تو وہ دونوں کیفے میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ ویٹر کو سوپ کا آرڈر دینے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تمہارا تعلق پاکستان کے کس شہر سے ہے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''لاہور سے۔''

میرب نے جواباً کہا تو وہ ہلکا سا چونکا اور بے اختیار ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔

''لاہور زندہ دل لوگوں کا شہر ہے، میرا ددھیال بھی وہیں پر ہے۔ میں بچپن میں بہت بار لاہور گیا ہوں، اندرونِ شہر کی خوب صورتی اور ثقافت میں اک انوکھا چارم ہے۔ جن کے عکس میرے ذہن کے پردے پر آج بھی تازہ ہیں۔ وہاں کی حلوا پوری اور فالودے مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ سوشل ورک میرا شوق ہے، یوں تو میں ایونٹ پلاننگ کے بزنس سے منسلک ہوں۔ یہ صبح سے شام والی جاب نہیں ہے اسی لیے تو میں آزادی سے گھوم پھر لیتا ہوں، میرا آبائی گھر برصا میں ہے وہاں سے روزانہ شپ میں بیٹھ کر استنبول جاتا ہوں۔ خیر تم بتاؤ کہ تم پاکستان کب جا رہی ہو؟'' وہ اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا۔ وہ توجہ اور یکسوئی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''منگل کو ہم پاکستان جا رہے ہیں۔۔۔ میں اس ٹرپ کو بہت یاد کروں گی کہ یہ میری زندگی کا یادگار ٹرپ ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔ وہ ذرا آگے کو جھکا اور کہنیاں میز پر رکھیں۔

''مجھے یقین ہے کہ تم دوبارہ یہاں ضرور آؤ گی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے۔۔۔ پُراسرار انداز میں مسکرایا۔ وہی دل آویز مگر چونکا دینے والی مسکراہٹ جس نے اسے اسیر کر لیا تھا۔ اس نے بے ساختہ پلکیں جھکا لیں۔

''پاکستان سے ترکی آنا کوئی آسان کام نہیں ہے، سارا سال جاب کر کے پیسے جمع کرنے پڑتے ہیں جناب۔۔۔'' اس نے روانی سے کہا۔

''کہاں جاب کرتی ہو تم؟'' اس نے توجہ سے پوچھا۔

''میں نے ایم بی اے کیا ہے اور میں ایک پرائیویٹ سوفٹ ویئر کمپنی میں جاب کرتی ہوں۔۔۔ کچھ دنوں کی چھٹیاں لے کر یہاں آئی ہوں۔۔۔ دراصل مجھے سیر و سیاحت میں بے حد دلچسپی ہے۔'' میرب نے بتایا۔

ویٹر دھواں اڑاتے ہوئے گرم، گرم سوپ کے پیالے لے آیا۔ ساتھ گندم کی ڈبل روٹی اور تلی ہوئی مونگ پھلیاں بھی تھیں۔

''جب انسان کسی سفر پر نکلتا ہے تو دراصل وہ کھوئی ہوئی خوشیوں کی جستجو میں نکلتا ہے۔۔۔ سکون ڈھونڈتا ہے، اسے سکھ کی نرمی کی خواہش ہوتی ہے اور یہ

بیاد معراج رسول

سعدیہ رئیس، کراچی

بہت بار سوچا کہ جناب معراج رسول صاحب کے لیے چند الفاظ لکھ ڈالوں مگر ہر کوشش قلم یہ دکھ لکھنے سے انکاری رہا۔ میں ان سے بذاتِ خود کبھی نہیں ملی ہاں مگر عذرا رسول کے مجسم وجود میں ہمیشہ معراج صاحب نظر آتے رہے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ کسی محفل میں عذرا جی نے ان کا ذکر محبت سے نہ کیا ہو۔ وہ وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ جب بھی عذرا رسول کی سجائی گئی محفل میں ان سے ملاقات ہوتی تو معراج صاحب کو ان کے ساتھ پایا۔ ان کی باتوں میں، سوچ میں، مسکراہٹ میں، فکر میں اور خیال میں وہی جھلکتے تھے۔

میں نے عذرا رسول کی باتوں سے ان کو جانا۔ ان کی بیماری کے دنوں میں ان کی حالت اور کیفیت سب کچھ عذرا کی زبانی سنا...... یہ ان دونوں کی آپس کی انسیت کا کمال تھا کہ معراج صاحب ان کے ساتھ اتنا عرصہ صرف سانس کی ڈوری سے بندھے رہے۔

معراج صاحب کے لیے آخر میں اتنا کہوں گی کہ وہ خود تو اس دنیا سے بے شک چلے گئے لیکن پاکیزہ، جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت کی صورت میں ان کا نام زندہ رہے گا۔

ایک عظیم شخصیت

حمیرا انجم، واہ کینٹ

دو سال قبل جب سماعت سے یہ خبر ٹکرائی کہ معراج صاحب اس دنیا میں نہیں رہے تو آنکھیں نم اور دل دکھی ہو گیا۔ معراج انکل کے لیے کچھ کہنے کے حوالے سے مجھے الفاظ نہیں مل رہے۔ اتنا کہوں گی ایک روشن چراغ سے

خواہش اسے دور دیس کا سفر کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ کیا تم واقعی یہاں سیر کرنے آئی ہو یا خوشیاں اور سکون تلاش کرنے آئی ہو؟'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بڑا عجیب سوال کر رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کی اداسی کو محسوس کر چکا تھا۔ میرب بری طرح چونکی۔

''کیا مطلب......؟'' ایک لمحے میں اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا...... وہ اس کی بات سن کر جیسے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ سکھ، خوشیاں، سکون کتنے اجنبی سے لفظ لگتے تھے۔ سمندر میں چھپے سیپ میں بند موتی کی طرح جو تھی مگر نا قابلِ رسائی...... وہ نظریں چراتے ہوئے سوپ کے پیالے سے اٹھتا دھواں دیکھنے لگی۔

''میں چہرے پر لکھے لفظ پڑھ لیتا ہوں......'' وہ غور سے اس کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

میرب کے اردگرد جیسے کوئی زلزلہ آیا تھا۔ وہ یونہی ساکت انداز میں بیٹھی رہی...... اسے یوں لگا جیسے اس کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وضاحتیں، تاویلیں سب اس کے ذہن سے محو ہو گئیں......'' وہ شخص کون تھا۔ کیا واقعی پیناڑم سے اس کا کوئی تعلق تھا......''

سوپ کے پیالے سے اٹھتا دھواں فضا میں عکس بناتے ہوئے تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اس سے نظریں نہ ملا پائی۔

''سوپ پیو، ٹھنڈا ہو رہا ہے، یہ مسور کی دال کا سوپ ہے اسے lentil soup کہتے ہیں اور یہ ترکی کا مشہور سوپ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں موسم سرما طویل ہوتا ہے، اس لیے گرم مشروبات جیسے سوپ، چائے، کافی کا رواج عام ہے۔'' وہ کچھ دیر اس کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے دانستہ بات بدل دی۔ اسے اس کی خاموشی سے احساس ہوا کہ اس نے کچھ زیادہ ہی فلسفیانہ بات کر دی تھی۔ کیا اس نے کوئی ایسا بھیانک جملہ بول دیا تھا جسے سن کر اس سنہری رنگت والی لڑکی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اسے ملال ہوا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے سوپ کے پیالے میں چمچ چلانے لگی۔

نومیت ہے؟" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔
اس کے دل میں اِک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ جملہ اس نے عام سے انداز میں کہا نہ ہوتا اس خواہش کے ادراک نے اسے خوفزدہ کردیا۔ وہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔
"سوپ کیسا ہے؟" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔ وہ بمشکل مسکرائی۔
"اچھا ہے، مونگ، مسور کی دال پاکستان کے ہر گھر میں بنتی ہے۔ پاکستان جا کر میں اپنے کزنز کو بتاؤں گی کہ میں نے انقرہ میں مسور کی دال کا سوپ پیا تھا تو وہ میرا بہت مذاق اڑائیں گے۔" میرب نے سوپ پیتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی بات سن کر محظوظ ہوا۔
"تمہارے کزنز تمہارے ساتھ ہی رہتے ہیں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔
میرب کی مسکراہٹ یک دم سمٹ گئی اور چہرے پر سایہ سا لہرایا۔
"میں اُن کے ساتھ رہتی ہوں۔" اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔
"اور تمہارے پیرنٹس......؟" اس نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے نظریں چرا لیں۔ اس سوال کا جواب دینا اس کے لیے شروع سے ہی مشکل رہا تھا۔
"جب میں چھوٹی تھی تو میرے والدین میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ بعد میں میرے بابا کا انتقال ہوگیا اور میری ممی امریکا چلی گئیں۔ میں اپنی خالہ کی فیملی کے ساتھ رہتی ہوں......" اس نے بھاری ہوتے دل کے ساتھ مدھم آواز میں بتایا۔ وہ لوگوں کے سامنے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جھجکتی تھی۔ ہر شخص کا اتنا آئی کیو لیول نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کی ذاتی زندگی کی الجھنوں کو سمجھ سکے...... عقلمند لوگ بڑی محنت سے بھرم کی دیوار بناتے ہیں تاکہ اپنے گھروندے کے شگاف چھپا سکیں۔
اس نے شیشے کی کھڑکی کے پار دیکھا۔ بارش تھم چکی تھی۔
"میں چلتی ہوں......" میرب نے کرسی پر پڑے شاپرز اٹھا لیے۔
"میں چھوڑ آتا ہوں تمہیں...... یہاں کی سڑکیں تقریباً ایک جیسی ہیں، کہیں غلط موڑ مڑ گئیں تو راستے میں کہیں کھو جاؤ گی۔" اس نے نرمی سے کہا۔ یہ خیال رکھنے والا انداز تھا۔ پھر وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔
بارش میں بھیگی سڑک پر چلتے ہوئے وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔
انقرہ، ترکی کا دارالحکومت ہے اور اسلام آباد جیسا ہی لگتا ہے۔ ہملی اسٹریٹ کے بازار میں بڑی رونق تھی۔ مین روڈ کے اطراف زیادہ تر وہاں کے روایتی عروسی ملبوسات کی دکانیں تھیں...... سفید موتیوں سے سجے جالی اور فرل والے لباس شیشوں کے ریک میں سجے تھے۔ جگہ جگہ ترکی کا سرخ و سفید پرچم لہرا رہا تھا۔
وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی جا رہی تھی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کے دل میں جھانکا تھا اور جو اس کے چہرے پر لکھے لفظ پڑھ سکتا تھا۔ بھلا وہ اس سے کیسا نہ متاثر ہوتی۔
وہ چلتے ہوئے یک دم رکا...... اور ایک جیولری شاپ کے سامنے ٹھہر گیا۔
"کیا تم نے سلطان نائٹ کی رنگ لی ہے؟ یہ ترکی کا مشہور پتھر ہے جو روشنی کے ساتھ رنگ بدلتا ہے؟" اس نے جیولری شاپ کے پاس رکتے ہوئے اس سے...... بے ساختہ پوچھا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔
"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں......" وہ اسے لیے شاپ میں چلا آیا۔ اس نے سفید بالوں والے ادھیڑ عمر جیولر سے ٹرکش زبان میں کچھ بات کی تو جیولر خوش دلی سے ٹائف مختلف چمکتی دمکتی انگوٹھیاں دکھانے لگا۔
"سلطان نائٹ ترکی کے قیمتی پتھر کا نام ہے جو ترکی کے ہی پہاڑوں کی کانوں سے نکلتا ہے...... یہ پتھر روشنی کے ساتھ رنگ بدلتا ہے، کبھی یہ گلابی ہو جاتا ہے، کبھی سبز تو کبھی جامنی اس میں بہت سے ڈیزائن ہیں، تم پسند کرلو...... ترکی آنے والے لوگ اس انگوٹھی کو

ضرور خریدتے ہیں۔ اسے یہاں کا souvenir (کسی ملک کی خاص روایتی چیز) سمجھا جاتا ہے۔'' وہ اسے بتا رہا تھا۔ اور وہ حیرت اور دلچسپی کے ساتھ شیشے کے ڈبے میں بجی مختلف ڈیزائن کی انگوٹھیاں دیکھتی رہی پھر اس نے چوکور پتھر والی ایک انگوٹھی اٹھائی۔

''مجھے یہ انگوٹھی پسند آئی ہے مگر یہ ذرا ڈھیلی ہے مگر کوئی بات نہیں میں پاکستان جا کر اپنے جیولر سے ٹھیک کرالوں گی۔'' اس نے وہ انگوٹھی اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنتے ہوئے کہا۔

اور جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور انگوٹھی میں جڑے پتھر پر ٹیوب لائٹ کی روشنی بہت واضح انداز میں پڑنے لگی تو پتھر کا رنگ پلک جھپکتے ہی بدل گیا اور گلابی نظر آنے والی انگوٹھی یک دم جامنی ہوگئی۔

''ارے اس پتھر کا رنگ تو واقعی بدل گیا ہے۔'' وہ ایکسائٹڈ انداز میں بولی۔

آبان اس کی ایکسائٹمنٹ دیکھ کر مسکرایا پھر وہ جیب سے والٹ نکالتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

''یہ کتنے کی ہے؟'' میرب نے جلدی سے پوچھا مگر وہ ادائیگی کر چکا تھا۔

''یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا مگر وہ متامل تھی۔

''مگر یہ مناسب نہیں ہے۔ اس کی کیا پرائس ہے؟ مجھے بتادو، میں پے منٹ کردیتی ہوں......'' اس کے انداز میں جھجک در آئی۔ وہ شروع سے ہی بے حد خوددار اور انا پرست تھی۔

آبان نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"a thing of beauty is a joy forever" (John keats)

اس کی آواز کے فسوں نے اسے متاثر کردیا۔

''یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ میں بے حد خوب صورت لگ رہی ہے اور بخت و نگار اسے تجھے کی خوب صورتی کم ہوجاتی ہے۔'' وہ دو قدم اس کی طرف بڑھا

اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کی نظر اس کی نگاہ سے ملی...... اس کی نگاہوں میں جذبات کی شدت تھی۔

اس کی نظریں صرف اس کے چہرے کو ہی نہیں بلکہ اس کے دل کو بھی چھو لیتی تھیں۔ ہر مرد کی نگاہ عورت کے دل کو نہیں چھو پاتی اور بات بھی یہی ہوتی ہے جب مرد کی نگاہ عورت کے دل کو چھولے تو دل اسی کا ہو جاتا ہے۔

وہ دونوں شاپ سے باہر آئے تو شام ڈھل رہی تھی۔ انقرہ کی بھیگی سڑکوں پر اس کی ہمراہی میں چلتے ہوئے وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی...... اسے یہ سفر خوابناک لگ رہا تھا۔ ورجینیا وولف اور جین آسٹن کے ناول پڑھتے ہوئے وہ بھی کسی محبت کرنے والے شخص کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ اس کے بھی وہی خواب تھے جو سب لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ خوب صورت زندگی، محبت کرنے والا شوہر اور خوشیوں کی برسات...... کچھ زیادہ تو نہیں مانگا تھا اس نے۔ محبت کی تشنگی کے معاملے میں سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

راستے میں وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا پھر اس نے اسے ہوٹل کے دروازے تک چھوڑا۔ وہ کمرے میں آئی تو ضوبیا کب کی آچکی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''میرب! تم بازار میں اچانک کہاں گم ہوگئی تھیں؟ میں نے تمہیں مختلف دکانوں میں تلاش کیا مگر مجھے تم کہیں نظر نہیں آئیں۔ پھر میں نے یہی سوچا کہ آؤ گی تو خیر تم ہوٹل ہی؟''

میرب نے سارے شاپنگ بیگز میز پر ترتیب سے رکھے۔ ضوبیا نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر انوکھے رنگ تھے۔

''بارش ہو رہی تھی تو میں کچھ دیر کے لیے ایک کیفے میں بیٹھ گئی پھر بارش ذرا تھمی تو میں وہاں سے باہر آئی... راستے میں مجھے ایک جیولری شاپ نظر آئی۔ میں نے وہاں سے سلطان نائٹ کی یہ رنگ خریدی...... دیکھو اس پتھر کا رنگ روشنی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔''

اس نے ضوبیا کو ہاتھ میں پہنی انگوٹھی دکھاتے ہوئے ایکسائٹڈ انداز میں کہا۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور چہرے پر اک انوکھا سا عکس تھا جس نے اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ انگوٹھی کے وسط میں جڑے پتھر کو رنگ بدلتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ بات اس انگوٹھی کی نہیں تھی۔ اہمیت تو دراصل تحفہ دینے والے کی ہوتی ہے۔

''یار میں نے بھی ایسی رنگ لینی ہے۔ میں نے سلطان تائٹ کی رنگز کے بارے میں سنا ہوا ہے۔ کوئی بتا رہا تھا کہ یہ استنبول کے گرینڈ بازار سے بھی مل جاتی ہیں۔ اب تو بارش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ باہر جانا ناممکن ہے۔ میں استنبول سے ہی لے لوں گی۔'' ضوبیا نے اشتیاق سے کہا۔

میرب نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ شام ڈھل چکی تھی اور انقرہ کی شفاف سڑکیں بارش میں بھیگتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ملاقات اسے کسی خواب کی طرح لگ رہی تھی۔ انقرہ کا بھیگا موسم، دال کا سوپ، رنگ بدلتے پتھر کی انگوٹھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی خواب سفر سے واپس آئی ہے۔ وہ اپنے احساسات خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایسی کیا بات تھی آبان کی شخصیت میں جو اسے مقناطیس کی طرح کھینچتی تھی کہ اسے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔

وہ لوگ صبح صبح برصا کے لیے روانہ ہوئے تو وہ بس میں بیٹھی کھڑکی کے شیشے کے پار نظر آتے زیتون کے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے آبان کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ اولڈ ہاؤس آف برصا کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ برصا ترکی کا قدیم شہر ہے اور قدیم تاریخ کے اثرات ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ Green Mosque دیکھنے کے بعد وہ لوگ شام کو سلک مارکیٹ گئے، وہ کچھ دیر غائب دماغی کے عالم میں سلک مارکیٹ کی دکانوں میں بجی مختلف چیزیں دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ابھی ان کے پاس یہاں شاپنگ کے لیے دو گھنٹے تھے۔

وہ خاموشی سے واپس مڑی اور سبک رفتاری سے چلتے ہوئے پارکنگ ایریا کے پاس آئی جس کے دوسری طرف رہائشی کالونی تھی اور وہاں جنگل نما باغوں والے پرانے زمانے کے طرز کے گھر بنے ہوئے تھے۔

وہ چلتے ہوئے ذرا آگے آ گئی۔ درختوں کے درمیان تنگ سڑک گزرتی جا رہی تھی۔ راستے کے اطراف گلابی پھولوں کا جنگل تھا۔ وہ ونڈر لینڈ کی ایلیس کی طرح حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پھولوں سے بھرے جنگل میں بنے راستے پر چلتی چلی گئی۔ دفعتاً اسے کسی ساز کی دھن سنائی دی۔ اس کا دل بے ساختہ دھڑکا کہیں کوئی مدھر موسیقی کی تانیں بکھیرتا ساز بجا رہا تھا۔ وہ آواز کے تعاقب کی سمت میں چلی اور آواز قریب ہوتی گئی۔

ایک موڑ مڑتے ہی اس کی نظر بڑی، بڑی سفید کھڑکیوں والے گہرے اینٹوں والے گھر پر پڑی۔ جس پر ترکی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور پچھلی طرف والے باغیچے میں ٹولپ کے رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ کوئی برآمدے میں بیٹھا محبت سے ساز بجا رہا تھا۔

باغ کی چار دیواری نہیں تھی، چاروں طرف سبز جھاڑیوں کی چھوٹی سی باڑ تھی اور اندر جانے کا راستہ بنا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ بے اختیار رکا اور اس کے چہرے پر خوشی کا عکس نمودار ہوا۔ اس نے ساز میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور گرم جوشی سے پرتپاک انداز میں اس کے استقبال کے لیے اس کی طرف بڑھا۔

''خوش آمدید مجھے پتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔''

وہ خوشی سے معمور کھنکتی آواز میں یقین بھرے انداز میں بولا۔ اس کی آواز میں ایسا مان تھا جس کا تعلق محبت سے ہوتا ہے۔ وہ بے ساختہ مسکرائی اور آہستگی سے چلتے ہوئے اس خوب صورت باغ میں آ گئی۔

ہلکے گلابی رنگ کی لانگ اسکرٹ پر سفید بلاؤز پہنے بالوں میں پھولوں والا ہیئر بینڈ لگائے وہ اسے باغ میں

آنے والی کوئی شہزادی محسوس ہوئی۔ اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں سلطان نائٹ کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

آبان نے عزت افزائی کے سے انداز میں اس کے لیے کرسی آگے کی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''مجھے یوں لگ رہا ہے کہ آج میرے گھر اک شہزادی آئی ہے۔'' خوشی اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

سرسبز باغ ٹیولپ کے خوب صورت پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ جامنی پھولوں کے پاس رکھی سفید رنگ کی میز پر چائے کی خوش رنگ پیالیاں اور چینک کے ساتھ وہاں کی مشہور مٹھائی ٹرکش ڈیلائٹ اور تازہ اسٹرابیری سے بنا اسٹرابیری چیز کیک رکھا تھا۔

اسے یقین تھا کہ وہ یہاں ضرور آئے گی اسی لیے تو اس نے اتنا اہتمام کیا تھا اور خود وہ بھی نک سک سے تیار تھا۔ سفید ڈریس شرٹ اور گرے رنگ کا پینٹ کوٹ پہنے.... سفید اور گرے چیک والی ٹائی لگائے۔ وہ بے حد ہینڈسم لگ رہا تھا۔ بال سلیقے سے بنے تھے، جوتے چمک رہے تھے۔ اس کی آمد پر وہ یوں تیار ہوا تھا جیسے انسان کسی وی آئی پی شخصیت کی آمد پر تیار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی کا انوکھا رنگ تھا۔ اور سحر انگیز آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ اس لمحے میرب نے آبان کے دل میں اپنی جگہ کو بھی دریافت کر لیا تھا۔ وہ کسی ملکہ کی سی آن بان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

باغ کے کونے میں فوارہ نصب تھا جس میں سے شفاف پانی گرتا جا رہا تھا اور جس کی دیوار پر خوب صورت پروں والے پرندے بیٹھے تھے۔

''تم بہت اچھا ساز بجاتے ہو، اس ساز کو کیا کہتے ہیں؟'' اس نے میز پر پڑے سلور رنگ کی تاروں والے لکڑی کے ساز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اسے بلما کہتے ہیں اور یہ ترکی کا مشہور و معروف اور روایتی ساز ہے۔ اسے بجانے کے لیے مخصوص مہارت چاہیے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... میں نے ٹرکش ڈراموں میں اکثر لوگوں کو ایسا ساز بجاتے دیکھا ہے۔'' اس نے ساز کی تاروں کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا۔ اک مدھم آواز گونج کر معدوم ہو گئی۔

''تم لوگ بھی ٹرکش ڈرامے دیکھتے ہو؟'' اس نے بے اختیار ابرو اچکا کر اسے دیکھا پھر ہولے سے ہنس دیا۔

''ہاں محتشم حیز دل (میرا سلطان) اور ارطغرل غازی تو میرے فیورٹ ڈرامے ہیں۔ مجھے سلطنتِ عثمانیہ کے جاہ و جلال کا مرکز توپ کاپی محل اور مولانا روم کا قونیہ دیکھنے کی خواہش تھی۔ ہم استنبول میں ایک ہی دن ٹھہرے تھے اور سب جگہیں نہیں دیکھ پائے۔ کل ہم دوبارہ استنبول جائیں گے تو توپ کاپی محل بھی دیکھ لیں گے۔'' اس نے فوارے کے پاس کھلے ٹیولپ کے پھولوں کے گرد اڑتی تتلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

آبان مہمان نوازی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ بغیر دودھ والی چائے جو قہوے کی طرح تھی اور جس میں چینی بھی نہیں تھی، چینک پر اونی کروشیے سے بنا دیدہ زیب ٹی کوزی کور چڑھا ہوا تھا۔ یقیناً اس کی والدہ بے حد سلیقہ مند خاتون تھیں اور ویسی ہی بہترین ہنر مندی اس باغیچے میں بھی جھلک رہی تھی۔ اس نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔ وہ اس کی خوب خاطر تواضع کر رہا تھا۔ ایسا پروٹوکول دینے والا میزبان اس نے پہلی بار دیکھا تھا جو یوں خوشی، خوشی اس کے ناز نخرے اٹھا رہا تھا۔

''اور پرسوں تم لوگ پاکستان واپس چلے جاؤ گے؟'' اس کی گمبھیر آواز مدھم پڑ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی آواز میں اداسی کا رنگ تھا۔

''ہاں، صبح نو بجے کی فلائٹ ہے، ہم کچھ دیر جدہ میں رکیں گے پھر وہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔'' اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

آبان نے اس کی پلیٹ میں کیک کا ٹکڑا رکھتے ہوئے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں بھی پاکستان آؤں گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہرے لہجے میں بولا۔

"ہاں پاکستان میں تمہارے رشتے دار بھی تو رہتے ہیں ناں..." اس نے بالوں میں لگا پھولوں کا بینڈ ٹھیک کرتے ہوئے روانی سے کہا۔

"رشتے داروں سے ملنے نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لیے آؤں گا۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز میں عجب سا اسرار تھا۔

میرب کے ہاتھ میں تھاما کپ لرز گیا اور دل کی دھڑکن یک دم تیز ہوگئی۔ بعض دفعہ لفظوں سے زیادہ لہجے اہم ہوتے ہیں۔ اور اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس کی روشن آنکھوں میں انجانا سا چمکتا ہوا سا عکس تھا۔ میرب کو یوں لگا شاید وہ محبت کا عکس تھا۔ محبت کے عکس کی ایک ہی پہچان ہوتی ہے، وہ دیکھنے والے کو بنا اظہار کیے بھی واضح نظر آجاتا ہے۔

"کس مقصد کے لیے؟" وہ پلکوں کو جھپکاتے ہوئے خود کو یہ سوال کرنے سے نہ روک پائی۔

وہ مبہم انداز میں مسکرایا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر اک رنگ اترا تھا پھر اس نے میز پر پڑا ساز اٹھالیا۔

"اسے سرپرائز ہی رہنے دو.... چلو میں تمہیں ایک روایتی گیت سناتا ہوں جسے ترکی کے مشہور گلوکار عاشق مزین نے گایا تھا۔" اس نے کہتے ہوئے مہارت سے ساز بجانا شروع کیا۔ موسیقی کی دھن میں ردھم تھا وہ اپنی خوب صورت سحر انگیز آواز میں گیت گا رہا تھا۔

"میں ایسا ہی عاشق ہوں
میرے غم میرے خزانے ہیں
میری مشکلات میرا اثاثہ ہیں
میں اپنے غم کسی کو بتا نہیں سکتا
میری قسمت ہی ایسی ہے
میں اسے مٹا نہیں سکتا.....
وہ مجھے بےنوش کہتے ہیں انہیں کہنے دو
میں نہیں جانتا کہ میں بےنوش کیوں بنا
ہاں میں بےنوش ہوں غم اور دکھ کے نشے کا"

وہ فوارے سے گرتے شفاف پانی کو دیکھتے ہوئے محویت سے یہ گیت سن رہی تھی۔ فوارے کی دیوار کے پاس خوب صورت پرندے اپنے پر پھیلائے بیٹھے تھے۔ پھولوں کے گرد تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ گو کہ وہ گیت کا مطلب تو نہیں سمجھ سکتی تھی مگر آبان کی گمبھیر اور مسحور کن آواز، سر، تال، ردھم نے اسے مسمرائز کردیا تھا۔ اس کی آواز صرف خوب صورت ہی نہیں تھی بلکہ اس آواز کی زنجیر نے اس کے دل کو اسیر کرلیا تھا۔

اسے کالج کے زمانے میں پڑھی گئی ولیم ورڈز ورتھ کی ایک نظم the solitary repair یاد آگئی جس میں شاعر نے ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ کہ ایک مرتبہ شاعر کسی پہاڑی علاقے سے گزر رہا تھا اور اس نے راستے میں ایک لڑکی کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اجنبی زبان میں کوئی گیت گاتے دیکھا تو وہ وہیں ٹھہر گیا۔ وہ اس گیت کے بول تو نہیں سمجھ پا رہا تھا مگر اس لڑکی کی مدھر، سریلی آواز نے اسے وہاں رکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس خوب صورت باغ میں بیٹھے ہوئے آبان کا گیت سنتے ہوئے اسے ورڈز ورتھ کی وہ نظم یاد آگئی۔ یک دم پھولوں کی بیلوں سے سجا لکڑی کا دروازہ کھلا اور آبان کی ممی باہر آئیں۔ اس نے چونک کر اس سمت دیکھا اور پھر.... بےساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ وہ پھولوں والے لمبے اور گھیر دار اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس سرخ وسفید رنگت والی فربہی مائل مگر دراز قد خاتون تھیں۔ انہوں نے سر پر اسکارف باندھا ہوا تھا اور ہاتھ میں اک تحفہ تھاما ہوا تھا۔

"ممی یہ میرب ہے۔" آبان بھی احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ جس والہانہ انداز میں اس کا تعارف کروایا وہ دیکھنے والوں کو بھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ صرف میرب نہیں تھی بلکہ وہ آبان کی میرب تھی۔ خاتون بڑے وقار کے

ساتھ مسکرائیں۔

"السلام علیکم......" اس نے ان کے قریب آنے پر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام......کیسی ہو میرب......؟ گھر والے کیسے ہیں؟ بیٹھو......" ان کے انداز میں خوشی کے ساتھ رعب اور وقار بھی تھا اور وہ اسے غور اور توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"جی میں ٹھیک ہوں، ترکی کا سفر ہمارے لیے ایک یادگار سفر ہے، سفر کرتے ہوئے انسان مختلف ملکوں کی ثقافت اور کلچر کی خوب صورتی کو محسوس کرتا ہے۔" اس نے خوشدلی سے کہا۔

"ہمارے ملک میں مختلف قوموں کے لوگ سیاحت کی غرض سے آتے ہیں مگر پاکستانیوں کو دیکھ کر ہمیں دل سے خوشی ہوتی ہے۔ میں نے زندگی کے بہت سال پاکستان میں گزارے ہیں اور آج بھی ہم پاکستان کی ثقافت کو یاد کرتے ہیں۔ پاکستانی سادہ مزاج، مہمان نواز اور محبت کرنے والے لوگ ہیں، غیر ملکیوں سے ملتے وقت بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہیں جب میں پاکستان جایا کرتی تھی تو محلے کے لوگ خوشی، خوشی مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ مجھے دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتے، میرے پاس بیٹھتے، مجھے اردو سکھانے کی کوشش کرتے، ایک خاتون باقاعدہ مجھے اردو لکھنا اور پڑھنا سکھاتی تھیں۔ ایک ہمسائی خاتون میرے لیے کپڑے سلائی کرتی تھیں۔ ہم ترک لوگ فطری طور پر بہادر اور جنگجو ہوتے ہیں، ایک دفعہ جو فیصلہ کر لیتے ہیں اس پر کبھی نہیں پچھتاتے۔ آبان کے بابا سے علیحدگی ایک مختلف باب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں باقی پاکستانیوں کی محبت اور خلوص کو بھلا دوں......" وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پاکستان میں رہنے کی تفصیل بتانے لگیں۔

"لاہور سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ زندہ دل لوگوں کی بستی کی رونقیں آج بھی میری یادوں کے شہر میں آباد ہیں۔ اندرون شہر میں آبان کی دادی کی بڑی سی حویلی ہوا کرتی تھی جسے چاند حویلی کہا جاتا تھا جو آبان کی دادی چاند بیگم کے نام کی وجہ سے مشہور تھی۔ حویلی کے ساتھ نان خطائی کی دکان بھی تھی۔ آبان کی دادی جب تک زندہ رہیں خود نان خطائیاں بنایا کرتی تھیں۔ تہواروں پر رونق میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔ ڈھولک بجتی تھی، گیت گائے جاتے تھے۔ محلے والے ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ مجھے وہاں بہت محبت اور عزت ملی۔ میں پاکستانیوں کے خلوص اور اپنائیت کو کبھی بھول نہیں پائی کہ محبتوں کے رنگ گہرے ہوتے ہیں۔ زمانوں کا فرق اور برسوں کی طوالت بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔" آبان کی ممی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔ میرب بری طرح چونکی، اس کے چہرے کا رنگ یک دم بدلا تھا اور آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی در آئی۔ اندرون شہر، نان خطائی کی دکان، چاند حویلی...... کتنے شناسا نام تھے۔ یک دم ماضی کا دروازہ کھلا اور وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے حیرت زدہ تھی۔

"آبان کے والد کا کیا نام تھا؟" اس نے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

"عارفین احمد۔" جواب آبان نے دیا تھا۔

"عارفین ماموں!" میرب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس انداز اور اک نئے رشتے کے انکشاف پر آبان اور ممی دونوں چونک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"عارفین ماموں تو میرے رشتے دار ہیں۔ رشتے میں میری ممی کے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں۔ برسوں پہلے انہوں نے ترکی میں شادی کی تھی مگر بعد میں یہ شادی ختم ہوگئی تھی۔ بچپن میں، میں اپنی ممی، نانی اور خالہ کے ساتھ چاند حویلی جایا کرتی تھی مگر بعد میں وہ حویلی بک گئی اور عارفین ماموں کی فیملی بھی کسی دوسرے علاقے میں شفٹ ہوگئی۔" اس نے جوش و خروش بھرے انداز میں بتایا۔

"کیا نام ہے تمہاری ممی کا؟" آبان کی ممی نے بے ساختہ پوچھا۔ خود آبان بھی اس اتفاق پر حیران تھا۔

"نوشابہ..... میری ممی کا نام نوشابہ ہے اور میری خالہ ڈاکٹر آصفہ ہیں۔" میرب نے اسی انداز میں جواب دیا۔

ممی کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور آنکھوں میں اِک چمک سی ابھری۔

"اچھا! تو تم نوشابہ کی بیٹی ہو۔ وہ تو اپنی دوسری شادی کے بعد امریکا چلی گئی تھی۔" آبان کی ممی اسے پہچان چکی تھیں۔

"جی ہاں، میں آصفہ خالہ کے ساتھ رہتی ہوں۔" اس نے سر کو خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

"دنیا گول ہے، small world، یہ ایک حیرت انگیز اور عجیب اتفاق ہے۔ نوشابہ اور ہم بھی بچپن میں کبھی ملے [illegible] لگتے ہوئے [illegible] اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ یوں جیسے برسوں بعد انسان کسی اپنے سے ملا ہو۔" آبان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔" [illegible] بچپن کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئی تھیں جن میں سرخ و سفید رنگت اور چاکلیٹ براؤن بالوں والے ایک خوب صورت بچے کا عکس بے حد واضح تھا۔

"تمہاری نانی بہت اچھی اور شفیق خاتون تھیں۔ اکثر چاند حویلی آیا کرتیں تو میرے پاس بیٹھا کرتیں، میرے لیے تحفے لے کر آیا کرتی تھیں۔ نوشابہ اور آصفہ سے میری بہت دوستی ہوا کرتی تھی۔ ہم اکثر فارسی میں باتیں کیا کرتے تھے۔" آبان کی ممی بے ساختہ مسکرائیں۔ میرب چونکی۔

"کیا ممی اور آصفہ خالہ کو فارسی آپ نے سکھائی تھی؟" وہ حیران کن انداز میں بولی۔

"یہی سمجھ لو۔ انہوں نے مجھے اردو سکھائی اور میں نے انہیں فارسی سکھائی۔" ممی نے مسکرا کر کہا۔

میرب بے ساختہ ہنس دی۔ یہ راز تو اسے آج معلوم ہو رہا تھا۔

"مگر پھر وقت بدل گیا اور میں اور آبان ہمیشہ کے لیے ترکی آ گئے۔ بہت سال پاکستان نہیں جا سکے یہاں تک کہ عارفین اور میں علیحدہ ہو گئے مگر لاہور صرف عارفین کا ہی نہیں ہے۔ میرا اور آبان کا بھی ہے۔"

وہ ایک بااعتماد اور بہادر خاتون تھیں۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی، مشکلات کا ہمت سے مقابلہ کرنے والی..... روشن خیال شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ بھی ان کی شخصیت کے رعب کے زیرِ اثر آ گئی۔ میرب کو ان کی باتیں سن کر خوشی ہوئی۔

"مجھے بھی یہاں آ کر بہت اچھا لگا ہے، یہاں کی خوب صورتی میں ایسی کشش ہے جو میلوں دور بیٹھے لوگوں کو بھی اپنی جانب کھینچتی ہے۔ آپ کا لان بہت خوب صورت اور آرٹسٹک ہے۔ اور یہ کروشیے سے بنے ٹی کوزی کور بھی بہت محنت سے بنائے گئے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"میں سمجھی کہ تم آبان کے بارے میں کوئی بات کرو گی؟" دونوں ماں، بیٹا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ وہ اس انداز کو سمجھ نہ سکی۔

"جی، جی... یہ بھی اچھے ہیں۔" وہ اٹک گئی۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ مزید ان کے بارے میں کیا کہے..... کیسے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ دونوں ایک بار پھر ہنس دیے۔ وہ ہونقوں کی طرح انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اپنا آپ احمق محسوس ہوا۔

ممی نے اسے دیکھتے ہوئے آبان سے ترکش زبان میں کوئی جملہ کہا۔ وہ اس کا مطلب تو نہیں سمجھ پائی مگر اسے اندازہ تھا کہ وہ جملہ اسی کے بارے میں تھا پھر انہوں نے اس کی جانب تحفہ بڑھایا۔

"یہ تحفہ تمہارے لیے ہے، تم پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو، امید ہے کہ یہ تحفہ تمہیں پسند آئے گا اور تمہیں ترکی کے سفر کی یاد دلاتا رہے گا۔" ان کے انداز میں وضع داری تھی۔

"شکریہ....." اس نے مسکرا کر کہا۔

وہ کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھی رہیں اور چائے پینے کے دوران ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتی رہیں۔

انہیں آج بھی پاکستان کے بے شمار قصے یاد تھے۔ پھر وہ کسی کا فون سننے اندر چلی گئیں۔ آبان نے گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے میرب سے کہا۔

''چلیں......؟ سلک مارکیٹ سے تمہارے گروپ کے لوگ واپس آگئے ہوں گے۔'' اس کے انداز میں فکرمندی تھی۔

''ہاں چلو......'' وہ تختہ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے پھولوں کے جنگل کے درمیان گزرتے راستے پر اس کے ہمراہ چلتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ کسی خواب سفر پر نکلی ہو۔

''کیا سوچ رہی ہو......؟'' وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے بولا۔

''سوچ رہی ہوں کہ یہ جگہ کتنی خوب صورت ہے کہ اس کی خوب صورتی نے مجھے مسمرائز کر دیا ہے۔'' اس نے راستے کے اطراف کھلے پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور میں یہ کہوں گا کہ میرب کہ تمہاری خوب صورتی نے مجھے مسمرائز کر دیا ہے۔ حالانکہ میں نگر نگر پھرنے والا مسافر ہوں۔ مگر پہلی بار میرا دل کہیں ٹھہرا ہے۔'' وہ گہرے لہجے میں بولا۔

اتنا واضح اظہار اس کے لیے خلافِ توقع تھا۔ اس نے بھلا کب کسی مرد کے منہ سے ایسے جملے سنے تھے۔ اظہار کا لمحہ آگیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اسے یوں لگا جیسے فلک پر کہکشاں اتر آئی ہے اور پھولوں کے جنگل میں جگنو چمک رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔ وہ ان معاملات میں ایسی کند ذہن واقع ہوئی تھی کہ اس خوب صورت اظہار کا ڈھنگ سے جواب بھی نہ دے سکی۔ اس کے دل میں کہیں یہ احساسِ کمتری بھی موجود تھا کہ کوئی شخص اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اب تک وہ لوگوں کی جو باتیں سنتی ہوئی آئی تھی ان کا اثر بھی کہیں لاشعور میں موجود تھا۔

''کچھ کہو گی نہیں......؟'' وہ دھیرے سے بولا پھولوں کے جنگل کو دیکھتے ہوئے وہ چونکی۔

''بہت کم لوگوں نے میری تعریف کی ہے۔ اسی لیے مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں......'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا اب تک تم بدذوق لوگوں کے درمیان رہتی رہی ہو؟'' وہ آہستہ سے ہنسا۔ اس کا اندازہ پھر درست نکلا تھا۔

''کبھی، کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم لوگوں کو ہپنا ٹائز کرنا جانتے ہو، تم بہترین قوتِ مشاہدہ کے حامل ہو...... بہت سی باتیں وضاحتوں کے بغیر ہی سمجھ لیتے ہو......'' درختوں کے درمیان گزرتے راستے پر چلتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اس کی بات سن کر محظوظ ہوا۔

''یہ تمہارا خیال ہے، میں اس حوالے سے کوئی

راہ نہیں دوں گا۔'' وہ پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مبہم سے انداز میں بولا۔ یک دم وہ کسی خیال سے چونکی۔

''تمہاری ممی ترکش میں کیا کہہ رہی تھیں؟ شاید وہ میرے بارے میں کوئی بات کر رہی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

وہ پھر ہنسا۔

''وہ کہہ رہی تھیں کہ میرب کتنی سادہ لڑکی ہے، تمہیں کہاں سے مل گئی۔ چونکہ انہوں نے بہت عرصہ پاکستان میں گزارہ ہے اس لیے وہ کہتی ہیں کہ پاکستانی خواتین بہت سادہ ہوتی ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے انہیں باہر کی دنیا کے بارے میں زیادہ پتا نہیں چل پاتا اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے بارے میں ان کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں پارکنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

میرب نے دور سے دیکھا اس کے گروپ کے لوگ بس میں سوار ہو رہے تھے۔ ان کا گائڈ بس کے قریب کھڑا، سیٹی بجاتے ہوئے لوگوں کو بس میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

''بس اب میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے دانستہ اسے وہیں روک دیا۔

''اوکے ..... میں بھی کل استنبول آؤں گا۔'' اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ یہ اظہار کی کڑی کا دوسرا جملہ تھا۔

''میں انتظار کروں گی۔'' میرب نے اس کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں نے یہ جملہ کہا اور کچھنے والا بجھ گیا۔ پھر وہ جا کر بس میں بیٹھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ کسی فیری ٹیلز میں پڑھی کہانی کا سفر کر کے آئی ہے۔ لالہ کے پھولوں والا برصا کا پرانا گھر، پھولوں کے جنگل سے گزرتے ہوئے راستے، ساز اور گیت اور دل کی باتیں کرنے والے اک شخص کی ہمراہی، ہوٹل آ کر بھی وہ اس ماحول کے ٹرانس میں رہی۔

اس نے آبان کی ممی کا دیا گیا گفٹ کھول کر دیکھا۔ وہ اون سے بنا ہوا ایک خوب صورت سوئٹر تھا۔ یہ تحفہ بھی اس کے لیے قیمتی تھا۔ وہ کچھ دیر اس سوئٹر کو چھو کر دیکھتی رہی پھر اس نے اسے تہ کر کے اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اگلے دن جب وہ لوگ برصا سے استنبول کے لیے بحری جہاز میں روانہ ہوئے تو وہ دھوپ میں چمکتے نیلے پانی کے سمندر کو دیکھتے ہوئے مسلسل آبان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

بحری جہاز سمندر کے پانی میں لکیریں بناتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ برصا سے استنبول تک سمندر کے راستے اور سڑک کے راستے دونوں طریقوں سے جایا جاتا ہے۔ ان کے گائڈ نے خصوصی طور پر ان لوگوں کے لیے سمندری سفر کا اہتمام کروایا تھا تاکہ وہ لوگ نیلے پانیوں کے سفر کی خوب صورتی کو محسوس کر سکیں۔ وہ جہاز کے عرشے پر لگے جنگلے کے قریب کھڑی تھی۔

سمندر کی سطح سے بلندی پر سی گلز (سفید سمندری پرندے) پر پھیلائے فضا میں اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہ منظر بے حد خوب صورت تھا۔

''کتنا حسن ہے یہاں .....'' اس نے بے اختیار سوچا۔

یک دم ایک بازگشت اس کے دل میں گونجی۔

''تمہاری خوب صورتی نے مجھے مسرائز کر دیا ہے حالانکہ میں نگر نگر پھرنے والا مسافر ہوں مگر پہلی بار میرا دل کہیں ٹھہرا ہے۔'' اس آواز کو سنتے ہوئے وہ چونکی..... یہ آواز اس کے دل میں کہیں قید ہو گئی تھی۔ استنبول پہنچ کر وہ بے اختیار ارد گرد چلتے پھرتے لوگوں میں اسے تلاش کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا تو وہ ضرور آئے گا۔

توپ کاپی محل میں مسلمانوں کے لیے بے شمار زیارتیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ کی متبرک چیزیں، موئے مبارک، انبیائے کرام کی چیزیں اور دیگر مقدس تبرکات بھی موجود تھے۔

توپ کاپی محل آج بھی فنِ تعمیر کا شاہکار اور جاہ و جلال کا مرکز تھا۔ اس محل کے صدر دروازے پر سنہری حروف سے کلمہ لکھا تھا۔ محل کی خوب صورتی اور شان و شوکت دیکھنے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ اس محل میں داخل ہوتے ہی لوگ اس محل کی خوب صورتی کے اسیر ہو جاتے۔ وہ محل کی طویل راہداریوں سے گزرتے ہوئے لالہ کے پھولوں کے باغ کے پاس چلی آئی جہاں شفاف پانی کا فوارہ موجود تھا اور جس کی دیوار کے گرد پرندے بیٹھے تھے۔ وہ باغ کو پار کر کے ایک عمارت کے قریب آئی جس کے ستونوں پر سونے کا دیدہ زیب کام کیا گیا تھا۔ مرکزی دیوار کے پاس ایک فوارہ نصب تھا اور کونے میں سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ عمارت کے ستونوں کے ساتھ برآمدہ بھی تھا۔

وہ اس خوب صورت عمارت کے سامنے کھڑی تھی جب اس نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ اک جانی پہچانی مانوس سی خوشبو اس کے اطراف پھیل گئی۔

''سلطان کا حرام ...'' یک دم اس کے عقب سے آواز سنائی دی۔ کسی نے اس عمارت کا تعارف کروایا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے پلٹی۔ وہ سنہری دھوپ کی چمکتی ہوئی روشنی میں کھڑا تھا۔ نیلی جینز اور سیاہ شرٹ میں ملبوس، بال سلیقے سے بنائے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ سرخ و سفید چہرے پر تازگی تھی اور روشن چمکتی آنکھوں میں محبت کا اسرار پنہاں تھا۔

''میں جانتی تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔'' میرب کی نگاہوں نے کہا جن میں مان بھرا یقین تھا۔

''کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو گی۔'' آبان کی نگاہوں نے جواب دیا۔

نگاہ نے نگاہ کی بات سمجھ لی اور یہی دل کے رشتے کی خوب صورتی کا اسرار ہوتا ہے۔ وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔

''توپ کاپی محل ایک تاریخ ساز محل ہے۔ اس محل کو دیکھنے کی خواہش میں ہی تو تم پاکستان سے ترکی چلی آئیں۔ آج بھی اس محل کی شان و شوکت قائم ہے۔ یہاں آنے والے لوگ اس محل کی خوب صورتی کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ یہ سامنے والی عمارت سلطان کے حرم کی ہے جہاں دیوار پر سنہری حروف سے خوشخطی کی گئی ہے۔'' وہ عمارت کے ستونوں کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اگر مجھے دوبارہ موقع ملا تو میں دوبارہ بھی ترکی ضرور آؤں گی۔ یہ جگہ اتنی خوب صورت ہے کہ میں اس جگہ کی خوب صورتی کو کبھی بھول ہی نہیں سکتی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں عمارت کی دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے ذرا آگے تک آگئے۔

''جب میں نے تمہیں پہلی بار استقلال اسٹریٹ پر دیکھا تھا تو میں چونکا تھا۔ ایسا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں ہر ویک اینڈ پر وہاں گیت گاتا ہوں اور بے شمار لوگوں کو دیکھنے کا عادی ہوں مگر نہ جانے کیوں مجھے تمہارا چہرہ اور انداز یاد رہ گیا۔ میری نظر تم پر پڑی تو ٹھہر ہی گئی۔ تم اپنی سہیلی کے ہمراہ تھیں اور بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔ تم میرا گیت سنتے ہوئے یوں کھڑی تھیں جیسے ایسا گیت تم نے پہلی بار سنا تھا۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ہاں ایسا اتفاق میرے ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔ جب لوگ پہلی بار کسی دوسرے ملک آتے ہیں تو وہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر ایکسائٹڈ ہو جاتے ہیں۔ وہ چاندنی رات تھی۔ اس رات میں نے تمہیں گیت گاتے دیکھا تو نہ جانے کیوں اس گیت نے کچھ دیر کے لیے مجھے جیسے مبہوت کر دیا تھا۔ تم نے میری طرف دیکھا تھا اور وہ نگاہ مجھے یاد رہ گئی پھر میں نے تمہیں قونیہ میں دیکھا تھا اور تمہارے سوشل ورک کے بارے میں سن کر میں بہت حیران ہوئی تھی اور مجھے اچھا بھی لگا تھا کہ آج کے دور میں بھی ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کی مدد کا جذبہ رکھتے ہیں اور انسانیت کی خدمت کو مقدم سمجھتے ہیں۔

اس رات مجھے تمہارا گیت اچھا لگا تھا مگر قونیہ میں تمہیں شامی مہاجر بچوں کے ساتھ دیکھ کر میرے دل میں تمہاری عزت بڑھ گئی۔ جب میں برصا میں جنگل میں بنے راستے پر چلتے ہوئے تمہارے گھر آئی تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی پرانے محل میں چلی آئی ہوں......اس دن میں تمہاری مہمان نوازی کی معترف ہوگئی۔ لالہ کے پھولوں سے بھرے باغ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے یہاں کے کلچر اور روایات کو دل سے محسوس کیا تھا۔ واپس پاکستان جاتے ہوئے میں یہاں سے بے شمار خوب صورت یادیں ساتھ لے جارہی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آبان نے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے سر کو جنبش دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''سفر کے دوران اکثر ہماری ملاقات ایسے شاندار لوگوں سے ہو جاتی ہے جن سے ہونے والی دوستی پائیدار ہوتی ہے اور جس میں فاصلوں کے باوجود رابطے ہوتے ہیں۔ تم اپنے ملک واپس جارہی ہو مگر میری اور تمہاری دوستی پر یہ فاصلے اثر انداز نہیں ہوں گے۔'' اس نے یقین بھرے انداز میں کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔ ہاں وہ دونوں اچھے دوست تھے۔ اس نے دوستی کا نام لیا تھا۔ محبت کی بات نہیں کی تھی۔ محبت کا پیغام تو اس کی نگاہوں میں تھا مگر اس نے زبان سے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ ''ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرب ہم دونوں زندگی کے سفر کے ہم سفر بھی بنیں گے۔'' وہ اس کی خوب صورتی کو سراہتا تھا۔ دوستی کا دعویدار بھی تھا اور اس کا خیال بھی رکھتا تھا مگر اس نے مستقبل کے حوالے سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اسے بتانہ پائی کہ انقرہ کی بھیگی سڑکوں پر اس کے ہمراہ چلتے ہوئے، اس کی باتیں سنتے ہوئے نہ جانے کب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی، وہ اس کی شخصیت کے ٹرانس میں گرفتار ہوگئی تھی۔

نیلے پانیوں کے کنارے آباد اس خوب صورت شہر میں آکر اس نے محبت کو محسوس کیا تھا۔ گلابی پھولوں سے بھرے راستوں پر چلتے ہوئے اس نے محبت کے رنگ دیکھے تھے مگر اس نے دل کا راز دل میں ہی رکھ لیا اگر اس نے نہیں کہا تھا تو آبان کو تو سمجھنا چاہیے تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتی رہی۔

''میں تمہیں سی آف کرنے ائرپورٹ نہیں آسکوں گا۔ مجھے ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں برصا جانا ہے جہاں میری شرکت بے حد ضروری ہے ورنہ میں ائرپورٹ ضرور آتا۔'' اس نے شائستگی سے معذرت کی۔ میرب کے دل میں کچھ ٹوٹا تھا۔ خوش فہمی کے آئینے میں دراڑ پڑی تھی مگر وہ زبردستی مسکرادی۔

''کوئی بات نہیں...... اٹس اوکے......؟'' اس نے بھاری ہوتے دل کے ساتھ کہا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ وہ ہر بار اس کے ناز نخرے اٹھاتا اور اس کے لیے اپنے ضروری کام چھوڑ دیتا۔

آبان نے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔

''تم مجھے اپنا ایڈریس اور فون نمبر دے دو...... میں جب بھی پاکستان آؤں گا تو تمہیں انفارم کردوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرب نے اسے اپنا ایڈریس اور فون نمبر لکھوا دیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے لالہ کے پھولوں کے باغات کی سمت چلے آئے تھے جس کے پاس حاجیہ صوفیہ کی تاریخی عمارت نظر آرہی تھی۔ ذرا فاصلے پر تاریخ ساز Blue Mosque بھی موجود تھی۔

''یہ حاجیہ صوفیہ ہے۔ پہلے یہ چرچ ہوا کرتا تھا مگر بعد میں اسے مسجد بنادیا گیا۔ صدیوں بعد یہاں اذان دی گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

وہ دونوں حاجیہ صوفیہ کی عمارت میں چلے آئے۔

وہ ایک وسیع عمارت تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے گروپ کے لوگوں کو بھی حاجیہ صوفیہ میں آتے دیکھا۔ آبان کی ہمراہی میں وہ اپنے گروپ کے لوگوں کو بھول ہی چکی تھی۔ آبان نے بھی مڑ کر اس کے گروپ کے لوگوں کو آتے دیکھا۔

"میں چلتا ہوں مجھے برسا کے لیے بھی نکلنا ہے۔ تم اپنے گروپ کے لوگوں کے پاس جاؤ۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے گروپ کے لوگ اب قریب آرہے تھے۔

"ہم پھر ملیں گے۔" وہ پُراسرار انداز میں مسکرایا اور اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے دروازے سے باہر چلا گیا۔

ضویا نے اسے دور سے دیکھا تو اس کے پاس چلی آئی۔

"میرب تم کہاں ہو یار؟ میرا خیال ہے کہ مجھے اب تمہارا ہاتھ پکڑ کر رکھنا ہوگا..... اب گروپ کے ساتھ ہی رہنا۔" ضویا نے اس کے قریب آتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔ ان کا گائیڈ سرخان گروپ کے لوگوں کو مسجد صوفیہ کی عمارت سے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گروپ کے لوگوں کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔

وہاں سے باہر آکر انہوں نے قریبی ریسٹورنٹ میں لنچ کیا۔ وہ دال کے سوپ میں چمچ چلاتی رہی۔ ضویا نے کئی بار اسے ٹہوکا دیا۔ ہوٹل آکر ان لوگوں نے سامان کی پیکنگ کی۔ انہیں صبح سویرے پاکستان کے لیے نکلنا تھا۔

واپسی کے سفر پر وہ خوش بھی تھی اور اداس بھی..... وہ بار بار یہی سوچتی رہی کہ کم از کم اسے ائرپورٹ سی آف کرنے تو آنا چاہیے تھا بھلا اسکی بھی کیا مصروفیت..... اسے ملال ہوا۔

ائرپورٹ پر افراتفری کا سماں تھا۔ مختلف کاؤنٹرز پر ٹکٹ اور ویزا چیک کرواتے ہوئے سامان سنبھالتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کہیں وہ انگوٹھی گر گئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔ جہاز میں بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ دیکھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ انگوٹھی تو راستے میں ہی کہیں گر گئی ہے۔ وہ انگوٹھی اس کے لیے قیمتی تھی۔ اسے اس انگوٹھی کے کھو جانے کا افسوس تھا۔

جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں..... وہ اپنے احساسات خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ پردیس میں ایک اجنبی سے ملی۔ پھر وہ دونوں اچھے دوست بن گئے۔ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی تھی اور اس کی خوبیوں کی معترف بھی تھی۔ وہ دردمند دل رکھنے والا شائستہ اطوار کا حامل ایک اچھا انسان تھا۔

وہ دونوں اچھے دوست تھے مگر وہ اسے یہ بتا نہ پائی کہ وہ اس کے لیے محبت کے احساسات رکھتی ہے۔ وہ محبت جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔ وہ اسے آبان کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ نہ جانے کس لمحے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ محبت کا یہی اسرار ہوتا ہے۔ وہ کب، کہاں کس لمحے دل میں گھر کر لیتی ہے پتا ہی نہیں چلتا۔

وہ پاکستان آئی تو اسے یوں لگا جیسے اس کے دل کا ایک حصہ وہیں رہ گیا ہے۔ روبی اور مینا اسے تھکے دیکھتے ہوئے ایکسائٹڈ تھے، وہ اسے متوجہ کرنے کے لیے آوازیں دیتے رہ جاتے مگر وہ خیالوں ہی خیالوں میں استنبول کی سڑکوں پر گھومتی رہتی۔ اک شخص کی یاد کا آسیب اس کے ساتھ آیا تھا۔

وہ تاریکی میں پلکیں جھپکاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ اس کے اردگرد کسی کی یاد کے جگنو چمکتے اور رات اندھیرا محسوس ہی نہیں ہوتا۔ گھر والے محسوس کر رہے تھے کہ میرب جب سے ترکی سے آئی ہے بدل گئی ہے۔ یہ تبدیلی خالہ نے محسوس کرلی تھی اور اس کا اظہار بھی کردیا۔

"جب سے ترکی سے آئی ہو، تم کچھ بدل سی گئی ہو، کیا بات ہے؟" خالہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے فکرمندی سے بولیں۔ اس نے بے ساختہ پلکیں جھپکیں۔ اسے بھی احساس تھا کہ وہ بدل گئی ہے۔ اس کی سوچ..... اس کا دل بدل گیا ہے۔

"گلابی پھولوں اور نیلے پانیوں کے دیس کا سفر کر کے آئی ہوں اسی لیے بدل گئی ہوں۔" اس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا پھر اس نے گردن موڑ کر ان

کی طرف دیکھتے ہوئے اِک انکشاف کیا۔

''خالہ! وہ تھے ناں! ہمارے عارفین ماموں! جنہوں نے برسوں پہلے ایک ترکش خاتون سے شادی کی تھی۔ میں ترکی میں ان خاتون سے اور عارفین ماموں کے بیٹے سے بھی ملی تھی۔''

خالہ بری طرح ٹھٹک گئیں۔

''ہیں، کیا کہہ رہی ہو؟ عارفین بھائی کی پہلی بیوی اور بیٹا تمہیں کہاں مل گئے؟ بھلا تم نے انہیں پہچان کیسے لیا؟ ارے برسوں گزر گئے ان کی کوئی خیر خبر نہ آئی؟ تم نے ترکی کی سیر کے دوران بھولے بسرے رشتے داروں کو بھی تلاش کر لیا۔''

''جی ہاں، یوں ہی سمجھ لیں۔ آبان سے میری ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی پھر اس کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی تو انہوں نے لاہور کا ذکر کرتے ہوئے چاند حویلی کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے تو یہ بھی بتایا کہ ممی اور آپ کو فارسی انہوں نے ہی سکھائی تھی۔'' میرب نے مزید بتایا۔

خالہ بے یقینی سے اس کی بات سن رہی تھیں۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا تم واقعی صوفیہ سے مل کر آئی ہو اور آبان تو اب بڑا جوان ہوگا، نہ جانے عارفین بھائی اور صوفیہ کے مابین ایسی کیا بات ہو گئی کہ وہ مڑ کر بھی نہیں آئی۔'' خالہ نے.... بے اختیار گہری سانس لی۔

''مگر وہ کہتی ہیں کہ لاہور آج بھی ان کا ہے۔'' میرب کی آواز مدھم پڑ گئی۔

خالہ ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ یہ حیرت انگیز اتفاق اور انکشاف تھا۔ برسوں پرانی رشتے داری اور دوستی کی جڑیں آج بھی گہری تھیں۔

''ہاں، وہ سچ کہتی ہے۔ لاہور بھی اس کا ہے اور ہمارے دل میں آج بھی اس کے لیے محبت اور احترام ہے۔ مجھے یاد ہے اس کے والدین کا گھر برصا میں تھا۔ جب تم بہت چھوٹی تھیں تو ہم صوفیہ کی کشش میں بھاگ، بھاگ کر چاند حویلی جایا کرتے تھے۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا کرتے، اسے اردو سکھاتے، اس سے فارسی سیکھتے۔ ہم نے بے شمار خوب صورت دن ایک ساتھ گزارے پھر وقت بدل گیا اور ہماری زندگیاں بھی بدل گئیں۔ ہم حالات اور مشکلات سے لڑتے ہوئے زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ پتا ہی نہ چلا کتنا وقت گزر گیا۔ ہم نے عارفین بھائی کو کبھی معاف نہیں کیا اور پھر ان سے میل جول بھی نہ رہا۔'' خالہ نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

''آبان اور میں چند ہی دنوں میں اچھے دوست بن گئے، وہ کہہ رہا تھا کہ جلد لاہور آئے گا۔'' میرب نے کہا۔

''کیسا ہے آبان؟ خوبرو جوان ہوگا؟ کیا کرتا ہے؟ پڑھا لکھا بھی خوب ہوگا؟ اس کے نانا بہت امیر آدمی تھے۔'' خالہ نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جی ہاں، اچھا ہینڈسم بندہ ہے۔ ایونٹ پلاننگ کا کام کرتا ہے۔ اس کے نانا واقعی امیر آدمی تھے۔ بہت بڑا گھر ہے ان کا برصا میں۔'' اس نے جواباً کہا۔

خالہ کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد وہ خالو کی آواز پر اٹھیں تب بھی ان کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے تھے۔

☆☆☆

پھر اسے یہ اطلاع ملی کہ ارمغان کی شادی طے ہو گئی ہے۔

''کون ارمغان.....؟'' وہ خیالوں میں گم غائب دماغی سے بولی۔

اپنے تحفے سمیٹتے مینا اور رومی یک دم اچھل پڑے اور حیران پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ انہیں اندازہ ہوا کہ شاید وہ صدمے کے زیرِ اثر تھی۔

''ارمغان...... بھئی وہی ارمغان.....'' رومی اٹک اٹک کر بولا۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ اب ارمغان کا تعارف کس طرح کروائے...... اسے فکر ہوئی کہ صدمے اور غم کی وجہ سے کہیں میرب کی یادداشت تو متاثر نہیں ہو گئی۔

میرب نے اس ذکر میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ وہ اس باب کو فراموش کر چکی تھی۔ ترکی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے اس نے ارمغان کی یاد کو وہیں کسی ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا۔ اسے تو بس ایک شخص یاد تھا۔ گٹار بجاتا ہوا، گیت گاتا ہوا۔

''چلیں چھوڑیں...... کچھ لوگوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' مینا نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

''آپی! ترکی میں ایسا کیا ہوا ہے جس نے آپ کو اتنا بدل دیا ہے۔ ہمیں بھی ترکی کے قصے سنائیں۔''

روحی اور مینا ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ پھر سے خیالوں میں کھو گئی۔

''ترکی بہت خوب صورت ملک ہے۔ میں ابھی تک ان خوب صورت یادوں کے اثر سے باہر نہیں نکل پائی ہوں... استنبول میں نیلے پانیوں کا سمندر، جس کا پانی دھوپ میں چمکتا ہے اور جہاں فضا میں سفید پروں والے سمندری پرندے اڑتے نظر آتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے عہد میں تعمیر کی گئی عمارات، محلات، مساجد جن کا فن تعمیر خوب صورت اور منفرد ہے۔ کپاڈوکیا کی انوکھی وادی اور گلابی پھولوں والے چیری بلاسم کے درخت، قونیہ کی فضا میں رچا تصوف کا رنگ، انقرہ کے بازار اور رونقیں، لالہ کے پھولوں کے باغات اور زیتون کے کھیت، سب یادیں میرے ذہن میں تازہ ہیں اور میں ابھی تک اس سفر کے اثر سے نہیں نکل پائی ہوں۔'' یادیں اسے دور لے گئیں۔

روحی اور مینا اسے بات چیت میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتے۔ بار بار ترکی کے بارے میں پوچھتے، ترکی کی سوغاتیں، وہاں کے کھانے، استنبول کے قصے، قونیہ کی کہانیاں، انقرہ کی باتیں، وہ بول، بول کر تھک جاتی مگر سننے والے نہ تھکتے۔

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو آیان کا فون آ گیا۔

جو تم نے مجھ سے کیے ہیں سوال جانے دو

جو تم نے مجھ سے کیے ہیں سوال جانے دو
ہے ہجر راس ہمیں تو وصال جانے دو

فیصلہ ہے مرا آج تم بھی سن جاؤ
کبھی نہ ہوگا تعلق بحال جانے دو

مجھے بتانے کی باتیں ہزار کرتے ہو
جواب جان کے ہوگا ملال جانے دو

عداوتیں بھلا میرا بگاڑ لیں گی کیا
محبتوں کا بھی دیکھا ہے حال جانے دو

تمہارے بارے میں کیا سوچتے رہے ہیں ہم
نہ پوچھو ہم سے ہمارا خیال جانے دو

یہ لوگ مجھ پہ بھلا اس قدر ہیں کیوں مرتے
خدا نے مجھ کو دیا ہے کمال جانے دو

تمہیں تو اپنی ہی شہرت عروج سے ہے غرض
ملے شگفتہ کو چاہے زوال جانے دو

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

’’پہنچ گئی ہو پاکستان.....؟‘‘ اس نے خوشدلی سے پوچھا۔ وہی خیال رکھنے والا انداز......وہی گمبھیر اور دل کو چھو لینے والی آواز جس کی بازگشت اس کے دل میں گونجتی رہتی تھی۔

’’ہاں۔‘‘ اسے خوشی ہوئی تھی کہ آبان نے اسے اتنی دور سے فون کیا ہے۔

’’سوری......میں تمہیں سی آف کرنے کے لیے ائرپورٹ نہیں آسکا۔ بے حد مصروف تھا۔‘‘ اس نے شائستگی سے معذرت کی۔ میرب کو اس کا یوں کہنا اچھا تو نہیں لگا مگر اس نے شکوہ کرنا مناسب نہ سمجھا......بعض دفعہ شکوہ کرنے کے لیے بھی بہت ہمت چاہیے ہوتی ہے۔

’’کوئی بات نہیں......‘‘ اس نے بھرم رکھتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

’’کیا ہوا......؟ اتنی چپ چپ کیوں ہو؟‘‘ اس نے اس کی خاموشی کو محسوس کر لیا۔

’’کچھ نہیں......بس تھک گئی ہوں، فلائٹ بہت لمبی تھی اور پھر میری سلطان نائٹ والی انگوٹھی بھی ... ائرپورٹ پر کہیں گم ہوگئی تھی جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔‘‘ وہ مدھم آواز میں بولی۔

’’چلو کوئی بات نہیں...... دکھی نہ ہو، چیزوں کے نقصان پر افسوس نہیں کرنا چاہیے۔‘‘ اس نے اسے تسلی دی۔ وہ اسے بتا نہ سکی کہ وہ انگوٹھی اس کے لیے کتنی قیمتی تھی۔

چند ہلکی پھلکی باتوں کے بعد فون بند ہوگیا۔ عام سی بات چیت تھی جیسے دو اچھے دوست ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ اس کے انداز میں نرمی اور شائستگی تھی۔ اس نے اس کی خیریت پوچھی تھی۔ محبت کا اظہار اور ہم سفری کا وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ وہ بھی انا پرست تھی۔ لفظ دل کے دروازے سے باہر نہ نکل پائے۔ وہ موبائل آف کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھ کے کنارے نم ہوگئے۔ اندھیرے میں آنسو بہانے کی یہ عادت تو اس کی برسوں پرانی تھی۔ برسوں پہلے جب اس کے والدین میں علیحدگی ہوئی تھی تو وہ اور ممی، نانا کے گھر آگئے تھے۔ وہ آٹھ سال کی چھوٹی نا سمجھ اور معصوم بچی تھی مگر پھر بھی اسے بدلتے ہوئے حالات کا ادراک تھا۔ وہ معصوم اور شفاف آنکھوں سے ممی کو چھپ، چھپ کر روتے دیکھتی اور محسوس کرتی تھی کہ اس کے ماموں اور ممانیوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ماموں بے حس اور بے پروا تھے۔ ممانیاں مغرور اور تنک مزاج تھیں۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر طویل لڑائیاں ہوتیں۔ سالن، آٹا، دودھ، گھی سب کا حساب ہوتا۔

پہلے نانی کا اور پھر نانا کا انتقال ہوا تو خاندان میں نئے تنازعے کھڑے ہوگئے۔ نانا کا گھر بک گیا۔ ماموں اپنے اپنے حصے لے کر الگ ہوگئے۔ وہ اور ممی بے سروسامانی کے عالم میں روبی خالہ کے گھر آگئے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ روبی خالہ ان کے آنے سے پریشان تھیں اور خالو بھی ہر وقت بلاوجہ چیختے، چنگھاڑتے رہتے۔ اسے یاد تھا کہ اس کی نانی بھی کبھار فارسی بولا کرتی تھیں۔ روبی خالہ اور ممی مدھم آواز میں فارسی میں نہ جانے کیا، کیا باتیں کرتی تھیں جن کے درمیان خاموشی کے طویل وقفے ہوتے تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر وہ اندازہ کرسکتی تھی کہ وہ باتیں... بے حد سنجیدہ نوعیت کی تھیں۔

پھر ایک دن اچانک بڑی خاموشی سے ممی کی شادی ہوگئی...... دوسری شادی جن مجبوریوں میں کی جاتی ہے ان کی فہرست طویل ہوتی ہے۔ وہ بہت سی باتیں خاموشی سے بن کہے ہی سمجھ گئی تھی۔ اب ان کا کوئی گھر نہیں تھا اسی لیے ممی نے شادی کے نام پر کسی کے گھر پناہ لی تھی۔ اور اسے ہاسٹل میں داخل کروادیا۔ باپ کے گھر سے نانا کے گھر پھر خالہ کے گھر اور پھر ہاسٹل تک کے سفر میں اس چھوٹی سی بچی نے جیسے زندگی کے بے شمار ادوار دیکھ لیے......پھر ممی بے شمار آنسو چھپائے بہت سے وعدے کرنے کے بعد امریکا چلی

گئیں۔ وہ انہیں روکنا چاہتی تھی مگر روک نہ سکی۔

جب اس نے ممی کو دلہن کے روپ میں ایک اجنبی شخص کے ساتھ جاتے دیکھا تھا تو اس کے لاشعور نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ وہ اب انہیں روکنے کا حق بھی نہیں رکھتی ہے۔ اس کا سارا بچپن بورڈنگ میں گزرا۔ چھٹیوں میں وہ خالہ کے گھر آجایا کرتی...... خالو تنک مزاج اور غصیلے تھے۔ انہیں ہر چیز پر اعتراض کرنے کی عادت تھی۔

خالہ اس کا خیال تو رکھتی تھیں مگر ذمے داریاں اٹھاتے ہوئے وہ اتنا تھک چکی تھیں کہ وہ اس محبت اور شفقت کا اظہار نہیں کر پاتی تھیں جو خالاؤں کا خاصہ ہوتی ہے۔

وہ ڈاکٹر تھیں اور ان کا سارا دن اسپتال میں گزرتا... کبھی آؤٹ ڈور، کبھی ان ڈور، کبھی ایمرجنسی، کبھی وارڈ کی ڈیوٹیاں... وہ تھکی ہاری گھر واپس آتیں تو ان کے پاس کسی سے بات کرنے کی فرصت بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے گھر کی ساری ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ گھر کے سب اخراجات، بجلی و گیس کے بل، بچوں کے اسکول کی فیس اور دیگر اخراجات پورے کرتے ہوئے وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی تھیں۔

خالو کو نوکری سے نفرت اور بزنس کا شوق تھا مگر وہ جو بھی نیا بزنس کرتے وہ ٹھپ ہو جاتا...... پھر انہیں کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اخراجات تو سارے آصفہ خالہ اٹھا رہی تھیں... دہری ذمے داریوں کے بارے میں خالہ کو تلخ مزاج بنا دیا تھا۔ خالو کے ساتھ لڑائی جھگڑے نہ، بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ، سسرال والوں سے تلخ کلامی، ایسے میں جب وہ چھٹیوں میں ان کے گھر آجایا کرتی تو اسے یوں لگتا جیسے خالہ کے بوجھ میں اضافہ ہو گیا ہے۔

وہ رومی اور مینا کی احمقانہ شرارتوں میں خود کو بہلانے کی کوشش کرتی۔ خالہ اس کے معاملے میں.... بے حد وہمی واقع ہوئی تھیں۔ اکثر رومی اور مینا کے ہمراہ اس کے بورڈنگ اسکول اور ہاسٹل آیا کرتیں، اس کی پرنسپل کو فون کرتی رہتیں۔ جب وہ اسپتال ڈیوٹی پر جاتیں تو میرب بھی اپنی کتابیں لیے ان کے ساتھ چلی جاتی۔ اسپتال کے ویٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھ کر اس نے بے شمار ناول پڑھ ڈالے۔

جس دن خالہ کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی اس دن رومی، مینا اور میرب ضروری سامان کا چھوٹا سا بیگ تیار کر کے کھانے کے ٹفن کے ساتھ ان کے ساتھ ہی اسپتال جاتے وہیں رکتے، وقت کے ساتھ وہ لوگ اس روٹین کے عادی ہو گئے تھے۔

ممی، امریکا سے فون کرتیں، تحفے بھیجتیں، پیسے بھی بھیجا کرتیں، میرب نے بھی ان بہلاووں کے ساتھ خود کو بہلا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ ممی، امریکا میں بہت مشکل زندگی گزار رہی ہیں، برف کے شہر میں رہتے ہوئے انہوں نے یونہی انتھک محنت کرتے ہوئے برسوں گزار دیے۔

وہ پیسے جمع کرتیں، بونس سنبھال کر رکھتیں.... چھپ چھپ کر اسے رقم بھیجتیں تاکہ وہ اچھی تعلیم حاصل کر سکے اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے...... اس کے اسکول، کالج کے اخراجات پورے ہو سکیں۔

ممی ایک اسٹور پر جاب کرتی تھیں۔ رات کو جب سب لوگ سو جاتے تو وہ پاکستانی کمیونٹی کے لوگوں کے کپڑے سیا کرتیں۔ اس وقت ایک سوٹ کی سلائی انہیں بیس ڈالر مل جایا کرتی تھی.... انہوں نے اسٹور روم میں سلائی مشین رکھی ہوئی تھی اور وہ ہفتے میں دو سوٹ آرام سے سی لیا کرتی تھیں۔ قربانیوں اور سمجھوتوں کی لمبی داستان تھی جسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ کبھی وہ اپنے ماں، باپ کی نازوں پلی بچی ہوا کرتی تھیں اور اب پردیس میں جفاکشی کا یہ عالم تھا۔ وہ پبلک بوتھ سے اکثر اسے فون کیا کرتیں۔ فون پر وہ ہر بار پوچھتی۔

”ممی آپ پاکستان کب آئیں گی؟“

وہ اسے تسلیاں دیتیں..... وعدے کرتیں، ان کی نم آواز میں ہزاروں آنسو ہوتے مگر وقت گزرنے کے

ساتھ وہ یہ سوال کرنا چھوڑ چکی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سوال بے سود تھا۔
جب بھی کسی فیسٹول کی سیل لگتی تو ممی اس کے لیے بہت ساری چیزیں خرید لیتیں اور پھر اپنی کولیگ کے گھر رکھوا دیتیں تاکہ ان کے گھر میں کسی کو پتا نہ چلے...... پھر وہیں سے اسے پارسل بجھوا دیتیں۔ ساتھ ایک خط بھی ہوتا جس پر لکھی تحریر کو وہ کئی گھنٹوں تک پڑھتی رہتی۔
''پیاری میرب...... ! سدا خوش رہو...... یہ تمہارے لیے کچھ چیزیں ہیں سب تمہاری پسند کی ہیں۔ میں جلد پاکستان آؤں گی۔ تم خوب پڑھنا لکھنا۔ بیٹا، میں تمہیں کامیاب انسان دیکھنا چاہتی ہوں جب میں بہت سارے پیسے جمع کرلوں گی اور ہم اپنا ایک گھر بنا سکیں گے تو میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس پاکستان آجاؤں گی۔
تمہاری ممی.....''
آنسوؤں سے خط دھندلا جاتا۔ وہ خط کی سطروں میں ممی کا پیار، محبت اور شفقت محسوس کرتی۔ خط کا ہر لفظ محبت سے لکھا ہوتا۔ کچھ تحفے خالہ، روی اور بینا کے لیے بھی ہوتے۔ اسے دکھ ہوتا کہ ان کا کوئی گھر نہیں تھا۔ ممی کو پیسے کمانے کے لیے امریکا جانا پڑا اور خود وہ بورڈنگ اسکول میں آگئی۔ ایک پناہ نے کئی بھوتوں کا سوال کیا تھا۔
وہ محسوس کرتی کہ بے سائبانی کا دکھ اٹھانے والے اِک پناہ اور گھر کے حصول کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ کتنے مہینے، کتنے سال یہاں کہ بڑھاپا ان کے وجود پر دستک دینے لگتا ہے۔ اس نے اپنی الماری کی دراز میں ممی کے خط سینت، سینت کر سنبھال رکھے تھے۔ خطوط کا یہ زیور اس کے لیے بے حد قیمتی تھا۔ پھر ایک دن اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کے بابا کو نشے کی لت نے تباہ کردیا ہے اور وہ انتقال کر گئے ہیں۔ اس خبر کو سنتے ہی اس کے ارد گرد سناٹے اتر آئے۔ اس کی یادوں میں بابا کی موہوم سی شبیہہ تھی۔
نشے کی لت نے انہیں اس حد تک برباد کردیا تھا کہ ان کے لیے رشتے بھی اہم نہیں رہے تھے۔
پھر کتنے ہی سال گزر گئے کہ ممی پاکستان نہیں آسکیں...... وہ بڑی ہوگئی اور اسکول سے کالج میں آگئی۔ بہت سالوں بعد ممی پاکستان آئی تھیں..... ان کے سسرال میں شادی تھی۔ وہ بوڑھی ہوگئی تھیں اور ان کے چہرے پر لکیریں واضح نظر آرہی تھیں۔ وہ کتنی دیر تک آنسو بہاتے ہوئے کسی چھوٹی بچی کی طرح اسے خود سے لپٹائے بیٹھی رہیں۔ اس نے ممی کے ساتھ... بھرپور وقت گزارہ۔
ممی کچھ دن کے لیے خالہ کے گھر رہنے کے لیے آئی تھیں۔ پتا نہیں ممی اور خالہ آپس میں فارسی زبان میں کیا باتیں کرتی رہتیں۔ وہ ان کے راز و نیاز بھی سمجھ نہ سکی تھی۔
وہ دونوں ذمے داریاں اٹھاتیں، تھکی ہاری، بوڑھی ہوتی خواتین تھیں۔ محنت و مشقت کی لکیریں ان کے چہرے کے خدوخال میں واضح نظر آتیں اور سفید ہوتے بال برسوں کی ریاضتوں کے گواہ تھے۔ پھر ممی واپس چلی گئیں۔ انہیں گرین کارڈ مل گیا تھا اور دیگر مراعات بھی حاصل تھیں۔ میرب اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔ ایم بی اے کرنے کے بعد وہ مستقل خالہ کے گھر آگئی تھی۔ خالہ جانفشانی سے اس کے لیے اچھا رشتہ تلاش کرنے کی مہم میں سرگرداں تھیں۔ وہ جلد از جلد اس کی شادی کردینا چاہتی تھیں مگر کہیں بات بن کے نہیں دے رہی تھی۔
پھر اس کی زندگی میں ارمغان آیا۔ وہ خالو کی دور پار کی رشتے دار کا بیٹا تھا۔ جاب کے سلسلے میں اس کا ٹرانسفر لاہور ہوا تو وہ اکثر ان کے گھر چلا آتا۔ وہ خوش مزاج تھا اور اسی خوش مزاجی کی وجہ سے وہ لوگوں کے قریب ہوجاتا۔ ارمغان اس کی طرف بڑھنے والا اور اسے توجہ دینے والا پہلا شخص تھا مگر یہ رشتہ بھی خاندانی سیاستوں کی نذر ہوگیا۔ ارمغان کی ماں نہ مانیں۔ وہ بار، بار یہی کہتی رہی تھی کہ میرب کے باپ نے میرب کی

ماں کو طلاق دے دی تھی۔ جہالت کی وہی سوچ جس نے اس معاشرے کے ان گنت لوگوں کے سکھ کھا لیے۔

ارمغان کی ساری خوب صورت باتیں سراب بن گئیں۔ وہ بزدل مرد تھا۔ اس کی خاموشی اور بزدلی نے میرب کو دکھ دیا۔ مرد کی بزدلی عورت کے لیے باعث شرمندگی ہوتی ہے۔

خالو بھی اس رشتے کے خلاف ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے خاندان والوں سے ساز باز کر کے اس رشتے کو طے پانے نہ دیا۔

خالہ اور خالو کے درمیان طویل معرکہ ہوا۔ جس خاندان کے بزرگ لڑتے جھگڑتے ہوں وہاں امن اور سکون نہیں رہتا پھر ان کی نئی نسل ڈپریشن کا شکار ہونے لگتی ہے اور یہ ڈپریشن ان کی صلاحیتیں مفلوج کر دیتا ہے۔ وہ بھی ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی۔ پھر خالہ نے طویل کال پر ممی سے بات کی۔ وہی فارسی والے رازو نیاز، کوڈ ورڈز کی باتیں...... وہ اپنے آنسو چھپاتے ہوئے نا سمجھ میں آنے والی گفتگو سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ خالہ بھی اس کے لیے دکھی تھیں۔ وہ جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتی تھیں...... وہ کبھی میرج بیوروز سے رابطہ کرتیں، کبھی پرانی دوستوں کو لمبے، لمبے فون کرتیں۔ بہانے، بہانے سے اس کی تعریفیں کرتیں۔ خالہ کی یہ جدوجہد اس کے دکھوں میں اضافہ کر دیتی۔

پھر ممی نے اسے کچھ پیسے بھجوائے کہ وہ کہیں گھوم پھر آئے۔ خالہ کی چند کولیگز کسی ٹرپ کے ساتھ ترکی جا رہی تھیں۔ خالہ نے اس کا نام بھی لکھوا دیا۔

وہ وقتی طور پر بہل گئی۔ ایک نئے دیس کے سفر کی ایکسائٹمنٹ نے اس کے صدمے کو کسی حد تک کم کر دیا۔ کچھ پیسے ممی نے بھیجے...... کچھ رقم اس کے پاس جمع تھی۔ وہ آسانی سے یہ ٹرپ افورڈ کر سکتی تھی وہ انٹرنیٹ پر نت نئے ڈیزائن کے کپڑے دیکھتی اور شاپنگ میں مصروف ہو گئی۔ ترکی میں اس کی ملاقات آبان سے ہوئی تو جیسے سب کچھ یک دم بدل گیا۔ اسے احساس ہوا کہ ارمغان کوئی اتنا بھی اہم شخص نہیں تھا۔

وہ تو بہت عام سا بندہ تھا۔ تھکی، فلرٹ، جھوٹے وعدے کرنے والا، ایسے سطحی شخص کو تو کسی کی یادوں میں رہنے کا حق بھی نہیں ہے۔ اسے اپنی اس حماقت پر ہنسی آتی۔

پاکستان واپس آکر بھی وہ اس سفر کے سحر سے نہ نکل پائی۔ لاہور کے گھر میں بیٹھ کر اسے لگتا وہ انقرہ کی بھیگی سڑکوں پر گھوم پھر رہی ہے۔ اک آواز کی بازگشت اس کے اردگرد گونجتی رہتی۔

اس دن بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی جب روحی چھلانگیں مارتے ہوئے بلند آواز اور چونکاتے ہوئے لہجے میں چلاتے ہوئے اس کے کمرے میں آیا۔

”آپی! آپ کا پارسل آیا ہے...... ترکی سے......“ اس نے پُرجوش انداز میں اسے اطلاع دی۔ اس کے پیچھے ہینا بھی تھی۔

میرب یک دم اچھل پڑی...... اس کے اعصاب کو کرنٹ لگا اور دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔

ترکی سے پارسل آنا خلاف توقع اور حیران کن امر تھا۔ وہ دوپٹا درست کرتے ہوئے ننگے پاؤں ہی باہر کی طرف دوڑی۔ خالہ، خالو گھر پر نہیں تھے۔ اس نے کوریئر والے سے چھوٹا سا پارسل لیا۔ اس پر کوئی اجنبی سا نام لکھا تھا۔

”صوفیہ کزاخیل......“

اس نے بہ آواز بلند پارسل پر لکھا یہ نام پڑھا وہ الجھ گئی۔ وہ تو کسی ”صوفیہ کزاخیل“ خاتون کو نہیں جانتی تھی۔

روحی اور ہینا مسلسل سوال کرتے جا رہے تھے۔ کس نے بھیجا ہے یہ پارسل......؟ کہاں سے آیا ہے یہ پارسل......؟ یہ خاتون مس صوفیہ...... کون ہیں؟ آپ کی دوست ہیں؟ وہ ہینا کوئی جواب دیے الجھے ہوئے انداز میں احتیاط سے پارسل کھولنے لگی۔ وہ کیا بتاتی۔ اسے تو خود بھی پتا نہیں تھا کہ اسے یہ پارسل بھیجنے والی صوفیہ نامی خاتون کون تھی۔ اندر ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ ڈبیا

کھولی تو اس میں چمکتے ہوئے پتھر والی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ ساتھ ایک چھوٹا سا رقعہ بھی تھا جو نفاست سے تہہ کیا ہوا تھا۔

''سلطان نائٹ رنگ......'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا......ایک یاد اسے کہیں دور لے گئی۔ اس نے بے تابی سے وہ رقعہ کھولا......اس پر سیاہ حروف سے انگریزی میں ایک جملہ لکھا تھا۔

''A thing of beauty is joy for ever''

جان کیٹس کا یہ جملہ اسے یاد تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ انگوٹھی کہاں سے کس نے بھیجی تھی۔

''کتنی خوب صورت انگوٹھی ہے آپی......'' مینا نے بے ساختہ سراہتے ہوئے کہا۔

''واہ جی کیا بات ہے تحفے آرہے ہیں ترکی سے...... کاش کہ آپی کی دوست ہمارے لیے بھی کچھ بھیج دیتی۔'' زوہی مسکرا کر بولا۔

اس نے انگوٹھی ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہن لی۔ وہ اسے بالکل فٹ تھی۔ اس کے چہرے پر انوکھے رنگ اتر آئے۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

دروازہ بند کر کے اس نے فوراً آبان کو فون ملایا جسے اس نے پہلی ہی بیل پر اٹھالیا یوں جیسے وہ اس کے فون کا ہی منتظر تھا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی آبان؟'' اس نے اس کی آواز سنتے ہی یہ پہلا جملہ کہا۔

''انگوٹھی پسند نہیں آئی؟'' دوسری طرف خوش مزاجی سے پوچھا گیا۔

''یہ انگوٹھی!'' میرب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تم اپنی انگوٹھی کے کھو جانے کی وجہ سے غم زدہ تھیں؟ اس لیے میں نے ایک نئی انگوٹھی بھیج دی ہے۔ تمہاری خوشی میرے لیے قیمتی ہے میرب۔''

''بہت اچھی ہے مگر...... پارسل پر تو کسی ''صوفیہ کرزاخیل'' کا نام لکھا ہے۔''

''یہ میری ممی کا نام ہے۔ دراصل یہ پارسل انہوں نے ہی بھیجا ہے۔ تمہیں ترکی پسند ہے تو میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں آجاؤ......'' اس کی آواز میں جذبات کی آنچ تھی مگر اب کی بار میرب کو اس کی آواز نے نہیں بلکہ اس کے الفاظ نے چونکا دیا تھا۔

''کیا......؟'' وہ ہونق رہ گئی۔ یہ جملہ محبت کے معاملے میں کند ذہن لڑکی کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''ہاں، برصا کے اس گھر میں، جہاں بیٹھ کر میں نے تمہیں ترکی کا مشہور گیت سنایا تھا۔'' وہ سنجیدہ آواز میں بولا۔ اس کی آواز میں محبت بھی تھی اور مان بھی تھا۔

میرب کے چہرے پر کہکشاں کے رنگ اتر آئے۔ کیا خواہشیں ایسے بھی پوری ہوجایا کرتی ہیں، سراب کا دکھ اٹھانے والی لڑکی کے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور ہونٹ لرزنے لگے۔

''تم نے جواب نہیں دیا؟'' وہ اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔

''کیا تمہیں برصا کا وہ گھر پسند نہیں آیا تھا؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''آیا تھا۔'' وہ ہنسی۔ ''مگر اس سے پہلے تمہیں پاکستان آنا پڑے گا۔'' اس کی آواز میں حیا کے رنگ تھے۔

''میں اگلے ہفتے کی فلائٹ سے پاکستان آرہا ہوں...... اسی لیے میں تمہیں سی آف کرنے ائرپورٹ نہیں آسکا تھا کہ اچانک مجھے ایک اہم ایونٹ کی میٹنگ کے سلسلے برصا جانا پڑ گیا تھا۔ وہ پروجیکٹ میرے لیے بے حد اہم تھا کیونکہ اس کی پے منٹ کے بعد ہی میں...... بہ آسانی پاکستان کا ٹکٹ افورڈ کر پاتا۔'' اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔ اس کے دل سے ملال بھی ڈھل گیا۔

''ترکی کی مٹھائیاں لے کر آنا......'' وہ بے اختیار ہنسی...... اس ہنسی کی جلترنگ میں محبت کا اقرار بھی تھا۔

''ضرور......'' آبان کا قہقہہ بھی بے ساختہ تھا۔ جس میں خوشی کی کھنک واضح تھی۔ میرب نے اس لمحے اس انمول خوشی کو محسوس کیا تھا جو نصیب والوں کو ملتی ہے۔ گلابی پھولوں کے راستوں سے سجا نیلے پانی کے کنارے آباد شہر اسے بلا رہا تھا۔

❋❋❋

مہنگا ٹیکا

یوم خواتین کے موقع پر ایک اہم مسئلے پر ماؤں کو

آگاہی دیتی زاہدہ ثقلین کی معلوماتی تحریر

الٹرا ساؤنڈ کرتے ہوئے ڈاکٹر کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے ساجدہ سے پوچھا۔

''اس حمل میں پہلے چیک اپ کروایا ہے؟''

''نہیں جی۔'' ساجدہ سے پہلے جھٹ اس کی ساس بولی۔''اس سے پہلے بھی ایک بچہ ہے، گھر میں ہی کیس ہو گیا تھا۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''اچھا ٹھہریں، میں دوسری ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔'' اس نے پلٹ کر اپنی سینئر ڈاکٹر کو پکارا اور اس کے آنے پر مریضہ کی ہسٹری اور اپنی تشخیص بتائی۔ سینئر ڈاکٹر نے دوبارہ الٹرا ساؤنڈ کیا اور پھر اِک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''آپ کو اپنا خون کا گروپ پتا ہے؟'' ساجدہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی ساس کا ضبط جواب دے گیا۔

’’باجی بچہ تو ٹھیک ہے ناں؟‘‘

’’آپ یہاں بیٹھیں، میں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔‘‘ ڈاکٹر نے ویٹنگ ایریا میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ساجدہ اور اس کی ساس اپنے ڈوبتے دلوں کو سنبھالتی بیٹھ گئیں، کسی انہونی کا احساس ان دونوں کو ہو گیا تھا۔ پچھلے حمل میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوئی تھی۔ گاؤں کی تجربہ کار دائی سے ایک دو دفعہ ہی معائنہ کروایا تھا۔ اس دفعہ بھی یہی ارادہ تھا۔ ابھی ساتواں ماہ ہی لگا تھا کہ اتفاقاً دائی ان کے گھر آئی اور ساجدہ کو دیکھتے ہوئے ساس سے پوچھا کہ نویں کے کتنے دن چڑھے ہیں۔ اور یہ جان کر کہ ابھی ساتواں ماہ ہے دائی کے چہرے پر پریشانی چھا گئی اور اس نے مشورہ دیا کہ اس کا اسپتال سے چیک اپ ضرور کروالو۔ حمیدہ بی بی (ساجدہ کی ساس) دائی کی بات کو بہت اہمیت دیتی تھیں اسی لیے اگلے ہی روز بہو کو لے کر اپنے علاقے کے سرکاری اسپتال آ گئیں۔ اب نہ جانے ڈاکٹر کیا بتانے والی تھی۔

’’ساجدہ کیا آپ کو محسوس نہیں ہوا کہ آپ کا پیٹ ساتویں مہینے کے حساب سے کافی بڑا ہے؟‘‘ ڈاکٹر نے سوال سے ابتدا کی۔

’’جی باجی......‘‘

’’مجھے افسوس ہے کہ آپ کے پیٹ میں پانی کافی زیادہ ہے اور بچے کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں بھی کافی جمع ہو گیا ہے۔‘‘

’’دوائیوں سے ٹھیک ہو جائے گا ناں......؟‘‘ حمیدہ بی بی بے چینی سے بولیں۔

’’نہیں......اب مسئلہ زیادہ ہو گیا ہے اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔‘‘

ساجدہ نے متوحش نظروں سے اپنی ساس کو دیکھا۔

’’پھر اب کیا کریں......؟‘‘ حمیدہ بی بی نے اوسان بحال رکھے۔

’’ہم ساجدہ کو اسپتال میں داخل کر لیں گے کچھ ٹیسٹ کروائیں گے اور پھر اس بچے کی پیدائش کروانی پڑے گی...... کیونکہ جو اس کی صورتِ حال ہے ایسی حالت میں بچہ یا تو پیٹ میں ہی فوت ہو جائے گا یا پیدائش کے فوراً بعد......اور اگر 9 ماہ تک انتظار کریں تو خطرہ ہے کہ بچے کے اندر اتنا پانی جمع ہو جائے گا کہ نارمل کیس کرنا ممکن نہ ہوگا۔‘‘

’’لیکن یہ کیوں ہو گیا؟ پچھلا بچہ تو بالکل ٹھیک ہوا تھا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔‘‘ ساجدہ نے لب کھولے۔

’’اس وقت تو ہم اس کی صحیح وجہ نہیں بتا سکتے کچھ ٹیسٹ کروالیں پھر ان کی رپورٹس دیکھ کر ہی وجہ پتا چلے گی۔‘‘ ڈاکٹر نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

حمیدہ بی بی نے اسی وقت بہو کو اسپتال میں داخل کروایا اور پھر گھر جا کر اپنے بیٹے اسلم کو بھی بلوا لیا۔ ساجدہ کا دو سالہ بیٹا اس کی بہن نے سنبھال لیا تھا۔

شام کو ساجدہ کے خون ٹیسٹ کی رپورٹ آ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے اسلم کو بھی اپنا خون کا گروپ چیک کروانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں اسلم اپنا گروپ چیک کروا آیا۔ ڈاکٹر نے حمیدہ بی بی اور اسلم کو کچھ یوں سمجھایا۔

’’مریضہ کے خون کا گروپ او نیگیٹو (O -ve) ہے اور ان کے شوہر کا A+ve جب بھی ماں کا گروپ نیگیٹو ہوتا ہے تو پیدائش کے فوراً بعد بچے کے خون کا گروپ چیک کروایا جاتا ہے۔ اگر وہ ماں سے مل جائے یعنی نیگیٹو ہی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں اگر وہ باپ سے مطابقت رکھتا ہو یعنی + پوزیٹو ہو تو اس کی وجہ سے اگلے حمل میں بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے جیسا کہ دوسرے حمل میں ساجدہ کے ساتھ ہوا۔‘‘

’’اس کا کوئی علاج نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ؟‘‘ اسلم پریشانی سے پوچھنے لگا۔

’’جب پہلا بچہ پیدا ہوا تھا تو اس کی پیدائش کے تین دن کے اندر اندر ماں کو ایک خاص ٹیکا لگایا جاتا ہے۔ جو ذرا مہنگا بھی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اگلا بچہ محفوظ رہتا ہے مگر ساجدہ کو وہ ٹیکا نہیں لگا اس لیے اس

دفعہ مسئلہ بڑھ گیا۔‘‘

’’تو آپ اب وہ ٹیکا لگا دیں ڈاکٹر صاحب......‘‘ حمیدہ بے تابی سے بولی۔

’’نہیں اماں جی اب لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔‘‘ ڈاکٹر ہمدردی سے بولی۔’’ اس بچے کو بچایا نہیں جاسکتا۔ وہ ٹیکا پچھلی پیدائش کے تین دن کے اندر، اندر لگانا ضروری تھا۔ البتہ اگلے حمل کے لیے میں آپ کو تفصیل سے سمجھا دوں گی۔ اگر باقاعدگی سے معائنہ کرواتے رہیں اور ڈاکٹر کے مشوروں پر عمل کریں تو بچہ ٹھیک رہے گا ان شاء اللہ......‘‘ ڈاکٹر کے اچھی طرح سمجھانے پر اسلم اور اس کی ماں کسی حد تک مسئلہ سمجھ گئے تھے مگر اب بھی بے یقینی کی کیفیت ضرور تھی اس لیے کہ ان کے اردگرد آئے دن عورتوں کے ہاں بچے ہوتے رہتے تھے کسی کو اس مسئلے سے دوچار ہوتے نہیں سنا تھا۔ ہاں ایک مرتبہ کسی دور کے رشتے دار کے ہاں کیس بگڑ گیا تو وہاں کسی ٹیکے کا ذکر ضرور ہوا مگر ان لوگوں نے دھیان نہیں دیا مگر اب ساجدہ کے ساتھ یہ سب ہوا تو حمیدہ بی بی کو کچھ، کچھ یاد آیا مگر پھر بھی دل نہیں مان رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اگرچہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ماں کی صحت و جان سلامت تو اللہ پھر سے گود بھر دے گا مگر اسلم بہت مایوس تھا۔

’’یہ بچے کی قبل از وقت پیدائش کروانے کا اجازت نامہ ہے۔‘‘ ڈاکٹر نے ایک صفحہ اسلم کی طرف بڑھایا۔’’اس پر دستخط کردیں۔‘‘ اسلم نے خاموشی سے دستخط کردیے اور آنکھوں کی نمی چھپاتا باہر نکل گیا۔ پروسس مکمل ہوا مگر دل مطمئن نہیں تھا۔

☆☆☆

تیسرے دن ساجدہ خالی گود اور خالی دل کے ساتھ گھر واپس آگئی۔ دکھ تو تھا مگر ننھے احمد کو دیکھ کر دل بہل جاتا کہ اللہ نے کم از کم اولاد کی نعمت سے تو اسے نوازا ہوا ہے۔ رفتہ، رفتہ سب کو صبر آ گیا اور اللہ کی رضا سمجھ کر اپنے، اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد دوبارہ امید کی کرن نظر آئی تو حمیدہ بی بی نے ساجدہ کی سنبھال کر رکھی ہوئی پرانی رپورٹس نکالیں اور اسی ڈاکٹر کے پاس جا پہنچی۔ تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ تجویز کیے ان کی رپورٹ دیکھ کر ادویات دے کر ایک ماہ بعد آنے کی تاکید کی۔

حمیدہ بی بی نے اس دفعہ ڈاکٹر کی ہدایات پر پورا عمل کیا۔ ہر دفعہ ساجدہ کے خون کے ٹیسٹ دہرائے جاتے۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر نے تاکید کی کہ اب ہر دو ہفتے بعد آنا ضروری ہے۔ ہر دفعہ حمیدہ بی بی یہ سوال دہرانا نہ بھولتی۔

’’بچے میں پانی تو نہیں پڑ گیا......؟‘‘ اور ڈاکٹر تسلی دیتی۔

’’اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہے۔‘‘

چھٹے ماہ کے آغاز میں جب ساجدہ کے خون ٹیسٹ کی رپورٹ ڈاکٹر کے سامنے آئی تو وہ چونک گئی۔ رپورٹ نارمل نہیں تھی۔ اس نے ساجدہ کو الٹرا ساؤنڈ کے ماہر ڈاکٹر کے پاس بھیجا کہ اب خون ٹیسٹ نہیں کروایا جائے گا بلکہ مناسب وقفے سے بار، بار یہ خاص الٹرا ساؤنڈ کروائے جائیں گے تاکہ اگر بچے میں پیچیدگی پیدا ہو تو ابتدا میں ہی علم ہو جائے جب تک ساجدہ اندر رہی حمیدہ بی بی بے چینی سے باہر بیٹھی انگلیوں پر حساب لگاتی رہی۔

’’پچھلا بچہ ساتویں ماہ میں تھا جب مسئلہ ہوا۔ یہ تو ابھی چھٹے میں ہے۔ اللہ خیر کرتا......‘‘

اس دن تو اللہ نے خیر ہی کی تسلی پا کر وہ گھر آئیں مگر ہر دو ہفتے بعد اسی الٹرا ساؤنڈ کی ہدایت کے ساتھ۔ اور اس پر باقاعدگی سے عمل بھی کیا گیا...... ڈیڑھ ماہ بعد پھر ڈاکٹر نے الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا اور حمیدہ بی بی، اسلم اور ساجدہ کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی۔

’’ساجدہ کے بچے کو جو بیماری ہے جس کی وجہ سے پچھلے بچے میں بھی پانی جمع ہو گیا تھا وہ یہ ہے کہ بچے میں رفتہ، رفتہ خون کی کمی ہونا شروع ہو جاتی ہے

Hemolytic disease of Newborn

اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں بہت فعال مدافعتی نظام بنایا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی بیرونی عنصر خون میں شامل ہوتا یہ نظام متحرک ہو جاتا ہے اور اس عنصر کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کرتا ہے۔ انہی اقدامات میں سے ایک antibodies کا بننا ہے۔ اس بیرونی خطرے کے خلاف antibodies بنتی ہیں جو اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں اور پھر یہ تمام عمر خون میں موجود رہتی ہیں تاکہ اگر وہی خطرہ دوبارہ نمودار ہو تو یہ اس کا فوراً قلع قمع کر دیں۔ vaccination یعنی حفاظتی ٹیکہ جات کا بھی یہی اصول ہے۔

جب ماں کا گروپ نیگیٹو ہو اور بچے کا پازیٹو تو حمل کے دوران بچے کے خون کے کچھ خلیے ماں کے خون کی نالیوں میں آ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ ماں کے گروپ سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے ماں کا مدافعتی نظام ان کو بیرونی حملہ آور سمجھ کر ان کے خلاف antibodies بنا لیتا ہے اور ماں کے جسم میں موجود بچے کے خلیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ بچہ ٹھیک رہتا ہے کیونکہ عموماً بچے کے خلیے ماں کے جسم میں تب شامل ہوتے ہیں جب زچگی کا عمل ہو۔

پیدائش کے فوراً بعد بچے کا گروپ چیک کروایا جاتا ہے اگر پازیٹو کی تصدیق ہو جائے تو ایک انجکشن Anti.D ماں کو لگتا ہے جس کی قیمت آج کل تو سات ہزار سے کچھ زائد ہی ہے۔ یہ انجکشن ماں کے خون میں موجود پازیٹو بلڈ گروپ کے خلاف antibodies کو ختم کر دیتا ہے۔

اب اگر کسی وجہ سے یہ انجکشن نہ لگ سکے یا تاخیر سے لگے (بہترین نتائج کے لیے پیدائش کے تین دن کے اندر اندر یہ لگنا ضروری ہے) تو اگلے حمل میں کیا صورت حال پیش آئے گی؟ یہ جاننا ضروری ہے۔

اگر دوسرے بچے کا بھی گروپ پازیٹو ہو تو دوران حمل ہی ماں کے خون میں موجود antibodies اس

اور جب زیادہ شدید ہو جائے تو بچے کا دل کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس دوران اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں پانی جمع ہوتا ہے اور پھر بچہ فوت ہو جاتا ہے۔" وہ تینوں حیرت سے ڈاکٹر کی بات سن رہے تھے۔

"اب تک جو ہم ٹیسٹ اور الٹراساؤنڈ کرواتے رہے وہ یہی دیکھنے کے لیے تھا کہ بچے میں خون کی کمی تیزی سے تو نہیں ہو رہی۔ آج کی رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کے مطابق اب بچہ خطرے میں ہے۔"

"اب کیا ہوگا ڈاکٹر؟" ساجدہ بمشکل بولی۔

"جیسے کسی مریض میں خون کی کمی ہو تو خون کی بوتل لگائی جاتی ہے ایسے ہی ماں کے پیٹ میں بھی بچے کو خون دیا جا سکتا ہے۔"

"کیا؟" اسلم حیرت سے آگے ہو کر بیٹھا۔ "وہ کیسے؟ یہ بات تو کبھی نہیں سنی تھی۔"

"ہم الٹراساؤنڈ کرتے ہوئے ایک باریک سی سوئی ماں کے پیٹ کے ذریعے بچے کے پیٹ میں داخل کرتے ہیں اور اس سے اس کو خون دیا جاتا ہے۔"

وہ تینوں منہ کھولے حیرت زدہ سے ڈاکٹر کے چہرے کو تک رہے تھے۔ ایک بات تو کبھی دیکھی نہ سنی [illegible] عقل یقین نہیں تھی۔

"پھر بچہ ٹھیک ہو جاتا ہے؟" حمیدہ بی بی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"الحمدللہ بہت سارے بچے اور مائیں اس طریقہ علاج سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔" ڈاکٹر نے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ آپ بچے کو خون لگا دیں۔" اسلم نے فیصلہ کیا۔

"ہمارے پاس یہ سہولت موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو کسی بڑے شہر جانا پڑے گا۔ میں پوری تفصیل آپ کی پرچی پر لکھ دوں گی اور ساتھ اسپتال کا پتا بھی...... وہاں جا کر پرچی دکھا دیجیے گا۔ ایک دفعہ خون لگ جائے تو پھر ہمارے پاس ہی چیک اپ ہوتا رہے گا۔" ڈاکٹر نے اچھی طرح سمجھایا۔

بچے کی خون کی نالیوں میں پہنچ جائیں گی اور چونکہ بچے میں تو پازیٹو بلڈ ہی ہوگا تو یہ antibodies ان خلیوں کو تباہ کرنا شروع کردیں گی ۔ یہاں تک کہ بچہ شدید خون کی کمی کا شکار ہوجائے گا اور اس کے پیٹ، پھیپھڑوں، سر اور جلد میں پانی جمع ہونا شروع ہوگا جو آخر کار بچے کی موت پر منتج ہوگا۔ یہ سب کچھ ماں کے پیٹ میں ہی بچے کو برداشت کرنا ہوگا۔

اگر کسی خاتون کو anti.D انجکشن نہ ہو تو اگلے حمل میں آغاز ہی سے خون میں موجود anti.D antibodies کے ٹیسٹ کروائے جاتے ہیں تاکہ ان کی تعداد کا اندازہ ہوسکے۔ جب اتنی بڑھ جائے کہ خطرہ ہو کہ اب بچے کو نقصان پہنچا سکتی ہیں تو پھر مناسب وقفے سے بچے کا doppler ultrasound کرواتے ہیں تاکہ بچے میں خون کی کمی کا اندازہ لگا سکیں۔ جب وہ اس مقام تک کم ہوجائے کہ بچے کا نظام صحیح طور پر کام نہ کرسکے تو پھر بچے کو خون کی بوتل لگائی جاتی ہے جس کی سہولت الحمدللہ لاہور اور کراچی میں fetal medicine unit میں موجود ہے۔

اس طریقے سے الحمدللہ بہت سے بچے زندگی پا چکے ہیں۔

بچے میں خون کی کمی کی اس بیماری کو hemolytic disease of newborn کہتے ہیں۔

پیدائش کے بعد یہ بچے عموماً تندرست رہتے ہیں کیونکہ اب ماں میں موجود antibodies ان تک نہیں پہنچ پاتیں۔ آج کل انٹرنیٹ کا دور ہے، معلومات کا دور ہے اس لیے یہ بنیادی معلومات ہر شخص کو خصوصاً خواتین کو ضرور ہونی چاہئیں تاکہ بروقت غیر معمولی افسوس ناک صورت حال سے فوری بچا جاسکے۔

ان کا علاقہ لاہور شہر کے قریب تھا سو وہ رخت سفر باندھنے لگے۔

☆☆☆

تین ہفتے بعد وہ تینوں دوبارہ اسی ڈاکٹر کے پاس موجود تھے۔ بچے کو خون لگ چکا تھا اور لاہور والے ڈاکٹر نے تسلی بھی دی تھی۔ یہاں ڈاکٹر نے انہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اب دوبارہ دو، دو ہفتوں کے وقفے سے الٹرا ساؤنڈ ہونا تھا۔ اسلم اور حمیدہ بی بی نے بے حد تعاون کیا اور ساجدہ نے اللہ کا بہت شکر ادا کیا۔ وہ ڈاکٹر کی بات سمجھ چکے تھے۔ جب ہر الٹرا ساؤنڈ پر رپورٹ ٹھیک رہی اور ایک لمبی مسافت طے کر کے سعدیہ نام کی گڑیا ان کی گود میں آئی تو اُن کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔

احمد اور سعدیہ کے ساتھ ان کی زندگی میں بہار کے رنگ بکھرے...... احمد تو پہلا بچہ ہونے کے ناتے لاڈلا تھا ہی مگر سعدیہ کے ساتھ تو ان سب کی شدید جذباتی وابستگی تھی۔ اس کو صحیح معنوں میں ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا۔

اور حمیدہ بی بی نے بہت سمجھداری کا کام یہ کیا کہ اپنے گاؤں کی دائی اور سب ملنے جلنے والوں کو پوری تفصیل سے ساجدہ کے مسئلے اور علاج سے آگاہ کیا اور جو بھی تو بیاہتا لڑکی پہلی دفعہ امید سے ہوتی اس کو حمیدہ یاد دلانا نہ بھولتی۔

”بیٹی اپنا خون کا گروپ ضرور چیک کروالینا اور اگر ساجدہ والا گروپ ہو (یعنی نیگٹو) تو بچے کی پیدائش کے بعد مہنگا ٹیکا ضرور لگوانا۔“

ڈاکٹر کے مکمل تعاون اور تسلی سے ان معمولی پڑھے ہوئے دیہاتیوں کو بات سمجھ آگئی تھی کہ عورت کی صحت کا خیال رکھنا نہایت اہم ہے اور یہ کہ ہر مسئلے کا حل ڈاکٹر سے باہمی مشاورت اور مکمل معلومات میں ہے۔

❀❀❀

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے۔۔۔ کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں۔۔۔ غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہون منت ہے۔۔۔ لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے۔۔۔ اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل موہ لینے والی تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے ۔۔۔ کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے

[illegible] اپنے نصیب کی خوشیاں ۔۔۔ [illegible] انتظار سے [illegible] یہ حال ہونا ہے

[illegible] ہماری [illegible] ۔۔۔ محبتوں میں [illegible] وہ مثال ہونا ہے

ہمیں یقین ہے [illegible] وہ لوٹ [illegible] ۔۔۔ [illegible] اپنے [illegible] کو ملال ہونا ہے
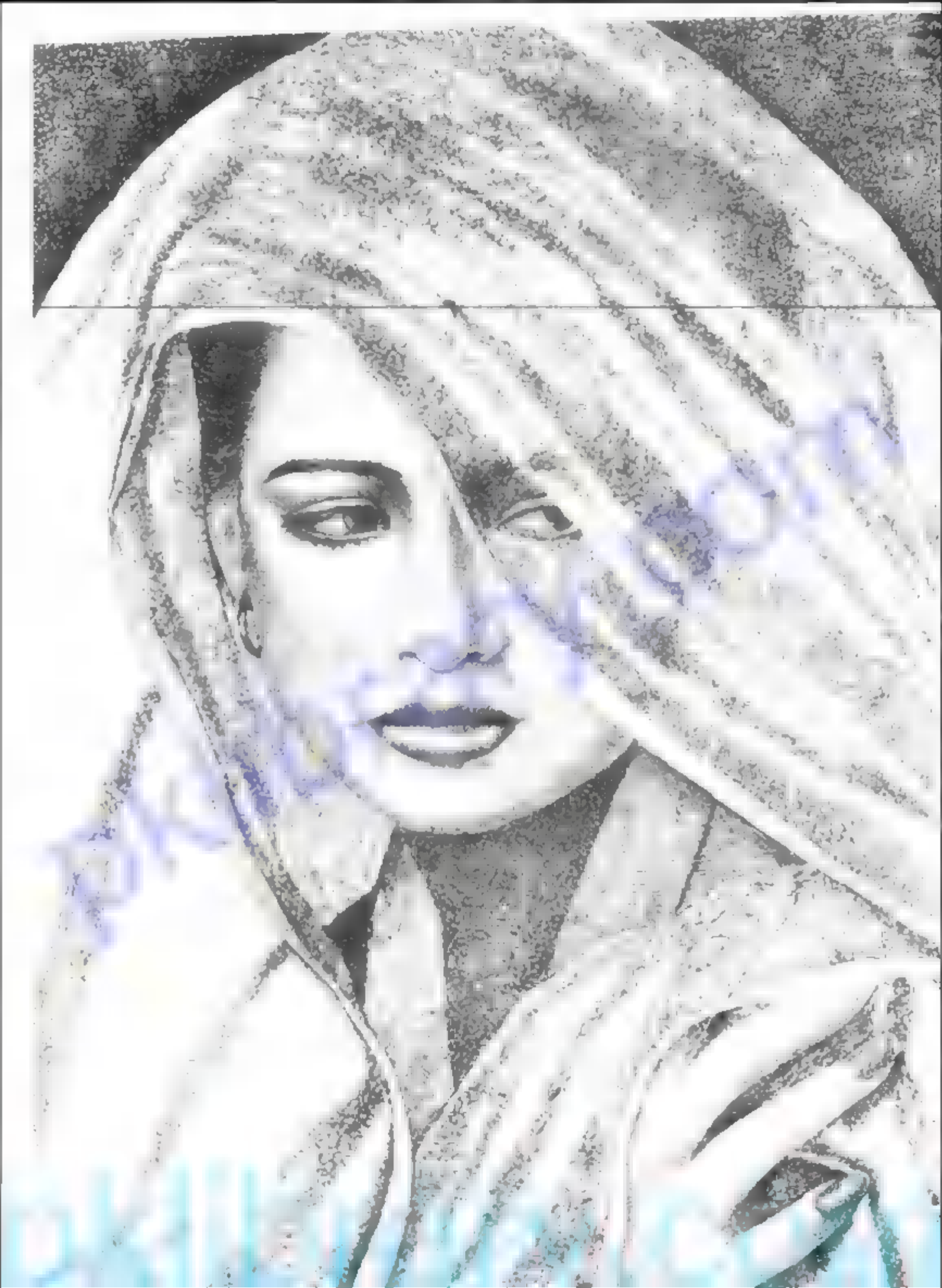
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور امو جان اور تیسری شخصیت دادی پھپو۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ امو، عمائم سے کہتی ہیں کہ ایمان کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ماہم کا رشتہ احتشام کے لیے مانگ لیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ضرور مانگیں مگر اذان کے لیے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ بسمہ چاچی بعد میں عمائم سے معافی مانگتی ہیں کہ یہ دن ہی ایسا ہے شاید تو وہ پوچھتی ہے آج کیا دن ہے تو بسمہ چاچی کہتی ہیں جیل والوں کی ملاقات کا دن۔ جس پر عمائم دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل میں کون ہے۔ عمائم، نورس کے ساتھ زریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو میرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ امو، حریم کو بتاتی ہیں کہ عمائم کی وجہ سے ایمان ان سے بات نہیں کر رہا، ان کی یہ بات ماہم سن لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج ایمان تو کل کوئی اور بھی عمائم کے لیے کھڑا ہوگا۔ زریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہو گئی ہے۔ عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہو گئی۔ وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار..... عمائم، اُمِ رومان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ عمائم اس پیکٹ کو کھول کر دیکھتی ہے لیکن ان عجیب سی چیزوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ عمائم، نورس سے ملنے جاتی ہے تو نورس اس کی بہت تعریف کرتی ہے اور اسے آفر کرتی ہے کہ اگر وہ نورس کے ساتھ کام کرے گی تو وہ اسے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دے گی اور اس کو وہ کلپ دکھاتی ہے کہ کس طرح وہ جامعہ سے بھاگ نکلی تھی۔ عمائم کہتی ہے میں اتنی بھاری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی..... عمائم، نورس کو بتاتی ہے کہ وہ پیکٹ مل گیا ہے لیکن پیکٹ سے برآمد چیزیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ یہ سامان بدل گیا ہے۔ عمائم کہتی ہے کہ میں نے نہیں کیا تو وہ اسے خبردار رہنے کو کہتی ہے اور کہتی ہے کہ راشن ڈپو میں جا کر راشن اتروائے۔ اسٹور کا ہیڈ عمائم کو کہتا ہے کہ ڈیلر نے نیا ڈرائیور بھیجا تھا جس نے ایکسیڈنٹ کر کے سارے انڈے توڑ دیے ہیں۔ عمائم، ڈرائیور کو دیکھ کر الجھن کا شکار ہوتی ہے اور اسے چھپ کر نورس کی تصویریں لیتے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ عالی، عمائم کو بتاتی ہے کہ حریم کی کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ روشان کو ڈھونڈ میں احتشام کو بتاتا ہے کہ مرغی کی تصویریں لیتے ہوئے اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ احتشام کہتا ہے کہ چوزی نے دیکھا ہے تو کوئی پریشانی نہیں۔ عمائم جامعہ سے واپس جانے کے لیے نکلتی ہے تو احتشام اسے لفٹ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ بے طالوی نژاد کرن کی لاش ان کی جامعہ کے بیک سائڈ گٹر سے ملی ہے۔ عالی، کرن کی والدہ سے سوالات کرتی ہے اس رات کے بارے میں تو پتا چلتا ہے کہ کرن نے شاید راستے میں کسی کو لفٹ دی تھی۔ نورس، کرن کے گھر تعزیت کرنے آتی ہے تو عمائم کے ساتھ نورس اور عالی بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تائی امی کو گھر ڈراپ... کر کے جامعہ آتی ہیں تو فٹ پاتھ پر ایک بظاہر بزرگ بیٹھا تھا جسے عالی کوئی رقعہ دیتی ہے تو وہ اپنی وگ اتار کر سامنے کی بلڈنگ میں چلا جاتا ہے، عمائم جب عالی سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اسے اس نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ عمائم واپس وہاں جاتی ہے تو اسے وہ نوٹ ملتا ہے جس پر لکھا تھا کہ میدان خالی ہے۔ جامعہ میں الیکٹریشن آتا ہے تو عمائم اس کے پیچھے جاتی ہے اور اس کو ایک آلہ دیوار میں نصب کرتے دیکھ کر سوچتی ہے کہ نورس کی جان کو خطرہ ہے۔ روشان کے گھر میں اذان اور احتشام تھے وہاں عالی آتی ہے تو احتشام اجنبی ■ تا ہے کہ عمائم ان کی باتوں پر چونک رہی ہے۔ تائی امی بتاتی ہیں کہ ایمان نے کہا کہ میں امو جان کی نفرت کی وجہ جانے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا اور بابا صاحب نے کہا ہے کہ ہمیں عمائم کی خوشی مقدم ہے۔ عمائم کے دل کو بابا صاحب کی باتیں لگی تھیں۔ ایمان، عمائم سے اس کا جواب جاننا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میری رائے تائی امی کے پاس محفوظ ہے۔ ایمان، عمائم کو بتاتا ہے کہ امو نے اس فیصلے پر خاموشی اختیار کی ہے اور خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جلد ہی منگنی ہوگی۔ حریم، عمائم پر منگنی کو لے کر غصہ کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اور کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ بسمہ، عمائم کو بتاتی ہے کہ امو کو جیل میں سے کسی نے فون کیا تھا اس

تو کرنی چاہیے تھی۔ منصور سیال، شام سے دوبارہ بیس ہزار روپے لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ صالح کی بہن سے شادی کر کے اپنے جذبات اور زندگی کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو پھر وہ صوفی صالح کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ عمامہ اور شام کی شادی کر دیں۔ طاہرا اپنی پسند کو لے کر گھوم پھر سکتا ہے تو میرا بیٹا کیا گناہ کر رہا ہے۔ سونیا کالج نہیں آ رہی تھی تو عمامہ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی ہے اور اپنے آنے کا کہتی ہے پھر بڑی مشکل سے وہ اجازت لیتی ہے تو دادی کہتی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جاؤ لیکن طاہرہ شام کو فون کر کے بلا لیتی ہیں۔ سونیا اس کے آنے سے بہت خوش ہوتی ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس کی بہن کو محبت ہو گئی ہے۔ عمامہ کہتی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے..... پھر وہ چونکتی ہے کیا تم دونوں کو ایک ہی بندے سے محبت ہو گئی ہے۔ سونیا، طاہرے مارکیٹ میں نکلی ہے تو منصور سیال اسے دیکھ لیتا ہے اور پھر صوفی صالح کو فون کر کے کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا دو لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا پھر رہا ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ میں نے اپنا رستہ بدل لیا ہے۔ سونیا، عمامہ کو اپنے منگیتر سے ملواتی ہے تو تقی جو عمامہ کو لینے آتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے اور عمامہ پر غصہ کرتا ہے۔ فیقہ، سونیا کا نمبر عمامہ کی ڈائری سے لے کر اسے فون کر کے مدد کرنے کا کہتی ہے۔ سونیا، فیقہ کی مدد کرنے کی ہامی بھرتی ہے اور پھر اس کا حلیہ بدل دیتی ہے اور اس کے لیے ایک رشتے کا تذکرہ کرتی ہے تو دادی کہتی ہیں کہ بچپن کے رشتے نہیں توڑے جاتے اور وہ سونیا کا یہ احسان نہیں اتار سکتی تو وہ کہتی ہے کہ آپ یہ احسان اتار سکتی ہیں۔

اب آگے پڑھیے..

قسط نمبر: 15

عمائم کی پھیلی آنکھوں میں حیرتوں کا سمندر کروٹیں لے رہا تھا۔ بے یقینی پانی کے سفید جھاگ کی طرح بہہ رہی تھی۔ بلا کا تحیر تھا۔ وہ تعجب سے بسمہ کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں سے ابھی تک یاقوت گر رہے تھے۔ وہ ضبط کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ فوٹو فریم اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا جس کی شفاف سطح پر پانی کی بوندوں کے نشان تھے۔ بسمہ کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ منجدھار میں ڈولتی کشتی کی طرح تھی۔ جو پانی کے تیز بہاؤ میں ڈوب رہی تھی، کبھی ابھر رہی تھی۔

اس کے پورے وجود پر گھن دردکی طرح سایہ کر رہا تھا۔ ہر طرف تاریکی پھیل رہی تھی۔ مہیب اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یہ کون سا مقام تھا؟ یہ کون سی جگہ تھی؟ وہ کسی سائے کے نیچے تھی یا سائبان کے؟ ابر سیاہ اس پر پھیل رہا تھا یا برس رہا تھا؟ وہ تاریکی میں داخل ہو رہی تھی یا نکل رہی تھی؟ وہ زندگی جی رہی تھی یا پھر مر رہی تھی؟ وہ ایک بے سانس مورت میں ڈھل چکی تھی۔

عمائم نے کپکپاتے ہاتھ کو بسمہ کے گھٹنے پر رکھ کر اس ''گھن دار'' خاموشی کا اسم توڑا تھا۔

''انہوں نے کیا... کیا تھا؟ کون سا جرم کیا؟'' اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔ بے ربط سا لہجہ تھا۔

''تمہارے باپ کو قتل کیا تھا۔'' بسمہ کے لہجے میں مہیب تھرتھراہٹ تھی۔ عمائم کے سر پر آسمان آ گرا تھا۔ وہ لمحوں میں دم بخود رہ گئی...... اس کے اندر لمحوں میں گھن لگا تھا جو منٹوں میں اسے کھوکھلا کر کے چاٹ گیا۔ وہ ساعتوں میں ڈھے کر بکھر گئی تھی۔ اسے بسمہ کا لفظ، لفظ اجنبی لگا تھا۔ جیسے اس کے کہے لفظ جھوٹ تھے۔ لیکن وہ جھوٹ کہاں تھے؟ وہ تھرا کر چیخ پڑی۔

''نہیں، میں نہیں مانتی.....'' اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ کیا یہ حقیقت تھی؟ اس کا باپ قتل ہو چکا تھا، مارا جا چکا تھا۔ صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا..... پر اس کے باپ کو کیوں مارا گیا؟ کس جرم میں مارا گیا؟ اس کی خطا کیا تھی؟

''تم نہیں مانو گی، تو کیا فرق پڑے گا؟ مقتول واپس آئے گا، نہ قاتل کی سزا ٹلے گی، ہر کوئی اپنے، اپنے کیے کا بھگتان بھگت رہا ہے۔'' بسمہ ٹوٹتے لہجے میں بول رہی تھی۔ عمائم ساکت کھڑی تھی۔ لفظ، لفظ بیکار تھا۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

ہم سفر وہ نہیں جو آپ کا ساری زندگی ساتھ نبھائے بلکہ ہم سفر تو وہ ہے جو آپ کو لمحوں میں پوری زندگی دے جائے۔

وہ لمحوں میں پوری زندگی سمیٹ کر بیٹھا تھا۔ مزید کی "چاہ" یا چاہت نہیں تھی۔ وہ طلب اور حاصل سے آگے نکل چکا تھا۔ اور اس کا بھائی اذان اور دوست روشان یہاں پر اس سے بڑا اختلاف رکھتے تھے۔ ان کے اختلاف اور اعتراض اپنی جگہ تھے لیکن احتشام کو بھی اپنے مقام سے نیچے آنا گوارا نہیں تھا۔

اور روشان تو ہمیشہ کہتا تھا "محبت ایک کھیل ہے جس میں دلیل ہار جاتی ہے۔" لیکن وہ احتشام تھا۔ یہاں پر بھی اپنی مرضی کی دلیل اچھالتا، بحث بھی کرتا اور جیت بھی جاتا...... حالانکہ اس کی دلیل کے جواب میں روشان آرام سے کہہ سکتا تھا۔ "تم مانو یا نہ مانو..... محبت میں ایک قباحت ضرور ہے۔ جس کو یہ گرفتار کر لے عمر بھر آزاد نہیں کرتی۔" وہ روشان کی بات بھی سن لیتا..... اندر سے مان بھی لیتا لیکن بظاہر تسلیم نہ کرتا۔

اذان اور روشان حیران ہوتے، یہ محبت کے ساتھ کیسی گیم کھیل رہا تھا؟ محبت کوئی تاش کے پتوں کی طرح تھی کہ جب چاہا مرضی کا پتا چلا..... مرضی سے ہار لیے، مرضی سے جیت لیے۔

وہ اس کی عقلی منطق تک پہنچنے کا "کمال" نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بس ایک ہی حیرانی تھی۔ "کوئی اتنی آسانی کے ساتھ اپنی محبت کا گلاب کسی اور کے کوٹ میں نہیں سجاتا..." ان دونوں کے بس کی کہانی نہیں تھی جو ہر ٹریک پر بدلتے میروں کا اندازہ کر لیتے۔ وہ تو بس سیدھی سادی بات سمجھتے تھے۔ جسے چاہو، اسے پالو..... احتشام دوسرے معنوں میں ایک کنواں تھا۔ جس کے اندر اتر کر اس کی گہرائی کو ماپنا آسان نہیں تھا۔ دراصل احتشام کی پیمائش کرنے کا کوئی آلہ اب تک دریافت نہیں ہو پایا تھا۔

وہ اپنے بھائی اور دوست کی محبت سمجھتا تھا۔ اسے اذان نے ببانگ دہل اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "برابر ایمان نہیں، رتی بھر تو ایمان ہے۔ تمہارا دوست اور ہم راز..... وہ تمہارے لیے اپنی خواہشوں کے رخ موڑ دے گا۔ مجھے اتنا یقین ہے، تم کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتے..... ؟ منزل آگے بڑھنے سے ملتی ہے۔ رک رک کر چلنے سے نہیں..... تم اپنے ساتھ، ساتھ اس محبت سے بھی زیادتی کر رہے ہو، جسے وہ معصوم، تنہا اور لاوارث لڑکی اٹھا، اٹھا کر تھک رہی ہے۔ میں تمہیں بتائے دے رہا ہوں..... محبت تمہارا پسندیدہ گلاب ہے جو اظہار کی اوس میں بھیگ کر، سنہری دھوپ میں بہت کھلتا ہے۔ لہلہاتا ہے، یہ اظہار کی چاہ میں انتظار کے کشٹ اٹھاتا ہے۔ مگر اَن دھوپ میں فریاد کرتا ہے۔ ناامیدی کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ بے اعتنائی کی ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ بے رخی کے طوفان کی زد میں آ کر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ یاد رکھنا، پھول شاخ سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہتا، مرجھا جاتا ہے۔ محبت یک طرفہ ہو تو نڈھال ہو جاتی ہے، بے حال ہو جاتی ہے۔ دھیرے، دھیرے جیتی ہے اور پھر آخر میں مر جاتی ہے۔" اذان نے محبت پر کوئی تھیسس نہیں لکھے تھے۔ لیکن وہ احتشام سے زیادہ محبت کو کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ محبت مانم کے اندر اگر سانس لیتی تھی تو احتشام کے اندر دھڑکتی تھی۔

یہ وہ آگ تھی جو اوائل عمری کی گلابی شاموں میں چنگاری کی طرح دھیرے دھیرے سے بھڑک اٹھی تھی۔ یہ یک طرفہ محبت کا بوجھ نہیں تھا جسے تنہا مانم نے اٹھا کر رکھا تھا۔ اس بوجھ کو احتشام نے بھی اتنا ہی سہارا دے رکھا تھا۔ برابر بانٹ رہا تھا۔ میزان میں تول رکھا تھا۔ دونوں پلڑے برابر تھے۔

یہ گئے دنوں کا بڑا پرانا قصہ ہے۔ زندگی کی کتاب کا پہلا ورق اگر وقت کی گرد سے جھاڑ کر دیکھتا تو اسے دو روشن آنکھوں والی لڑکی کے آنسو بڑی تکلیف دیتے تھے۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا اور تکلیف دہ مرحلہ وہ تھا جب اس نے ان دو آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ آنسو جو سرمایۂ حیات ہوتے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ جنہیں کوئی چھین نہیں سکتا۔ کوئی چرا نہیں سکتا..... وہ آنسو اس کے اختیار میں تھے۔ وہ انہیں بے دریغ لٹاتی، بہاتی، بے مول کرتی

لیکن احتشام بے بس تھا۔ وہ انہیں بہنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ نہ انہیں گرتے ہوئے چن سکتا تھا۔ کاش وہ ان آنسوؤں کو بے مول ہونے سے روک سکتا یا ان پر کوئی ٹیکس لگا دیتا۔

اس نے تھوڑا شعور پکڑا تو اسے اندازہ ہوا تھا۔ اس لڑکی کو رُلانے والے بہت لوگ تھے۔ جو کبھی لفظوں سے رُلاتے اور کبھی رویوں سے مارتے، وہ اپنی ذات میں تنہا، اداس اور قطعاً اکیلی تھی۔ اِک طویل مدت تک اس کی کوئی سہیلی نہیں تھی۔ احتشام نے ایک لمبی مدت تک اس گھر میں عمائم کے لیے کسی لڑکی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ عمر بھر سے تنہا تھی۔ اس کا کوئی دوست، ہمراز نہیں تھا۔ ہاں اس کے دشمن بے شمار تھے۔ ایمان کی والدہ، ماہم کی والدہ اور خود احتشام کی والدہ...... ان تین عورتوں کو اس چڑیا جیسی ننھی لڑکی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ اس کی شکل تو کیا، اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس کے پیچھے کیا وجوہات تھیں؟ اس نفرت کا سبب کیا تھا؟ اس نفرت کے زہر کی تاثیر کہاں تک تھی؟ اس گھر کے کسی اور فرد کو سوچنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اپنی مصروفیات میں مگن، گم اور مشغول ان لوگوں کو کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ گیلری کے ایک آخری سرے پر تاریک کمرے میں دبکی لاوارث لڑکی رات کی تاریکیوں میں اٹھ اٹھ کر کیوں روتی تھی؟ اسے طوفان سے ڈر لگتا تھا [illegible] بارش سے ڈر لگتا تھا، اندھیرے سے ڈر لگتا تھا، تنہائی سے ڈر لگتا تھا [illegible] یا انسانوں سے ڈر لگتا تھا؟ کسی اور [illegible] یا نہ ہوتی؟ احتشام کو تو خبر تھی...... اس سہمی ہوئی چڑیا جیسی لڑکی کو انسانی رویوں سے خوف آتا تھا۔ وہ ان تین عورتوں کی نفرت انگیز باتوں اور زہریلے رویوں سے سہم کر تاریک گیلری کے آخری کونے میں موجود اس کمرے کی خاموشی میں دبک کر بیٹھ جایا کرتی۔

وہ کبھی عام بچوں کی طرح کھیلنے کے لیے باہر نہیں آتی تھی۔ وہ ماہم کی طرح بہت شوخ نہیں تھی۔ وہ بہت سنجیدہ رہتی تھی۔ وہ سنجیدہ کیوں رہتی تھی؟ اسے ڈائننگ ہال میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے امو کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے احتشام کی امی کو دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کبھی احتشام کے پورشن میں نہیں آئی۔ اسے ایک محدود دائرے میں مقید رکھا گیا تھا کیوں؟ آخر کیوں؟

وہ ایمان، سبحان یا اذان نہیں تھا جو غور نہ کرتا...... سوچتا نہ، نکتے نہ اٹھاتا...... اس کے پاس غور کرنے اور سوچنے کے لیے بڑا زرخیز دماغ تھا۔ ایسا دماغ جو ہر اچھی اور بری گھنٹی کی آواز کو پہچان لیتا، سمجھ لیتا اور الرٹ ہو جاتا...... اس کے اندر ایک الیکٹرک شاک موجود تھا۔ جو وقتاً فوقتاً کرنٹ مار کر چونکاتا رہتا۔

یہ شاک بہت بچپن میں ماں کی طرف سے لگا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کی ماں کو عمائم کے ساتھ ساتھ خود احتشام کے وجود سے بھی نفرت تھی۔ اتنی خطرناک اور بھیانک نفرت جس میں مبتلا ہو کر اس کی ماں نے کئی مرتبہ اسے مارنے کی بھی کوشش کر لی تھی۔

تو گویا احتشام کو عمائم کے قریب وہ "نفرت" کا احساس لے کر آیا تھا جس کا شکار احتشام بھی تھا اور عمائم بھی تھی۔ وہ دونوں اپنوں کی نفرت کا شکار تھے، کیوں...... آخر کیوں......؟ اللہ نے سوچنے کے لیے دماغ دے رکھا ہے۔ غور کرنے کے لیے عقل دے رکھی ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھیں دے رکھی ہیں۔ اس نے غور کرنا تب شروع کیا تھا جب وہ شعور کے گام پر کھڑا ہوا...... تب اس کی ذات پر ایک تلخ ترین انکشاف ہوا تھا...... اسے پتا چلا کہ وہ اپنی ہی ماں کی نفرت کا شکار ہے۔ اور بالکل ایسی ہی صورت حال میں عمائم بھی مبتلا ہے۔ سو بہت اوائل عمری میں ہی اس کے دل میں عمائم کے لیے ایک احساس ابھرا تھا۔ اگلے کئی سال تک وہ اسی احساس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ عمر کے بہت نازک دور میں اس احساس کو احتشام نے ایک حتمی اور مکمل جذبے کا نام دیا تھا۔

اسے گیلری کے انتہائی تاریک کمرے کی سہمی، سہمی مکین سے بڑی خطرناک قسم کی محبت ہو گئی تھی...... اس

انکشاف نے احتشام کو بلایا نہیں تھا بلکہ عمر بھر کے لیے شانت کر دیا تھا۔ وہ اسی دلفریب احساس کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا، چلتا رہا۔

پہلی محبت کا جذبہ دلوں میں وحی بن کر اترتا ہے۔ سو اس کے دل پر بھی محبت وحی کی طرح اتر گئی تھی۔ اس نے دل کے سارے کواڑ کھول دیے تھے۔ وہ اس محبت کو خوش آمدید کہہ رہا تھا..... دریچے کھول رہا تھا۔ محبت کو باہر نکلنے کے لیے رستہ دے رہا تھا۔ محبت پنج سنور کے آ رہی تھی۔ یہ اس کا اوائل عمری کا فیصلہ تھا۔ جس سے محبت کرے گا، اسی کو اپنی زندگی میں شامل کرے گا۔ اور جب فیصلہ ہو گیا تو پھر ماں کو بتانے میں کیا قباحت تھی۔ اس نے تب ایک غیر مناسب وقت میں بڑی مناسب بات کر دی تھی۔ اتنی حیران کن مناسب بات جس نے اس کی ماں کو ہرتا پا لرزہ کر دیا تھا۔

”ابھی آگ تو لو..... پھر عشق بھی کر لینا۔ آخر کس عاشق صادق کی اولاد ہو..... وہی کرو گے جو تمہارے باپ نے کیا۔“ اس کی ماں صدمے کی شدت سے پھٹ پڑی تھی۔ اس پر ایک جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ اس جنون میں مجنون بنی رہی تھی۔ تب اس کی ماں نے چپ کے ساتھ اس کی دھنائی کر ڈالی تھی۔ اس رات احتشام کا کھانا بھی بند کیا۔ اسے اسٹور روم میں ڈال دیا تھا۔ اور اگلے کئی دن تک ہر روز وہ باقاعدہ ماں کے عتاب کا شکار رہا۔ لیکن کیا وہ اس کی محبت کو چھوڑ پایا تھا؟ ہرگز نہیں..... یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ عائم کو سوچتا تو وہ اپنی سوچ سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن تب وہ خاموش ضرور ہو گیا تھا..... یہ سکوت اس وقت ٹوٹ گیا تھا جب اذان نے اسے بتایا اس کی ماں نے عائم کو جانے کیا کچھ کہا ہے..... امو نے عائم پر بڑا تشدد کیا..... وہ اسے جادوگرنی، ظالم اور خاندان برباد کرنے والی کہتی ہیں۔ عائم کی بار وہ دن رات احتشام اندر سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ محض احتشام کی وجہ سے عائم کی زندگی مزید تنگ ہوتی یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ سو اس نے [illegible] لینا احساس ابھرا تھا۔

عائم سے متنفر ہو کر ایک ڈھونگ رچانے والا..... وہ بہت [illegible] دونوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا تھا۔ وہ یہ کام بڑی دلجمعی سے کر رہا تھا، کرتا جا رہا تھا۔ اس نے سوانگ بھر لیا۔ عائم سے نفرت کا بہروپ بھر لیا۔ وہ ایک اور احتشام کے روپ میں ابھر رہا تھا۔ جو عائم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کیا اس بہروپ کے پیچھے والے احتشام کے اندر سے دھڑکتی ہوئی عائم کی محبت کو نکالا جا سکتا تھا؟ یا یہ کام آسان تھا؟

☆☆☆

یہ ان دنوں کی بات ہے..... جب وہ S.S.O کی پوسٹ کے لیے انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اذان اور روشان بھی تھے۔ انٹرویو کی کامیابی کے بعد وہ لوگ طویل اور صبر آزما ٹریننگ کے لیے ایسے ایسے خطرناک علاقوں میں گئے تھے جو انہوں نے زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ اذان اور روشان تو کئی مرتبہ مشقت سے گھبرا کر رسیاں تڑوانے کے چکر میں ہوئے۔ لیکن احتشام ثابت قدم نکلا۔

ٹریننگ کے بعد وہ لمبی چھٹی پر گھر آیا تو تب اسے عائم کی پے در پے کامیابیوں کی اطلاع ملی تھی۔ اسے تائی امی کی زبانی پتا چلا تھا بابا صاحب نے عائم کو جامعہ میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو ”عالمہ“ بن رہی تھی۔ عائم کو اس بات پر فخر تھا یا نہیں تاہم احتشام بڑا پراؤڈ فیل کر رہا تھا۔ اس کا بہت دل چاہا کہ وہ عائم کو اس کامیابی کی مبارک باد دے۔ لیکن اب کی دفعہ وہ کوئی بھی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

احتشام اور اذان کی کامیابی کے اعزاز میں بابا صاحب نے جو اس کے ماما تھے۔ بڑے زبردست ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ اس رات بڑے طویل عرصے بعد ”بڑے گھر“ میں محفل سجی تھی۔

کھانے کے بعد وہ سب لان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے سب کزنز کرید کرید کر انٹرویو اور ٹریننگ کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔ اذان کچھ جھوٹ اور کچھ سچ کی ملاوٹ کے ساتھ سب کو ہنسانے اور قہقہے لگانے پر مجبور کر رہا تھا۔

احتشام کچھ دیر تک ان کی بکواس سنتا رہا۔ پھر اٹھ کر اندر کی طرف آ گیا۔ برآمدے کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک ہیولا دکھائی دیا۔ جو پلر کے ساتھ چپک کر کھڑا تھا۔ احتشام کے قدم رک سے گئے تھے۔ اس نے دبی، دبی ہنسی کی آواز سنی تھی۔ یہ ہنسی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ بغیر دیکھے بھی جان گیا۔ وہاں اندھیرے میں عائم کھڑی تھی۔ ابلتی ہوئی ہنسی کو بمشکل روکتے ہوئے۔ وہ ازان کی باتوں کو انجوائے کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ کو دبانا چاہتی تھی۔

''جھوٹا......'' اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ وہ یقیناً ازان کو کسی ''ہوائی'' پر جھوٹے کا خطاب دے رہی تھی۔ احتشام نے گردن موڑ کر دیکھا۔

''کمال تو احتشام کرتا ہے ازان نہیں......'' وہ بن دیکھے زیر لب کہہ رہی تھی۔ احتشام سن سا کھڑا ہو گیا۔

''احتشام کو کوئی بھی لاجواب نہیں کر سکتا۔'' اس کے کانوں نے پھر سے عائم کی آواز سنی تھی۔ اس آواز میں بھرپور یقین بول رہا تھا۔ یقین کے ساتھ کچھ اور بھی تھا...... کچھ ایسا جو پنہاں تھا، عیاں نہیں تھا...... پر ہو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں آخر وہ کیا بول رہا تھا جس نے احتشام کو ٹھٹکا دیا تھا۔ وہ کیا تھا، وہ جذبوں میں بہتا ہوا میٹھی چاندنی میں نہایا عشق بول رہا تھا۔ وہ عشق جس سے عائم خود بھی ناواقف تھی۔ وہ عشق جس سے احتشام ناواقف نہیں تھا۔ اس نے عائم کو ہمیشہ سے الگ تھلگ اور تنہا پایا تھا۔ وہ محفلوں سے بہت دور رہتی تھی۔ گھر والوں سے الگ رہتی تھی۔ کیونکہ گھر والے اسے الگ ہی سمجھتے تھے۔ وہ ان کی زندگیوں کا حصہ نہیں تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ بہت سالوں کی کھوج کے بعد بالآخر احتشام سراغ پا گیا تھا۔ لیکن اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ عائم کو بھوت سمجھنے میں کہیں نہ کہیں اس کی ماں کا بھی قصور رہ چکا تھا۔

یہ دن اس کی زندگی کے نصاب کا سیاہ ترین دن تھا...... بہت کالا، تاریک، بھیانک اور زہریلا...... وہ اپنی نئی، نئی جاب میں مصروف تھا۔ ان دنوں اس کی ماں کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح شدت پسند اور ...... نہیں رہی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ خاموش ہو چکی تھیں۔ کمرے میں بند رہتیں...... یا بھیگی آنکھوں سے احتشام کو دیکھتی رہتیں۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں، کچھ بتانا چاہتی ہوں...... پھر کچھ اور وقت آگے گزرا تو اس نے اپنی ماں کو جائے نماز پر پایا...... یا تو وہ مصلے سنبھال کر بیٹھ جاتی تھیں یا قرآن کھول کر اونچی آواز میں پڑھتیں یا تسبیح لیے روتی نظر آتیں...... احتشام کو اپنی ماں میں بڑی، بڑی تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ پہلے کی طرح اسے دیکھ کر منہ نہیں موڑتی تھیں۔ نفرت کا اظہار نہیں کرتی تھیں۔ بس زیر لب بڑبڑاتیں یا پھر اونچی آواز میں رونے لگتیں۔ کبھی اللہ سے معافی مانگتی، گریہ کرتی، تڑپتی دکھائی دیتیں۔

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے ''آگہی......'' اور ''ادراک'' کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ آگہی کا مرحلہ انسان کو نامۂ اعمال دکھاتا ہے۔ اس کا وہ عمل جو جانے کس، کس کی اذیت، دکھ اور درد کا باعث بنتا ہے۔ اس کا وہ عمل جو کسی کی آنکھ میں آنسو لے آتا ہے۔ اس کا وہ عمل جو کسی کو کانٹوں پر گھسیٹ دیتا ہے۔ اس کا وہ عمل جو کسی کی جان کا روگ بن جاتا ہے۔ اس کا وہ عمل جو دلوں کو توڑ دینے کا سبب بنتا ہے۔ دل جسے اللہ کا گھر کہا جاتا ہے۔ دل جسے پاک جائے تشبیہ دی جاتی ہے۔ دل جو آبگینہ ہے، آبدار ہے۔ جو ٹوٹ جائے تو جڑتا نہیں...... مر جائے تو زندہ نہیں ہوتا۔ بجھ جائے تو دھڑکتا نہیں، مٹ جائے تو دل نہیں رہتا...... کھنڈر بن جاتا ہے۔ ویران ہو جاتا ہے۔ فنا ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں نے احتشام کو بڑے بھاری وقت میں اپنا دل کھول کر دکھا دیا تھا۔

''مجھ سے ایک ''گناہ''...... ہوا تھا احتشام! میں آج بھی اس گناہ کی گرفت میں ہوں......'' اس کی ماں تڑپ، تڑپ کر اسے بتا رہی تھی۔ وہ بری طرح بدحواس تھی۔

''کیسا گناہ......؟'' احتشام نے تڑپ کر پوچھا۔ ماں اس سے منہ موڑ سکتی تھی۔ وہ ماں سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ ماں اسے دکھ دے سکتی تھی۔ وہ ماں کو دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ ماں اسے نظر انداز کر سکتی تھی مگر وہ ماں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ماں اس کی آنکھوں میں آنسو بھر سکتی تھی پر وہ ماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجبور تھا، ماں مجبور تھی۔

''میں نے دلوں کو توڑ دینے کا گناہ کیا تھا...... کچھ جان کر، کچھ انجانے میں۔ اس گناہ کی پکڑ سے بچنے کے لیے میں نے اور بھی گناہ کیے۔ خود کو غافل کرنے کے لیے، خود کو اذیت دینے کے لیے تمہارے بچپن اور لڑکپن کو ذ…
کیا...... میں بہت بری ہوں، احتشام، مجھے سزا چاہیے۔ مجھے سزا سنا دو...... میرے ضمیر کو آرام چاہیے...... مجھے بس سکون چاہیے۔'' اس رات احتشام کی ماں نے اسے پچھلی زندگی کے باب کھول کر دکھا دیے تھے۔ اسے ایک، ایک صفحہ پڑھ کر سنایا۔ ایک، ایک سطر کھول کر بیان کی۔ احتشام کو اپنی ماں بڑی مجبور اور دکھی لگی تھی۔ بڑی ویران اور اداس بھی...... وہ اتنی خوشحال ہو کر بھی بدحال تھی، نڈھال تھی جیسے زندگی اس کے لیے وبال تھی۔

''ہر گناہ کا ایک کفارہ ہوتا ہے، کیا ہم کفارہ ادا نہیں کر سکتے؟'' اس نے بڑے سکون سے اپنی ماں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر لاد دیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے گناہ کا بوجھ اٹھا لیا تھا۔ اس نے ماں سے کفارے کے لیے کہا۔ اور خود کو کفارے کے لیے پیش کر دیا...... وہ اپنی ماں سے نفرت کے باوجود اس کی محبت میں جتلا تھا۔ وہ اپنی ماں کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کسی اذیت میں جتلا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو ضمیر کے کوڑوں سے زخم، زخم ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے ماں کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا۔ اس کی ماں سے محبت کا یہی تقاضا تھا۔

''کچھ گناہوں کے کفارے نہیں ہوتے۔'' اس کی ماں سسکتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''کفارے ضرور ہوتے ہیں۔'' احتشام نے نرمی سے کہا۔

''میرے گناہ کا کوئی کفارہ نہیں......'' وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔

''یہ آپ کا وہم ہے......'' احتشام ملائمت سے بولا۔ وہ ماں کو سنبھالتے، سنبھالتے خود بھی ٹوٹ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں کفارے کی امانت کا بوجھ اس پر سوار کرنے والی تھی۔ وہ خود کو اس بڑی آزمائش کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس بڑے بحران میں اترنے کے لیے تازہ دم کر رہا تھا۔ وہ طاقت ور تھا، جرأت مند تھا، بڑا بہادر تھا۔ اسے ''خطرات'' سے کھیلنا پسند تھا۔ اسے جنگوں میں جیتنا پسند تھا۔ اسے محبت میں ہارنا پسند تھا۔ وہ اپنی ہاری ہوئی محبت پر بڑے غرور کے ساتھ فردکش تھا۔ اور اس کی ماں اسے جیت جانے کے اسم بتا رہی تھی۔ اس کے اندر اک نئی روح پھونک رہی تھی۔ اس کو نئی زندگی بخش رہی تھی۔

''اسے ''امو'' سے بچا لو...... یہی میرے گناہ کا کفارہ ہو گا۔ میں اس کی ویران آنکھوں میں تمہارے نام کے ستارے بھرنا چاہتی ہوں......'' اس کی ماں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے تھرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پایا تھا۔ وہ اپنی ماں کے کس روپ پر اعتبار کرتا؟ اب کے یا پہلے والے پر......؟

☆☆☆

''زندگی کی خوب صورتی رشتوں سے ہے...... اور رشتے تب ہی قائم رہتے ہیں جب ہم ایک معمولی سی مسکراہٹ اور ہلکی سی معذرت سے سب کچھ نظر انداز کر دیتے ہیں......'' اسے صبح، صبح اسی انجان نمبر سے ایک میسج موصول ہوا تھا۔ وہ جلدی میں تھی۔ پھر بھی پڑھے بغیر نہیں رہ سکی تھی...... حالانکہ آج وہ پہلا پیریڈ اور پہلی کلاس مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر بھی رک کر جواب ٹائپ کرنے لگی۔

''تو ایمان سے معذرت کر لوں......؟ اس کی غلطی کے باوجود؟ اس کی فضول ڈیمانڈز کے باوجود؟'' اس نے

خفگی سے میسج سینڈ کیا۔ کچھ ہی دیر میں جواب آ گیا۔

''ایک چھوٹا سا لفظ ''سوری''...... دوسرے کو بڑی انمول خوشی دیتا ہے۔ دوسرا بھی کوئی غیر نہیں...... اپنا منگیتر اور کزن بھی ہو......'' اس نے میسج کھول کر پڑھا اور برا سا منہ بنا لیا۔

''وہ عادی ہو جائے گا......'' عمائم نے جھنجھلا کر لکھا۔

''نہیں ہوگا......'' ترنت جواب آیا۔

''تم یقین سے کہہ رہے ہو؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عمائم اس کی باتوں کو سچ سمجھ لیتی تھی۔ کیونکہ اس کی پیشین گوئیاں اور باتیں جھٹلانے والی نہیں ہوتی تھیں۔

''سو فیصد......'' جواب ملا۔

''وہ اکڑ جائے گا۔'' عمائم نے روہانسی ہو کر لکھا۔

''نہیں...... وہ خوش ہو جائے گا......'' میسج جھٹ سے آیا۔

''اس کی خوشی وبال نہ بن جائے......؟'' وہ گھبرا اٹھی ''کہیں عذاب بن جائے......''

''عذاب نہیں، نجات بن جائے گی۔'' مبہم سا جواب ملا...... وہ ٹھٹکی۔

''میں سمجھی نہیں...... نجات کیسی......'' وہ گھبرائی۔

''وقت آنے پر پتا چل جائے گا......'' وہی مبہم انداز۔

''اور وقت کب آئے گا......؟'' وہ جھنجلائی۔

''بہت جلد......'' آخری جواب آیا تھا۔ اس کے بعد دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ عمائم کچھ دیر کے لیے سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ پھر زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ کچھ سوچ کر اس نے اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی پہلے حریم اپنے کمرے سے بھاگتی باہر آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہیئر برش تھا، بال کھلے تھے۔ وہ نم بھی تھی۔

''بال تو بنا دو......'' وہ عمائم کا بازو پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اس نے برش لے کر حریم کے بال چوٹی میں گوندھنے شروع کر دیے تھے۔ بڑے دنوں بعد حریم نے خود سے فرمائش کی تھی۔ آج وہ خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی...... عمائم کو اندازہ تھا۔ وہ خود ہی بتا دے گی۔ کیونکہ اس کے ہلکے پیٹ میں کوئی بات رکتی نہیں تھی۔ اس معاملے میں حریم خطرناک حد تک بدنام تھی۔

''تم نے دیکھا نہیں...... آج میں بہت خوش ہوں......'' اس کی توقع کے عین مطابق وہ بے ساختہ بولی تھی۔ عمائم بالوں کے سروں پر پونی لگا کر مسکرائی۔

''دیکھ رہی ہوں......'' اس نے ملائمت سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر مجھ سے پوچھا کیوں نہیں......؟'' حریم نے خفگی سے کہا۔

''مجھے یقین تھا تم خود ہی بتا دو گی......'' عمائم نے دھیمی آواز میں بتایا۔ دوسرے معنوں میں اس کے ہلکے پیٹ پر چوٹ کی تھی۔ وہ سمجھ کر خفیف سی ہو گئی۔

''اچھا، سنو تو......'' اس نے عمائم کی طرف جھک کر دلچسپی سے کہا۔ وہ ذرا چونک گئی تھی۔

''آج میں بہت خوش ہوں......'' حریم مچل کر رہ گئی تھی۔ عمائم نے اسے گھور کر دیکھا جیسے زچ ہو کر بولی تھی۔

''آگے بھی بولو......''

''مجھے احتشام بھائی نے ایک بات بتائی تھی۔'' حریم اس کی گھوریوں پر جلدی سے مسکرا کر بتانے لگی تھی۔ عمائم ایک بھوں اچکا کر رہ گئی۔

''کون سی......؟'' اس نے حیرت سے دریافت کیا تھا۔ کیونکہ حریم ایویں ہی کوئی بات نہیں کہہ دیتی تھی۔ کچھ نہ کچھ اس میں ہوتا ضرور تھا۔

''احتشام بھائی نے بتایا مجھے...... عنقریب اس گھر میں کچھ ہونے والا ہے۔'' اس نے ہر ممکن حد تک تجسس پھیلانے کی کوشش میں اداکاری کی تھی۔ اسی پل حرم نے کمرے میں جھانکا تھا۔ وہ حریم کی بات سن کر برجستہ بولی۔

''ہونے والا نہیں، ہونے والی ہے۔'' حرم نے چہک کر ٹکڑا لگایا۔

''کیا....؟'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔ جیسے اس کی سماعت پر بجلی گری تھی۔

''شادی۔'' حرم نے عمائم کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ بے ساختہ نگاہ چرا گئی تھی۔

''کس کی.....؟'' وہ تڑخ کر پوچھتی۔

''اپنی عمائم کی۔'' حرم نے مزے سے بتایا۔

''کس کے ساتھ؟'' حریم نے غصے میں پوچھا۔ وہ ایسی نگاہ سے حریم کو دیکھنے لگی تھی جیسے اس کا دماغ چل گیا تھا۔

''ایمان بھائی کے ساتھ...... اور کیا تمہارے ساتھ۔'' حرم نے تڑخ کر جواب دیا تھا۔ وہ اسے گھورنے لگی تھی۔ جیسے اس کی بات ناگوار گزری ہو۔

''خوش فہمی ہے تمہاری......'' اس نے چڑ کر کہا۔ حرم بھی چہک اٹھی تھی۔

''خوش فہمی کیوں؟ منگنی کے بعد شادی ہوتی ہے۔ اور عمائم کی بھی ہوگی......'' وہ بھنا کر بولی۔ عمائم نے سر تھام لیا۔ وہ دونوں لاحاصل تکرار میں ایک دوسرے کا دماغ کھا رہی تھیں۔

''ہوگی، ضرور ہوگی...... لیکن ایمان بھائی کے ساتھ نہیں......'' حریم نے جھوم کر بتایا تھا۔ وہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ ٹھٹک گئی تھیں۔

''تو پھر کس کے ساتھ......؟'' حرم نے تنجی سے پوچھا۔ اسے حریم کی نادانیوں پر بڑا غصہ آتا تھا۔ اسے بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادت جو تھی۔ اور وہ دیکھ بھی رہی تھی کہ عمائم کو ان کی تکرار اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''یہ تو وقت بتائے گا......'' شاید وہ عمائم کے چہرے پر پھیلی ناگواریت محسوس کر کے سیانوں کی طرح بیان تبدیل کر گئی تھی۔ عمائم نے گہری سانس کھینچی تھی۔ پھر اٹھ کر باہر جانے لگی۔ لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی تھی۔ پھر اس نے حریم کو مخاطب کیا تھا۔

''اپنے احتشام بھائی کو بتا دینا ضروری نہیں سب کچھ اس کی منشا کے مطابق ہو......'' اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا اور پھر دروازہ بھیڑ کر باہر نکل آئی۔ اس نے جامعہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب اسے اوپر جانا تھا وہ جانتی تھی ایمان گھر میں ملے گا۔ وہ فلائٹ کے بعد ریسٹ لیتا تھا۔

اس نے ڈرتے، ڈرتے زینہ طے کیا تھا۔ وہ اسو کا سامنا کیے بغیر ایمان سے ملنا چاہتی تھی۔ چونکہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اوپر آرہی تھی سو دل بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے ٹانگیں تک کپکپا رہی تھیں۔ اس نے لاؤنج میں ڈرتے، ڈرتے پہلا قدم رکھا تھا۔ وہ سخت بدحواس ہو رہی تھی۔

یہ جدید طرز پر بنا پورشن تھا۔ فرنیچر تک میں جدت تھی۔ ہر چیز میں نفاست نظر آرہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک ڈیکوریشن پیس قیمتی اور جدید تھا۔ کچھ تو غیر معمولی منفرد تھے اور کچھ نمونے غیر ملکی تھے۔ یقیناً ایمان باہر سے خرید کر لایا تھا۔ عمائم بھاں، بھاں کرتے لاؤنج سے گزر کر کاریڈور میں آئی تھی۔ ہر طرف مہیب سناٹا تھا۔ جانے سب لوگ کہاں تھے؟ آمنہ ایمان اور اسو۔ لقمان، سبحان تو یقیناً دفتروں کو جا چکے تھے۔ آمنہ یونیورسٹی سے فارغ تھی اور آج کل گھر میں دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس وقت جانے کہاں تھی؟ ایمان شاید سو رہا تھا۔

اس نے اچانک ہی واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بھلا سوہنی کے لیے منہ اٹھا کر اوپر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایمان سے فون پر بھی معذرت کرسکتی تھی یا پھر جب بھی ایمان نیچے آتا بات ہو جاتی۔ اب وہ پچھتانے کی کوشش کررہی تھی۔

کاریڈور سے گزرتے ہوئے اسے اچانک ایک کمرے سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک زنانہ اور ایک مردانہ آواز تھی۔ عمائم کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ ان دونوں آوازوں کو پہچانتی تھی۔ اس نے سوچا، وہ الٹے قدموں بھاگ جائے لیکن ان آوازوں کی تیزی نے اسے بے ساختہ روک دیا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو روکا۔ اسے امو کی ٹوٹی، بکھری آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہچکیاں لیتے، روتے بمشکل بمشکل...... اس آواز میں صحرا کی ریت اڑ رہی تھی۔ کرب کے نوحے بکھر رہے تھے۔ عمائم کا دماغ سن ہونے لگا تھا۔ اس کی سوچیں مفلوج ہونے لگیں۔

''نصیب چہرہ بدل، بدل کر آتا ہے، چاہے جتنے بھیس بدل کر آئے۔ بدنصیبی کا چہرہ کبھی نہیں بدلتا۔ بدل ہی نہیں سکتا۔'' امو بڑے بھیانک انداز میں رو رہی تھیں۔ باہر کھڑی عمائم کا دل پھٹنے لگا۔

''کبھی کبھی یہ بدنصیبی دہرائی نہیں جاتی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس گھر میں کہیں تو دیپ جلتے ہیں کہیں دل جلتے ہیں۔ کسی ایک کو پوری خوشی نہیں ملتی۔ سارے روگی ہیں، سارے ادھوری خوشیوں کو گلے میں لٹکا کر ڈھول بجا رہے ہیں۔ خوش ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔'' انہوں نے ہچکی، بھیگی آواز میں اپنی بات جاری رکھی تھی۔ گوکہ ان کا لہجہ بڑا بے ربط تھا، مشکل سے بات سمجھ میں آرہی تھی۔ لیکن عمائم پھر بھی سب کچھ سمجھ رہی تھی۔

''کون خوش ہے، بتاؤ مجھے۔ کیا ماہم خوش ہے؟ جس کے خواب جل گئے؟ کیا عمائم خوش ہے؟ جس نے بابا صاحب کا مان بچانے کے لیے خود کو قربان کیا۔ کیا احتشام خوش ہے؟ جو عمائم کے نام کی تسبیح پڑھ رہا ہے۔ کیا تم خوش ہو؟ خوش رہ پاؤ گے؟ عمائم کے ساتھ نباہ کر پاؤ گے؟ ماہم کے جلے خوابوں پر اپنی چاہت کا تاج محل بنا پاؤ گے؟ تمہیں اردگرد بکھری زندگیوں کو دیکھ کر سبق کیوں نہیں آتی...... سبق کیوں نہیں ملتا...... ؟ کسی کی آنکھوں سے خواب نوچ کر حقیقی مسرتیں کبھی نہیں ملتیں۔ تم میری اولاد ہو، میرے جگر کا ٹکڑا ہو، عمائم ہو یا ماہم، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم خوش نہ ہوئے تو مجھے فرق ضرور پڑے گا۔ میں پاگل، بدحواس، مجنون ضرور ہوں لیکن میں تمہاری ماں بھی ہوں۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں ایمان، اس گھر کے افراد نے بڑے بھیانک غم برداشت کیے ہیں۔ اب ہم میں اور سکت نہیں...... اب ہم میں اور طاقت نہیں۔'' ان کی آواز بکھی ہوکر بالکل معدوم ہوگئی تھی۔ عمائم کا رواں، رواں کان بن گیا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روکا تھا۔ وہ ایمان کا جواب لیے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ایمان سے بھی پہلے امو کی ایک مرتبہ پھر آواز سنائی دی تھی۔ عمائم پھر سے سن ہوگئی۔

''احتشام کا عمائم کی طرف متوجہ ہونا، تمہیں بھی عمائم کی طرف متوجہ کرگیا تھا ایمان! ورنہ تم تو ماہم کے لیے دل میں نرم جذبات رکھتے تھے۔ میں نے اس کی ماں کو زبان دے رکھی تھی۔ تم نے میرے ارادے توڑ ڈالے۔'' امو سسکاری لے کر رک سی گئی تھیں۔ ایمان نے موقع غنیمت جان کر اس الزام پر تڑپتے ہوئے جواب دیا۔

''امو! یہ سراسر الزام ہے، بہتان ہے۔ میں کب احتشام کی ضد میں عمائم تک آیا ہوں...... یہ غلط بیانی ہے، مجھے عمائم پر ترس آتا تھا۔ آپ سب لوگ اس کے ساتھ کسی اچھوت کی طرح سلوک کرتے تھے۔ آپ سب کی زیادتیاں دیکھ، دیکھ کر مجھے خوف آتا تھا۔ ایک لاوارث، تنہا لڑکی کے ساتھ آپ لوگوں کا رویہ درست نہیں تھا۔ وہ بیچاری سہم، سہم کر یہاں وقت گزار رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے مضبوط حوالہ دوں...... ایک پہچان دوں، ایک نام دوں۔'' ایمان نے تھم آواز میں عمائم کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔ تو کیا وہ ایمان کی ''خواہش'' نہیں تھی؟ چاہت نہیں تھی، محض انسانی ہمدردی کے ناتے ترس کھا کر۔ وہ تو ایک ہی لمحے میں افق کی بلندیوں سے زمین کی

کھائیوں میں منہ کے بل آ گری تھی۔ اس کی عزت نفس اور انا کا بت پاش، پاش ہو گیا تھا۔

"آپ نے ماما سے کوئی وعدہ کیا بھی تھا تو میں اس بات سے واقف نہیں تھا۔ میں نے عائم کے ساتھ تعلق جوڑنے کے لیے رشتہ بنایا ہے آخری سانس تک نباہوں گا بھی۔" ایمان نے مستحکم لہجے میں اپنے ارادے ظاہر کیے تھے۔

"تم اس سے محبت نہیں کرتے۔" امو نے بھیگی آواز میں اسے یاددہانی کروائی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بہت سی شادیاں محبت کی نہیں ہوتیں لیکن لومیرج سے زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔" ایمان نے بے پروائی سے کہا تھا۔

"عائم تم سے محبت نہیں کرتی..... اس بات سے تو فرق پڑتا ہے۔" امو نے ایمان کے ساتھ، ساتھ عائم کے دماغ کی چولیں بھی ہلا ڈالی تھیں۔ کیا یہ مخبوط الحواس مجنون عورت تھی؟ اتنی روانی سے بولتی ہوئی ذہنی مریضہ تھی؟ کیا یہ پاگل عورت تھی کیا.....؟ عائم چکرا کر رہ گئی تھی۔ اس عورت تک عائم کے دل کا احوال کیسے پہنچا؟ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ سر پر آسمان آن گرا تھا۔ وہ لمحوں میں ریزہ، ریزہ ہو گئی تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے راز تک امو کی رسائی کیسے ہو گئی تھی؟ ایمان بھی اس انکشاف پر دم بخود رہ گیا۔

"آپ کو اندازہ ہے، کیا بات کر رہی ہیں آپ....." وہ تڑخ کر بمشکل بولا۔ شاید بڑے ضبط کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ کیونکہ جس بھونچال کی زد میں عائم آئی تھی۔ اسی زلزلے کو ایمان بھی محسوس کر رہا تھا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی میرے بچے، میں تمہیں خوش اور آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ لہرا کر ایمان کے پیروں میں گر گئی تھیں۔ اس کے پیروں پر امو کے ہاتھ پڑے تھے۔ وہ سرتاپیر کانپ اٹھا تھا۔ اس کی ماں نیم غشی میں تڑپ، تڑپ کر پکار رہی تھی۔

"عمامہ سے شائم تک کی یہ داستان مت دہراؤ..... مت دہراؤ....." وہ ایمان اور عائم کو ساکت کرتی خود سے بیگانہ ہو گئی تھیں۔ باہر کھڑی عائم اور اندر موجود ایمان بھی چیخ پڑا تھا۔ پھر وہ دوسرے ہی پل امو کو اسپتال لے کر بھاگے تھے۔

☆☆☆

"اس کو گڑانب کہتے ہیں۔" حریم شیشے کے باؤل میں گڑ اور املی کا مربہ ڈال کر پراٹھے کے ٹکڑوں سے نوش فرما رہی تھی۔ حرم نے ناک چڑھا کر اس فضول ڈش کو بغور دیکھا تھا۔ پھر منہ بنا کر بولی۔

"تمہارا ٹیسٹ بھی تمہارے جیسا ہے۔" اس نے اپنے تئیں طنز کرنے کی کوشش میں بھویں چڑھائی تھیں لیکن حریم اس کے طنز کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔

"انگور کھٹے ہیں۔" حریم نے انگلی سے باؤل کے کناروں پر لگی املی کی باقیات کو چاٹتے ہوئے کہا۔

"ویسے یہ انگور نہیں، املی ہے، بہت کھٹی......" اس نے لمبا سا چٹخارا ابھرا۔ حرم کو بڑا ہی غصہ آیا تھا۔

"مبالغہ ایک حقیقت ہے۔ جس کی فطرت قابو سے باہر ہوتی ہے۔" وہ کلس کر رہ گئی تھی۔ حریم نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"چکھ کر دیکھ لو....." اس نے خالی باؤل پر لگی تھوڑی سی املی کی طرف اشارہ کر کے حاتم طائی کی روح کو تڑپا دیا تھا۔ حرم نے کراہت سے باؤل پرے کیا۔

"میں تمہارا "جھوٹا موٹا" کھانے کے لیے نہیں ہوں....." وہ بسور کر رہ گئی تھی۔ حریم کو باول ناخواستہ اس پر ترس آ گیا تھا۔

"اچھا، دل چھوٹا نہ کرو..... یہ سامنے والا کیبنٹ کھولو اور اندر سے اسٹیل کی کٹوری نکال لاؤ..... میں نے

نہیں رہ سکتی تھی۔

''کہاں گئے ہیں سب لوگ......؟'' خاتون کچھ مضطرب سی ہو گئی۔

''ایمان بھائی کی منگنی اسو کی پسند کے خلاف ہوئی ہے ناں...... تو اسو اسی غم میں بیمار پڑ گئی ہیں۔'' حریم نے دکھی ہو کر بتایا۔ ''سب لوگ انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔ دعا کریں، منگنی ٹوٹ ہی جائے۔ میرا تو پہلے ہی دل نہیں تھا۔'' وہ ہاتھ مسلتے ہوئے متفکر سی بولتی چلی گئی تھی۔ خاتون بھی لمحوں میں چونک گئی۔ معاً حریم کو خیال آیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''سونیا'' کچھ توقف سے کچھ سوچ انداز میں جواب ملا۔

''بہت اچھا نام ہے آپ کی طرح...... اب میں کس کو بلاؤں......؟ میرا خیال ہے عمائم ہو گی۔'' وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اٹھ رہی تھی۔ جب سونیا نے جلدی سے کہا۔

''مجھے عمائم سے ہی ملنا تھا۔''

''اوہ...... تو پھر عمائم گھر میں ہے، میں ابھی اسے بلاتی ہوں......'' حریم مسکرا کر باہر نکل گئی تھی۔ سونیا گہری سانس کھینچ کر در و دیوار دیکھنے لگی۔ اسے ہر چیز میں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ فرنیچر میں، پردوں میں، قالین میں، سامانِ آرائش میں...... اب چیزوں میں قدامت نہیں، جدت تھی۔ وقت کے ساتھ تبدیلی کا پر یہاں بھی مار گئے تھے۔ بہت کچھ سوچتے ہوئے سونیا کی آنکھوں کے کونے بھیگ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر کئی طرح کے بنتے بگڑتے عکس پھیلنے لگے۔

کافی دیر بعد عمائم چلی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئی۔ سونیا بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی پیاس تھی۔ عجیب سی تشنگی تھی، عجیب سا درد تھا، عجیب سا کرب تھا۔

''مسز ابرار......؟'' عمائم نے سوچ کی سلوٹ سے کرن کی ماما کا چہرہ کشید تھا۔ وہی کرن جو کسی گینگ کا شکار ہو گئی تھی۔ اور جس کا کیس ابھی تک قانونی کاغذی کارروائی تک محدود تھا۔ اس خطے کے اپنے ہی اندھے قانون تھے۔ نہ قانون کو ہاتھ میں لینے دیتے تھے اور نہ قانون کو ہاتھ ہلانے دیتے تھے۔ چاروں جانب سے قانون شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انتہائی بے بس، لاچار، بے حال...... یہ تو میڈیا کا شور تھا جس کی وجہ سے کرن کا کیس حساس ادارے کو ریفر کر دیا گیا تھا۔ ورنہ تو سالوں فائلوں میں بند پڑا رہتا۔

''کرن کے قاتلوں کا کچھ پتا چلا......؟'' عمائم نے افسردگی سے ہاتھ مسلتے ہوئے پوچھا تھا۔ سونیا ابرار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ عمائم کا ایک، ایک نقش کھوج رہی تھی۔ آنکھوں میں بسا رہی تھی۔ دل میں اتار رہی تھی۔ وہ عمائم کو حفظ کر رہی تھی۔ اسے سونیا کی نظروں سے الجھن ہونے لگی۔ عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ قدرے متفکر ہو گئی تھی۔ پھر اس نے سونیا کی بے قراری آواز سنی۔

''تمہیں اپنی ماں کا پتا ہے عمائم......'' سونیا اپنی جگہ سے اٹھ کر عمائم کے قریب آ گئی تھی۔ پھر وہ دو زانو عمائم کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے عمائم کا چہرہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کسی سوکھے پتے کی طرح...... چرمرا رہی تھی۔ عمائم کو لگا تھا کوئی بھاری انکشاف اسے ہلانے والا ہے۔ کوئی آسمان اس کے سر پر گرانے والا ہے۔

''میری ماں......'' اس نے جہانوں کا کرب لہجے میں سمو کر بے قراری سے دھیمی آواز میں زیر لب بڑبڑا کر کہا۔

''کہاں ہے میری ماں......؟'' وہ سونیا کے کپکپاتے ہاتھ تھام کر بے تابی بھرے کرب سے پوچھ رہی تھی۔ سونیا نے اس کے لرزتے، کپکپاتے، تھرتھراتے وجود کو سینے میں سمو کر ضبط کے پل صراط سے گزرتے ہوئے پھٹی، پھٹی آواز میں بتایا۔

''میرے سینے سے لگو عمائم...... میں ہوں تمہاری بدنصیب ماں۔'' کائنات کی ہر چیز گول، گول گھومتے ہوئے عمائم کے سر پر آن گری تھی۔ باہر کھڑی دروازے سے چپکی حریم بھی اس انکشاف پر دہل گئی۔

☆☆☆

رہی۔ نورس کی آواز سنتی رہی۔

''کبھی، کبھی زندگی تاریک موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے۔ جس سے پیچھے بھی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی اور آگے بھی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔'' ٹوٹتی، بکھرتی آواز میں بلا کی ملائمت تھی۔ عجیب سا کرب اور کانچ سی چبھن تھی۔ وہ چلتی رہی اور سنتی رہی۔

''کسی کے چہرے پر مت جاؤ...... کیونکہ چہرہ بند کتاب کے مانند ہے، جس کا سرورق کچھ اور ہوتا ہے اور اندر کچھ اور تحریر ہوتا ہے۔'' وہ روسٹرم پر کھڑی تھی اور ہال میں موجود لڑکیوں کو کیا بتا رہی تھی؟ اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر سوچا تھا۔

''سب کو سب کچھ [illegible] یہ میری زندگی کا اصول ہے۔'' نورس نے مضبوط آواز میں اسے باور کروایا تھا۔ ہال میں موجود ان لڑکیوں کو؟ جن کے دل نورس کی محبت اور عقیدت میں نہال اور لبالب بھرے ہوئے تھے؟ خود کو یا کاریڈور میں چلتی اس صحافی کو جو اس عظیم الشان عمارت میں ایک عظیم الشان مقصد لے کر داخل ہوئی تھی۔

''انسان مجبوری توڑنا چاہتا ہے۔ اور فطرت اسے مجبور رکھنا چاہتی ہے، دونوں اپنے، اپنے راستوں پر مجبور ہیں۔'' اب وہ کس مجبوری کی پتا سنا رہی تھی؟ کون سی ایسی مجبوری ہے جسے وہ توڑنا چاہتی تھی؟ جسے چھوڑنا چاہتی تھی؟ جس سے دور ہونا چاہتی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے پھر سے ٹھٹک گئی۔ رک گئی، اسے کچھ سوچنا تھا۔ غور کرنا تھا، نکتہ پکڑنا تھا۔ اور اس نے سوچ لیا تھا غور کر لیا تھا، نکتہ پکڑ لیا تھا کیونکہ وہ ایک صحافی تھی۔

☆☆☆

اس نے کتابوں میں پڑھا اور داناؤں سے سنا تھا۔ ''انسان کا کردار اس پھول کے مانند ہوتا ہے۔ جو اگر ایک بار شاخ سے گر کر ٹوٹ جائے تو دوبارہ جڑ نہیں سکتا۔ جب تک پھول شاخ سے جڑا رہتا ہے تب تک اس میں رنگ اور خوشبو موجود ہوتی ہے، جو اس کے حسن اور سحر میں اضافہ کرتی ہے مگر جب شاخ سے جدا ہوتا ہے تو رنگ و خوشبو کھو دیتا ہے۔'' اسی طرح انسانی کردار ہے جب تک پاکیزہ اور سچا رہتا ہے وہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنی پاکیزگی اور سچائی کھو دیتا ہے تو وہ کمتر چیزوں سے بھی ارزاں ہو جاتا ہے۔ اور وہ کمتر چیزوں سے بھی ارزاں ہو چکی تھی۔

کچھ لوگ قسمت کے ایسے دھنی ہوتے ہیں جو ببول اگائیں تو پھولوں کی فصل کاشت ہوتی ہے اور کچھ لوگ ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جو پھول اگائیں تو ببول نمودار ہوتے ہیں۔

وہ بھی ایسی بدنصیب تھی۔ اس نے کردار کی فصل پر ببول کاشت کیے تھے۔ لیکن اگائے تھے، کانٹے تیار کیے تھے۔ حالانکہ وہ تو ہمیشہ رائل روڈ پر چلتی رہی تھی۔ سیدھی سڑک اور سیدھا راستہ تھا۔ کوئی موڑ نہیں تھا...... کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر بھی سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے نہ جانے کہاں سے بریکر آ گئے تھے...... اسے بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا اور وہ منہ کے بل جا گری تھی۔ پھر ایسی چوٹ لگی، ایسی ضرب لگی کہ اسے سہلاتے، سہلاتے عمریں گزر گئیں اور ہاتھ سوائے پچھتاوؤں کے کچھ نہیں آیا تھا۔

وہ آج بھی اسی بام پر اسی موڑ پر کھڑی تھی۔ حیران، پریشان اور متعجب...... جیسے آج تک اسی گمان میں تھی کہ اس کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا؟ گو کہ غلطی ایسی بڑی نہیں تھی لیکن اسے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ضرور کر گئی تھی۔ اور اب جبکہ اتنا طویل وقت گزر گیا تھا سو دبی ہوئی راکھ سے بجھی ہوئی چنگاری کریدنا کہاں کی دانشمندی تھی؟ لیکن ابرار کی جذباتیت کا سامنا کون کرتا؟ تب بھی ابرار کی ضد اور جذباتیت کے ساتھ اس کی ''میں'' نے اسے آج تک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ کل سے لے کر آج تک اسی دوراہے پر کھڑی تھی۔

اسی نیم جاں تاریکی میں اس ننھے جگنو کو تلاش کرتی، جو وقت کی تیز ہوا میں اس کے ہاتھ سے پھسل کر کھو گیا تھا۔ وہ آج بھی اسی جگنو کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔

جانے کب تک وہ اتنی شدید سردی میں کھڑی رہتی۔ ابرار کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ بھیگی پلکوں کو اٹھا کر ٹیرس سے نیچے تک بکھرتی رات کو دیکھ رہی تھی...... وہ رات جو اماوس کی تھی...... وہ رات جو تاریک تھی اور اس کے چمکتے نصیب کو غبار آلود کر رہی تھی۔

ابرار نپے تلے قدم اٹھاتے اس کے قریب آگئے تھے پھر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا...... اور دوسرے ہاتھ میں موجود شال اس کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ محبت اور احساس کے اس گرم لمس نے سونیا کے اندر گرمائش سی اتار دی تھی۔ اس نے پلٹ کر ابرار کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح مہربان کھڑے تھے۔ زندگی کے پھیلے پُر وسیع لمحات میں صرف ایک لمحہ نکال دیا جاتا تو ابرار کی اس سے محبت عمر بھر کے احساس سے لبریز تھی۔ صرف وہ ایک کمزور لمحہ چھلکتے ہی سب کچھ پہلے کی طرح اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔ لیکن سونیا کے اندر سے بس ایک ممتا کا احساس بچھڑ گیا۔ وہ بچھڑا ہوا احساس آج بھی اس سے جدا تھا۔

اور ابرار چاہتے تھے وہ کھویا ہوا احساس ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک مرتبہ پھر ماضی کی گرد سے نکال کر اس کی آنکھوں میں سجا دیا جائے...... لیکن کیا یہ ممکن تھا؟

سونیا آتی جاتی سرد برفیلی ہواؤں سے سوال کرتی بڑی بے بس ولاچار کھڑی تھی۔ نہ کوئی رستہ سجھائی دیتا تھا نہ کسی منزل کی کچھ آتی تھی۔ اس معنی خیز برفیلی چپ کو ابرار کی آواز نے بالآخر توڑ دیا تھا۔ وہ بہت جھجک کر سونیا سے مخاطب تھے۔

''تم وہاں گئی تھیں کیا......؟'' گو کہ وہ جانتی تھی ابرار نے یہی سوال کرنا ہے...... اور وہ بڑی بے چینی سے سونیا کا انتظار بھی کر رہے تھے اور سونیا کی چپ پر بڑے مضطرب بھی نظر آ رہے تھے کیونکہ واپس آنے کے بعد بھی سونیا نے انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ نہ ان کی بے چینی کو کم کیا تھا نہ ان کی بے قراری کو زائل کیا تھا۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ ابرار کو اس کا کندھا ہلا کر متوجہ کرنا پڑا۔

''تم نے بتایا نہیں......'' ابرار متفکر سے پوچھ رہے تھے۔ سونیا نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''کیا بتاؤں......؟'' اس نے بڑی اداسی سے سوال کیا۔ آنکھوں میں جیسے ریت بھر رہی تھی۔ وہ بے ساختہ نظر چرا گئے تھے۔ سونیا کی آنکھوں میں اڑتی ریت دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

''عمائم سے ملی ہو......؟'' اندر چبھتی پھانس کو بالآخر انہوں نے باہر نکال ہی دیا تھا۔ سونیا ہونٹ کاٹتی اماوس کی پہلی رات کو دیکھنے لگی تھی جو ایک مرتبہ پھر اس کی زندگی پر محیط ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھ میں بھی سیاہی پھیلی۔

''ہاں......'' وہ آنکھوں سے نکلتی سیاہی کو ہتھیلیوں میں سمیٹتی رہی۔

''تم نے اسے بتایا......؟ اس کا ردعمل کیا تھا؟'' ابرار بے قراری سے بولتے چلے گئے۔

''ردعمل کیسا ہونا چاہیے؟'' اس کے ٹھنڈے ٹھار لہجے نے ابرار کو بہت کچھ باور کروا دیا تھا۔ وہ بے دم سے ہو گئے۔ گویا اس کا جواب بن جانے ہی بجھ چکے تھے۔

''تو اسے تمہاری بات پر اعتبار نہیں آیا؟''

''ہاں...... اور وہ ثبوت مانگ رہی ہے۔'' سونیا حلق میں اٹکی پھانس بالآخر نکال کر بے بسی سے بول رہی تھی۔

☆☆☆

وہ چوتھی مرتبہ بے مراد پلٹی تھی۔ عمائم نے دروازہ کھولنا تھا نہ کھولا...... گو کہ وہ کئی مرتبہ دستک دے چکی تھی اور کئی مرتبہ عمائم کی بھرائی آواز میں ڈونٹ ڈسٹرب بھی سن چکی تھی پھر بھی دل کو پتنگے سے لگے تھے۔ وہ بار، بار خود بخود مڑ کے اندھیرے میں ڈوبی گیلری کے سرے تک آ جاتی۔

جب سے وہ خوب صورت آنٹی، عمائم سے مل کر گئی تھی تب سے عمائم کمرا بند کیے غروب تھی...... گو کہ سچ کی کہانی سے حریم بھی فیض یاب ہو چکی تھی۔ اور عمائم کی ڈسٹربنس سے واقف بھی ہو چکی تھی پھر بھی تنہائی کے ان لمحات

میں عمائم کو اکیلے چھوڑنا اسے گوارا نہیں تھا۔ یہ بھی جانتے ہوئے کہ آنٹی کے بھیانک انکشاف عمائم کو ڈسٹرب کر رہے تھے۔ پھر آنٹی کی آہ و زاری، آنسو اور کرب سے گمان لگتا تھا کہ وہ سچ ہی کہہ رہی تھی۔ کیونکہ اداکاری میں اتنے سچے آنسو کہاں سے آسکتے تھے کم از کم حریم کے لیے تو جھوٹ موٹ رونا بڑا مشکل اور ناممکن سا کام تھا۔ اور اب عمائم کا کمرا بند کر کے رونا یقیناً وہ رو رہی تھی۔ حریم سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جو بھی تھا اسے عمائم سے بڑی محبت تھی۔ اور عمائم کی خاموشی اسے ہراساں کر رہی تھی۔

چونکہ گھر میں کوئی بڑا موجود نہیں تھا اس لیے حریم کی گھبراہٹ دو چند تھی۔ اب کرے تو کیا کرے؟ خوب صورت آنٹی کے انکشاف پر جتنا حیران ہوا جاتا کم تھا۔ اوپر سے عمائم کا رونا، تو حریم کا ذہن مختلف نہیں تھا۔ ایک بلا دینے والے انکشاف پر عمائم آنٹی کو ہر پھول تو پہچاننے سے رہی..... وہ تو خود آتش فشاں پہاڑ کے نیچے تلے دبی تھی۔ خوب صورت آنٹی کا انکشاف بھی کوئی معمولی تھوڑی تھا۔

”میں تمہاری بدنصیب ماں ہوں“ حریم کے لیے ان الفاظ کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر عمائم کیسے برداشت کر لیتی۔ یہ کون تھی جو اچانک ”ٹرمے“ سے اٹھ کر عمائم کی ماں ہونے کا دعویٰ اٹھائے چلی آئی۔

حریم کا دماغ سنسنا رہا تھا دل میں گھبراہٹ، تجسس اور بے چینی کی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اوپر سے عمائم کے نے ”ٹنمز“ ہر حال رہا تھا۔ وہ بے چینی سے دروازہ بجا بجا کر تھکنے لگی۔

”اللہ جی.....! عمائم کہیں ”صدمے“ سے گزر ہی نہ جائے... خودکشی ہی نہ کر لے... بندہ دکھ اور صدمے کی انتہا پر لاچار ہو جاتا ہے“ حریم نے دکھی دل سے دعا کی اور متواتر دروازہ بجاتی رہی۔ عمائم نے اب کے ڈونٹ ڈسٹرب ہی کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اندر مہیب خاموشی تھی جو حریم کو ہولائے دے رہی تھی۔

اچانک ایک خیال آنے پر وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ حریم کی وارڈ روب کو کھول کر کپڑوں کی تہوں کے پیچھے سے اس نے پرانا سا سیٹ موبائل نکال لیا تھا جو حریم نے اپنی بہن سے کسی کو میسج کرنے کے لیے ادھار لیا تھا۔ گم کرلائی تھی اور جسے حریم سے چھپا کر چپکے چپکے کھیلنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ حریم نے جلدی سے ایک میسج ٹائپ کیا۔ نیچے اپنا نام بھی لکھا۔

”گھر ہو کیا.....؟“ چند لمحوں بعد جواب آیا۔

”ہاں.....“

”تو پھر ہمارے گھر پہنچو..... فوراً۔“ حریم نے تیزی سے دوبارہ ٹائپ کیا..... رپلائی فوراً آیا تھا۔

”پارٹنر خیریت ہے!؟“ اب کہ جواب میں تشویش تھی۔ حریم کو دوبارہ لکھنا پڑا۔

”نہیں...“ اس نے تیزی سے ٹیکسٹ ڈیلیٹ کیے اور موبائل کپڑوں کی تہوں میں سنبھال دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ اب جواب نہیں آئے گا بلکہ وہ خود آجائے گا۔

پھر واقعی اگلے تین منٹ میں وہ اپنے مخصوص شارٹ کٹ سے اوپر ایمان کے ٹیرس سے ہوتا ہوا سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا تھا۔ گیلری کے سرے پر حریم بے قراری سے ٹہلتی دکھائی دی تھی۔ اسے دیکھ کر بے چین ہوتی آگے بڑھی۔

”آگے شام بھائی!“ حریم نے سخت بے چینی سے کہا۔

”نہیں..... راستے میں ہوں.....“ اس کا انداز مخصوص تھا۔ وہ آؤٹ شرارت سے انتہائی سنجیدہ۔

”کام کی بات بتاؤ.....“ وہ بھی خاصا متفکر تھا... کیونکہ حریم کے بلاوے پر اسے صورت حال خاصی گمبھیر لگ رہی تھی۔

”بات یہ ہے.....“ حریم نے کہنا شروع کیا تو احتشام نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا تھا۔

”اوں ہوں...“ اس نے تنبیہہ کی تھی۔ ”وہاں سے شروع کرو..... جب خوب صورت آنٹی نے کہا۔ میں عمائم میں تمہاری بدنصیب ماں ہوں“ احتشام کا انداز دو ٹوک اور سنجیدہ تھا۔

''مگر وہ تو آخری بات تھی۔ آنٹی نے اینڈ میں کہا..... پہلے تو..... '' حریم خوب صورت آنٹی کی انٹری سے لے کر عمائم کے سر پر دھماکا کرنے تک پوری سچویشن کی جزئیات بتانا چاہتی تھی لیکن احتشام نے اسے روک دیا تھا۔

''ہاں..... جانتا ہوں میں..... جب وہ گھر میں داخل ہوئیں..... تم نے جو کچھ کہا..... بلکہ تمہی نے کہا..... انہیں بولنے کا موقع نہیں دیا..... آگے بتاؤ..... وہیں اینڈ سے.....''

''لیکن تمہیں کیسے پتا چلا شام بھائی.....'' حریم کچھ ہونق ہوئی۔

''یار تم بھی ناں..... ہر دفعہ وضاحت چاہتی ہو.....'' وہ بیزار ہوا تھا۔ حریم سمجھ گئی تھی۔

''اچھا، اچھا..... تم نے اپنے مورچے سے ایکسرے کرلیا ہوگا.....'' حریم نے سر ہلایا تھا۔ مورچے سے مراد غالباً ٹیرس یا اس کا ٹیرس سے جڑا کمرا تھا..... جہاں پر کھڑے ہوکر وہ اردگرد کی لوکیشن اور سچویشن سے ہمیشہ باخبر رہتا تھا۔

''سیانی تو ہو تم..... جانے کبھی کبھی پٹڑی سے کیوں پھسل جاتی ہو.....'' احتشام کی سنجید گی قابلِ دید تھی۔ حریم اپنی تعریف پر پھولے نہیں سمائی تھی بلکہ ''جامے'' میں ہی پھولنے لگی۔

''اب بولو بھی۔'' اس نے چٹکی بجائی تھی۔ حریم نے اسٹارٹ لے لیا۔ آخر سے لے کر بیچ تک ساری بات کہہ سنائی تھی۔ آغاز کو حذف کردیا گیا تھا۔ کیونکہ احتشام کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے ساری بات سنتا رہا، سوچتا رہا۔ حریم کو ٹوکا نہیں..... جب پورے جوش کے عالم میں حریم نے قصہ تمام کیا اور داد طلب نگاہ احتشام پر ڈالی تو سخت مایوسی کا سامنا ہوا تھا۔ احتشام غیر دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ سینے پر ہاتھ باندھے جیسے کچھ بیزار ہو، حریم کو بڑا ہی برا لگا..... اتنی بڑی بات پر احتشام کا ردعمل اتنا معمولی تھا کہ حد نہیں..... یعنی عمائم جیسی ''سوالیہ نشان'' لڑکی کی اچانک ایک امیر خاتون ماں کا دعویٰ لے کر سامنے آجاتی ہیں۔ خود کو اس کا وارث بتاتی ہیں تو یہ بات معمولی تو نہیں ہوئی ناں.....

''کچھ اور.....؟'' احتشام نے اس کے خاموش ہوتے ہی پوچھا۔ حریم کا سر نفی میں ہلتا چلا گیا تھا۔ اسے احتشام کے رویے سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ یعنی کہ اتنے بڑے انکشاف پر ایسا فضول ردعمل؟ ہونہہ.....

''اس سے بڑھ کر اور کیا؟ اتنی بڑی رپورٹ تو دی ہے۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''اب..... انعام..... چاہیے.....'' دفعتاً احتشام کو رویہ بدلنا پڑا۔

''ہرگز نہیں.....'' اس نے تنک کر کہا تھا۔

''تو پھر.....'' احتشام کی آنکھوں میں سوالیہ نشان اتر آیا۔

''مجھے عمائم کی فکر ہے..... وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ بہت رو رہی تھی۔ مجھے لگا، اس انکشاف پر اسے ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ اس نے کمرا بند کرلیا۔ اور میرے اتنے اصرار پر بھی نہیں کھولا..... اور وہ اکیلی ہے، دکھی ہے، صدمے سے بے ہوش نہ ہوجائے..... دروازہ بھی نہیں کھول رہی.....'' حریم دکھی سی بولتی چلی گئی تھی۔ جیسے اس جذباتی تقریر پر احتشام فوراً ''جذبات'' میں آکر دروازہ توڑ ڈالے گا۔

''اور میں اب کیا کروں.....؟ میرے لیے حکم.....'' وہ اتنی معصومیت اور انجان پن سے بولا تھا کہ حریم کو..... بے انتہا غصہ آگیا۔ یعنی اس کی ساری تقریر بیکار گئی۔ وہ ابھی تک حکم کا منتظر تھا۔ یا بات کا پس منظر نہیں سمجھا تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ تم..... میرے لیے حکم.....'' اس نے احتشام کی نقل میں غصے میں نقل اتاری۔

''تم چاہتی کیا ہو.....؟'' احتشام اس کے غصے پر مصالحانہ انداز میں بولا تھا۔ حریم نے تنک کر اسے دیکھا..... اور بولی۔

''کچھ نہیں.....'' اس نے محض تیور دکھانے کے لیے کہا تھا۔ احتشام نے سچ سمجھ لیا اور تھینکس بولتا آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ حریم کو جیسے رونا آگیا۔ ''کتنا کٹھور ہے احتشام بھائی..... بس اتنی محبت تھی عمائم سے، وہ کمرے میں بند چاہے مری پڑی ہو کسی کو کیا پروا ہونہہ..... یہ ہوتی ہے محبت کچھ کرتی ہوں عمائم! میں ہی کچھ کرتی ہوں۔''

وہ اسٹور روم میں جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ وہی اسٹور روم جس میں لوہے کی ایک الماری رکھی تھی۔ جس کے سیف میں پورے گھر کی چابیوں کے گچھے پڑے تھے۔ تلاش کا کام مشکل ضرور تھا۔ لیکن وہ عائم کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی، وہ آنسو پونچھتی اسٹور روم میں غائب ہوگئی تھی۔

احتشام نے سیڑھیوں سے پار دور تک دیکھا تھا۔ بڑبڑاتی ہوئی حریم کہیں نہیں تھی۔ گیلری کے دونوں سرے خاموش تھے۔ وہاں حریم کا سایہ نہیں تھا۔ احتشام دبے قدموں واپس اسٹیپس اتر آیا۔ پھر اس نے جیکٹ کی ایک خفیہ پاکٹ ہولے سے تھپتھپائی تھی کسی چیز کی موجودگی کا یقین کر کے وہ اندھیرے میں ڈوبی گیلری کے آخری کونے میں آ گیا۔

اردگرد کا جائزہ لے کر اس نے خفیہ پاکٹ کے خانے کو آرام سے کھولا۔ اندر ایک لوہے کا خاص اوزار تھا۔ چابی نما نوک دار اوزار ''چابی'' نہیں تھا۔ پھر بھی مشابہت چابی سے مختلف نہیں تھی۔

اس نے کی ہول میں اوزار پھنسایا اور کھٹک کی آواز کے ساتھ ہی ایک جھٹکے میں دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے انتہائی [illegible] میں [illegible] مثل بردبا ڈالا اور عائم کی راجدھانی میں پہلا قدم دھر دیا۔ وہ عائم کی ''سلطنت'' میں پہلی مرتبہ اس کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے آ رہا تھا۔

کیا یہ سلطنت دل تھی؟

☆☆☆

''آپ اس احسان کا بدلہ اتار سکتی ہیں دادی! اگر آپ اسے احسان سمجھتی ہیں تو؟'' سونیا نے ایک مرتبہ پھر اپنی بات دہرا کر محفل پر سکوت طاری کر دیا تھا۔ اس کا لہجہ نہایت میٹھا اور شہد آگیں تھا۔ وہ اپنا نرم ہاتھ دادی کے گھٹنے پر رکھے ملائمت سے کہہ رہی تھی تاکہ دادی کو برا بھی نہ لگے، غصہ بھی نہیں آئے۔ لیکن وہ جانتی نہیں تھی۔ دادی سب کچھ سہہ سکتی تھیں تاہم شام پر کسی بھی قسم کا سمجھوتا کرنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ شام کے حق سے دستبرداری کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

''بدلہ......؟'' ہر ایک کی آنکھ میں سوال مچل گیا تھا۔ سونیا کیا بولنا چاہ رہی تھی؟ اس کا ارادہ کیا تھا؟ طاہرہ اور عمامہ کا دل مٹھی میں بھینچ گیا۔ کیا کوئی نیا امتحان آنے والا تھا؟ کوئی نئی آزمائش......؟ طاہرہ نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ عمامہ کا رنگ زردی مائل ہونے لگا۔ جیسے کسی نے گالوں پر زعفرانی برش پھیر دیا ہو۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو سونیا بیٹی......!'' دادی متعجب سی پوچھ رہی تھیں۔ طاہرہ اور رافعہ کا [illegible] اندر باہر آ رہا تھا۔ عمامہ کسی بت کی طرح ساکت تھی۔ اور طاہرہ بے سانس کھڑی تھیں۔

''دادی! شام اور رفیقہ؟ یہ کچھ ''بے جوڑ......'' نہیں؟ میں نے تو رفیقہ کے لیے بہت اعلیٰ پرپوزل ڈھونڈا ہے۔ شام سے بہت اچھا...... ایک مضبوط بیک گراؤنڈ رکھنے والا...... امیر، خوشحال اور شام سے بڑھ کر تعلیم یافتہ، اس کے پاس باہر کی ڈگری ہے۔ نہایت قابل اور اعلیٰ رشتہ ہے۔ شام تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں......'' سونیا نے ہچکچا کر بالآخر وہ سب کہہ دیا جو اس کے اندر موجود تھا۔ وہ اپنے لائے پرپوزل کی ہر اس خوبی کو بیان کر رہی تھی جو دادی کو متاثر کر سکتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی اس تقریر کا اختتام ''بے سود'' رہا۔ سونیا وکیل باپ کی بیٹی...... اور وکیل بہن کی ساری وکالت کا بھرکس نکال کر اٹھ گئی تھی۔ کیونکہ وکالت وہاں کامیاب ہوتی ہے جہاں موقف کو سنا جائے...... دادی نے تو اس کو دوٹوک لفظوں میں بتا دیا تھا۔

''ہمارے ہاں بچپن کے رشتوں کو توڑا نہیں کرتے......'' وہ ہٹیلے پن سے بولی تھیں۔ اگر سونیا کا تازہ، تازہ احسان نہ ہوتا تو ابھی کے ابھی...... اسے مزہ چکھا کر بھیج دیتیں۔ لیکن اس وقت صبر کے گھونٹ بھرنے پر مجبور تھیں۔ کیونکہ آگے بھی رفیقہ کو سونیا کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

سونیا جب تھک ہار کر واپس جا رہی تھی تب اس نے عمامہ کو صرف اتنا کہا۔

"یہ عورت بہت جیلسی ہے یا پھر شام ہی تمہارے نصیب میں نہیں......" سونیا کا لہجہ انتہائی غم زدہ تھا۔ وہ عمامہ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ یہ پچھتاوا اس کے اندر سے کبھی نہیں گیا۔ گو کہ وہ قصور وار نہیں تھی پھر بھی خود کو مجرم سمجھتی...... دوستوں کا کیا فائدہ اگر کام نہ آسکیں...... حالانکہ عمامہ نے اسے بہت دفعہ پچھتاوے کے اثر سے نکالنا چاہا تھا۔ وہ سونیا کو شرمندگی کے حصار میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن سونیا کے اندر سے یہ گلٹ کبھی نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

باغ میں منال ٹہل رہے تھے۔ لاجوردی کنٹھے والے خوب صورت منال...... وہ کٹوری میں چوری کوٹ کر کچن سے باہر نکلی۔ نرم و ملائم دیسی گھی میں گندھی چوری کی خوشبو سونگھ کر منال بھاگتے ہوئے آ گئے تھے۔ عمامہ نے جھک کر منال کو پیار کیا...... ان کے لاجوردی کنٹھوں کو چھیڑا...... کٹوری گھاس پر رکھ دی۔ منال کٹوری میں چونچیں گھسا کر اردگرد سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ عمامہ کچھ دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ بڑی محبت اور پیار سے...... پھر پلٹ کر ماربل کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر نرم سی چمک تھی۔ وہ بے خودی میں معصوم پرندوں کو دیکھتی رہی۔

معاً کوئی سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا تھا۔ عمامہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ جینٹس شلوار قمیص میں شام اس کے قریب آتا دکھائی دیا تھا۔ شاید اپنے دھیان میں وہ عمامہ کے قریب سے گزر جاتا۔ عمامہ نے خود ہی آواز دے کر اسے روک لیا تھا۔ وہ رک گیا۔ ٹھہر گیا۔ پھر پلٹ آیا تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" عمامہ اسے فریش اور تر و تازہ دیکھ کر برائے بات کی غرض سے بولی۔

"کہیں بھی نہیں......" شام نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر......؟" وہ چونک گئی تھی۔ شام نے گردن گھما کر منال کو دیکھا۔ وہ بڑے امن کے ساتھ کٹوری میں منہ گھسائے مصروف تھے۔

"تم وہ پوچھو، جو پوچھنے کا ارادہ رکھتی ہو......" شام کی سنجیدگی پر اس نے گہری سانس کھینچ لی تھی۔ اب وہ...... بے خیالی میں امرود کے پیڑ دیکھ رہی تھی۔ جن کی شاخوں سے طوطے لٹک رہے تھے۔ کچھ امرود کی نرم سطح کو ٹھونگ رہے تھے، کچھ بلاوجہ ہی شور مچا رہے تھے۔ ماحول پر پرندوں کا ہنگامہ بکھرا ہوا تھا۔

"دادی نے تم سے کچھ کہا؟" وہ سنجیدہ تھی، آزردہ تھی، اندر سے بکھری بکھری، ٹوٹی پھوٹی تھی۔ پھر بھی پُرامید تھی۔ امیدیں اتنی آسانی سے ٹوٹا نہیں کرتیں۔ اگر ٹوٹ جائیں تو پھر جڑا نہیں کرتیں۔

"جب کہا تو سب کو خبر ہو جائے گی۔" شام بھی سنجیدہ تھا۔ اس کی رگیں عمامہ کی بات سمجھ کر کھنچ گئی تھیں۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ دادی کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔" عمامہ ایک امید کے تحت پوچھ رہی تھی۔ کیا خبر، شام کے پتھر دل پر سوراخ ہو جاتا...... کیا خبر، وہ بزدلی کا لبادہ پھینک دیتا۔

"ہمارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ جو اوپر لکھا جا چکا ہے ہو کر رہے گا۔" شام نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اس کے اردگرد اداسی پھیل رہی تھی۔ ایسی اداسی جسے وہ ظاہر نہیں کرتا تھا اگر عمامہ پر کر دیتا تو وہ اتنی صابر نہیں تھی جو برداشت کر جاتی۔ بلکہ گریبان چیر کر جنگلوں میں نکل جاتی۔

"تم ایک مرتبہ کوشش تو کرتے۔" عمامہ کی وہی التجائیں، وہ کتنا جھکتی؟ وہ کتنا گرتی؟ کیا شام اندازہ کر سکتا تھا؟ کیا وہ خود اندازہ کر سکتی تھی؟ عمامہ کیا تھی؟ کیا ہو رہی تھی۔ کیا بنتی جا رہی تھی۔

"عمامہ!" اس التجا پر وہ بے بس ہو جاتا تھا۔

"کہہ دو، تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم بزدل ہو شام......" عمامہ نے ہمیشہ والا "طعنہ"...... دہرا دیا تھا۔ وہ اور بھی بے بس ہو گیا۔

"تم ایک دفعہ قسمت تو آزماتے۔ تم ایک مرتبہ کوشش تو کرتے۔" اس کی آنکھوں میں اصرار پگھلتا رہا، کرب

پھیلتا رہا، غم بڑھتا رہا۔

"کیا کوشش کروں......؟" شام ضبط کرتے، کرتے بھی پھٹ پڑا تھا۔ "کیسی کوشش کروں ؟ بتاؤ مجھے، تمہارے باپ کے سامنے کھڑا ہو جاؤں؟ تمہارے بھائیوں کے منہ پر کیا کہوں......؟ ایسی "بہادری" اور "ہمت"..... مجھ میں نہیں کہ تمہیں بھگا کر لے جاؤں۔ میری غیرت، عزت اور حرمت ایسی "شرمناکی" گوارا نہیں کرتی۔ اور اس کے علاوہ کوئی آپشن ہے تو بتاؤ۔" وہ ضبطِ غم سے بولتا رہا۔ عمامہ بے سانس سنتی رہی۔

"تو کیا فیقہ سے شادی کر لو گے؟" عمامہ سب جانتے بوجھتے بھی زخم ادھیڑ رہی تھی اور ہمیشہ ہی ادھیڑتی تھی۔

شام نے نمی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ وہ اسے لمحہ لمحہ دیکھتا رہا۔ قطرہ، قطرہ اندر دل میں اتارتا رہا۔ نقش، نقش پڑھتا رہا۔ گویا حفظ کر رہا ہو۔ اور وہ اسے حفظ کرتے، کرتے خود کو بھول رہا تھا۔ اس وقت کو بھول رہا تھا۔ ساری قسموں، سارے وعدوں، سارے "احسان" بھول رہا تھا۔ کیا تھا اگر وہ کچھ خود غرض ہو جاتا؟ کیا تھا اگر کچھ بے حس اور سنگ دل ہو جاتا؟ کیا تھا ذرا سا بے ضمیر ہو جاتا۔ کیا تھا اگر تھوڑا سا "بے غیرت" ہو جاتا۔ کم از کم "نارسائی" کے عذاب سے تو بچ جاتا۔ لیکن وہ بے ضمیر اور بے غیرت نہیں تھا۔ ہاں "بے بس" ضرور تھا۔

"ایک بات سن لو عمامہ!" وہ اس کے شہرے پانیوں والی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے علاوہ کوئی بھی ہو...... کیسی بھی ہو...... شاہ میر منصور کو کوئی فرق نہیں پڑتا...... کوئی فرق نہیں پڑتا...... زندگی کو آگے تو بڑھنا ہے۔ پھر یوں ہی سہی...... ایسے ہی سہی...... بقول تمہارے، بزدل تو میں بلا کا ہوں...... خودکشی کر نہیں سکتا، مر بھی نہیں سکتا...... مرتا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔" شام کی آنکھوں میں "شامِ محبت" اتر آئی۔ محبت کی غمناک شام...... جس کی سویر بھی شام ہی۔ دوپہر بھی شام تھی...... پھر بھی شام تھی۔ "لیکن تم حیران ہو گی عمامہ! جب تمہیں زندہ وجود میں مردہ ڈھانچے نظر آئیں گے۔ چلتے پھرتے بے جان بت اور لاشے جو مرے ہوئے سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ مُردوں پر صبر آ جاتا ہے۔ زندوں پر صبر نہیں آتا...... زندہ لاشوں سے سب لوگ جلد بیزار ہو جاتے ہیں، تنگ پڑ جاتے ہیں لیکن کوئی ان کی "بے بسی" اور اذیت کو نہیں سمجھتا۔ دعا کرنا عمامہ! خدا کسی کو "لاوارث" پیدا نہ کرے...... اگر کوئی وارث ہو تو میرے باپ اور تمہاری دادی جیسا "سفاک" اور "ظالم" نہ ہو...... خود غرض نہ ہو...... اللہ کی زمین پر ایسے فرعون نہ ہوں جو جسموں پر قابض ہوتے ہیں اور دلوں کو پیروں تلے روندتے چلے جاتے ہیں۔" وہ بولتا ہوا "شامِ محبت" کو عمامہ کے پلو تلے باندھ کر شکستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کاندھے جھکے ہوئے اور ژولیدہ حال تھے۔ وہ خود بدحال تھا اور وہ چھتا رہا...... آگے بڑھتا رہا۔

شام صحراؤں کی گرم ہواؤں کی طرح آگے بڑھ گیا...... عمامہ اسی گام پر کھڑی رہی...... زندگی اپنی "چال" چلتی رہی۔

☆☆☆

گھر میں ایک مرتبہ پھر شادی کی دبی، دبی سرگوشی اٹھنے لگی۔ دادی بہت پُرجوش تھیں اور بابا سے شادی کی مد میں اخراجات کے لیے بھاری رقم نکلوا چکی تھیں۔ ان دنوں فیقہ کا جہیز بن رہا تھا۔ طاب اور رافعہ، دادی کی اس ضمن میں بہت مدد کر رہی تھیں۔

دادی دنیا جہان کی قیمتی اشیا کا ڈھیر لگا رہی تھیں۔ بہترین فرنیچر سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ زیورات تک۔ فیقہ کی باقی شاپنگ طاب نے کی۔ رنگ، رنگ کے اسٹائلش کپڑے خریدے۔ میک اپ، جوتے، میچنگ جیولری۔ سونیا ان دنوں ایسی روپوش ہوئی کہ دادی کی ہزار پکار پر بھی واپس نہیں لوٹی تھی۔ وہ عجیب دکھ اور پچھتاوے کا شکار تھی۔ اس میں عمامہ کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

اور عمامہ کس حال میں تھی؟ بہت سے لوگ واقف تھے۔ بہت کچھ جانتے بھی تھے۔ پھر بھی انجان تھے یا جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لیکن طاہرہ تو سمجھتی تھیں۔ دیکھتی بھی تھیں۔ جانتی بھی تھیں۔ انہیں خبر تھی عمامہ اندر ہی اندر گھٹ، گھٹ کر مر رہی ہے۔ ان دنوں عمامہ کی آنکھیں ہمہ وقت گیلی رہتیں۔ سوجی اور بھیگی نظر آتیں۔ لال، انگارہ، پُرتپش آنکھیں افسردہ، رنجیدہ اور غمزدہ آنکھیں۔

طاہرہ نگاہ چرا، چرا کر بھی تھکنے لگی تھیں۔ لاتعلق رہ، رہ کر بھی دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تکلیف میں تھیں۔ اذیت میں تھیں۔ عمامہ کی خاموشی سے انہیں ہول اٹھتے تھے۔ وہ بولتی کیوں نہیں تھی؟ کچھ کہتی کیوں نہیں تھی؟ اتنی چپ کیوں تھی؟

طاہرہ کا دل چاہتا وہ عمامہ کو جھنجوڑ دیں۔ اسے بولنے پر مجبور کریں۔ وہ عمامہ کی آواز سننے کے لیے ترس گئی تھیں۔ پھر ایک دن عمامہ کی انارکلی فراک پر موتی ٹانکتے ہوئے طاہرہ ''تلے دانی'' کا ڈھکن بند کر کے لکڑی کا زینہ چڑھتی کارنر والے کمرے میں آ گئی تھیں۔ دروازہ کھولا تو عمامہ پلنگ پر چت لیٹی دکھائی دی۔ اس کی آنکھیں کھلی اور چھت سے لگی تھیں۔ جیسے پتھرائی ہوں، پلکیں بھوؤں کو چھو رہی تھیں۔ طاہرہ نے غور کیا تو پتا چلا اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔ آنکھوں کی جھیلوں کے کناروں سے موتی لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔ اور کانوں سے ہوتے ہوئے گھنگھرالے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے میں پیوست جیسے کبھی کھلیں گے نہیں...... وہ اتنی ساکت تھی جیسے کبھی ہلے گی نہیں۔ طاہرہ کا دل ڈوبنے لگا۔ بہت نیچے، بہت گہرائی میں...... جیسے کسی کنویں میں اتر رہا ہو...... جیسے کسی کھائی میں گر رہا ہو۔ وہ تھکے، تھکے نڈھال انداز میں پلنگ پر گر سی گئی تھیں۔ عمامہ پھر بھی چونکی نہیں...... جیسے وہ اپنے دھیان اور گیان میں نہیں تھی۔

طاہرہ نے بڑی ہمت سے اس کا کندھا ہلایا۔ عمامہ ایک دم چونک گئی تھی۔ پھر ماں کو اپنے اتنا قریب دیکھ کر سہم گئی۔ ایک دم ٹھٹک کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پھر حواس باختہ ہو گئی۔ جانے اماں کب سے یہاں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ رہی تھیں۔ عمامہ نے غیر ارادتاً چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پھیرتی رہی جلدی سے اپنے گال نم، نم لگ رہے تھے۔ اسے اپنی آنکھیں بھی نم، نم لگ رہی تھیں۔ اس کا دل تھرا اٹھا۔ تو کیا وہ بے خودی کے عالم میں رو رہی تھی؟ وہ ایک ''ہراس'' کے عالم میں ماں کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ ایسا چہرہ جو بے شکن تھا۔ جس پر ملاحت اور ملائمت تھی، تازگی تھی لیکن اس وقت ''غم ناکی'' کے سائے پھیل رہے تھے۔ عمامہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

طاہرہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسی جھکے سر کے ساتھ طاہرہ نے عمامہ کے کپکپاتے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ ان کا اپنا ہاتھ بھی کپکپا رہا تھا۔

''عمامہ! اتنے اندھیرے میں کیوں لیٹی ہو؟ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ چلو، باہر آؤ......'' وہ نظر چرا کر نرمی سے بولیں۔ انہیں اپنا لہجہ کھوکھلا سا محسوس ہوا۔ خالی برتن کی طرح ٹھنٹھناتا ہوا۔

عمامہ نے زخمی نگاہ جھکائی تھی۔

''جب قسمت میں اندھیرا ہو تو روشنی کہاں سے لاؤں......؟'' اس کا لہجہ بھرّا گیا تھا۔ طاہرہ کے اندر بے قراری بڑھ گئی تھی۔

''زندگی کے پہلے ہی موڑ پر ہمت ہار چکی ہو؟ ابھی تو بڑی لمبی مسافت باقی ہے عمامہ......''

''کون جانے کوئی کتنے لمبے سفر کے قابل ہے؟ بعض مسافر بہت طویل سفر کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اماں......'' وہ سسکی دبا کر بمشکل بولی۔ طاہرہ کا اندر تک کٹ گیا تھا۔

''عمامہ......! اتنی مایوس ہو تم؟'' وہ تھرا کر رہ گئی تھیں۔

''کوئی امید ہے تو بتا دیں......؟'' اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ اداسی میں لپٹا، نہایت دھیما، پُراثر، اندر تک کاٹتا ہوا۔

''زندگی میں ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ بیٹا صبر اور قناعت کو پکار کر تو دیکھو......'' طاہرہ کو سمجھ نہیں آئی تھی اسے کیا تسلی دیں۔

''میری خواہش اتنی بڑی نہیں تھی جو آپ سے پوری نہ ہو سکتی۔'' عمامہ کی زبان پر نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ پھسل گیا۔ وہ ہونٹ کاٹتی سر جھکا گئی۔

''کچھ معاملوں میں انسان بے بس ہوتا ہے۔'' طاہرہ کے اندر حبس بڑھنے لگا۔

''کیا کوشش بھی نہیں کی جاتی ؟'' وہ بے کاری دبا کر پوچھ رہی تھی۔ ''میں نے آپ سے آج تک کچھ نہیں مانگا اماں......'' اس کی تڑپ پر طاہرہ بھی تڑپ گئیں۔

''ایسا کچھ مانگیں جو تمہاری ماں کی ''اوقات'' میں ہوتا ......'' ان کے لہجے پر تھکاوٹ اتر آئی تھی۔

''اماں'' ''آپ......آپ بابا سے کہیں ناں۔ آپ کچھ کر سکتی ہیں اماں......! بابا چاہیں تو، پلیز اماں میری خاطر...فیتہ کو کوئی بھی مل سکتا ہے۔ مجھے شام کبھی نہیں مل سکتا......پلیز، اماں! میں مرجاؤں گی۔'' عمامہ کو جانے کیا ہوا تھا۔ وہ بے قراری سے اٹھی تھی اور دوزانو طاہرہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ طاہرہ کے پیروں پر رکھ دیے تھے۔ اس کی التجا نے ان کا کلیجا پھاڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھ سے گرتے ایک، ایک آنسو کی قیمت کوئی اس ماں سے پوچھتا۔ جس کے ٹھنڈے پیروں پر بیٹی کے گرم آنسو قطرہ، قطرہ گر رہے تھے۔ طاہرہ کے کندھے جھک گئے تھے۔ ان کی انا، ان کا وقار، ان کی ہمت سرنگوں ہوگئی۔ ایک حیا اور جھجک کا پردہ پھٹ گیا۔ ایک ماں کا سر جھک گیا۔ اولاد کی محبت اور ''خواہشات'' کبھی کبھار ماں، باپ کے سر ایسے ہی جھکا دیتی ہے۔ طاہرہ بھی جھک گئیں۔ عمامہ کی محبت ہر اس احساس سے بھاری تھی جو انہیں ''خود غرض'' یا ''بے شرمی'' کے ٹائٹل سے نواز دیتا۔

وہ عمامہ کے لیے بغیر ہتھیار اٹھائے ایک آخری جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ یہ ماں کی ممتا تھی۔ یہ ماں کی محبت تھی۔ جس نے طاہرہ کو مجبور کر دیا تھا۔ مائیں مجبور نہیں ہوتیں اولاد کی محبت انہیں مجبور کر دیتی ہے۔ وہ سر جھکائے صوفی صالح سبحانی کے ''دیوان خاص'' کی طرف جانے کے لیے ہمت اور دلیری جمع کرنے لگی تھیں۔ صبح کا سورج نہ جانے کیسا ''انجام'' دکھاتا؟ پھر بھی وہ آخری بازی کھیلنے کے لیے اس رستے پر چل پڑی تھیں جس پر نوکیلے پتھر اور کانٹے اگے تھے۔ کہیں کوئی ستارہ، کوئی جگنو، کوئی سویرا نہیں تھا۔

☆☆☆

صوفی صالح کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ یہ ان کی سماعتوں نے کیا سنا تھا؟ کیا اتنی ذلت سہنے کے لیے وہ زندہ تھے؟ محلے کے لوگ اٹھ کر ان کا گریبان ''میلا'' کرنے پہنچ جاتے؟ کسی کی ایسی جرأت تھی؟ کوئی صوفی صالح کے صاف شفاف ''عمامہ شریف'' کو داغ لگا جاتا۔ وہ سر پر رکھے بل دار سفید براق عمامہ شریف کو کبھی اتارتے، کبھی پہن لیتے۔ پھر اتار دیتے پھر ہاتھ پھیرتے اور پھر سر پر رکھ لیتے۔ ان کا خون ابھی تک کھول رہا تھا۔ اگر بس میں ہوتا تو اسی وقت منصور کو گولیوں سے بھون ڈالتے......لیکن وہ اس معاملے میں قطعی طور پر بے بس تھے۔ اس وقت وہ فیکٹری سے سیدھا گھر پہنچ گئے تھے۔ ان کے قدم شکستہ تو تھے ہی لیکن انداز میں غصہ اور رعب و دبدبہ قائم و دائم تھا۔

ساری بہوؤں نے سسر کا انداز ملاحظہ کیا اور چپکے سے آگے پیچھے ہو گئیں۔ جانے معاملہ کیا تھا؟ کہہ بد اپنی جگہ......ڈائریکٹ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔

صوفی صالح کا رخ طاہر کے کمرے کی طرف تھا۔ دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ ساری بہوؤں نے دریچوں کا پیچھا کرنے سے گریز کیا۔ اور چپ چاپ کول کمرے میں بیٹھ گئیں۔ صوفی صالح کو دیکھ کر طاہر لمحوں میں بھونچکا ہو گیا۔

''آپ نے مجھے بلوا لیا ہوتا بابا! خود کیوں زحمت اٹھائی......؟'' وہ ہکلا کر بمشکل بول سکا تھا۔ کیونکہ بابا کے

انداز کسی خیریت کا تاثر نہیں دے رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر ڈر گیا۔ جانے کیا ہوا؟ بابا اس طرح تو کسی کے کمرے میں نہیں جاتے تھے۔

"بابا... سب ٹھیک تو ہے......؟" طاہر کو اس معنی خیز خاموشی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ پھر سے بول اٹھا۔

"تم جیسی اولاد ہو تو کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؟" انہوں نے دھیمے لہجے میں غرا کر کہا۔ طاہر کو چکر سا آ گیا۔ معاملہ گمبھیر لگ رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں......" وہ ہکلا گیا۔

"میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں......" وہ زہر خند تھے۔ ان کا لہجہ کاٹ دار اور طنزیہ تھا۔ وہ کبھی اپنے بیٹوں سے اس لہجے میں مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ پھر آج کیا ہوا تھا؟ کچھ ایک...... کچھ ہوا تھا...... کچھ خوفزدہ کرنے والا۔

"کیا مطلب بابا......؟" طاہر روہانسا ہو گیا۔ اس کی جان پر بن گئی کیونکہ معاملہ بہت گمبھیر لگتا تھا۔

"مطلب کے بچے! پورے شہر میں میری عزت کا جنازہ نکالتے تمہیں مطلب سمجھائی نہیں دیا؟" ان کی گرج دور، دور تک سنائی دی گی۔ باہر تک بھی، دالان تک بھی اور سب کے کانوں تک بھی۔ طاہر روہانسا سا ہو گیا۔

اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی؟ بابا کیا کہہ رہے تھے؟ کیوں غصہ کر رہے تھے؟

"بابا... بابا......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بکواس مت کرو...... اور مجھے اتنا بتاؤ...... کسی کی بہن، بیٹی اور "عزت" کو پہلو میں لگا کر ہوٹلوں میں جانا، بازاروں میں گھومنا شریفوں کا وتیرہ ہے؟" صوفی صاحب یک لخت دہاڑ کر چیخے تھے۔ طاہر کی سانس تک رک گئی تھی۔ ایک پردہ سا ہٹا تھا۔ اسے ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ کسی رقیب نے بابا کو غلط اطلاعات سے آگاہ کیا تھا...... وہ جیسے سب سمجھ گیا تھا۔ سب جان گیا تھا۔ بابا کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ شدید غلط فہمی......

"بابا... بابا ایسا کچھ نہیں......" وہ وضاحت دیتا، وہ بتا پاتا کہ... بابا ایک مرتبہ پھر خلاف عادت دہاڑے تھے۔

"کیا کچھ نہیں......؟ اب تم مجھ سے جھوٹ بولو گے؟ انکار کرو گے......؟ ایک گناہ پر دوسرا گناہ؟ اگر ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو تمہارے اتنے لمبے قد کی پروا کیے بغیر جوتوں سے تمہاری دھنائی کروں گا۔ وہ بھی یہاں نہیں بیچ چوراہے میں......" ان کی دھمکی پر طاہر کو پسینہ آ گیا تھا۔ اسے بابا سے ایسے انتہائی اقدام کی امید نہیں تھی۔ وہ تو خود کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ بابا اور اماں کو سمرہ کے گھر بھیجتا۔ شریفانہ طریقے سے رشتہ مانگ لے آتا۔ لیکن سارا منصوبہ کسی دشمن نے فلاپ کر دیا تھا۔

"میری بات تو سنیں...... بابا کسی کو پسند کرنا گناہ تو نہیں...... پھر آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، خدا کی قسم بس ایک مرتبہ اتفاقیہ طور پر سمرہ سے ہوٹل میں ملاقات ہوئی۔ یقین کریں...... سمرہ وہ ایڈووکیٹ ہمدانی کی بیٹی......" بے ربط سا بولتا لمحے بھر کے لیے چپ ہو گیا تھا۔

"کسی کو پسند کرنا جرم نہیں...... کسی کی عزت کو چوراہوں میں نیلام کرنا تو جرم ہے ناں......" صوفی صاحب نے غیظ بھری آنکھوں سے طاہر کو گھورا۔ وہ ناقابل فہم انداز میں باپ کے جلالی چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ ان کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں......" طاہر رو دینے کو ہوا۔ اسے تو بابا کے غصے کے سامنے وضاحت دینا بھی نہیں آ رہی تھی۔

"تم کیوں سمجھو گے......؟ میں سمجھا دیتا ہوں...... ایڈووکیٹ ہمدانی کی ایک بیٹی کو پسند کرتے ہو اور دوسری کو پلو سے باندھ رکھا ہے۔ تم میں غیرت نام کی کوئی چیز ہے؟ اس کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ چکر چلا رکھا ہے تم نے۔" انہوں نے اپنے غصے کی اصل وجہ اگل دی تھی۔ طاہر تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنے بڑے الزام پر

ابل پڑی تھیں۔ وہ شدت بے تحاشی سے پھٹ پڑا۔

''استغفار ...... یہ ہوائی کس نے اڑائی ......؟ سراسر جھوٹ ہے بابا! آپ کو کسی نے میرے خلاف ورغلایا ہے۔''

''جھوٹ کیوں ہے؟ بتانے والے تحقیق کیے بغیر کچھ نہیں بکتے ......'' وہ یک لخت غرائے تھے۔ ''ایک عمامہ کی سہیلی اور دوسری بچی وہ وکیل ...... تمہیں شرم نہیں آئی بے غیرت انسان ......'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ طاہر کا قیمہ بنا دیتے۔

''عمامہ کی سہیلی، مجھے عمامہ کی طرح ہے بابا! میری تو بھی اتفاقیہ ہی ملاقات ہوئی ہوگی اس کے ساتھ۔ یقین مانیے، ایسا کچھ نہیں ... میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ...... کوئی جان بوجھ کر دشمنی نکال رہا ہے۔ بلکہ کوئی اور کیا ...... یہ خبیث شام کا باپ ہوگا ...... یاد آیا، اس دن مارکیٹ میں باہر آتے ہوئے دکھائی دیا تھا۔ اور شاید اس دن ہوٹل میں بھی جب میں بسمہ کے ہمراہ تھا ...... اتفاقیہ طور پر تب بھی یہی وہاں تھا۔ اسی نے آپ کو غلط انفارمیشن دی ہوگی ......''

طاہر نے لمحوں میں کڑی سے کڑی ملائی تھی۔ صوفی صالح کچھ گڑبڑائے۔

''اور دیکھیں بابا ......! آپ کو منصور نے بلیک میل کر لیا ...... حد ہے، آپ اس کمینے کی باتوں میں آگئے ہیں ...... کیا آپ کو اپنی اولاد پر ذرا بھی بھروسا نہیں ......'' طاہر کو بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ صوفی صالح نے ایک سلگتی نگاہ بیٹے پر ڈالی تھی۔ کہہ تو وہ ٹھیک رہا تھا۔ وہ منصور کی باتوں میں کیسے آگئے تھے؟ سب جانتے بوجھتے بھی۔ شاید اپنی نیک نامی پر وہ کسی بلیک میلر کا دھبا بھی لگنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا غصہ ذرا کم ہوا تھا۔ جو بھی تھا انہیں طاہر کی بات پر یقین آگیا تھا۔ وہ منصور کی دلالی سے واقف بھی تھے۔ پھر بھی وہ انہیں بہکا گیا تھا لیکن وہ منصور کو مزید ''موقع'' دینا نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی وہ عمامہ کے بارے میں بڑی بکواس کر رہا تھا۔ بہتر یہی تھا۔ شام اور فیقہ کا اماں کی خواہش پر نکاح ہو جاتا۔ ان کی عمامہ کی طرف اٹھتی انگلیوں کے سر سے خیدہ ضرور ہو جاتے۔ لیکن اس کے ساتھ، ساتھ ضروری تھا کہ طاہر کو بھی منصور کی بلیک میلنگ سے بچایا جاتا۔ کیا خبر، منصور اپنی خباثت دکھانے ایڈووکیٹ ہمدانی تک بھی پہنچ جاتا۔ آخر وہ بیٹی والے تھے ... منصور کی غلط بکواس پہ دی ایکشن بھی دکھا سکتے تھے۔

صوفی صالح نے کھڑے، کھڑے لمحوں میں اگلے تمام معاملات بھی طے کر لیے تھے۔

''میری بات سنو، بہت لمبی چوڑی تمہید نہیں۔ اس بچی کے گھر اطلاع کر دو، ہم لوگ شریفانہ انداز میں رواج کے مطابق رشتہ لے کر ہمدانی کے گھر جائیں گے اور تمہارا نکاح بھی شام کے ساتھ ہوگا مع رخصتی ......'' وہ اپنا فیصلہ سناتے، غصہ سمیٹتے لمحوں میں پلٹ گئے۔ باہر کھڑی عوام جیسے ہق دق رہ گئی تھی۔ جبکہ اندر موجود طاہر پر تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔

''اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ بابا نے جو کچھ دیر پہلے اتنی'' بے عزتی '' بلا وجہ کی تھی اس پر سوگ مناتا ......؟ یا جاتے، جاتے جو وہ مژدۂ جاں فزا سنا کر گئے تھے اس پر بھنگڑے ڈالتا ...... وہ بھی، اکیلے، اکیلے ...... اس کی آنکھوں میں خوشی کے ڈھیروں ستارے اُمڈ آئے تھے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ... ''منحوس منصور'' کی چالبازی پر ٹوٹ کر پیار آگیا تھا۔ منصور کی ''اپنی ٹینشن'' نے طاہر کے وہ کام بھی کر دکھائے تھے جو اگلے دو سال تک بھی کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ اسے بن مانگے، بنا تردد کیے، بنا کوشش کے بسمہ ہمدانی عرف حواس باختہ مل رہی تھی۔ کیا روئے زمین پر اس سا کوئی خوش نصیب تھا؟ جسے محبت طشتری میں سجائی مل جاتی؟

☆☆☆

گھر میں ایک خوشگوار ہلچل سی مچ گئی تھی۔ صوفی صالح کے حکم نامے پر ساری بہویں، اماں، دادی، بسمہ کو دیکھ آئیں اور رسم کے مطابق انگوٹھی ڈالی اور بصد اصرار رخصتی اور نکاح کی تاریخ بھی لے لی۔ یہ سب معاملات اس قدر

تیزی سے طے ہوئے تھے کہ کوئی بھی سوچ، سمجھ یا اعتراض کا نکتہ نہیں اٹھا سکا تھا۔ ویسے بھی اعتراض کرتا کون......؟ حالانکہ طابہ نے عادتاً عمامہ کو ضرور سنایا تھا۔

''حیرت ہے، سونیا کی جگہ اس کی بہن آرہی ہے، یہ کچھ الٹ نہیں ہوا۔ سونیا سے تمہاری محبت دیکھ کر لگتا تو تھا...... طاہر کی دلہن کوئی اور نہیں بنے گی۔ لیکن سب کچھ توقع کے مطابق نہیں ہوتا۔ اب دیکھ لو، کبھی سوچا تھا شام اور فیقہ کا جوڑ بنے گا۔ اور شام عقل، شعور رکھتے ہوئے بھی مٹی کا مادھو ثابت ہوگا۔ دیکھ لو عمامہ...... !وہ محبت کرنے کے بعد نباہ نہیں پایا۔ کمال کا بزدل نکلا۔ ایسا جی دار ہوتا تو ہاتھ پکڑ کر ببانگِ دہل اعلان کرتا۔ اسے فیقہ کا ساتھ نہیں تمہارا ساتھ چاہیے......'' طابہ کی باتیں عمامہ کا احساسِ زیاں بڑھا دیتی تھیں۔ وہ بھابی کے سامنے شرمندہ ہو جاتی۔ اس کی عزتِ نفس پاش، پاش ہو جاتی۔ شام نے اسے بھابیوں کی نظروں میں شرمسار کر دیا تھا۔ اس کا سر کبھی اٹھتا ہی نہ...... آنکھیں بھری، بھری رہتیں۔ ہونٹوں پر چپ کے تالے پڑے تھے۔

یہ بڑے پُر اذیت دن تھے۔ بے انتہا تکلیف دہ راتیں تھیں۔ عمامہ رات بھر گھٹ، گھٹ کر روتی تھی۔ دن بھر چھپ، چھپ کر آنسو بہاتی تھی۔ اسے بالی عمر میں بڑا جاں گسل روگ لگا تھا اور غم تو یہ تھا کہ کوئی بوجھ بانٹنے والا بھی نہیں تھا۔ وہ کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ ایک سونیا کا سہارا تھا۔ لیکن شاید وہ بھی اسی ''امر'' سے گزر رہی تھی۔ اسی ''سفر'' سے گزر رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی ارجنٹ شادی والی ہلچل مچی تھی۔ اور اسے بھی دل کو سنبھال کر بہت سے معاملات دیکھنے تھے سو آج کل سونیا بھی عمامہ سے غافل تھی۔

وہ خالی، خالی نگاہوں سے ایک، ایک منظر کو دیکھتی اور حیران ہوتی۔ اسے پورے گھر کی سجاوٹ دیکھ کر جھٹکے لگا کرتے۔ روشنیاں، پھول، خوب صورتیاں، ہنگامے، ہنسی، باتیں، لطیفے۔ اسے فیقہ کے نصیب پر رشک آتا...... کوئی ایسا قسمت کا دھنی بھی ہوگا......؟ اللہ رحیم کتنے پیارے جوڑ بناتا ہے۔ اپنی مرضی اور چاہ سے۔ کسی انسان کی جرأت نہیں، وہ کسی اور کا مقدر چھین سکے۔ کسی اور کا نصیب چرا سکے...... عمامہ بھی فیقہ کا نصیب نہ چھین سکتی تھی، نہ چرا سکتی تھی۔ ہاں، بس وہ حیران ضرور ہوتی تھی۔ کبھی اپنے دل کو ٹٹولتی، وہاں کیا تھا؟ فیقہ سے نفرت کا کوئی احساس؟ فیقہ سے بغض، عداوت یا حسد کا کوئی جذبہ......؟ ان دنوں اس پر حیرانی سایہ فگن تھی۔ وہ حیران ہوتی جب اس کا دل ''شفاف'' ملا۔ بغض...... کینہ، نفرت [illegible] اسے فیقہ سے جلن نہیں [illegible] تھی۔

وہ اپنے دل کو دن میں کئی بار ٹٹولتی تھی۔ وہاں سے حسد، نفرت، کینے اور انتقام کے بیج تلاش کرتی تھی۔ لیکن اسے سوائے ایک احساس کے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے دل میں صرف شام سے محبت کا احساس باقی تھا۔ دور، دور تک پھیلی محبت، وسیع و عریض محبت کی فضا جس پر شام کی محبت کے علاوہ کوئی اور فصل کاشت نہیں ہوئی تھی۔ حسد کی نہ بغض کی، نہ نفرت کی۔

پھر انہی پُر اذیت دنوں میں سونیا کی کال آ گئی۔ اسے عمامہ کا بہت غم تھا۔ شاید اپنے غم سے بھی بڑا...... کیونکہ وہ تو یک طرفہ پسندیدگی میں مبتلا تھی جب مقابل کا رخ اور سمت کہیں اور دیکھی تو خود ہی رستہ بھی بدل گئی۔ کیونکہ وہ بہت بہادر تھی یا اس کی محبت ایسی منہ زور نہیں تھی۔

''تم طاہر بھائی اور بسمہ کی شادی پر خوش ہو؟'' عمامہ نے بلا ارادہ ہی پوچھ لیا۔

''ہاں، کیوں نہیں...... میری بہن کی خوشی ہے۔ میں سوگ کیوں مناؤں......'' سونیا کے انداز میں سچائی تھی یا بہادری...... عمامہ سمجھ نہیں سکی۔ ان دنوں اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ باتیں، نہ گنگناہٹیں، اماں کی تسلیاں، نہ لہجے، نہ روتے نہ آنکھیں...... اس کا ذہن جیسے بند ہوتا جا رہا تھا۔ اور سونیا نہ جانے کیوں معذرتیں اور معافیاں مانگتی تھی۔

''میں کچھ بھی نہیں کر سکی...... اور شام بھی بہت بزدل نکلا...... عمامہ! اسے تم سے کبھی محبت نہیں تھی۔ ورنہ کوئی ایسے نہیں کرتا...... کوئی بیچ راہ میں نہیں چھوڑتا......'' سونیا کی آواز بھرا گئی تو اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اس پر عمامہ کا

دکھ بھاری تھا اور وہ شام سے سخت بدگمان تھی۔ لیکن عمامہ بدگمان نہیں تھی...... وہ کسی سے بھی بدگمان نہیں تھی اور شام سے تو کبھی قیامت تک نہیں ہوتی۔

اور آج کی شام بڑی سیاہ تھی۔ انتہائی بھیانک، بہت ہی کالی حالانکہ آسمان پر ستارے سجے تھے۔ اتنے ڈھیر سے ستارے، ننھے منے، روشن، جگنوؤں کی طرح چمکتے دمکتے۔ اور عمامہ کا گھر بھی بہت روشن تھا۔ لائٹنگ سے سجا، گلابوں میں مہکا۔ پھر بھی عمامہ کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آنکھوں کے اندر سیاہی تھی یا باہر وہ سمجھ ہی نہیں پاتی...... بس کارز والے کمرے کے دریچے میں کھڑی بے خیالی میں دیکھتی رہتی، سوچتی رہتی...... جیسے جو کچھ ہو رہا تھا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

گھر میں آئے مہمان بہت غور سے عمامہ کو دیکھتے، سوال کرتے، سرگوشیاں کرتے، باتیں بناتے۔ لیکن اسے کہاں پروا تھی۔ اسے کیا فکر تھی؟ اسے کچھ سمجھ ہوتی تو فکر کرتی۔

طاہرہ کو سب نظر آ رہا تھا...... سب دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر روتی اور مرتیں۔ ساس کے سامنے ظاہر نہ کرتیں۔ ورنہ ان کے طعنے کون برداشت کرتا؟ انہوں نے تو مہمانوں کے سامنے جھاڑ دینا تھا۔

''میری بچی کی خوشی برداشت نہیں ہو گی۔'' ان کے طنز دل کی مراد پا کر بھی جاری تھے۔ وہ طاہرہ کو کچوکے لگانے سے باز نہیں آئی تھیں۔

''دیکھا، جل گئی تمہاری بیٹی...... کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ اکلوتی پھوپی کی شادی پر گوشہ نشین ہے۔ ڈھولک نہ گیت...... حسد کے مارے روپوش ہو گی۔ سوگ طاری کر رکھا ہے جیسے میرے منہ میں خاک کوئی مرگ ہو۔'' دادی کی تیز دھار طاہرہ کا جگر پاش پاش کر دیتی تھی۔ تب وہ انگرکھے کا سوٹ اور غرارہ لے کر اوپر پہنچ گئیں۔ آخر دنیا داری نبھانی تھی۔ لیکن عمامہ کو کون سمجھاتا...... اسے محبت چھپانی آئی نہ نبھانی...... خود تو سوالیہ نشان تھی ہی، ماں کو بھی بنا ڈالا تھا۔

وہ ہر ایک سے نگاہ چرائی پھر رہی تھیں۔ اور عمامہ کی حالت دیکھ کر طاہرہ کے ہاتھ سے انگرکھے اور غرارہ گر پڑا تھا۔ ساری نصیحتیں خود بخود دم توڑ گئی تھیں۔ سو وہ اسے کیا سمجھاتیں...... وہ تو ہر سمجھنے والی حدود سے آگے نکل گئی تھی۔ طاہرہ نے جو کہا مان لیا...... ورنہ وہ تو سوچ کر آئی تھیں۔ عمامہ کو تیار کروا کر نیچے لانے میں آدھی رات بیت جائے گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اس نے چپ چاپ کپڑے بھی پہن لیے، طاہرہ نے اس کے بال بنائے اور زندگی میں پہلی مرتبہ از خود انہیں کھول کر پنیں لگا دیں...... حالانکہ وہ نظر لگ جانے کے ڈر سے عمامہ کو کبھی بال کھولنے نہیں دیتی تھیں۔

پھر اپنے ہاتھ سے چاندی کے جھمکے اور پازیبیں پہنا دیں۔ عمامہ کا سنگار مکمل تھا...... لیکن انہیں کچھ ادھورا لگا۔ طاہرہ کے دل میں کیا آئی...... چاندی کا ایک نگ والا ٹیکا بھی ماتھے پر سجا دیا۔ پھر آنکھوں کے لیے کاجل بھی لائیں۔ پھولوں کے گجرے بھی اور کنگنا بھی۔ ہاتھوں میں کھن کھن کرتے کڑے بھی ڈال دیے۔ پھر انہوں نے جی بھر کے عمامہ کو دیکھا۔ کتنی حسین مورت تھی۔ موم میں ڈھلی۔ کندن سے بنی ایک، ایک نقش تراشا ہوا تھا...... ماں کے دل میں محبت کا سمندر امڈا۔ انہوں نے بے ساختہ اسے خود میں بھینچ لیا۔

''اللہ میری بچی کے نصیب بلند کرنا......'' طاہرہ نے تڑپ کر با آواز بلند دعا کی۔ عمامہ نے سرخ آنکھوں سے پہلی مرتبہ ماں کا چہرہ دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''بعض دعائیں قبول نہیں ہوتیں اماں......'' اس کا لہجہ پرنم تھا، اداس تھا...... اداسی میں لپٹا تھا۔ طاہرہ کے اندر سکوت اتر آیا۔ سناٹا اتر آیا۔

''عمامہ......!'' وہ کانپ سی گئی تھیں۔ ''آج ایک بات تو بتا دو...... پہلی اور آخری مرتبہ۔'' طاہرہ کی آنکھوں میں سوال اتر آیا...... یہ سوال وہ بہت پہلے پوچھنا چاہتی تھیں لیکن ہر دفعہ اک خوف کے عالم میں خود کو روک لیتیں۔ اگر عمامہ کا جواب توقع کے برعکس ہوتا تو؟ ان کی روح تک کانپ جاتی تھی۔

''پوچھیں......'' وہ سر جھکائے بے آوازی بولی تھی۔ طاہرہ لمحہ بھر کے لیے سوچتی رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اس

کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹوروں میں بھر لیا۔ وہ اس کا نقش، نقش دیکھ رہی تھیں۔ کتنے اجلے سے نقش تھے۔ کتنی سوہنی صورت لیکن کتنی بری قسمت تھی۔ اس پل طاہرہ کو گمان بھی نہ تھا۔

''اگر شام تمہارا ساتھ دیتا اگر وہ بغاوت کا جھنڈا بلند کر کے تمہاری حوصلہ افزائی کرتا تو کیا تم وہ انتہائی ''قدم'' اٹھا لیتیں؟'' وہ ان خدشات کا ذکر کر رہی تھیں جو عمامہ نے ببانگ دہل ان کے دل میں بھرے تھے۔ طاہرہ اس کی دھمکیاں بھولی نہیں تھیں۔

''میں شام کے ساتھ بھاگ جاؤں گی.....'' عمامہ کا باغی لہجہ آج بھی انہیں نیند سے جگا ڈالتا تھا۔ وہ خوف کے مارے بستر سے اٹھ جاتیں۔ ننگے پیر سیڑھیوں پر بھاگتیں۔ کارنر والے کمرے کا دروازہ کھولتیں اور عمامہ کو بستر پر دیکھ کر ان کی جان میں جان آ جاتی تھی۔ یہ کیسا اندیشہ تھا، یہ خوف تھا جو ان کے دل سے کبھی نہیں نکلا تھا۔

عمامہ ایک ماں کے وسوسوں اور خوف کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود ماں نہیں تھی۔ اور طاہرہ دعا کرتی تھیں کہ کبھی عمامہ زندگی کے کسی بھی لمحے میں اس امتحان اور آزمائش سے نہ گزرے جس سے طاہرہ گزر رہی تھیں۔ روز جیتی تھیں، روز مرتی تھیں۔

عمامہ نے گلابی آنکھوں سے ماں کے فرشتوں کی سی پاکیزگی لیے چہرے کو دیکھا..... کیا یہ چہرہ کرب سہنے کے قابل تھا.....؟ کیا یہ چہرہ ذلت جھیلنے کے لیے بنا تھا؟ کیا اس چہرے پر ندامت دیکھنے کا عمامہ حوصلہ کر سکتی تھی؟ اس کا غبار میں سب بے ساختہ نکل گیا، بہتا چلا گیا تھا۔ طاہرہ اسے دیکھتی رہیں..... دیکھتی رہیں، ان کی پلکیں بھیگتی رہیں۔ آنکھیں نم ہوتی رہیں۔

''بابا نے میرا نام ''عمامہ'' رکھا تھا۔ اس لیے نہیں کہ عمامہ ان کا سر جھکا دیتی۔ ان کی عمامہ ہوں اماں..... امر پرنی عمامہ..... پیروں میں کیسے آ گروں.....؟'' ایک درد ناک آواز لہروں میں بکھر کر پھیل رہی تھی۔ پھیلتی جا رہی تھی، اس آواز کی روشنی نے طاہرہ کے اندر اجالے بھر دیے تھے۔ انہوں نے عمامہ کو بے ساختہ سینے میں بھینچ لیا تھا۔

''عمامہ سر پر سجانے کے لیے ہوتے ہیں پیروں میں رولنے کے لیے نہیں۔'' آواز لہریں بدل رہی تھی۔ رنگ بدل رہی تھی۔ روپ بدل رہی تھی۔ طاہرہ کی آنکھوں سے سیال بہتا رہا، بہتا رہا..... پھر انہوں نے عمامہ کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔

''اگر صبر کرنا کیمرہ رہی ہو تو پہلا پرچہ دینے نیچے چلی آؤ۔ میں سب کے سوالوں کو جھیل کر تھک چکی ہوں۔''

☆☆☆

اس نے بڑے ضبط اور حوصلے کے ساتھ لکڑی کے فریم میں سجے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا تھا۔ اس کا چندن روپ کسی سنگار کا محتاج نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی ماں پور، پور اسے سجاتی تھی۔ وہی ماں جو اسے سنگار کرنے نہیں دیتی تھی۔ آج اسی ماں نے عمامہ کو گہنے پہنا دیے تھے۔ اور آج عمامہ کو ان لوازمات کی خواہش نہیں تھی۔

وہ انگرکھے اسٹائل کی شرٹ اور غرارے میں سجی، تھکے قدم اٹھاتی زینے کی طرف آ گئی تھی۔ لکڑی کے جنگلے سے نیچے بلا کی رونق اور چہل پہل تھی۔ ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کی مخصوص دھن سنائی دے رہی تھی۔ بابا نے گھر کی اور باہر کی لڑکیوں کو ڈھولک بجانے سے منع نہیں کیا تھا۔ شاید دادی کے لیے مصلحتاً خاموش ہو گئے تھے۔

عمامہ بہت دیر تک بے خیالی میں کھڑی دیکھتی رہی..... شاید آج مایوں کی تقریب تھی یا مہندی کی؟ اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ کل طاہر کی بارات تھی یا شام کی؟ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

آج بہت دن ہو گئے تھے۔ وہ پوروں پر حساب نہ بھی لگاتی..... فقط ایک بات اسے یاد تھی۔ شام کو دیکھے ہوئے آج ساتواں دن تھا۔ اس معاملے میں عمامہ کا حساب اور یادداشت کمال کی تھی۔ وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتی۔ اس نے کھوئی، کھوئی بے رنگ آنکھوں سے ایک، ایک منظر کو دیکھا۔ اسے ہر منظر سے لہو ٹپکتا دکھائی دے رہا تھا۔

سرخ، گرم، لال، گاڑھا لہو...... اس کی آنکھوں میں ہراس اتر آیا، خوف اتر آیا۔ وہ دوپٹا سنبھالے خوفزدہ سی کچ، کچ زینہ اترنے لگی۔

معاً کوئی تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ آنے والا بڑی عجلت میں تھا۔ عمامہ بن دیکھے بھی جان گئی تھی۔ آنے والی خوشبو بتا رہی تھی۔ عمامہ کے دل کی گلیوں سے کس مسافر کا گزر ہو رہا تھا۔ وہ کون تھا جو چل رہا تھا۔ جو چلتے، چلتے رک رہا تھا۔ جس کے قدم لمحہ بھر میں ہی سست ہو کر بے جان ہو گئے تھے۔ جیسے زمین نے پکڑ لیے ہوں...... جیسے زمین میں دھنس گئے ہوں۔

وہ ''شہر دل'' کی گلیوں سے سر جھکائے چپکے سے گزر جاتا۔ بن آہٹ کیے، بن شور کیے، چلا جاتا ہے...... لیکن اس کی خوشبو ایسی تو نہیں تھی جو عمامہ کو ''چونکا'' نہ دیتی...... وہ گزرتا رہا، عمامہ چونکتی رہی۔ چونک، چونک کر دیکھتی رہی۔ وہ رک، رک کر چلتا رہا۔ چل، چل کر رکتا رہا۔ وہ ٹھہر گیا...... عمامہ رک گئی...... نہ وہ لاتعلق رہ سکا نہ عمامہ بے نیاز بن سکی۔ اِک غلاف اجنبیت کا تھا جو تن گیا تھا۔ اب ہٹ رہا تھا...... ہٹتا جا رہا تھا۔

بس نگاہ سے نگاہ ملنے کا کمال تھا، اِک الاؤ تھا جو بھڑک گیا۔ اِک برزخ تھا جو جل گیا۔ اِک شعلہ تھا جو پھیل گیا۔ اِک دوزخ تھا جو دہک گیا۔

اس نے اپنے اردگرد...... ''آتشِ عشق'' کو بھڑکتے دیکھا۔ وہ عشق کی آگ تھی جو پھیل رہی تھی، جل رہی تھی۔ جلا بھی رہی تھی۔ اس نے آگ ہی آگ کو بھڑکتے دیکھا۔ بھرتے دیکھا۔ یہ آگ شام کی نگاہوں کے سمندر سے نکل رہی تھی۔ یہ آگ کا سمندر تھا جس سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور عمامہ کے شنگرفی لبوں پر تپش اور آگ بکھر رہی تھی۔

آگ خرید کر لائی نی میں
آگ خرید کر لائی
دنیا داری قسمت ماری

شکلیں بدلے ضرور
دل کی ایک نہ چلنے دے
اور عقلیں بدلے روز
عشق کے کاروبار میں پڑ کے
اچھا نفع کمایا
گھڑی، گھڑی پل کو
اپنے دل کا ماس کھلایا
تن من دھن سب بیچ دیا اور
بھاگ خرید کے لائی نی میں
بھاگ خرید کر لائی
گوئل لینے گھر سے نکلی
کاگ خرید کے لائی نی میں
کاگ خرید کے لائی نی میں
آگ خرید کر لائی نی میں

اس نے آگ کے اتنے روپ اور اتنے رنگ کبھی نہیں دیکھے تھے جو رنگ شام کی نگاہوں سے نکل رہے تھے، پگھل رہے تھے، بہہ رہے تھے۔ اور عمامہ کشکول تھام کر انڈ عادت آگ خریدنے بھاگ رہی تھی۔ آگ جو کوئی عقل والا مفت میں بھی نہ لے، اسے عمامہ خریدنے بھاگ رہی تھی۔ وہ بڑی کم فہم سی گاہک تھی۔ بڑی نادان خریدار...... ذرا فہم رکھتی تو بھلا آگ خریدتی......؟ آگ جو کبھی گلزار نہیں کرتی۔ ہمیشہ جلاتی اور جھلساتی ہے۔

عمامہ کی اٹھی نگاہیں جھک نہ سکی تھیں۔ شام کی جھکی نگاہیں اٹھ نہ سکی تھیں۔ حالانکہ وہ اوپر جا رہا تھا۔ عمامہ نیچے آ رہی تھی۔ وہ بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ عمامہ پستی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عمامہ پاتال میں اتر رہی تھی۔ وہ زمین کے اوپر تھا عمامہ زمین کے نیچے تھی۔

عمامہ رک گئی تو وہ رک گیا، ٹھہر گیا۔ اس کی جھکی نگاہوں سے ''پچھتا عشق'' پوری فضا کو نمناک کر رہا تھا۔

''تو کہانی ختم......'' فضا نے ایک افسردہ سا نغمہ پڑھا تھا۔ اور افسردگی کی دھنیں چھڑ گئی تھیں۔ کوئی ''دریا بوڑھی گنگا'' کنارے بیٹھا رو رہا تھا، روتا جا رہا تھا۔

''اور اس کا انجام......؟'' وہ حرف، حرف کو لکھ رہی تھی۔ لفظ، لفظ کو محفوظ کر رہی تھی۔ کیا یہ آخری ملاقات تھی؟

''اتنا بھیانک......؟'' کوئی ''بوڑھی گنگا'' کے کنارے بیٹھا چلا اٹھا۔

''تم نے کیا سمجھا تھا؟'' آگ چھلکتی آنکھوں نے بڑا افسردہ سا سوال کیا۔

''عشق کی بازی جیت کر رہو گی...... ہارو گی نہیں......؟''

''میں نے جیت کی بازی لگائی کب تھی......؟'' گلابی آنکھوں کا سوال بڑا اذیت ناک تھا۔ آگ بھری آنکھیں سلگتی رہیں۔

''گر لگا دیتی تو؟'' عمامہ نے شعلہ فشاں نظروں سے اسے دیکھا۔

''پھر خود کو ہار جاتی......'' وہ نگاہ چرا گیا تھا۔

''اب تمہیں کیا ''فاتح'' لگتی ہوں......؟ کس علاقے کو فتح کیا ہے؟ کہاں فتح کے جھنڈے گاڑے ہیں؟''

عمامہ جیسے بکھر گئی تھی۔ شام لمحہ بھر کے لیے چونکا ... ٹھٹکا ... پھر گرم نگاہ سے عمامہ کو دیکھا۔

''ہاں تو ....'' شام کا جواب اسے متحیر کر گیا تھا۔

''کہاں؟'' وہ بے آواز بولی۔

''میرے دل پر ..... کیا تم نہیں جانتی عمامہ ..... ! جو تم نے کیا، وہ کمال کیا۔ وصال سے بڑھ کر ہر احساس سے بڑھ کر ... حتیٰ کہ میری ہر سانس سے بڑھ کر .....'' شام بھیگی ویران شام میں بھیگ رہا تھا۔

''میں نے کیا، کیا؟'' وہ دنگ رہ گئی۔

''اس گھر پر ''احسان'' کیا۔ میری ذات پر ''احسان'' کیا۔ آنے والی نسلوں پر احسان کیا۔ بقا اور محبت کی جنگ میں اگر محبت ہار گئی تو کیا ہوا؟ جو محبت بزرگوں کی دستار کا دھیان نہ رکھے جو سروں کے ''عمامہ'' کو داغدار کرے اسے بے وفائی نہیں ''رسوائی'' کہتے ہیں ..... عمامہ! تم جانتی نہیں ..... تم نے مجھے ''مجبور'' نہ کر کے اک نئی تاریخ رقم کر دی ہے۔ اسے ''تاریخ محبت'' میں کوئی لکھے نہ لکھے شاہ میر منصور کے دل سے کوئی عمر بھر کے لیے مٹا نہیں سکتا۔ یہ وہ ''احسان'' ہے جو میرے دل پر ''کندہ'' رہے گا۔ میں رہوں یا نہ رہوں .....'' وہ اپنے لفظوں کا ''سحر'' پھونک رہا تھا۔ وہی لفظ جو عمامہ کو دیوانہ کر دیتے تھے۔ وہی لفظ جو عمامہ کو بیگانہ کر دیتے تھے۔

''تمہاری محبت مجھے ''مجبور'' کر دیتی تو نہ تمہارے باپ کا سر اٹھ سکتا نہ بھائیوں کی نگاہیں۔ اور میں اس جہان میں اور اُس جہان میں ہر چیز کے بغیر رہ سکتا ہوں مگر اپنی ''عزت'' کے بغیر نہیں۔ وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ جب مجھے دھتکارا جائے گا، ذلیل کیا جائے گا، راندۂ درگاہ کیا جائے گا۔ میں اپنوں کی نگاہوں میں اتری اپنے لیے ''نفرت'' اور ''ذلت'' کبھی برداشت نہیں کر سکتا عمامہ ... تم نے کہا تھا ہمیشہ کہا ہے ..... میں بزدل ہوں، مجھے کیا چیز تم تک آنے سے روکتی ہے؟ کیا عمر بھر کے لیے ایک جواب کافی نہیں ..... میں ''رسوا'' ہونے اور ''ذلیل'' ہونے سے ڈرتا ہوں۔ میں تمہیں ''داغ دار'' کرنے سے ڈرتا ہوں۔ تم فرشتوں کی عمامہ ہو اور ہمارا عشق ''فرشتوں'' سے کم نہیں۔'' وہ بولتا رہا، عمامہ سنتی رہی ..... وہ دیکھتا رہا، عمامہ بے خود ہوتی رہی۔ وہ رکا نہیں ..... عمامہ چلی نہیں ..... پھر وہ رک گیا۔ عمامہ چل پڑی۔

اس کے قدموں میں شکست اور ''ہار'' کی دھول اڑ ... رہی تھی۔ عمامہ اس دھول میں کھو رہی تھی، گم ہو رہی تھی۔ شام دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں دھند بکھرتی رہی۔

جیسے عکس، عکس گنوا دیا
کبھی روبرو تھی میرے لیے
جیسے نقش، نقش بجھا دیا
کبھی چار سو تھی میرے لیے
جو حد ہوا سے دور ہے
کبھی کو بکو تھی میرے لیے
جو تپش ہے موج سراب کی
کبھی آب جو تھی میرے لیے
جیسے آپ کہتا ہوں میں اب
کبھی صرف ''تو'' تھی میرے لیے

(جاری ہے)

شادی اِن لاک ڈاؤن

زرتاشیہ نعمان

''ہم بتائے دیتے ہیں قطب الدین...... آنسہ کی شادی اس سنیار کے بیٹے سے قطعاً نہیں ہوگی...... اور اگر آپ کو بہت شوق چرا رہا ہے۔ بیٹی کی شادی کا تو ہماری لاش پر سے گزر کر دو رخصت ہوں تو ہوں......'' دادی حضور پان کے پتے پر دور، زور سے کتھا لگاتے یوں بول رہی تھیں جیسے وہ پان کا پتا نہ ہو بلکہ اس لڑکے کے والد کا سر ہو۔ جسے ان کی پوتی آنسہ بنت فجستہ جہاں نے پسند کرنے کی جرأت کی تھی۔

''آپ کیوں فکر کرتی ہیں اماں حضور۔ ہم سمجھائیں گے آنسہ کو۔'' قطب الدین باادب ہو کر بولے۔

''اے! سب سمجھتے ہیں ہم...... جیسے وہ آپ کی بات سمجھ ہی تو لیں گی ناں...... وہ تو چھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتیں۔ اتنی سی عمر میں گز بھر کی زبان لیے گھومتی ہیں آج کل کی لونڈیاں۔ ہمارے زمانے میں تو لڑکی کو نظر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کسی بڑے کے سامنے...... یوں منہ بھر کے اپنی پسند بتانا تو دور کی بات۔ یہ سب آپ دونوں کے بے وجہ لاڈ پیار کا نتیجہ ہے......اور دوسرا وہ موا منحوس مارا...... شیطان کا آلہ...... (موبائل فون) اس پر لگی رہتی ہیں وہ...... اللہ جانے کیا، کیا گٹ پٹ کرتی رہتی ہیں اس پر......'' دادی حضور کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

قطب الدین سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کے پاس ان کی زوجہ محترمہ فجستہ جہاں کرسی کی ہتھی پر کہنی رکھے اسی ہاتھ کی ہتھیلی پر رخسار رکھے غور سے اپنی ساس کے قیمتی فرمودات سن رہی تھیں۔

''ہم نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' دادی حضور دبنگ لہجے میں بولیں تو قطب الدین نے چونک کر سر اٹھایا۔

''کیسا فیصلہ اماں حضور......؟''

''ارے آپ کی خالہ پُرشکوہ خاتون......ان کا پوتا ہے، اجمل بدر زماں...... بہت خوب صورت، خوب سیرت نوجوان ہے...... اچھے اطوار...... نشست و برخاست خالصتاً لکھنوی تہذیب کا عکس۔ جب ہم پچھلے برس ان کے ہاں گئے تھے تو صاحبزادے کی ڈاکٹری کا آخری سال تھا۔ اب تو خیر سے وہ ڈاکٹر اجمل کہلاتے ہوں گے...... بس ان کے ساتھ اپنی آنسہ کا جوڑ خوب جچے گا۔ چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔ ماشاءاللہ سے دیکھ لینا......'' اپنی بات مکمل کر کے وہ خود ہی مزے لے کر ہنسنے لگیں اور ان دونوں میاں، بیوی نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔

''پر اماں حضور! وہ اجمل کی والدہ محترمہ طاہرہ خانم کی نظر ہم غریبوں پر کہاں ٹھہرے گی؟ کئی مربعوں کی مالک ہیں وہ اور سنا ہے یہ کہ وہ اس بات کا اظہار بھی کرتی رہتی ہیں کہ اپنے اکلوتے فرزند ارجمند کی شادی کسی ہم پلہ گھرانے میں کریں گی۔'' فجستہ جہاں نے پہلی بار ساس کے سامنے لب کشائی کی اور انہوں نے اس زور سے سروتا پاندان میں پھینکا کہ وہ دونوں اچھل ہی پڑے۔

''ضروری نہیں فجستہ جہاں کہ اب بھی طاہرہ خانم ایسے نادر خیالات رکھتی ہوں...... مانا کہ کچھ عرصے پہلے تک ہمارے حالات اچھے نہیں تھے مگر اب تو الحمدللہ پیسے کی ریل پیل نہ سہی تو تنگی ترشی بھی نہیں...... میں بات کروں گی اس سے اور یقین سے کہتی ہوں کہ وہ انکار نہیں کریں گی، ارے اجمل کے والد بدر زماں...... بہت عزت کرتے ہیں ہماری، آپ فکر نہ کریں، بہو بیگم......!'' ساس اماں کی تسلی پر انہوں نے سرِ تسلیم خم کیا۔

☆☆☆

''لو جی...... چھٹی ہوئی...... آپا آنسہ کے لیے دادی

کھڑی آنسہ کو دھیرے دھیرے بجھاتے ہوئے بولیں تو وہ جو پودینے کی پتیاں ٹہنیوں سے توڑ توڑ کر پیالی میں جمع کر رہی تھی یکدم ہی جا کر نل سے ہاتھ دھونے لگی۔

"یہ رکھا ہے پودینہ...... خود ہی چٹنی بنا لیجیے گا...... اور ہاں دادی حضور سے کہہ دیں، ہم بھی انہی کی پوتی ہیں۔ انہی کی طرح ضدی...... کسی ڈاکٹر بابو کو گھاس نہیں ڈالنے والے......" ناک پر سے مکھی اڑانے کے سے انداز میں وہ کچن کی دہلیز عبور کر گئی اور خجستہ جہاں منہ پر ہاتھ رکھے حیرت کا بت بنی کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

چھت پر آ کر آنسہ گہری، گہری سانس لے کر خود کو کچھ دیر نارمل کرتی رہی اور پھر وہیں پیچھے دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں تھامے موبائل کو کچھ دیر گھورتے رہنے کے بعد آخر اس نے حارث کو کال ملا لی۔ چار، پانچ گھنٹیوں کے بعد آخر اس دشمن جاں کی آواز سنائی دی تھی۔

"کہاں تشریف فرما ہے آپ؟ کہ جہاں آپ کو فون کی گھنٹی بھی سنائی نہیں دے رہی تھی......؟" چھوٹتے ہی وہ چیخ کر بولی۔

"السلام علیکم...... اخیریت......؟ اتنا غصہ کیوں؟" نرم لہجے میں حارث بولا تو آنسہ، اپنا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا محسوس ہوا...... مگر پھر ڈاکٹر اجمل کو یاد کر کے غصہ عود کر واپس آیا۔

"دادی حضور نے ہمارے لیے لڑکا پسند کیا ہے...... آپ سے پوچھنا تھا...... مٹھائی بھجوا دوں آپ کے گھر......؟" ایک آوارہ سی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر وہ انگارے چباتے ہوئے بولی۔

"نہیں، مٹھائی تو نہیں...... ہاں اگر اپنے ہاتھ کی بریانی کھلانا چاہو تو بندہ حاضر ہے......" حارث اسے ستانے کی غرض سے بولا تو آنسہ کا دل چاہا کہ فون سامنے فرش پر مار کے توڑ دے یا پھر اپنا سر پیٹ لے۔

"ہاں...... کھلا دوں گی بریانی آپ کو...... زہر ڈال کے' بھاڑ میں جائیں آپ اور ہماری محبت بھی۔" موبائل سوئچ آف کر کے سر گھٹنوں میں دے کر وہ بے آواز رونے لگی۔

☆☆☆

"ہمیں تو ہول اٹھ رہے ہیں...... آنسہ کے بابا...... دادی، پوتی آمنے سامنے ہیں۔ اللہ جانے کیسا دنگل

دیکھنے کو ملے...... دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں...... ہمارا تو دل ہوکے پتے کے مانند کانپتا ہی رہتا ہے کہ کہیں دونوں میں منہ ماری نہ ہو جائے۔" خجستہ جہاں بستر کی چادر تبدیل کرتے ہوئے آرام کرسی پر بیٹھے قطب الدین کو اپنے اوہام سے آگاہ کر رہی تھیں۔

"ہم...... م...... کافی گمبیر ہو چلا ہے یہ مسئلہ...... حالانکہ میں ملا ہوں اس لڑکے سے...... کیا بھلا سا نام ہے اس کا......" عینک کی کمانی ماتھے پر لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔

"ہاں حارث...... اچھا نوجوان ہے...... ادب آداب والا سلجھا ہوا۔ ادھر پچھلی گلی میں ہی گھر ہے ان کا...... مگر اماں...... حضور ان کا نام سننے کی روادار نہیں...... پھر آنسہ کا چہرہ جب دیکھتا ہوں تو دل کو دھکا سا لگتا ہے، دل نہیں مانتا اسے اتنی دور بھیجنے کو، یہ تینوں، تتلیاں ہی تو کل کائنات ہیں ہماری......" انگلیوں کی پور سے انہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔

"ہوں...... بیٹیاں کے پیاری نہیں ہوتیں...... بس ان کے نصیب سے ڈر لگتا ہے، میرے تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ نصیب تو دشمن کی بیٹیوں کے بھی اچھے ہوں...... جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپائے، چھپائے پھرتی ہے...... ہر گرم و سرد سے بچاتی ہے...... ہم ماں، باپ بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں اپنی اولاد کے ساتھ...... مگر جب بیٹیاں پرائی ہو جاتی ہیں تو ان کا ہر سرد و گرم ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ بس اللہ پاک ہماری تینوں بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔ آمین......" دونوں کے لبوں سے ایک ساتھ ادا ہوا تھا۔

☆☆☆

تین دن بخار میں پھنکنے کے بعد آج آنسہ کیمپس چلی آئی تھی۔ بدر زماں نے بات پکی ہونے کا عندیہ دیا تھا۔ سو اب گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے...... کورونا نامی عالمی وبا کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے شادی جلد ہونا قرار پائی تھی...... کارڈ چھپنے کو جا چکے تھے۔ دادی حضور خجستہ جہاں کو ہولائے رکھتیں۔ سارا دن کے روز کے چکر لگ رہے تھے بازاروں کے اور پھر خالہ وزن کی طرف...... باقی سامان کی خریداری قطب الدین کے ذمے تھی جس میں دادی حضور دل کھول کے مین میخ نکالتیں اور قطب الدین بیچارے سر پکڑے بیٹھ جاتے۔ اس سب سے بیزار ہو کر ہی وہ یونی چلی آئی تھی۔ لاک ڈاؤن کی خبریں بھی گردش میں تھیں کہ کسی

ادارے بند کیے جانے کا امکان تھا..... سواس سب سے پہلے اس سے بھی تو ملنا تھا..... شاید آخری بار۔

''کیسی ہو.....؟'' حارث نے اسے نظروں میں سموتے ہوئے پوچھا۔ یہ پیاری سی لڑکی نہ جانے کب اس کے لیے اتنی اہم ہوگئی تھی لیکن اب اس کی دادی حضور ایک بھرپور ظالم سماج کی طرح ان دونوں کے بیچ آگئی تھیں اور وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

''آپ کو ہمارا گیٹ اپ دیکھ کر پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ہم کیسے ہیں؟ یا اب بھی ہمیں بتانے کی ضرورت ہے؟ آج تو ویسے بھی ہم فاتحہ خوانی کرنے آئے تھے آپ کے ساتھ اپنی محبت کی قبر پر..... یہاں شروع ہوئی تھی ناں..... تو یہیں پر دفن ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے آنسہ کا گلا رندھ گیا اور وہ دراز گھنی پلکیں جھپک، جھپک کر آنسو پینے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی لڑکیوں کے گروپ کو دیکھنے لگی جو خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ حارث اس معصوم سی لڑکی کو سمجھانے سے قاصر تھا کہ اگر وہ اس کی دادی حضور کو پسند نہیں ہے تو وہ اپنی وجہ سے کیسے اسے آگ کی سی تپش رکھنے والے رویوں میں جھونک دے۔ کس طرح اس کے گھر والوں کی ناراضی مول لے کر وہ اسے اپنا لے.....؟ اور کیا وہ بھی اپنے گھر والوں کو ناراض کر کے اس کے ساتھ خوش رہ پائے گی؟ مگر وہ یہ سب بس سوچ کے ہی رہ گیا..... کیونکہ جانتا تھا، آنسہ کو سمجھانا گویا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

☆☆☆

آج دادی حضور کے کمرے میں پھر ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا، مسئلہ انتہائی پیچیدہ تھا۔ عالمی وبا کورونا کے پیشِ نظر پوری دنیا میں لاک ڈاؤن شروع ہو چکا تھا اور شادی میں بمشکل تمام ایک ہفتہ باقی تھا۔ تمام کارڈ بٹ چکے تھے..... شادی ہال بک تھا..... مگر اب بند ہو چکا تھا..... اور پریشان کن سچویشن یہ تھی کہ بارات جو دوسرے شہر سے آنی تھی اب فی الحال ان کے آنے کی امید ختم تھی..... کیونکہ ٹرین سروس اور بس سروس بھی غیر معینہ مدت کے لیے بند ہو چکی تھی۔ طاہرہ خانم کا یہ مشورہ تھا کہ اگر آپ کو شادی کی بہت جلدی ہے تو اسکائپ پر ایجاب و قبول کی رسم مقررہ تاریخ پر ادا کر دی جائے اور پھر جب حالات بہتر ہوں تو آنسہ کو ان کے پاس بھیج دیا جائے کہ اجمل اپنی ڈاکٹری ذمے داریوں میں از حد مصروف ہیں یا پھر صورتِ حال بہتر ہونے کا انتظار کیا جائے..... اور یہ بات قطب الدین اور خجستہ جہاں کو کھٹکنے لگی تھی۔

''اماں حضور! ہماری بیٹی ہم پر بھاری نہیں ہے۔ طاہر خانم کی بات پر دل بہت دکھا ہے۔ کیا گڈے، گڑیا کا کھیل سمجھ رکھا ہے انہوں نے شادی بیاہ کو۔ مجھے اب یہ رشتہ منظور نہیں۔'' قطب الدین قطعیت سے بولے تو خجستہ جہاں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''فرزندِ من! آپ کی بات سولہ آنے درست ہے مگر ہمیں یہ اندیشہ ہولائے دے رہا ہے کہ سندیسے بٹ چکے ہیں..... برادری والے کیا سوچیں گے کہ رشتہ کیوں ٹوٹا.....؟ تان ہمیشہ لڑکی والوں پر ہی آکے ٹوٹتی ہے۔'' ان کا انداز ناصحانہ تھا بات مکمل کر کے دادی حضور پان بنانے میں مصروف ہوگئیں مگر وہ دونوں خاموش اپنی، اپنی سوچ میں غلطاں الجھ کے رہ گئے۔ بات دادی حضور کی بھی غلط نہیں تھی، باتیں بنانے کا فن دنیا والے خوب جانتے ہیں، کچھ بعید نہیں تھا کہ انگلیاں آنسہ کی طرف ہی اٹھتیں۔

☆☆☆

''واہ آپی! اس کورونا نے تو آپ کی بارات کی بینڈ بجا دی، آنا ان کا کینسل ہی ہوگیا۔ کمال ہے ناں.....'' بستر پر آڑی ترچھی لیٹی وانیہ نے آنسہ کو دیکھ کر کہا جو اپنی الماری کی صفائی میں جتی تھی۔

''خس کم جہاں پاک..... جان چھوٹی میری۔ شکر ہے اللہ کا۔'' بالوں کا جوڑا بناتی آنسہ وہیں بستر پر آبیٹھی۔

''مگر اب کیا ہوگا؟ ساری تیاری گئی چولہے میں..... کتنے شوق سے ہم نے نیٹ سے ڈیزائن نقل کر کے ڈریس بنوائے تھے آپ کی شادی کے لیے..... اب کب پہنیں گے.....؟'' وانیہ کو ڈریس کے نہ پہنے جانے کا شدید قلق ہو رہا تھا۔

''بہن کی شادی..... کوسوں دور بسے کسی ان دیکھے آدمی سے کی جا رہی تھی اور ان کو شادی کینسل ہو جانے کا غم ستا رہا ہے..... اس بات کی کوئی خوشی نہیں جان چھوٹی بہن کی۔'' ایک ملامتی نگاہ وانیہ پر ڈال کر آنسہ آنکھوں پر بازو رکھ کے لیٹ گئی۔

”اچھا......سوری آپی......ناراض تو مت ہوں پلیز......“ وانیہ دھیرے سے اس کا بازو چھو کر بولی۔

”نہیں ہوں ناراض، سر مت کھاؤ میرا۔“ آنسہ کی طرف سے مدھم سا جواب آیا۔

”تم جاؤ وانیہ......چائے بنا کر لاؤ......“

”خود تو بیٹھی رہتی ہو، بس مجھ پر ہی آرڈر چلانا آتا ہے تمہیں......“ ہانیہ کے حکم پر وانیہ ناک بھوں چڑھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

”آپی......حارث بھائی کو بتائیں گی آپ یہ بات؟ اب تو آپ انہیں کال بھی نہیں کرتیں۔“

”پتا نہیں......ہمیں یہ بات انہیں بتانی بھی چاہیے یا نہیں......؟ ہم نے تو سارے تعلق اس آخری ملاقات پر ختم کر دیے تھے۔“ آنسہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلی تھی۔

”وہ تعلق تو پھر جڑ سکتا ہے آپی......بس ایک کال کرنے کی دیر ہے۔“ ہانیہ نے موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جو کئی دنوں سے بند پڑا تھا اور آنسہ موبائل ہاتھ میں لے کر خالی، خالی نظروں سے اس کی تاریک اسکرین کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

رمضان المبارک کا آخری عشرہ جاری تھا، قطب الدین بھاری دل کے ساتھ تراویح گھر پر ہی ادا کر رہے تھے کہ وہ تو پانچ وقت مسجد جانے کے عادی تھے۔ دوسری طرف خاندان، برادری والوں نے خجستہ جہاں کو زچ کر رکھا تھا، وہ بتا، بتا کر تھک چکی تھیں۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے بارات کا آنا مشکل تھا۔ جبھی شادی کینسل ہوئی ہے۔

”کل راستے میں ہمیں حارث کے والد محترم ملے...... آنسہ کی خیریت دریافت کر رہے تھے کہ خوش ہے اپنے گھر میں؟ ان کا گمان تھا کہ شاید اس کی شادی ہو چکی ہے......تو ہم نے کہا......کہاں کی شادی میاں کدھر کی شادی؟ تو انہوں نے پھر اپنے صاحبزادے کے لیے آنسہ کی خواہش ظاہر کی......“ خجستہ جہاں سے دودھ کا گلاس لے کر قطب الدین کل کی ہوئی ملاقات کا احوال انہیں سنانے لگے۔

”پھر کیا سوچا آپ نے......؟“ وہ متفکر سی انہیں دیکھنے لگیں۔

”آپ اماں حضور کو سچائی بتا کیوں نہیں دیتے کہ بدر زماں بھائی اور طاہرہ خانم نے آپ سے لمبے چوڑے جہیز کی فرمائش کی تھی اور جب آپ نے اس پر معذرت کا اظہار کیا تو تبھی وہ لوگ اماں حضور کے سامنے حیلے بہانے بنا کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگے، ہو سکتا ہے اماں حضور یہ سب سننے کے بعد حارث کے رشتے پر مان جائیں......“ خجستہ جہاں نے قیاس آرائی کی۔

”نہیں بیگم! اماں حضور کا مان ٹوٹ جائے گا کہ بدر زماں نے ان کی بات نہیں مانی......بس اب کوئی بات نہیں ہوگی، ہم کل حارث کے والدین کو افطار پر مدعو کرنے کا سوچ رہے ہیں، اب جو بھی بات ہوگی کل ہوگی۔“

دروازے کے پرلی طرف دادی حضور کا دستک دینے کے لیے اٹھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا......وہ جو بیٹے اور بہو کو اسکائپ پر نکاح کے لیے منانے آئی تھیں......شرمندگی کے مارے خود ہی زمین میں گڑ کے رہ گئیں۔

☆☆☆

آج عید کا دن عجب بہار لے کر آیا تھا......بہت محدود مہمانوں کو بلایا گیا تھا......گھر پر ہی خجستہ جہاں نے قورمہ اور بریانی تیار کی تھی اور میٹھے میں دادی حضور نے اپنی پوتی کی بارات کے لیے اپنے ہاتھوں سے بیسن کی مٹھائی بنائی تھی۔ افطار والی شام حارث کے والدین سے مل کر دادی حضور دل و جان سے ان پر فریفتہ ہو گئی تھیں۔

”اماں جان! ہمیں جہیز کے نام پر آپ کے گھر سے ایک سوئی بھی نہیں چاہیے......آپ اپنے جگر کا ٹکڑا ہمیں دینے پر راضی ہیں......وہ ٹکڑا جس کی اتنے سال آپ نے پرورش کی، کھلایا، پلایا، اعلیٰ تعلیم دلوائی اس کا خرچ الگ اور سب سے بڑی بات اچھی تربیت کی۔ تو کیا یہ ہمیں زیب دیتا ہے کہ وہ بچی مع سود مانگیں......میرے نزدیک جہیز ایک سود ہی ہے جو والدین پر ایک اور عظیم بار ڈال دیا جاتا ہے......“ حارث کے والد حاجی جاوید صاحب کی یہ بات کھٹک کر کے دادی حضور کے دل میں کھب گئی تھی......اور انہیں لالچی بدر زماں اور طاہرہ خانم یاد آ گئے۔

حارث کے پہلو میں سادگی سے سجی سنوری آنسہ پھر بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ اور اپنی پسند سے بنوائے گئے کھا کھرا ڈریس میں ہانیہ، وانیہ تتلیاں بنیں مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھیں......لاک ڈاؤن میں ہوئی یہ شادی ان سب کے لیے ایک حسین یادگار بن گئی تھی۔

❁❁❁

امیدِ بہار

باجبرہ ریحان

''بس تھوڑا صبر اور بیٹا... اسپتال آنے ہی والا ہے۔'' شاید پیچھے سے آنے والی سسکی کی آواز اب کی بار اس قدر زور دار تھی کہ خوشی اللہ کو آخر کار رولا سے میں کچھ بولنا ہی پڑا۔ وہ آگے بھی کچھ کہہ رہے تھے جو پیچھے بیٹھی شیما سن نہیں پا رہی تھی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ کوشش کے باوجود بھی وہ ہمت نہیں کر پا رہی تھی کہ گاڑی سے نکل سکے بلکہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خوشی اللہ کو ایمرجنسی میں جا کر کسی وارڈ بوائے سے وہیل چیئر لانے کی ہدایت ہی دے سکے... مگر وہ خود ہی جلدی میں گاڑی سے اتر گئے تھے اور پھر خوشی اللہ کی تکرار کی آواز گاڑی کے اندر تک آنے لگی۔ وہ کسی کو اس کی خرابیٔ طبیعت کے بارے میں بتا رہے تھے یہ بھی کہ ابھی وہ اس قابل نہیں کہ اس سے بات کر سکے ابھی اسے صرف اسپتال جانا ہے وغیرہ وغیرہ...... پھر کسی نے شاید اسٹیئرنگ کی ہی طرف کی کھڑکی سے سر اندر ڈال کر گاڑی کا جائزہ لیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے واپس کھینچ لیا تھا مگر اس مختصر سے وقفے میں بھی شیما اسے پہچان گئی تھی کہ وہ ولید تھا جو یقیناً اس سے کسی نہ کسی شکایت کی بنا پر جہاں ہوجیسی ہوئی بنیاد پر

کھری، کھری سنانے کے لیے شاید اس کی گاڑی کو اسپتال پہنچنے سے پہلے یا آس پاس روک چکا تھا۔

"یعنی اسپتال نہیں آیا۔" یہ سوچ کر اسے بے حد کوفت ہوئی اور دل چاہا کہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگے کیونکہ اب سر کی تکلیف برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ واقعی رونے لگی تھی یا پھر کراہنے لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اسٹیرنگ کی جگہ ولید نے سنبھال لی تھی اور دوسری طرف خوشی اللہ آکر بیٹھ گئے تھے۔

"یہ صحیح ہوا......" اس نے تمام تر تکالیف کے باوجود ٹھنڈی سانس بھری۔ خوشی اللہ اس گھر کے سب سے پرانے ڈرائیور تھے اور گاڑی کچھ اس احتیاط اور آہستگی سے چلاتے جیسے بائیسکل چلا رہے ہوں۔ اصل میں اس عمر میں اب وہ تیز گاڑی چلا ہی نہیں سکتے تھے......ان کو کبھی ایمرجنسی کی صورت حال میں ڈرائیوری کرنے نہیں دی جاتی تھی مگر رات کے اس پہر گھر کے سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے بھی واحد وہی ڈرائیور تھے اور شیما اس قابل نہیں تھی کہ خود گاڑی چلا کر اسپتال پہنچ جاتی......ولید نے حیرت انگیز طور پر اسے صلواتیں سنانے کے بجائے خاموشی سے گاڑی اڑانی شروع کردی تھی اور اُدھر شیما کی سسکیاں بھی تیز تر ہو چکی تھیں۔ پھر وہی ایک جھٹکا......ایک زور دار دھماکا شیما کو اپنے ماتھے پر ہمیشہ کی طرح کوئی پتھر جیسی چیز آکر لگتی محسوس ہوئی اور آہستہ، آہستہ اس کی آنکھ بند ہونے لگی اور پھر ہوش و حواس کھونے سے ذرا پہلے اسی بھاری بھرکم رعب دار آواز کی بازگشت......

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی پر ہاتھ اٹھانے کی؟ یہ تکلیف جو تم نے اسے دی ہے اس سے کہیں زیادہ تکلیف میں تمہیں دوں گا۔"

"آہ......" بند شیشوں کی گاڑی کی دبیز خاموشی میں ایک اور سسکی ابھری۔

"کہاں ہیں آپ بابا جانی......مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ دیکھیں ایک بار پھر آپ کی بیٹی کو کسی نے تکلیف دی ہے کسی نے ستایا ہے بابا جانی مجھے......بس ایک بار، آپ ایک بار پھر مجھے بچانے کے لیے آجائیں......پلیز بابا......واپس آجائیں......"

کوئی جواب نہیں......ہر طرف خاموشی......ہر طرف گہری اندھیری کھائی جیسی خاموشی تھی......یقیناً شیما کا آخری وقت آن پہنچا تھا اور ایک بار پھر وہ مرگئی تھی۔

☆☆☆

فاطمہ مسلسل ایمرجنسی وارڈ کے باہر ٹہل رہی تھی اور جب بھی ایمرجنسی وارڈ کے باہر رکھی واحد اسٹیل بینچ پر بیٹھے ولید کے پاس سے گزرتی تو اسے آس بھری نظروں سے دیکھنا نہ بھولتی......ولید بھی کچھ کم پریشان نہیں تھا......شیما کو ولید نے اس حالت میں تیسری بار دیکھا تھا۔ پہلی بار وہ صرف تیرہ سال کی تھی جب بابا جانی اسے اس کے والد یعنی پھوپا جان کے گھر سے ہانپتے کانپتے بھاگ اسپتال لے کر پہنچے تھے۔ اس وقت وہ اے لیول کا امتحان دے کر صرف کرکٹ کھیلتا تھا اور جب وہ کرکٹ نہیں کھیل رہا ہوتا تو ٹی وی پر پرانے کرکٹ میچ دیکھا کرتا تھا۔ اس کو شیما کی نازک حالت کے بارے میں فاطمہ نے ہی بتایا تھا مگر گمبھیر حالت کے بارے میں پتا چلنے اور باقاعدہ اسپتال جا کر شیما کا دبلا پتلا سراپا......آکسیجن ماسک اور طرح، طرح کے تار اور ٹیوبز میں قید دیکھنے میں کافی فرق تھا۔ اتنا فرق تھا کہ وہ شیما کے لیے بے حد ہمدردی رکھنے لگا تھا اور پھوپا جان پر اتنا ہی غصہ بھی......اس کے بعد اس نے مسلسل اسپتال جانا شروع کردیا تھا اور شیما کی ہر دن کی پوری رپورٹ لے کر وہ فاطمہ کو گھنٹوں بیٹھ کر سنایا کرتا تھا۔

شیما کے ماتھے پر کسی نے کھینچ کر کوئی بھاری پتھر جیسی چیز ماری تھی جس کے بارے میں بعد میں کھلا تھا کہ یہ کارنامہ کسی اور نے نہیں خود پھوپا جان نے سرانجام دیا تھا۔ پھوپا جان کو غصے میں سامنے والے کو چیزیں کھینچ کر مارنے کی عادت تھی......ان کے تمام بچوں کو پھینکی گئی چیزوں سے بروقت بچانے کے لیے ان کی ماں موجود تھی مگر شیما بچ نہیں سکی تھی کیونکہ اس کو بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اتفاق سے اسی وقت بابا جانی اپنے معمول کے

مطابق شیما سے ملنے پھوپا جان کے ہاں پہنچے تھے اور پھر شیما کو خون میں لت پت بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر پھوپا کو کافی سخت اور دھمکی آمیز باتیں سنا کر آئے تھے مگر شیما کی حالت نے کچھ دنوں بابا جانی کو یوں خود سے جوڑے رکھا کہ وہ اپنی دھمکیاں وغیرہ سب بھول گئے۔ یوں بھی وہ پھوپا جان کی طرح اس قدر کٹھور کبھی نہیں ہو سکتے تھے کہ اپنی دھمکیوں کو اپنے ہی رشتے دار.... پر عملی جامہ پہناتے۔ وہ ایک بھاری کرسٹل کا پیپر ویٹ تھا جس کے لگنے سے شیما کے ماتھے کی ہڈی کا ایک بہت ہی معمولی چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر دماغ کے اندر گھس گیا تھا اور اس ننھے دماغ کے اندر ایسی جگہ جا کر اپنا ڈیرا جمالیا تھا کہ آپریشن ناممکن تھا۔ اسے مسلسل نیند میں رکھا جا رہا تھا۔

ڈاکٹروں کے خیال میں اس کے بچنے کی بیس فیصد امید تھی اس صورت میں کہ اگر وہ اسی طرح دماغ میں گھسی ہوئی اس ٹوٹی ہوئی ہڈی سمیت چار سے پانچ دن سانس لیتے گزار لے...... مگر پھر اس کے دماغ نے عجیب کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی، کبھی سانس اکھڑ جاتی، کبھی اس کے گردے کام کرنا چھوڑ دیتے۔ یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ چھپی ہوئی ہڈی کو برداشت نہیں کر رہا تھا۔ اس کو جلد از جلد اپنی territory یعنی اپنے علاقے سے بے دخل کر دینا چاہتا تھا...... مگر دماغ کوئی راہ سجھ نہیں پا رہا تھا اور کسی طرح شیما کو باور کرانا چاہتا تھا کہ اس وقت جسم کے ساتھ، ساتھ دماغ بھی شدید تکلیف میں ہے۔ ایسے میں شیما کے اردگرد ہر وقت ڈاکٹرز اور پیرامیڈیکل اسٹاف کا ہجوم رہتا۔ ہر وقت وہ کسی نہ کسی طرح کی نازک حالت سے گزر رہی ہوتی، ہر دم ایسا ہی لگتا کہ بس اب اس کا اختتام ہوا چاہتا ہے۔ پھر چھ دن اور سات راتیں اسی اذیت اور تکلیف میں گزار کر اچانک اس کی حالت بہتر ہونے لگی...... شیما کے جسم نے اس دوران جو بھی تکالیف اٹھائی تھیں اس سلسلے میں اسے چند ہفتے اور اسپتال میں قیام کرنا پڑا تھا مگر ان سات دنوں کے بعد ہونے والے سٹی اسکین اور

ایم آر آئی کی تسلی بخش رپورٹ کے بعد ڈاکٹروں نے دماغی طور پر شیما کو خطرے سے باہر قرار دے دیا تھا۔

فاطمہ کو صرف ایک بار ہی شیما کو دیکھنے کی اجازت ملی تھی...... وہ دس سال کی تھی مگر اپنی عمر سے کئی گنا چھوٹی لگنے کی وجہ سے اسپتال آنے سے منع کر دی گئی تھی لہٰذا فاطمہ کو اسپتال میں شیما کی حالت کے بارے میں تمام معلومات پہنچانا ولید کا کام تھا۔ کرکٹ وہ سرے سے بھول گیا تھا اور جب وہ اسپتال میں نہیں ہوتا تو فاطمہ کے ساتھ گھر پر رہتا۔ بابا جانی صبح شام گھر صرف دیکھ بھال کے لیے آتے اور دن رات اسپتال میں ہی رہتے۔ صرف یہی وہ دن تھے جب اس نے اور فاطمہ نے اپنے بابا جانی کو کسی کے ساتھ اتنی فراخدلی سے شیئر کیا تھا...... وہ دونوں بابا جانی کے آنے پر ان کے اردگرد گھومتے۔ صرف ان کو گھر میں کام کرنے والوں کو ہدایات دیتے دیکھتے یا پھر فون پر آفس میں بات کرتے سنتے۔ بابا جانی کو شیما سے محبت بھی تو بلا کی تھی۔ تقریباً روز بابا جانی، شیما سے ملنے پھوپا جان کے ہاں جایا کرتے کیونکہ وہ بابا جانی کی اکلوتی چھوٹی مرحوم بہن کی اکلوتی اولاد تھی۔ پھوپا جان نے پھوپی جان کے انتقال کے ایک سال بعد ہی دوسری شادی کر لی تھی اور اب شیما کے چار سوتیلے بھائی بہن تھے...... پھوپا جان کو شیما سے کوئی دلچسپی تھی یا نہیں مگر اس کی سوتیلی ماں کو شیما سے ڈھیروں شکایات رہتیں اور بابا جان کے پہنچتے ہی وہ اپنی تمام تر شکایات پھوپا جان اور شیما کو بابا جانی کے سامنے بٹھا کر کیا کرتیں۔ ایسے میں ان کا منہ بند کرنے کا ایک ہی راستہ تھا یعنی...... پیسہ...... جو بابا جانی اپنی بن ماں کی بھانجی پر وار کر پھینکنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر مسئلہ وہاں شروع ہوا جب اس ایک حادثے کے بعد بابا جانی (جو شیما کے ماموں تھے) مستقل طور پر شیما کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ فاطمہ کو تو جیسے ایک دوست کی تلاش تھی، ایک بڑی بہن جو اس کے بال سنوارتی، اسے کہانیاں سناتی لہٰذا وہ تو خوشی میں ہر دم

سیما کے گن گانے لگی۔ مگر ولید کو بابا جانی کے یوں شیما کو ہر دم اپنے ساتھ رکھنے پر کہیں دل میں شکایت ہوتی تھی اور یہی وہ دن تھے جب اس نے بابا جانی کو اپنی غیر موجودگی کی سزا دینے کا سوچ کر لندن کی ایک یونیورسٹی کا رخ کیا... یہ اچھا ہوا کہ اس نے بھی اپنی ناپسندیدگی بابا جانی کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دی مگر جیسے شیما کے اس کے بابا جانی، فاطمہ اور محبت تک پر قبضہ جمانے سے ولید کے دل پر گہری چوٹ آئی تھی۔ وہ شیما سے ایک نامعلوم سی عداوت رکھتا تھا، سیاست اس وقت معلوم چلا جب بابا جانی کے انتقال پر یہی عداوت، نفرت میں تبدیل ہوئی تھی۔

جب وہ لندن یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر کی ماسٹرز ڈگری لے رہا تھا۔ اس نے شیما کے دوسری بار اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا سنا تھا۔ اس بار شیما کو بچنے کی امید بھی نہیں دیا گیا تھا۔ وہ بابا جانی کے ساتھ رہتے ہوئے ان جانے لگی تھی نہ صرف گھر پر بلکہ ان کے باہر کے ہر کام میں بھی ساتھ ساتھ رہنے لگی تھی اور پھر اچانک اس کی شادی کی خبریں آنے لگیں۔ فاطمہ نے ولید کو فون کر کر کے تنگ کر دیا تھا اس کا خیال تھا کہ ولید، شیما کو فاطمہ کی بھابی بنائے گا مگر ولید صرف خاموش رہا تھا، وہ شیما کو چاہتا تھا یا نہیں وہ نہیں جانتا تھا... مگر وہ شیما کو اپنا بھی سکتا تھا اگر ولید کے اپنے بابا جانی اس سے اس طرح کی خواہش کا اظہار کرتے... مگر نہیں بابا جانی نے تو جیسے شیما کے آتے ہی ولید کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ اگرچہ دونوں باپ بیٹا فون پر بات کرتے رہتے تھے مگر دونوں کے رویوں میں بے تکلفی اور گرم جوشی نام کو نہیں تھی۔ ویسے بھی ولید کو لگتا تھا کہ اس کے بابا جانی کو اپنی لاڈلی بھانجی کچھ یوں عزیز ہے کہ وہ اپنے سگے بیٹے تک کو اس کے قابل نہیں سمجھتے... لہٰذا وہ خاموش رہا تھا فاطمہ کے پہلے اسے اکسانے پر پھر اسے شادی میں شرکت کرنے کی ضد پر وہ صرف خاموش تھا، بے چین تھا مگر اپنی باتوں سے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ کسی چیز کے چھن جانے کے احساس سے لبریز تھا مگر فاطمہ کی ضد پر حامی بھی نہیں بھرتا تھا۔ اور پھر جس دن شیما کی رسم ہونے جا رہی تھی اچانک یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ اسپتال پہنچ گئی ہے۔ کئی سالوں بعد اس کے دماغ کو پھر شرارت سوجھی تھی... اس نے ایک بار پھر بڑی شدومد سے ماتھے کی چھپی ہوئی ہڈی کو باہر نکال پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ بقول فاطمہ، شیما اب تک ایک صحت مند زندگی گزار رہی تھی، بابا جانی کی خواہش کے مطابق شیما نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا تھا اور فاطمہ ڈھیروں شاپنگ کرتے تھے، گھومتے پھرتے۔ شادیوں، دعوتوں میں باقاعدگی سے جاتے تھے کیونکہ شیما کا سر درد معمول کی بات تھی جس کے سلسلے میں بابا جانی اسے مسلسل ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے رہتے تھے مگر اس طرح کا دورہ پڑنے کا نہ تو ان لوگوں کو کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا نہ ہی ان لوگوں کو خود ہی اندازہ تھا۔

رسم سے دو دن پہلے سے شیما نے کھانا پینا بند کر دیا تھا کہ اسے شدید متلی ہونے لگی تھی اور پھر رسم کے عین وقت پر اس کے سر میں شدید درد اٹھا اس قدر شدید کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔ اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کے دماغ نے اس کے جسم کو شدید نقصان پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی سے بابا جانی اور فاطمہ نے اسے فون کیا۔ اور وہ جو شیما کی شادی میں شرکت کرنے سے معذرت کر چکا تھا اس کی تکلیف میں چپ کر نہ بیٹھ سکا اور دوسرے ہی دن پہلی فلائٹ سے کراچی پہنچ گیا۔

شیما ایک بار پھر اسی طرح آکسیجن ماسک اور تاروں اور ٹیوبز میں قید نظر آئی۔ ایک بار پھر ولید کو اس پر بہت رحم آیا... وہ جاننا چاہتا تھا کہ شیما کو اتنے سالوں بعد یہ دورہ کیوں پڑا اور کیا اس کا مطلب یہ سب ہمیشہ ہوتا رہے گا...؟ ڈاکٹروں کے مطابق یہ میڈیکل سائنس میں بالکل ہی اچھوتی اور انوکھی بات ہو رہی تھی۔ شاید شیما مجموعی طور پر اس قدر مضبوط تھی یعنی اپنے دل و دماغ پر اس قدر قوت برداشت رکھتی تھی کہ اس نے ہر طرح کی تکلیف کے بعد بھی دماغ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا کام جاری رکھے شاید اسی وجہ

سے اس کے ذرا سے کمزور پڑنے پر اس کا دماغ ایک بار پھر اپنی چلانے لگا تھا...... مگر وہ کمزور کیوں پڑی تھی؟ کیا بات تھی؟ انسان کو کمزور تو صرف دکھ کرتے ہیں...... جبکہ شیما کی تو شادی ہونے والی تھی اسے تو خوش ہونا ہی چاہیے۔ سوالات کی لمبی فہرست اور ولید کا اس کے ارد گرد منڈلانا...... وہ فاطمہ اور بابا جانی کے لیے ڈھارس بن کر آیا تھا بابا جانی ایک بار پھر اپنے بیٹے کو جو قد میں ان سے بھی اونچا نظر آنے لگا تھا ہر وقت نظروں میں رکھتے تھے۔ فاطمہ اپنے بھائی پر واری صدقے جاتی...... مگر پھر بھی وہ دونوں اداس تھے، وہ خود بھی اداس تھا۔ پتا نہیں اسے کس بات سے تکلیف ہو رہی تھی۔ شیما کو اس حالت میں دیکھ کر یا پھر اپنے گھر والوں کو شیما کے لیے اس قدر پریشان دیکھ کر......

"وہ شادی کرنا نہیں چاہ رہی تھی...... میں نے ہی اسے زبردستی منایا تھا۔" آخر ایک دن ایمرجنسی کے باہر بیٹھے بابا جانی نے ولید سے کہا۔

"کیوں......؟" ولید نے چونک کر پوچھا تو بابا جانی نے گہری سانس بھر کر بیٹے کو غور سے دیکھا۔

"وہ کہتی تھی وہ انتظار کرے گی، میں نے اسے سمجھایا کہ بیکار ہے...... مگر اب پتا چلا کہ وہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے...... جس خاندان سے تم تعلق رکھتے ہو۔ وہ اپنی بات منوا کر رہے گی کسی کو تکلیف دیے بغیر بس خود کو تکلیف میں ڈال کر...... وہ اپنی بات منوا کر رہے گی یا پھر...... یا پھر مر جائے گی...... اور اس کی زندگی کی خاطر مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑے گی......" بابا جانی بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے مگر ولید ان سے گھر جا کر آرام کرنے کا کہہ نہ سکا۔

نہ جانے کون سے لمحے شیما کا آخری وقت آن پہنچے۔

"کس کا انتظار کر رہی ہے وہ......؟ آپ کو نام بتایا؟" ولید نے بے خیالی میں پوچھا اور پوچھ کر پچھتایا...... وہ جانتا تھا کہ شیما کس کے انتظار میں ہے، وہ جانتا تھا اس کے ساتھ بابا جانی اور فاطمہ بھی جانتے تھے...... مگر وہ چاروں سب کچھ جانتے ہوئے بھی کھلے

عام اس چھپن چھپائی کے کھیل میں برابری سے اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ شیما کا دماغ پچھلی بار کی طرح چھ سات دن اس کے جسم کو ہر طرح سے نقصان پہنچا کر خاموش ہو گیا تھا اور پھر تین ہفتوں بعد وہ گھر شفٹ ہو گئی۔ اس کے گھر آتے ہی تیسرے دن فاطمہ کے بار، بار روکنے کے باوجود ولید لندن نکل گیا۔

زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی تھی مہینے، دن اور سال، مہینوں کی صورت گزرنے لگے۔ ان دونوں موقعوں پر ولید نے شیما سے نہ صرف ہمدردی محسوس کی تھی بلکہ اس کی صحت یابی کی دل سے دعا بھی کی تھی اور وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شیما کو بھی اس دورے سے تیسری بار گزرتے دیکھ کر وہ تن کر گزار دے گا...... اسے نہ تو اس سے ہمدردی ہو گی نہ ہی وہ فاطمہ کو دلاسا دے گا......

کیونکہ تیسری بار شیما کے ساتھ، ساتھ جیسے اس کے اپنے دل و دماغ نے بھی شدید قسم کی بغاوت کی تھی۔

ولید ڈگری لے کر لندن میں ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرنے لگا تھا جو کہ...... اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت اس کی اس کے والد کو تھی جنہوں نے اس سے مایوس ہو کر شیما کو اپنا دایاں ہاتھ بنا لیا تھا۔ وہ اس بات پر بھی بابا جانی سے دل ہی دل میں شکایت رکھتا تھا مگر پھر...... فاطمہ کی شادی بھی کر دی گئی۔ اور ولید جانتا تھا کہ اب وہ کراچی نہ جانے کی کوئی بھی وجہ بتا دے فاطمہ اس کی ایک نہیں چلنے دے گی۔ جب وہ جہاز پر سوار ہو رہا تھا تو اس کے ذہن میں فاطمہ کی شادی کے بارے میں ہر طرح کا خیال تھا اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کراچی اترنے پر اسے بابا جانی کے انتقال کا معلوم چلے گا...... یہی وہ دن تھے جب اس نے جی بھر کر شیما کو احساس دلایا تھا کہ اس نے آج ہی نہیں بلکہ بچپن سے ہی ولید سے اس کا باپ چھین لیا تھا۔ فاطمہ دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ اسے اپنا بھائی بھی ایسا ہی عزیز تھا جتنی محبت اسے شیما سے تھی۔ بابا جانی، اب دنیا میں نہیں تھے تو ولید کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کس قدر بیوقوفی کا

ثبوت دیا تھا۔ اسے اپنے حق کے لیے اپنے باپ کی توجہ کے لیے لڑنا چاہیے تھا اب اسے بار، بار بابا جانی کے اشاروں میں اس کے واپس آنے کی التجاؤں کی یاد آنے لگی تھی اور اپنی بیوقوفی کا احساس اسے مسلسل شیما کو تکلیف دینے پر اکسا رہا تھا۔ اس کا غصہ، اس کی ضد بابا جانی کے وجود سے ہٹ کر صرف اور صرف شیما کو نشانہ بنانے لگی تھی۔ وہ اس کو ہر طرح سے باور کرا رہا تھا کہ اس کے اتنے بڑے نقصان کی ذمے دار... صرف شیما ہی ہے یہ سوچے بغیر کہ بابا جانی صرف اسی کے باپ نہیں تھے بلکہ وہ شیما کے سگے ماموں اور محسن بھی تھے انہوں نے شیما کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ دنیا کے واحد انسان تھے جنہوں نے شیما کو مشکل وقت میں اپنا ساتھ دیا تھا۔ ہر بار اس پر پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا اس کو اپنا قیمتی وقت دیا تھا اس کی زندگی سنواری تھی۔

بابا جانی اگر ولید اور فاطمہ کے باپ تھے تو شیما کے لیے باپ سے بڑھ کر تھے...... ولید کو اگر احساسِ زیاں تھا تو شیما کو اپنی دنیا ہی ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی پھر بھی وہ بڑی خندہ پیشانی سے ولید کے طنز اور طعنے برداشت کرتی رہی تھی مگر صرف اس وقت تک جب تک فاطمہ ان دونوں کے درمیان تھی۔ فاطمہ کی شادی طے تھی اور شیما نے بابا جانی کی خواہش کے مطابق فاطمہ کی رخصتی میں نہ تو کوئی دیر ہونے دی تھی نہ ہی کوئی اونچ نیچ ہونے دی۔ اب تک وہ بابا جانی کے بزنس اور گھر پر اس قدر اجارہ داری قائم کر چکی تھی... جیسے خود بخود تمام کے تمام لوگ اس کے حکم کے منتظر رہتے۔ ولید اپنے ہی گھر میں خود کو ایک اجنبی مہمان کی طرح محسوس کرتا۔ اس کے علاوہ اس نے دیکھا کہ شادی کے دوران پھوپا جان بھی یہ کہہ کر کے کہ ایک جوان لڑکی بھلا کس طرح اکیلے اپنی بہن کو بیاہ سکے گی اپنے بال بچوں سمیت اسی کے گھر میں آ چکے تھے۔ اور ہر طرح کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اکثر ہی رات کے کسی پہر وہ اٹھتا تو دیکھتا کہ بابا جانی کی اسٹڈی میں بابا جانی کی مخصوص کرسی پر شیما بیٹھی بڑی تمکنت اور فخر سے پھوپا جان کی باتیں سن رہی ہوتی...... وہ اگر اندر جاتا تو یا تو وہ دونوں خاموش ہو جاتے یا پھر شیما اٹھ کر کمرے سے چلی جاتی...... ولید کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا اس نے یہ آج تک کیوں نہیں سوچا کہ اب وہ ہی بابا جانی کی تمام جائداد کا اکلوتا وارث ہے۔ پھر اب بھلا شیما اور اس کے والدِ محترم کی اس گھر میں ضرورت ہی کیا ہے...... مگر فاطمہ کی رخصتی والے دن ہی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بابا جانی نے اپنی وصیت کے مطابق بزنس گھر اور ہر طرح کے مالی معاملات میں شیما کو ولید کا برابر کا حصے دار بنا دیا تھا۔ فاطمہ کو اس کا ہر ماہ حصہ دینے کا کام بھی ولید کے بجائے شیما کو سونپا گیا تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ ولید کے اس طرح بار، بار پاکستان سے فرار ہونے پر بابا جانی کچھ اسی طرح کا اقدام کرتے مگر پھر بھی شیما...... وہ دل میں ایک انگارہ سا جلتا محسوس کرتا اور اسی جلن میں فاطمہ کو رخصت کرتے ہی اس نے شیما کو بے دھڑک سنا دیا۔

ولید کو اس سے اس قدر شکایتیں تھی نہیں جتنی کا اس دن اس نے شیما کو ذلیل کرنے والے انداز میں اظہار کیا تھا اور پھر اندر کی دبی ہوئی نفرت جب ولید نے بھرپور انداز میں باہر انڈیلی تو شیما کو جواب میں صرف ایک ہی کام سوجھا۔ وہ اپنے آپ پر سے ایک بار پھر تمام تر قوت کھو بیٹھی تھی۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ ولید بھی محبت کے بجائے اس سے نفرت کا اظہار کرے گا تو کیا اب تک وہ خوش فہمی میں مبتلا رہی تھی۔ کیا اب تک وہ محض ایک غلط فہمی کا شکار رہی تھی۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے کئی بار ولید کو اپنے لیے پریشان ہوتے دیکھا تھا وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا مگر اپنی آنکھوں سے تو اس نے کئی بار...... نہیں ایسا نہیں تھا۔ یہ اس کی خام خیالی تھی یہ اس کا دیوانہ پن تھا اور اب اس دیوانے پن میں وہ تن تنہا ولید کی نفرت کے بوجھ تلے دب گئی تھی۔ جب رات کے اس پہر شیما، خوشی اللہ کے ساتھ اکیلی اسپتال کے لیے نکلی تھی تو ولید نہیں جانتا تھا کہ چند ہی منٹوں میں شیما کی غیر موجودگی اسے اس طرح اچانک تنہائی کے ڈر و خوف میں مبتلا کر دے گی۔

اس نے غیر ارادی طور پر پھوپا جان کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے گیٹ پر ڈیوٹی دیتے گارڈ نے بتایا کہ پھوپا جان کو خاندان سمیت صبح ہی شیما بی بی نے ان کے گھر بھجوادیا۔ بات کچھ کچھ نہیں آسکنے اور بہت کچھ سمجھ آنے پر وہ چند منٹوں تک اکیلے تنہا پورے گھر میں دیوانہ وار دوڑ بھاگ کرتا رہا...... اسے حیرت ہوئی وہ اپنے ہی گھر میں اکیلا رہ گیا؟

نہیں..... وہ اس پوری دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ بابا جانی آخر کار اس کی ضد کے آگے ہار گئے تھے اور اب وہ شیما کو بھی ہارنے جارہا تھا۔ اور پھر وہ پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کو اب کراچی میں گاڑی چلاتے ہوئے وحشت ہوتی تھی مگر رات کے اس پہر سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے باعث اور کچھ خوشی اللہ کے آہستہ گاڑی چلانے کی وجہ سے ولید ان لوگوں سے راستے میں ہی جاملا تھا...... اور پھر اس نے شیما کو نظر بھر کر دیکھا تھا...... اس کی حالت واقعی خراب تھی۔ فاطمہ اطلاع ملتے ہی اسپتال آگئی تھی...... ہمیشہ سے اسی مخصوص اسپتال میں شیما کا علاج ہوتا تھا اور ولید، خوشی اللہ سے پوچھتا اسے وہیں لے کر آیا تھا...... فاطمہ کو ولید کے تیور شروع سے ہی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور رخصتی کے وقت وہ بھائی سے لپٹ کر بس اسی بات کی درخواست کرتی رہی تھی کہ ولید اس بات کو قبول کرلے کہ بابا جانی کو شیما سے ان دونوں ہی جتنا ہی پیار تھا...... بابا جانی کی محبت کسی پیمانے میں بھرا ہوا مشروب نہیں تھا جو شیما کو دینے سے کم پڑ جاتا...... یہ ولید کی غلط فہمی تھی کہ بابا جانی نے شیما کی خاطر ولید کو نظر انداز کیا حقیقت اس کے برعکس تھی اور یہ بات جتنی جلدی ولید سمجھ لے اچھا تھا ورنہ بہت ممکن ہے کہ وہ عمر بھر کے لیے تنہا رہ جائے اور اس طرح کی تنہائی فاطمہ اپنے بھائی کے لیے نہیں چاہتی تھی مگر فاطمہ کو اب اس بات کا احساس ہورہا تھا کہ ولید سمجھنے والا نہیں تھا۔

اس وقت تک تو فاطمہ اپنے بھائی کو پیار محبت سے سمجھاتی رہی تھی مگر اب ایمرجنسی وارڈ کے باہر بیٹھے ولید سے فاطمہ کو شدید شکایت ہورہی تھی...... مگر وہ اپنی تمام شکایت ایمرجنسی وارڈ کے باہر ٹہل ٹہل کر رفع دفع کرنے کی کوشش کررہی تھی اسے معلوم تھا کہ کسی شخص کو کسی دوسرے انسان کی تکلیف، دکھ اور پریشانی کا ذمے دار ٹھہرانا اس ایک شخص کے لیے کتنا جان لیوا ہوسکتا ہے۔ اب کیا فاطمہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ وہی کرتی جو اس کا بھائی شیما کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ شیما کے معالجین میں سے ایک ڈاکٹر نے آکر ان دونوں کو اطلاع دے دی تھی کہ اب اس کی حالت اس قدر مخدوش نہیں تھی مگر پھر بھی ابھی وہ بے ہوش تھی...... اور اگر ان دونوں میں کوئی اسے دیکھنا چاہے اس کے پاس بیٹھنا چاہے تو یہ مریض کے لیے اچھا تھا۔

"پہلے اس کے پاس بابا جانی ہوتے تھے...... وہ اس کی بے ہوشی میں بھی اس کا ہاتھ تھامے اس سے گھنٹوں بات کرتے تھے اور شیما آپی نے بتایا تھا کہ وہ بابا جانی کی تمام باتیں سنتی تھیں...... وہی باتیں تو تھیں جو ان کو دنیا سے جوڑے رکھتی تھیں...... اب...... کون...... میں؟ میں تو ایسا نہیں کرسکتی...... ان کو اس حالت میں دیکھ کر میں تو بس رو پڑوں گی...... میں...... میں...... گھر جارہی ہوں۔" فاطمہ اعلان کی صورت اونچی آواز میں بڑبڑاتی آگے بڑھ گئی تھی۔

اس نے ایمرجنسی وارڈ کے لمبے سے کاریڈور کے آخری سرے پر پہنچ کر لفٹ کے لیے بٹن دباتے بہت ہی امید سے ولید کی طرف دیکھا تھا۔ اسی لمحے ولید کی نظر فاطمہ کی نظر سے ملی تھی اور ولید کو لمحے میں سمجھ آگیا تھا کہ فاطمہ اس سے کیا چاہ رہی تھی...... وہی امید بھری نظر...... وہی التجا بھرا سراپا...... وہی مسلسل چھلکتی ہوئی آرزو جو ولید، بابا جانی کے انداز میں بھی کئی بار محسوس کرچکا تھا۔ اور پھر فاطمہ نے ولید کو بینچ سے اٹھ کر چند قدم اپنی طرف بڑھاتے دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا تھا مگر پھر بیچ کاریڈور تک آتے آتے ولید واپس مڑ گیا تھا اور تیزی سے ایمرجنسی وارڈ کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تھا۔

❀❀❀

ناولٹ

سرابِ خواب و خیال

فرح بخاری

اس نے ریلنگ پر جھک کر سوئی سوئی آنکھوں سے لاؤنج کا منظر دیکھا اور دل چاہا واپس کمرے میں جا کر پھر سے بستر میں گھس جائے۔ اس بار جو مشکل ترین ٹیسٹ سر پر ناچ رہا تھا اس سے تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے ہی بچا جا سکتا تھا۔

"لیں! اٹھ گئے صاحبزادے....." باقر صاحب نے ابرو اوپر اٹھا کر عارفہ بیگم کو آگاہ کیا اور جب تک عارفہ نے نظریں اوپر اٹھائیں، وہ واپس کمرے میں جانے کے لیے پلٹ رہا تھا۔

"اے دارین..... نیچے آؤ بیٹا۔ بابا نے بات کرنی ہے۔ ضحیٰ بیٹا چاچو کو پکڑ کر لے آؤ....."

"جی دادی....." چھ سالہ ضحیٰ یوں سیڑھیوں کی طرف بھاگی جیسے چور بھاگا جا رہا ہو۔

"اور یہ آپ کیوں اٹھ کھڑے ہوئے.....؟"

عارفہ نے بوکھلا کر باقر صاحب کی طرف دیکھا جو اخبار تہ کر کے موبائل فون، بٹوا اور چابی سنبھال رہے تھے۔

''بھئی تم خود ہی بتا دینا ساری بات، مجھے تو کلینک کے لیے ابھی نکلنا ہے اور پھر جو بھی رائے ہو حضور کی مجھے بتا دینا۔ اظہر میرے جواب کا منتظر ہوگا۔'' وہ گھڑی باندھ کر چشمہ اٹھاتے بیچ بیچ ہی باہر نکل گئے اور نئی کلائی سے کھینچ کر دارین چادر کو زبردستی نیچے لے آئی۔ اور دارین یہ دیکھ کر کہ بابا جانی تو رخصت ہو چکے...... صوفے پر ہی الٹا ڈھیر ہو گیا۔

''سونے کے دن گئے دارین رضا...... اٹھ جاؤ اب۔'' عارفہ نے اس کے شانے پر دھپ لگائی۔ ''گیارہ بجے تک سونے والی عیاشی کا آج آخری دن سمجھو۔''

''یہ بھی قرب قیامت کی کوئی نشانی ہوگی۔'' اس نے جمائی لیتے سائڈ بدل کر ماں کو دیکھا تو وہ ہنس دیں۔

''تمہارا کام ہو گیا ہے۔ جانے کی تیاری پکڑو......'' ماں نے اس کے بکھرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر کر کہا۔

''اچھا واہ...... کام بھی ہو گیا۔ جانے کی تیاری بھی پکڑوں...... لیکن بھئی جانا کہاں ہے؟'' نئی اطلاع نے بالآخر اسے سوتے سے اٹھا ہی دیا۔

''ایبٹ آباد...... تمہارے بابا کے دوست اظہر ہاشمی کے ہاں۔'' عارفہ نے مزید تجسس نہ پھیلاتے فوراً آگاہ کیا۔

''ایبٹ آباد......'' دارین نے خوشگواریت سے دہرایا پھر سوچنے کے لیے رکا۔ ''اظہر ہاشمی...... وہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر؟ کڑک فوجی بندے تو نہیں ہوں گے ناں؟''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اجنبی ہوں تمہارے لیے، انکل اظہر ہی کی بات کر رہی ہوں۔''

''وہ تو سمجھ گیا میری ماں...... لیکن کہاں محض، سالوں بعد بھی کبھار کی مختصر سلام دعا اور کہاں یہ مہینے ڈیڑھ کی مہمان داری۔''

''بالکل ٹینشن نہ لو، تمہارے بابا جیسے ہی وہ بھی نرم، سیدھے سے بندے ہیں۔ بہت خوش ہو رہے تھے

تمہارے آنے کا سن کر..... اور ابھی کچھ دیر پہلے ان کی مسز کا فون بھی آیا۔"

"اچھا...... خیریت؟" دارین اب جوش محسوس کرتے باقاعدہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"بھئی اخلاق کا تقاضا ہے۔ مہمان کے آنے پر خوشی ظاہر کررہے ہیں تاکہ تمہیں جھجک نہ ہو۔"

"چاچو آپ جارہے ہیں؟" منی اس کے پہلو میں اداس صورت لیے چپک کر بیٹھ گئی۔

"جی بیٹا لگتا تو یہی ہے کہ ابھی دھکا دے دیں گے۔"

"تو دلہن چاچی کو آپ ساتھ ہی لائیں گے؟"

"دل...... ہن...... چا...... چی...... ی ی......"

دارین کی دونوں آنکھیں پوری پھیلیں اور عارفہ نے کلائی سے پکڑ کر منی کو اپنی طرف کھینچا۔

"کیا کہہ رہی ہو منی...... چاچو پڑھنے جارہے ہیں۔" عارفہ نے تنبیہ کرنے کے انداز میں گھورا لیکن وہ بچہ ہی کیا جو اشارہ سمجھ جائے۔

"آپ نے مما سے کہا......"

"راحمہ...... ارے لے جاؤ اپنی اولاد کو...... پتا نہیں کہاں، کہاں منہ کھول دیتی ہے۔" وہ مسلسل بڑبڑاتے اب دارین کی طرف دیکھنے سے گریز کررہی تھیں۔

"ادھر میری طرف دیکھیں۔" دارین کھسک کر صوفے کے بائیں کونے پر تقریباً ماں کے مقابل آیا۔ راحمہ بھابی زبان دانتوں میں دبائے جلدی سے منی کا بازو پکڑے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔

"ہاں، ہاں بتاتی ہوں۔" عارفہ نے فوراً ہی ہتھیار ڈالے۔ "لیکن دیکھو خبردار جو باپ کے سامنے ایک لفظ بھی پھوٹے۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر وارن کیا اور دارین نے مسکرا کر اچھے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ موضوع ہی اتنا چٹ پٹا نکلا تھا، امی سے تفصیل نکلوانے کے لیے تو اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دیا جاسکتا تھا۔

"ہم تمہیں بتانا نہیں چاہ رہے تھے، کم از کم تمہاری واپسی تک...... اب مجھے تو یہ فکر ہے پڑھائی کیا خاک ہوگی تم سے......" وہ پھر تاسف سے پیشانی سہلانے لگیں۔

"ارے پڑھ لوں گا، کیوں فکر کرتی ہیں۔ لیکن پلیز یہ قصہ ادھورا نہ چھوڑیں۔"

"وہ اظہر بھائی کی بیٹی ہے ناں ارسلہ...... اسی کے رشتے کے سلسلے میں پچھلے دنوں ان کی کال آئی۔ کہہ رہے تھے بڑی دو بیٹیاں پہلے ہی پردیس میں بیاہ دیں۔ اب چاہتے ہیں اپنے وطن میں کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔ تو تمہارے بابا نے بھی فوراً کہہ دیا کہ ہم بھی دارین کے لیے لڑکی دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے سنا تو بہت خوش ہوئے۔"

"اور یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ تو کچھ مہینہ بھر پہلے کی بات ہے...... لیکن ابھی جب تمہاری تیاری کا مسئلہ آیا تو بہت سوچنے پر انہیں اظہر بھائی کا خیال آیا۔ اصل میں وہ ان سے کسی ہاسٹل وغیرہ کا پوچھنا چاہ رہے تھے لیکن انہوں نے بصد اصرار اپنے ہاں بلا لیا۔"

"اور ان کے گھر کا ماحول بھی ایسا ہوا تو؟" دارین نے منہ بنایا۔

"ارے نہیں بھئی یہاں والے حالات تو بالکل نہیں ہیں۔ گھر میں صرف اظہر بھائی، ان کی مسز سعدیہ اور ارسلہ ہوتے ہیں۔ بیٹا تو ان کا ہے کوئی نہیں۔ تین بیٹیاں ہیں۔ دو بیاہی جاچکیں بس ایک رہ گئی...... اور سعدیہ بتارہی تھیں کہ گھر میں دارین پہنچا تو آؤٹ ہاؤس یعنی انیکسی بھی ہے۔"

"کچھ زیادہ ہی ایکسائٹڈ نہیں ہیں وہ لوگ......" دارین نے ابرو چڑھا کر جاننا چاہا۔

"اچھا ہے ناں...... اس بہانے تم خود دیکھ آؤ گے۔ میری تو ویسے بڑی تسلی ہے۔ ارسلہ کو دیکھا تھا، کچھ آٹھ دس ماہ پہلے وہ لوگ یہاں لاہور ایک فنکشن میں آئے تھے۔ بڑی پیاری بچی ہے۔"

"اور مجھ سے کیوں چھپا رہے تھے آپ لوگ؟"

"تمہارے بابا کہہ رہے تھے کہ جس مقصد کے لیے جارہا ہے۔ اس میں رکاوٹ آجائے گی۔"

''تو ..... اب کیا ہوگا؟'' اس نے شرارت سے ماں کو ڈرایا۔

''بس میں کہہ دیتی ہوں، دارین نے آؤٹ ہاؤس کے لیے حامی بھری ہے۔ اور تم بھی پکا وعدہ کر کے جاؤ کہ صرف پڑھائی پر دھیان دو گے۔'' عارفہ بتا تو بیٹھیں لیکن اب گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھیں۔

''جانا کب ہے؟'' ماں کی تسلی کی خاطر اس نے لہجہ سنجیدہ رکھا ورنہ ذہن و دل ارسلہ، ارسلہ پکارنے لگے تھے۔

''تمہارے بابا تمہارا جواب جاننے کے لیے بیٹھے ہیں۔ تم حامی بھرو تو پہلے اظہر بھائی کو انفارم کریں گے پھر تم باپ بیٹا ہی مل کر طے کرو کہ کب نکلنا ہے۔ بس اپنی تیاری کو دیکھو۔ مہینے بھر کے کپڑے، جوتے وغیرہ وہ بھی وہاں کے موسم کی مناسبت سے۔''

''گرم کپڑے بھی رکھنے پڑیں گے۔ اوکے...''

وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''علی اور حسیب سے ملتا ہوں۔ تیاری کے متعلق جاننے میں مدد ملے گی۔ بابا سے بات ہو تو بتا دیں، میں جانے کے لیے تیار ہوں .... اور جلد از جلد ..... پہلے ہی بہت ٹائم ضائع ہو چکا۔''

''ابھی کہاں جا رہے ہو؟''

''باتھ لینے جا رہا ہوں۔ ناشتا ریڈی کروائیں اور کپڑے وغیرہ بھی بھابی کے ساتھ مل کر نکال لیں۔ میں دیکھ لوں گا۔''

''اور دیکھو باپ کے سامنے مت اکڑنا۔'' وہ اونچی آواز میں پھر یاد دلانے لگیں۔

''اور دیکھو ...... دلہن چاچی کو بھی ساتھ لانا۔'' منّی کی عادت تھی سارا دن دادی کی نقل کرنا۔ عارفہ کے انداز میں ہاتھ اونچا کر کے ہلایا تو دور کھڑی راحمہ بھابی، کچن سے نکلتی سمیرا بھابی اور دارین قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

باقر حسین پیشے سے ڈاکٹر تھے ..... اور ڈاکٹروں کے گھر اکثر تو ڈاکٹر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں ..... معاملہ قریب قریب یہاں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بڑا بیٹا حیدر علی بھی اسی پیشے سے منسلک تھا وہ نیورو سرجن تھا۔ دوسرا حسن رضا جنرل فزیشن تھا۔ البتہ سب سے چھوٹے دارین رضا نے الگ ہی شعبہ پسند کیا، عارفہ بیگم اکثر ہی برا سا منہ بنا کر کہتیں۔ ''اس لڑکے کی پسند نے ہمیشہ سب کو مشکل میں ہی ڈالا ہے ...... اب یہی دیکھو ...... یہ آرکیٹیکچر، توبہ میرے تو منہ سے ادا ہونا بھی مشکل ہے۔ کوئی پوچھ لے دارین کیا کر رہا ہے تو میرا منہ ہی ٹیڑھا ہوتا رہتا ہے۔'' لیکن باقر صاحب اس کے مزاج کی نفاست و نزاکت کو دیکھتے سن کر مسکرا دیتے تھے۔

دارین سے کچھ ایسی ہی توقع تھی۔ اور پھر وہ بابا کی توقعات پر بھی پورا اترا اور اپنی پانچ سالہ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد دو سالہ انٹرن شپ بھی مکمل کر لی تھی اور اب اگلے مہینے کے آخر میں وہ پی کیٹ پی کا ٹیسٹ دے رہا تھا۔ یوں تو اس کی تعلیم اب مکمل تھی اور پچھلے تین ماہ سے وہ وسیم انکل کی فرم میں بطور اسسٹنٹ کے کام بھی شروع کر چکا تھا۔ لیکن پی کیٹ پی کا اضافی ٹیسٹ کلیئر کرنے پر وہ اپنی ذاتی فرم بھی کھول سکتا تھا۔ البتہ اس ٹیسٹ کی تیاری اب دارین کے لیے کے ٹو سر کرنے سے کم مشکل نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ انٹرن شپ بہت اچھے انداز میں مکمل ہوئی تھی۔ وہ ٹیسٹ دینے کے لیے صحیح معنوں میں تب ہی ذہن بنا پایا جب وسیم انکل کی فرم میں باقاعدہ کام شروع کیا، ان کے ساتھ کام کرنے کے دوران ہی اس نے ذاتی فرم کی اہمیت کو سنجیدگی سے لیا۔ اور جب سنجیدگی سے لیا تب تک ٹیسٹ تقریباً سر پر آ چکا تھا۔ دوسری وجہ ٹیسٹ پر فوکس نہ کر سکنے کی گھر کا ماحول بھی بنا۔ پانچ سالہ اسٹڈی کے دور میں گھر کا ماحول قدرے پُرسکون تھا لیکن دو سال پہلے حسن بھائی کی شادی کے بعد گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے حیدر بھائی، راحمہ بھابی اور ننھی منّی کے ساتھ گھر کا ماحول نسبتاً کافی پُرسکون تھا۔ لیکن اب حسن بھائی کی شادی کے بعد سمیرا بھابی کا اضافہ اور ایک برس بعد حسن بھائی کے ہاں ننھے فیصل اور راحمہ بھابی کے ہاں سعد کا اضافہ ہوا۔ فیملی

ماشاءاللہ پھل پھول رہی تھی۔ یوں تو اتفاق و امن کا یہ گہوارہ باقر زیدی صاحب اور اہلیہ عارفہ کی شفقت و محبت کا جیتا جاگتا نمونہ تھا پر اب فیملی بڑی ہو جانے پر حیدر علی نے اسی علاقے میں ہی اپنا پلاٹ خرید کر کنسٹرکشن شروع کروا دی تھی۔ لیکن تکمیل اور فنشنگ وغیرہ میں ڈیڑھ دو سال باقی تھے۔ ادھر دارین کے لیے ٹیسٹ کی تیاری بھی نہایت اہم ہو گئی اور گھر کا ماحول اس کی نفیس طبیعت کے قطعی موافق نہ تھا...... وسیم انکل سے اس نے ایک ماہ کے لیے رخصت لے لی تھی لیکن پڑھنے کے لیے جو خاموش تسلی بخش ماحول اسے درکار تھا وہ میسر نہیں آ رہا تھا۔ یہی حال کچھ اس کے دوستوں کا بھی تھا۔ حسیب کے چچا نے ایبٹ آباد کے ایک ہوٹل میں تین دوستوں کے لیے روم بک کروایا۔ حسیب علی اور جنید نے اسے بھی شامل کرنے کی کوشش کی لیکن باقر صاحب نے چند دن مانگ لیے کہ ہو سکتا ہے وہ اس کے لیے کوئی مزید بہتر بندوبست کر لیں۔

اور ایسا ہی ہوا، ان کے ذہن میں اپنے دیرینہ دوست اظہر کا خیال آیا۔ پھر مہینہ بھر پہلے ایک خاص موضوع پر ان سے تفصیلی بات بھی ہو چکی تھی۔ ان سے دارین کی تیاری سے متعلق بات کرنے پر باقر صاحب کو رسپانس توقع سے کہیں بڑھ کر ملا تھا۔ وہ خوش تھے کہ دارین کو وہاں نہ صرف تنہائی میسر تھی بلکہ ماحول بھی ٹھنڈا اور پُرفضا تھا۔ حسیب وغیرہ کے متعلق پتا چلا کہ دو روز بعد وہ بھی اس کے پیچھے ایبٹ آباد پہنچنے والے تھے۔ دارین نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اگر اسے اظہر انکل کے گھر کا ماحول پسند نہ آیا تو وہ بھی انہی کے ساتھ ہوٹل میں رہنے کو ترجیح دے گا۔

☆☆☆

"جی بیٹا پہنچ گئے تم؟" باقر صاحب کو دارین کی طرف سے کال آ رہی تھی۔ انہوں نے جلدی سے اٹینڈ کی۔

"جی بابا...... ایبٹ آباد پہنچ گیا تھا دو بجے...... ابھی آپ کے بتائے پتے پر یہاں کالونی آیا ہوں۔ اظہر انکل کا نمبر مجھ سے مس ہو گیا ہے۔ تھوڑا سا گائیڈ کر سکتے ہیں؟ یا پھر ان کا نمبر......"

"اپنی لوکیشن بتاؤ تو میں سمجھاتا ہوں۔"

"جی۔" دارین نے انہیں تفصیل سے بتانا شروع کیا اور بابا نے فوراً ہی بڑی سہولت سے اسے راستہ سمجھا دیا۔ دارین یہاں لاہور سے اپنی کار میں آیا تھا، اس کے بابا چاہتے تھے، ایبٹ آباد میں موومنٹ کے لیے اسے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔

اور اس وقت وہ اظہر علی کے گھر ان کی نیم پلیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ پہلی مرتبہ میں گاڑی کا ہارن دے کر کسی کو بلانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے کار سے نکل آیا۔ دھوپ کا چشمہ اتار کر بال درست کرتے اس نے ڈور بیل بجائی اور دیر تک بجائی لیکن کوئی آتا دکھائی نہیں دیا تو دروازہ بجانے کے لیے ہاتھ گیٹ پر رکھا لیکن ہاتھ رکھنے سے گیٹ ہلکا سا وا ہو گیا اور سامنے پورچ دکھائی دینے لگا...... دائیں ہاتھ پر لان اور پورچ کے اینڈ پر گھر کا اندرونی دروازہ جو کہ یہاں سے کافی دور تھا پھر بھی دارین نے گیٹ کو دو تین مرتبہ ہاتھ سے بجایا لیکن کوئی رسپانس نہ ملنے پر گیٹ کو تھوڑا اور کھولا۔ پورچ خالی تھا اور اندرونی دروازہ بند تھا۔ دارین نے سوچا آگے بڑھ کر اگلا دروازہ بجا لیا جائے۔ پھر نیم پلیٹ سے ظاہر تھا کہ وہ درست پتے پر آیا ہے۔ گلا کھنکھار کر اندر داخلی دروازے تک آیا۔

"میرے منع کرنے کے باوجود تم نے میری چیزوں کو ہاتھ کیسے لگایا، جاہل، بے وقوف...... میرا انکار نہیں کر سکتی تھیں۔" ایک چیختی ہوئی سی غصیلی آواز ذرا دور کہیں سے اچانک سنائی دی تو دارین کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ آواز اندر کے بجائے یہیں کہیں باہر سے آ رہی تھی۔ اس نے تھوڑا سا پیچھے ہو کر دائیں طرف لان میں دیکھا۔ لان کے انتہائی کونے میں نہ جانے کس سمت سے نکل کر دو خواتین اب ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ دارین اس وقت لان کی فینس کے قریب تھا اس لیے اس کا صرف سر دکھائی دے سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں جب وہ خواتین

پلٹ کر کر اِدھر دیکھتیں، دارین کو البتہ وہ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''وہ بی بی جی مجھے لگا آپ فارغ نہیں ہیں۔''
سامنے کھڑی لڑکی نے مجرموں کی طرح سر جھکایا اور دارین نے لفظ ''بی بی جی'' پر ٹھوک لگا۔ بقول امی کے اس گھر میں چھوٹی بی بی تو ایک ہی ہے۔ دارین نے آنکھیں پھیلا کر سر سے پیر تک بی بی جی کو دیکھا اس کے پھیکے آسمانی انتہائی بورنگ ڈریس سے اچھے کپڑے تو سامنے کھڑی خادمہ کے تھے۔ بالوں کا کھینچ کر عام سا جوڑا بنائے کسی قسم کی آرائش سے مکمل عاری کچھ سڑیل سا امپریشن دیتا وہ چہرہ ''خوابوں کی ارسلہ'' جیسا بالکل نہ تھا۔

''بڑی بی بی جی ناں، کوئی دنیا سے تو نہیں اٹھ گئی تھی۔ دفع ہو جاؤ اب تم ہاتھ توڑ دوں گی آئندہ اگر میری ایک بھی چیز اِدھر سے اُدھر کی۔''

''جی بی بی ......'' لڑکی فوراً ہی بھاگ کھڑی ہوئی اور بی بی جی کے عین اپنے سر پر پہنچ جانے کے خوف سے دارین نے بھی جلدی سے دروازہ بجا لیا۔

''جی......؟'' اندرونی دروازہ ایک مہکتی سی خوشبو لیے کھلا اور مدھر آواز نے دارین کے کانوں میں رس گھولا اس کی نظروں نے سفید پیروں اور گلابی پیراہن سے اوپر کا سفر کرتے رخِ روشن تک رسائی حاصل کی۔

واللہ......رخِ زیبا کی تازگی لباس کے گلابی پن پر حاوی ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ گھنی پلکیں پٹپٹاتی معصوم صورت حسینہ کچھ، کچھ بدحواسی کا تاثر لیے اسے گھور رہی تھی۔

''جی اظہر انکل ہیں؟ میں دارین رضا۔'' اس نے دو، دو حسینوں کی موجودگی پر امڈ آتی اپنی کنفیوژن پر بدقت قابو پاتے اپنا تعارف کروایا اور دارین کا نام آتے ہی لڑکی کے لبوں پر نرم سی شرمیلی مسکراہٹ آ گئی۔

''آیئے......'' اس نے راستہ چھوڑا اور دارین اندر داخل ہو گیا۔

سامنے لاؤنج کے صوفے پر ایک خاتون براجمان تھیں، دارین کو لگا وہ ضرور کبھی ان کے ہاں آئی ہوں گی بھی دیکھی بھالی سی لگیں۔

''السلام علیکم۔'' دارین نے ہلکا سا سر خم کیا۔
''دارین بیٹا، آؤ آؤ۔'' انہوں نے باقاعدہ اٹھ کر اسے ویلکم کیا۔
''گھر ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''
''جی نہیں آنٹی، بابا کال پر موجود تھے۔ ساتھ، ساتھ گائیڈ کرتے گئے۔''
''اچھا آؤ بیٹھو، تمہارے اظہر انکل بھی بس آتے ہی ہوں گے۔''

''آنٹی میں اپنی گاڑی اندر لے آؤں، وہ باہر۔''
''ارے ہاں، ہاں...... اصل میں ڈرائیور نہیں ہے، ورنہ وہی لے آتا۔'' آنٹی کا لہجہ معذرت خواہانہ سا تھا۔ دارین نے باہر آ کر اپنی گاڑی پورچ میں لگائی، سامان باہر نکال کر وہیں پورچ میں رکھا تب تک آنٹی اور وہ ویلکم کہنے والی پنک پری بھی باہر آ گئیں۔

''ماجدہ...... یہاں آنا۔'' انہوں نے اونچی آواز لگائی تو لان کی دائیں سمت سے وہی لڑکی آتی دکھائی دی جو ذرا دیر پہلے ہی اپنی مالکہ کی ڈانٹ کھا رہی تھی۔

''ماجدہ بیٹا، یہ بھائی کا سامان آؤٹ ہاؤس میں رکھ دو۔''

''آنٹی میں خود رکھ لیتا ہوں۔'' دارین شرمندہ سا ہو گیا۔ ''اتنا بھاری سامان اور ایک لڑکی۔''
''ارے نہیں بیٹا، وہ کسی کی مدد لے لے گی۔ تم اندر آؤ۔ چائے تیار ہے۔'' وہ اسے دوبارہ لاؤنج میں لے آئیں۔

''میں تو چاہتی تھی کہ تم یہیں ہمارے ساتھ ہی رہتے، اتنا بڑا گھر ہے، غیروں کی طرح گیسٹ روم کی بھلا کیا......''

''کوئی بات نہیں آنٹی، ویسے بھی مکمل تنہائی میرے پڑھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔''
''ہاں یہ تو ہے۔ ویسے آؤٹ ہاؤس بھی گھر کا حصہ ہے۔ یہاں وہاں میں کوئی فرق نہ رکھنا۔'' وہ گلابی ڈریس والی پیاری لڑکی اس دوران چائے لے آئی۔ دارین نے ایک نظر اس پر ڈالی تو وہ اسے ہی دیکھ رہی

تھی...... نظریں ملنے پر جھینپ کے مسکرائی اور دارین تو جواباً مسکرا بھی نہ سکا کہ کنفیوژن ابھی باقی تھی۔ ابھی ابھی وہ دوسری بدمزاج بی بی بھی اندر آ کر بیٹا دارین یا کسی اور کو خاطر میں لائے ماتھے پر ناگواری کا بل ڈالے کہیں اندر چلی گئی تھی۔ گلابی ڈریس والی بھی چائے کے دوران وہیں بیٹھی رہی۔

''ارسلہ بیٹا دارین کو آؤٹ ہاؤس میں لے جاؤ، تھوڑا آرام کرلے۔'' آنٹی نے نرم مسکراہٹ سے گلابی ڈریس والی کو مخاطب کیا تو دارین کے خطا اوسان بحال ہی نہیں شاد و آباد بھی ہو گئے۔ ''خوابوں کی ارسلہ'' حقیقت بن چکی تھی اور آس پاس گھومتا وہ وہم، اُف۔ دارین نے اس جلی سڑی کے تصور سے لاحول پڑھا۔

''جی آیئے۔'' وہ آداب میزبانی نہایت خوش اسلوبی سے نبھاتی آگے، آگے چلنے لگی۔ دونوں باہر لان میں آئے اور اسی سمت میں چلنے لگے جہاں سے کچھ دیر پہلے وہ لڑکیاں نمودار ہوئی تھیں۔ لان کے اختتام پر بائیں ہاتھ کو ایک گلی نما راستہ جاتا تھا جس میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر ایک دروازہ تھا، ارسلہ اس دروازے کو کھول کر اندر آ گئی۔ یہ ایک چھوٹا اور سادہ سا گھر تھا۔ جس میں ایک چھوٹا سا لان، سامنے رخ پر ایک برآمدہ اس میں ایک بڑی کمرے کی ایک بڑا دروازہ اور دائیں ہاتھ پر ایک اور دروازہ دکھائی دے رہے تھے۔ لان میں گھنے درختوں کی قطار تھی جس کی بدولت یہ چھوٹا سا گھر سائے میں ڈھکا چھپا عجیب پُراسرار سا دکھائی دیتا تھا۔ ارسلہ دروازہ کھول کر اسے اندر لے آئی۔ یہاں ایک لاؤنج، سامنے دکھائی دیتے دو کمرے، بائیں ہاتھ پر اوپن کچن اور دائیں طرف شاید اسٹور روم تھا۔

''دراصل یہ ایک بنا بنایا مکان تھا جو میرے بابا نے خرید لیا تو ہم نے اندر سے راستہ دے کر اسے آؤٹ ہاؤس کا نام دے دیا۔''

''بہت پُرسکون جگہ ہے۔'' وہ واقعی ایک دلی تسکین سی محسوس کرتے طمانیت سے مسکرایا۔

''امید ہے آپ یہاں آرام محسوس کریں گے۔''

''بے شک...... یہاں کا سکون بتاتا ہے۔'' دارین گھر کی صفائی اور نفاست کو ستائشی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

''او کے دارین، آپ ریسٹ کریں۔'' اس نے مسکرا کر اجازت چاہی۔

''شکریہ ارسلہ......'' دارین نے بھی اسی کے انداز میں پہلی مرتبہ اس کا نام لیا اور دونوں ہی لطیف سا ہنس دیے۔

''انکل آجائیں تو ضرور بتایئے گا۔ میرا دن کو سونے کا کوئی پروگرام نہیں ہے، میں آپ کو جاگتا ہی ملوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرا کر سر ہلاتی واپس پلٹ گئی اور دارین نے بھی توجہ اپنے سامان اور اس کی سیٹنگ کی طرف لگائی۔ نہ صرف جگہ بلکہ یہ سب لوگ بھی اسے بہت پسند آئے تھے۔ دل و دماغ نے مختصر دورانیے میں ہی اجنبیت رخصت ہوتی محسوس کی۔ ایک ماہ یہاں کے پُرسکون ماحول میں امتحان کی تیاری یقیناً ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہونے والی تھی۔ دارین نے اپنا بوجھ کچھ وقت سے پہلے ہی کم ہوتا محسوس کیا۔

☆☆☆

باہر کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا تھا۔ اس نے کتاب سے سر اٹھا کر بے ساختہ پیچھے دیکھا، لیکن کوئی نظر نہیں آیا تو اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ پڑھنے لگا، یہ رات کے کچھ دس بجے کا وقت تھا... اطہر انکل سے رات کے کھانے پر ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ بھی مزاجاً بڑے خوش اخلاق تھے۔ گپ شپ کرتے اس کے ساتھ ہی آؤٹ ہاؤس میں آ گئے تھے۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر کا حال احوال کیا اور پھر وہ اسے آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔ لیکن دارین پہلے دن سے ہی پڑھائی شروع کرنے کی نیت کرتے اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ سفر کا تھکا ہوا تھا پر دل میں سوچا جب تک نیند غالب نہیں آتی پڑھ لینے میں کیا حرج ہے۔

لیکن پھر دوسرا کھٹکا...... اس بار وہ کتاب ہاتھ میں لیے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے یہاں کا مین ڈور بند کر کے سب لائٹس آف کر دی تھیں۔ کھٹ پٹ

کی آواز اس چھوٹے کمرے کی طرف سے آ رہی تھی جسے اس نے اسٹور روم سمجھا تھا لیکن کھول کر دیکھا اب تک نہیں تھا۔ نزدیک آنے پر یہ یقین بھی ہو گیا کہ آواز اس کا وہم نہیں تھی۔ اس نے باہر کی کنڈی کھول کر ایک دم سے دروازہ پورا کھول دیا اندر اندھیرا تھا اور شاید ہلکی روشنی بھی۔ دارین سمجھنے کی کوشش میں تھا جب کسی کے دوڑنے کی آواز پر وہ اس کمرے کے پورا اندر آ گیا۔ اس چھوٹے کمرے میں ایک اور دروازہ تھا جو کہ باہر لان میں کھل رہا تھا۔ وہ اس وقت پورا کھلا ہوا تھا دارین اس دروازے میں آیا تو دوسرے دروازے سے وہ لڑکی باہر نکلتی نظر آئی۔

دارین نے اسے صاف، صاف پہچانا تھا۔ وہی بدمزاج نُزہل...... دارین کے حلق میں خوف سے کچھ پھنسا...... اس نے اسٹور روم کی لائٹ آن کی، چھوٹے سے اس کمرے میں اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں اور لکڑی کی ایک الماری، کچھ چھوٹا موٹا پرانا سامان...... دارین کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ لڑکی یہاں کیا کر رہی تھی...... کہیں وہ چھت سے نیچے تو نہیں آ رہی تھی۔ لیکن رات کے اس وقت...... کہیں وہ کوئی بھوت ووت تو نہیں......

رات کے وقت ایسی ایک نہ سمجھ آنے والی صورت حال میں دارین کی سوچ مذاق پر مبنی ہرگز نہ تھی۔ اسے خیال آیا کہ گھر میں کسی نے بھی اب تک اس سے تعارف نہیں کروایا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ یہاں کسی کو دکھائی ہی نہیں دیتی، اکثر بھوت ایسے بھی سنے ہیں جو کسی کسی کو دکھائی دیتے ہیں...... نہیں نہیں...... دارین کو اس کی ماجدہ (ملازمہ) سے لڑائی کا سین یاد آیا۔

شاید مجھے اور ماجدہ کو دکھائی دیتی ہو۔ اس نے ملے جلے خیالات کے ساتھ جلدی سے پہلے اسٹور روم کا لان والا دروازہ اندر سے بند کیا، ایک خوف بھری نگاہ سیڑھیوں پر ڈالی اور اسٹور روم سے نکل کر اس کی باہر سے کنڈی لگا دی...... پڑھائی میں بھی اب کہاں دل لگنا تھا۔ اس نے اپنا کمرا اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے کمبل میں دبک جانے میں عافیت جانی...... اور وہ تو خیر رہی کہ وہ ایک لمبے سفر کا تھکا ہوا تھا کہ نیند نے جلد آلیا ورنہ ایسی سرگرمی نیند تک اڑا لیا کرتی ہے۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ دارین، جلدی جاگ گئے آپ۔''

وہ قریب آٹھ بجے فریش ہو کر اپنے پورشن سے نکل کر اظہر انکل کے بنگلے میں داخل ہوا تو لان میں ارسلہ پھول چنتی نظر آئی۔ ہلکے فیروزی اور پیلے سے کپڑوں میں وہ بے حد فریش نظر آ رہی تھی۔

''جی میں رات کو جلدی سو گیا تھا۔'' دارین کو رات والی بھوتنی کا خیال آ کر گزر گیا۔ اب کس سے اس کے بارے میں پوچھے۔ کوئی مناسب سوال نہیں سوجھا۔

''نئی جگہ پر بے چینی تو نہیں ہوئی، اکثر جیسے......''

''نن...... نہیں، ایسے مسائل کا بالکل شکار نہیں ہوں۔'' وہ ہنس دیا۔

''آج کا کیا پلان ہے؟'' وہ اس کے ساتھ، ساتھ واک کے انداز میں چلنے لگی۔

''بس ناشتے کے فوراً بعد سے ہی پڑھنے کا شیڈول ترتیب دینا ہے۔ آں...... ہاں۔'' دارین کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ''شام کو کچھ دوست یہاں ایک ہوٹل میں آ رہے ہیں۔ مہینے بھر کے لیے انہوں نے ایک روم بک کیا ہے۔''

''اچھا؟'' ارسلہ حیران ہوئی۔ ''کیا اسٹڈی کے لیے؟''

''جی، دراصل ارادہ میرا بھی یہی تھا کہ اگر اظہر انکل کے ہاں ماحول پڑھائی کے لیے مناسب نہ لگا تو کسی بہانے سے نکل جاؤں گا۔'' اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا تو ارسلہ کا کھنکتا ہوا قہقہہ بلند ہوا۔

''آج بھی ہوٹل کا ماحول دیکھنے تو نہیں جا رہے؟''

''ہاہاہا...... بالکل نہیں۔'' دارین محظوظ ہوا۔ ''انہیں چونکہ میری یہاں آمد کا علم ہے تو باقاعدہ پر اس لے کر اجازت دی گئی کہ جب تک ہم سب یہاں ہیں، ملنا ملانا جاری رکھیں گے۔''

''چلیں پھر ناشتا کر لیں۔'' ارسلہ نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو دارین نے ہاتھ سے آگے چلنے کا

اشارہ کیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے اندر کی طرف بڑھنے لگے تبھی دارین کے موبائل پر امی کی کال آنے لگی۔

"جی امی السلام علیکم۔" دارین نے بشاشت سے آغاز لیا، ارسلہ ایک نظر دیکھ کر مسکرا دی۔

"جی جاگ گیا تھا کچھ آدھا گھنٹہ پہلے۔"

"ارے نہیں امی، اب تو الارم لگا کر سونا ہے روزانہ سونے کے لیے اب بس رات کے چھ سات گھنٹے۔ لمبی نیندیں اب ان شاء اللہ ٹیسٹ کے بعد......"

"جی بالکل ٹھیک......" دارین ان کی بات سن کر کچھ دیر چپ ہوا، وہ ارسلہ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ جو کہ اس وقت اس کے مقابل چل رہی تھی۔

"لیں بات کریں خود ہی۔" اس نے ماں کو حیران کرنے کے لیے موبائل ارسلہ کی طرف بڑھایا تو جہاں ارسلہ گڑبڑا سی گئی وہاں موبائل کی دوسری جانب عارفہ بیگم کا منہ بھی کھل گیا۔ ان کا بیٹا تو کچھ زیادہ ہی فاسٹ نہیں نکلا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی۔" ارسلہ نے شرما کر آغاز لیا اور عارفہ بیگم اندر تک سرشار ہو گئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

"کیسی ہو ارسلہ بیٹی؟"

"جی آنٹی اللہ کا شکر، آپ سنائیں طبیعت کیسی ہے؟" وہ دونوں اب لاؤنج میں آ گئے تھے۔ اظہر انکل اور سعدیہ آنٹی پہلے سے ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ ماجدہ ناشتا سرو کر رہی تھی۔ دارین کی متلاشی نگاہیں چوروں جیسی اردگرد منڈلا کر واپس آ گئیں۔ بھوتنی کہیں دکھائی نہ دی۔ امی سے اجازت لے کر اس نے سب کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ میں ناشتا کیا۔ اظہر انکل ناشتے کے فوراً بعد اجازت لے کر ڈرائیور کے ساتھ کہیں باہر چلے گئے۔ ارسلہ اسے اسٹڈی روم دکھانے لے آئی۔ اظہر انکل کی ترتیب دی وہ ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔

"کبھی اگر اپنے کمرے میں پڑھتے، پڑھتے اکتاہٹ ہونے لگے تو فار اے چینج آپ یہاں آ کر پڑھ سکتے ہیں۔"

"گڈ آئیڈیا...... مجھے بھی نیند سے چھٹکارے کے لیے جگہیں بدلنے کی عادت ہے۔" دارین ایک بک شیلف کی طرف بڑھا۔

"آپ ویسے کیا کرتی ہیں؟"

"جی گریجویشن کمپلیٹ کیا ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے ایگزامز ہوئے ہیں۔ آج کل بالکل فری ہوں۔"

"اچھا ماشاء اللہ......" دارین کی توجہ بکس نے لے لی تھی۔

سفرنامے، تاریخی ناول، انگلش لٹریچر، اور شاعری بھی۔

"واؤ...... انکل تو بڑا زبردست ذوق رکھتے ہیں۔"

"ابو کا ذوق جاننا ہے تو آپ کو ان ریکس کی طرف آنا ہوگا۔" وہ ہنس کر اسے متوجہ کرنے لگی۔ دارین کچھ اچنبھے میں پڑا پھر اس کے ہاتھ کے اشارے کی سمت آ گیا۔ مذہب، سیاست، جغرافیہ، معلومات عامہ، ڈکشنریز وغیرہ کی لمبی لائنیں لگی تھیں۔

"اچھا...... تو پھر وہ کارنر......؟" دارین نے اس ٹیکس کلیکشن کی جانب اشارہ کیا اور پلٹ کر واپس وہیں آ گیا۔

"جی یہ میرا شوق ہے......" اس نے شرما کر اقرار کرتے احمد ندیم قاسمی کی "کپاس کا پھول" نکال لی۔ "آج کل یہ زیر مطالعہ ہے۔"

"زبردست...... کمال ہے۔" اس نے انتظار حسین کی "نیا گھر" ریک سے کھینچی۔

"یہاں میرے مزاج کی اتنی چیزیں ہیں کہ ایگزامز نہ ہوتے تو یہاں سے نکلتا ہی نہیں تھا۔"

"تو پھر آپ کو اجازت ہے کہ تیاری مکمل کرنے کے بعد آپ جاتے ہوئے یہ سب بکس یہاں سے لے جاسکتے ہیں۔"

"واہ...... بکس کی شیدائی اور اتنی فیاض...... ہمارے ہاں تو حاتم طائی جیسی سخاوت والے بھی کتابوں کے معاملے میں بخیل نمبر ون ہوتے ہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے پھر آپ کے ہاں آنا ہوا تو کتابیں بالکل نہیں مانگیں گے۔" وہ شرارت سے ہنسی

اور دارین ایک لطیف سا جملہ بولتے، بولتے رہ گیا۔ نظر اچانک وال کلاک پر پڑی۔ نو بج چکے تھے اور اس نے پڑھائی کا شیڈول بنا کر باقاعدہ تیاری شروع کرنا تھی اور پہلے ہی دن انتالیٹ۔

''او کے، فی الحال تو پڑھائی کر لیتے ہیں۔ البتہ بوریت محسوس ہونے پر آپ مجھے یہاں پائیں گی۔''

''جی ضرور آیئے۔'' وہ اس سے پہلے ہی باہر آ گئی اور وہ تیز قدموں سے اپنے پورشن میں آ گیا۔ حسیب اور علی اپنے ایک تیسرے دوست کے ساتھ آج سہ پہر ایبٹ آباد پہنچ رہے تھے۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے پر دارین نے سعدیہ آنٹی کو بتایا کہ آج رات کے کھانے پر وہ اس کا ویٹ نہ کریں۔ وہ اپنے دوستوں سے ملنے ہوٹل جائے گا اور واپسی بھی کچھ دیر سے ہوگی۔ دراصل اس نے ارادہ کیا تھا کہ حسیب وغیرہ کے لیے رات کا کھانا کسی ہوٹل سے پیک کروا کے لے جائے گا۔ آج یہاں ان کا پہلا دن تھا۔ یقیناً بیچارے تھکے ہوئے پہنچے۔

''اوہ اچھا، ویسے ہم بھی آج رات ایک دعوت میں مدعو ہیں۔ یہاں کالونی میں میری ایک دوست کی بچی کی مہندی ہے۔ میں سوچ رہی تھی ارسلہ کو گھر چھوڑ جاؤں گی۔ ورنہ تم کیا کرو گے رات کے کھانے کا، ماہدہ دوپہر کو اپنے گھر چلی جاتی ہے۔''

''ارے نہیں آنٹی، میری وجہ سے اپنے معمولات متاثر نہ کیا کریں اور کھانے کے متعلق تو بالکل ہی بے فکر ہو جائیں۔ شام کا وقت تو میں اکثر ہی ایبٹ آباد گھومنے نکل جایا کروں گا۔''

اور اب وہ تکے کباب، روسٹ، رائس اور تندوری روٹیاں لیے دوستوں کے پاس ہوٹل پہنچا تھا۔ دوست تو اس کی زبردست مہمان نوازی پر اش اش کر اٹھے تھے۔ گھنٹا بھر کی گپ شپ میں دارین کا موڈ بھی ایک دم تر و تازہ ہو گیا تھا۔ آج سارا دن ہی وہ آؤٹ ہاؤس کے کمرے میں گھسا پڑھائی کرتا رہا تھا۔ اور پہلے دن کی تسلی بخش پڑھائی نے اسے مزید اطمینان دیا تھا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ مطلوبہ ہدف وہ وقت سے بہت پہلے حاصل کر لے گا۔

''یار موسم کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔'' علی ٹرے میں قہوہ لے کر اندر آیا تو مخاطب بھی دارین کو کیا کیونکہ نکلنا تو ایک اسی کو تھا۔

''اچھا؟'' اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا، واقعی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ آسمان گہرے بادلوں سے مکمل ڈھک گیا تھا۔

''آثار تو کچھ تیز طوفانی بارش کے ہیں۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''اچھا یار نکلتا ہوں، ورنہ انکل پریشان ہوں گے۔ تیز بارش شروع ہو گئی تو مجھے راستہ ہی سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' دو گھونٹ قہوے کے پی کر وہ فوراً ہی باہر نکل آیا...... اب بھی وہ پوچھتے پوچھتے ان کے ہوٹل تک پہنچا تھا۔ راستے یاد کرنے میں کچھ وقت لگنا تھا۔ وہ بارش سے پہلے گھر پہنچنا چاہتا تھا لیکن سفر ابھی آدھا طے کیا کہ ہلکی بارش اسٹارٹ ہو گئی، یہ البتہ عافیت رہی کہ اب وہ جانے پہچانے راستے پر چڑھ چکا تھا۔ اور کچھ ہی دیر میں جب بارش کچھ مزید تیز ہو چکی تھی وہ گھر کے گیٹ پر موجود تھا۔ اور یہاں پہنچ کر پہلی مرتبہ یاد آیا کہ آنٹی وغیرہ نے تو کہیں فنکشن میں جانا تھا، وہ سوچ میں تھا کہ معلوم نہیں کوئی گھر پر ہے بھی یا نہیں کہ حشمت چاچا نے گیٹ کھول دیا۔ اس نے اپنی کار پورچ میں روکی، انکل کی کار موجود نہیں تھی مطلب وہ لوگ ابھی فنکشن میں ہی تھے۔ وہ کار سے نکل کر پورچ میں ہی رک گیا۔ اپنی سائڈ پر جانے کے لیے لان سے گزرنا پڑتا اور ابھی تو تیز بارش پڑ رہی تھی۔ حشمت چاچا گیٹ بند کر کے تیزی سے کہیں غائب ہو گیا تھا کیونکہ بارش سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ پورچ سے بائیں ہاتھ کے برآمدے میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ پہلے اس کی نظر ہی نہیں پڑی تھی۔ یہاں برآمدے میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بھوتنی...... مجسم بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔

دارین نے اس کے اتنے قریب موجود ہونے پر تھوڑا سا خوف بھی محسوس کیا...... گھر کی واحد پُراسرار شخصیت بالآخر اس بھیانک موسم اور تنہائی میں اس کے مقابل آہی گئی تھی۔ دارین نے آج اپنے ڈر سے مقابلے کی ٹھانی، ایک نظر لڑکی کی طرف دیکھا جو نروس سی ہو کر بلاوجہ پاس رکھی کتابوں کو چھیڑنے لگی۔

"ایکسکیوز می...... وہ اندر کوئی ہے؟" دارین نے ہمت کر کے سوال سوچا اور لڑکی کا سر نفی میں ہلا۔

"جی نہیں۔"

"آ...... آپ...... اکیلی؟" دارین کو یقین سا ہونے لگا کہ وہ کسی اور مخلوق سے ہمکلام ہے، گھر والے آخر کیوں اسے اکیلا چھوڑ گئے۔

"حشمت چاچا ہیں ناں اپنے کوارٹر میں......"

اس نے سر جھکائے، جھکائے ہی جواب دیا۔ اور دارین کی نظر لائٹ میں دکھائی دیتے اس کے سائے پر پڑی۔

"روحوں شوحوں کے تو سائے نہیں ہوتے۔" غالباً یہ بھی کہیں پڑھا تھا۔

"ایکچوئلی میں اپنے پورشن میں نہیں جا سکتا، جب تک بارش کم نہیں ہوتی۔" دارین نے اپنی وہاں موجودگی کی وضاحت پیش کی اور اس نے بنا کوئی ردعمل دیے نظریں کتاب پر لگائے رکھیں۔ اور دارین نے پہلی مرتبہ اس کتابوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ وہ ایک کتاب ہاتھ میں لیے اور کچھ چار پانچ کا بنڈل سامنے میز پر لیے بیٹھی تھی۔

"کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ جاؤں؟" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی......!" اس نے روکھے سے انداز میں اجازت دی اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

"مس، کیا میں آپ کا تعارف لے سکتا ہوں؟ دو ایکچوئلی میں آپ کو کوئی دوسری مخلوق سمجھ کر دو دنوں سے ڈرتا رہا ہوں تو......"

"جی......؟" وہ اٹھنے کا ارادہ موقوف کرتے حیرت زدہ سی واپس بیٹھ گئی۔ عجیب صاف گو آدمی تھا۔

"آئی ایم سوری...... لیکن یہاں کسی نے باقاعدہ انٹروڈکشن نہیں کروایا۔ پھر پچھلی رات آپ چھت سے اتر کر......"

"چھت......؟ او...... نہیں، نہیں۔" وہ ایک دم بوکھلائی۔ "میں چھت سے نہیں آرہی تھی۔ میں تو یہاں سے اندر جانے کی کوشش کر رہی تھی......" وہ جلدی سے بول تو گئی لیکن پھر لب دبا لیے۔

"آئی ایم سوری، مجھے اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کو کافی پریشانی ہوئی شاید......"

"زیادہ نہیں، بس شک، یقین میں بدلنے لگا۔" وہ مسکراہٹ روک کر بولا۔

"یہ میرے ماموں کا گھر ہے، میں کوئی بھوت ووت نہیں۔" وہ خفا ہو کر اپنا تعارف کروانے لگی۔

"مطلب اظہر انکل آپ کے ماموں ہیں؟"

"جی......!"

"آپ چاہیں تو دن کی روشنی میں آسکتی ہیں وہاں...... آپ کو شاید کچھ کام تھا اُدھر......"

"میرا کچھ سامان وہاں رہ گیا تھا۔" ماجدہ نے مہلت نہیں دی۔

"آپ کا سامان وہیں رہتا ہے...... آؤٹ ہاؤس میں؟" دارین نے جاننا چاہا اور وہ پہلے تو متعجب سی دارین کو دیکھنے لگی پھر ایک دم مسکرا دی اور ایسے کہ دیر تک بھی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا ساتھ نہ چھوڑا جبکہ دارین کے لیے یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ وہ ہنسی تو جیسے بدمزاج، سڑیل، روکھی جیسے خطابات جھڑ جھڑ کر گرنے لگے۔ وہ آج بھی تھکے ہوئے کاسنی اور سفید سے بدمزہ کپڑوں میں سفید دوپٹا اوڑھے اول دن جیسی ناگوار ہی لگ رہی تھی لیکن مسکرانے پر شاید پہلی مرتبہ دارین نے اس کو ظاہری حلیے سے الگ کر کے دیکھا۔ اس کے بھی نقوش اس کی ہنسی کی طرح پُرکشش اور جاذب نظر تھے لیکن کوئی اسے پہلی نظر میں دل نہیں دے سکتا تھا...... شاید اسے خواہش ہی نہیں تھی، کبھی اپنا پیارا روپ۔

"آپ ہنسیں کیوں...... میں نے شاید کچھ غلط کہہ دیا۔" دارین کے لیے اس کی ہنسی سمجھ سے باہر تھی۔

''سوری، مجھے اصل میں آؤٹ ہاؤس پر ہنسی آئی لیکن بہت پیارا نام ہے۔ساؤنڈز گڈ۔'' وہ تائید میں سر ہلاتے مسکرا رہی تھی۔ جبکہ دارین نے کندھے اچکائے۔

''مطلب......؟''

''وہ ہمارا گھر ہے ناں، تو کافی کچھ وہیں رہ گیا تھا، بس ممانی نے کہا اِدھر شفٹ ہونا ہے لیکن میری سستی آڑے آگئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مہمان نے اتنی جلدی آنا ہے۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں تقریباً سب کچھ لے آئی ہوں۔'' وہ بولنے پر آئی تو پورا منہ ہی پھاڑ دیا۔ اور انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس کے نزدیک دارین کو بھی یہ سب پتا ہے۔

''ہوں...... آپ کا نام......؟'' دارین نے اتنا کچھ جان لینے پر بھی رویہ نارمل رکھا۔

''میرب فاطمہ۔'' اس نے فوراً بتایا۔ ذہنی طور پر اب وہ ریلیکس نظر آرہی تھی۔

''نائس نیم....'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ''تو میرب آپ کے گھر میں اور کون، کون ہوتا ہے؟''

''جی امی کے بعد بس میں۔'' وہ کچھ اداس ہوگئی۔

''اوہ......آپ کی امی؟''

''جی ان کا دو سال پہلے انتقال ہوگیا۔ ہم ابو کی وفات کے بعد کافی سالوں سے یہیں رہتے ہیں۔''

''آپ کا اپنا گھر ہے؟'' دارین نے لہجہ سرسری رکھا۔

''جی نانا کی جائداد میں سے امی کو ملا تھا۔''

''ہوں.... کیا پڑھ رہی ہیں ویسے؟'' دارین نے اپنا دھیان بدلنے کو ایک کتاب اٹھائی۔ فیض احمد فیض کا ایک شعری مجموعہ تھا، شاید اس نے صبح لائبریری میں بھی دیکھا تھا۔

''آج آپ کا سونے کا ارادہ نہیں ہے یا رینٹ پر لی ہیں کتابیں؟'' اس نے اوپر سے نیچے تک بکس کی جانب اشارہ کیا تو وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

''جی ایسی بات نہیں ہے.... بس ذرا اوور ایکسائٹڈ ہوگئی۔''

''یعنی......؟'' وہ پھر نہیں سمجھا۔

''اصل میں یہ ساری بکس ماموں کی لائبریری میں نئی آئی ہیں، مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کون سی پڑھوں کون سی چھوڑوں اور ابھی فری بھی کافی ٹائم کے لیے تھی تو جو ہاتھ لگیں اٹھالائی۔''

''ہوں صحیح......'' دارین ایک مرتبہ پھر تبصرہ محفوظ رکھتے ایک ایک کر کے سبھی بکس کو دیکھنے لگا، البتہ جوں جوں دیکھتا جارہا تھا اندرونی کیفیت میں بدلاؤ آتا جارہا تھا۔ یہ سبھی بکس وہ تھیں جو آج صبح ارسلہ نے یہ کہہ کر دکھائی تھیں کہ یہی اس کی پسند اس کا ذوق ہے۔

''مطلب یہ سبھی بکس نئی ہیں؟''

''جی......'' اس نے کچھ پڑھتے، پڑھتے جواب کی مہلت نکالی۔

''اور لگتا ہے سبھی آپ کے ذوق کی ہیں۔''

''جی، ادب سے کسے دلچسپی نہیں ہوگی۔''

''کمی نہیں ہے جی، ایسے باذوقوں کی جو صرف نمائش کے لیے ریکس کو ادب سے سجاتے ہیں۔'' وہ اپنے اندر کی بھڑاس کو روک نہیں پایا، میرب نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ دراصل اسے بھی بالکل اندازہ نہیں تھا کہ لائبریری میں ان بکس کی آمد کا کچھ خاص مقصد تھا۔

''بارش رک چکی ہے۔'' میرب نے باہر کی طرف اشارہ کیا تو دارین نے بڑی دیر بعد حیرت سے اُدھر دیکھا۔ میرب اس دوران اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اس نے بھی اندر جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔

''آپ سے مل کر اچھا لگا میرب۔'' دارین نے صاف گوئی سے کہہ دیا جبکہ وہ خاموشی سے کتابیں اٹھانے میں لگی رہی۔

''صحبت خلافِ مزاج ہو تو سوائے موسم کے کوئی موضوع نہیں سوجھتا۔ اور ساتھی ہم مزاج ہو تو موسم کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا اور میرب نے بالکل ان سنا کرتے فوراً اندر کی راہ لی۔ دارین البتہ سوچتی نگاہوں سے دیر تک اس سمت میں

دیکھتا رہا، اس کے چلے جانے کے باوجود......!

☆☆☆

''ایکسکیوزمی......'' شوخ، کھنکتی آواز کے ساتھ دروازے پر ہلکی سی ناک کرکے بھی متوجہ کیا گیا۔ دارین نے چشمہ اتارا اور کتاب ہاتھ میں لیے دروازے پر آیا، سامنے ہی ارسلہ ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''اجازت ہے......؟''

''جی جی آیئے......'' اس نے لاؤنج کی میز کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں براؤن صوفہ اور شیشے کی میز رکھے تھے۔ دارین نے بڑی ونڈو سے پردے ہٹائے۔ سہ پہر کے چار، پانچ کے درمیان کا کچھ ٹائم تھا۔

''ایک ماہ کی پڑھائی ہفتے بھر میں کرلینا چاہتے ہیں؟'' وہ صوفے پر بیٹھ کر اب چائے بنانے لگی تھی۔

''کیا کریں، بھئی اب جس مقصد کے لیے آئے ہیں وہ تو پورا کرنا ہے ناں۔'' اس نے چائے کا کپ اٹھایا، طبیعت واقعی بہت سست ہو رہی تھی۔ چائے بڑے صحیح وقت پر میسر آئی تھی۔

''جی بالکل لیکن کچھ ٹائم ہمیں بھی دیں، باہر نکلیں، ہمارا ایبٹ آباد دیکھیں۔''

''آپ کا شہر واقعی دیکھنے لائق ہے ماشاءاللہ ہے...... بس یہ پڑھائی کا جن تھوڑا سا اور قابو میں آجائے۔ ابھی تو پانچواں دن ہے۔''

''ویسے کیا صورت حال ہے......'' اس نے ہاتھ سے کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''پڑھائی تسلی بخش ہو رہی ہے؟''

''جی الحمدللہ۔ اور یہ سب انکل کا احسان ہے۔ ان کی مہربانی کہ......''

''بس کریں دارین...... شرمندہ کر رہے ہیں۔''

وہ ہنس پڑی۔

''اور چلیں اب باہر نکلیں، بس بہت ہو گئی پڑھائی۔'' وہ اپنا کپ اٹھا کر کھڑی ہوگئی تو دارین نے بھی کندھے اچکا کر تائید کی۔

☆☆☆

اس روز وہ دوپہر کو ہی دوستوں کے پاس چلا گیا۔ دن کا پہلا ٹائم پڑھنے میں گزرا تھا۔ دوستوں سے بات ہوئی تو انہوں نے ہوٹل بلا بھیجا، سب نے چائے ساتھ پی، دیر تک پڑھائی کے موضوع پر آپس میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ اور اب قریب چھ بجے جبکہ سورج غروب ہونے کو تھا وہ واپس گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اور گھر سے کافی پہلے کالونی کا پہلا موڑ مڑتے اسے سڑک کنارے جو لڑکی نظر آئی وہ بلاشبہ میرب تھی۔ وہ جو اس دوسری شام کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ لنچ اور ڈنر کے اوقات میں جبکہ وہ سب کے ساتھ ان کے گھر میں شریک طعام ہوتا، وہ کچن سائڈ پر کچھ کھٹ پٹ سی محسوس کرتا سمجھ تو جاتا کہ وہی ہے۔ لیکن وہ صاف بھی دکھائی نہ دی۔ اور اس وقت وہ اکیلی نہ جانے کہاں سے آرہی تھی۔ آج پہلی مرتبہ وہ ایک بہت اچھے خوب صورت ڈریس میں تھی۔ فریش رائل بلو کلر میں لائٹ پنک لپ اسٹک اور ڈھیلے ڈھالے بالوں کے ساتھ وہ خالص مشرقی لڑکی دکھائی دیتی تھی، مطلب اسے بننے سنورنے کا سلیقہ تو تھا۔ اور اگر وہ اس روپ میں پہلے دن اسے دکھائی دیتی تو اس کے خیالات کتنے الگ ہوتے۔ دارین ہلکی اسپیڈ میں کار چلاتے گھر کا گیٹ آنے تک نہ صرف اس کے پیچھے، پیچھے ہی رہا بلکہ سوچتا بھی مسلسل اسے رہا تھا۔

☆☆☆

ماجدہ صبح سویرے صفائی کا سامان لیے اس کے پورشن میں آجاتی اور تھوڑی ہی دیر میں سب شیشے سا چمکا کر چلی جاتی۔ البتہ کتابوں کو بھی نہ چھیڑتی۔ دارین اس کی صفائی کے دوران کتاب لیے باہر لان میں چلا جاتا...... اب جو ماجدہ کو صفائی سے فارغ ہوکر اندر سے نکلتے دیکھا تو ذہن میں الفاظ ترتیب دیتے تھوڑا قریب آیا۔

''سسٹر...... وہ میرب بی بی سے کہیے، اس دن اپنا کچھ سامان تلاش کرتے انہوں نے میری کچھ کتابیں اِدھر اُدھر کردی تھیں۔ اگر وہ فری ہوں تو ذرا ڈھونڈ دیں گی۔'' دارین نے سنجیدہ لہجے میں بڑے مؤدب

انداز میں پیغام دیا اور ماجدہ سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ دارین نے اندر آ کر جلدی سے آئینے میں اپنے بال سیٹ کیے۔ اور صوفے پر بیٹھ کر بظاہر خود کو پڑھائی میں مصروف کر لیا۔ کچھ ہی دیر میں میرب اور ماجدہ دونوں واپس آتی دکھائی دیں، ماجدہ کو ساتھ دیکھ کر دارین کے موڈ پر کچھ اوس سی پڑی۔

''السلام علیکم۔'' میرب نے اندر آ کر دروازے میں ہی رک کر سلام کیا، دارین بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میرب کے چہرے پر البتہ حیرت چھپی تھی۔ شاید یہ پیغام اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''جی، کون سی بکس......؟ سوری میں سمجھ نہیں سکی۔'' وہ ایک قدم آگے آئی۔

''جی میری دو بہت اہم بکس ہیں...... کافی پریشانی ہے، مل نہیں رہیں...... آئی سسٹر، وہ...... مجھے چائے کے ساتھ ایک سر درد کی گولی چاہیے...... اگر آپ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ماجدہ کو دیکھا تو وہ ایک دم گھبرا ہی گئی۔

''جی بھیا...... ابھی لائی۔'' وہ فوراً الٹے پیروں بھاگی اور میرب حیرت سے اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

''بٹ میرے پاس کوئی بکس نہیں ہیں۔'' وہ ہکا بکا تھی۔

''میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' وہ اسے گھور رہا تھا۔

''اوہ، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' وہ نادم سی وضاحت دینے لگی۔

''وہی میں کہہ رہا ہوں، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' اس بار لہجہ نرم اور بالکل نارمل تھا۔ میرب نے مشکوک انداز میں دیکھا۔ وہ غصے سے گھورنے والا کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتے قدم، قدم نزدیک آ رہا تھا۔

''مطلب؟'' وہ بھی ایک، ایک قدم پیچھے ہٹتی الماری سے جا لگی۔

''میں نے سوچا آپ کو اپنی امی کی یاد آ رہی ہو گی، کسی بہانے آپ کو یہاں بلا لوں......''

''یہ بھی جھوٹ......'' وہ الماری سے لگی کھڑی تھی۔ ابرو تن گئے تھے اور ہونٹ غصے سے گول سیٹی نما۔

''ہوں......'' دارین نے ہار ماننے کے انداز میں سر ہلایا۔

''مجھے کیوں بلایا؟'' وہ سچ مچ مشکوک ہو گئی تھی، انداز البتہ پولیس والوں جیسا تھا، دارین نے سر کھجایا۔

''جھوٹ تک تو پہنچ گئیں، سچ بھی معلوم ہونا چاہیے۔''

''کیا سچ، کون سا سچ؟'' ایک تو پتھر مارنے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ دارین نے مدد طلب انداز میں اوپر دیکھا۔

''پڑھ، پڑھ کر تھک گیا تھا۔ آپ سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا، بس......'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تو......'' وہ نفی میں سر ہلاتی سائڈ کو کھسکتے دروازے تک پہنچ گئی۔ ''دس از ناٹ فیئر......''

''اے میرب......'' وہ تیزی سے قریب آیا۔

''پلیز بس تھوڑی دیر......'' اور میرب نے اس کی آنکھوں میں بس لمحے کو دیکھا تو دارین کو ان آنکھوں میں مکمل بے یقینی نظر آئی، وہ محظوظ ہو کر پہلی مرتبہ آہستگی سے ہنسا لیکن وہ رکی نہیں اور تیزی سے واپس بھاگ گئی۔ البتہ دور جاتی میرب کی چال میں اب انتہا کی گھبراہٹ تھی...... اس نے جس سچ کی ہلکی سی جھلک پائی تھی، حیرت میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اور دارین خوش تھا کہ اب اسے جھوٹی وضاحتیں نہیں دینی پڑیں گی۔

☆☆☆

''تم اس طرف گئی تھیں؟'' سعدیہ ممانی سامنے کھڑی اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔

''انہی نے بلایا تھا۔'' وہ روکھے سے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''لیکن ماجدہ کہہ رہی تھی تم نے کوئی کتابیں گم کی ہیں۔'' وہ جیسے غصہ ضبط کر رہی تھیں۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اس روز وہاں گئی تھی تو شاید اسے شک ہوا کہ میں نے بکس ادھر اُدھر کی ہوں گی۔'' وہ زچ ہونے لگی، دل میں اس پر غصہ آ رہا تھا جس نے جھوٹ بولا۔

''لیکن تم اس طرف گئی ہی کیوں۔کہ دارین کو شک گزرا۔''

''اپنا سامان اٹھانے گئی تھی لیکن وہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔''

''تو اسے کیا الہام ہوا کہ تم یہاں آئی تھیں؟''

سعدیہ ممانی کا پارہ بھی ہائی ہونے لگا۔

''یقیناً وہ میرا گھر ہے۔انہوں نے اندازہ لگایا ہوگا کہ یہیں آئی ہوگی۔'' میرب چڑ گئی۔

''اسے نہیں پتا کہ وہ تمہارا گھر ہے اور تم بھی پھوٹنا مت۔'' وہ اب تنے ابروؤں کے ساتھ تنبیہ کر رہی تھیں اور میرب کا تعجب سے منہ کھلا، وہ تو آل ریڈی پھوٹ چکی تھی، بمکمل تفصیل کے ساتھ۔دل میں شدت کا دھڑکا اٹھا لیکن اس نے خود کو نارمل رکھا۔

''تو انہیں کیا، کیا بتایا ہے، یہ بھی بتا دیں تاکہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔''

''ہم نے اسے کہا ہے کہ یہ ہمارا آؤٹ ہاؤس ہے، تمہارے ماموں نے خریدا تھا۔بس اتنا ہی یاد رکھو، ویسے بھی تمہیں کیا ضرورت ہے اس سے کھلنے ملنے کی۔''

''ضرورت ہے نہ شوق لیکن ایک آخری بات......'' اس نے کھولتے دماغ کو پھر ضبط میں لانے کی کوشش کی۔

''میرے متعلق کیا بتایا گیا ہے، یہ بھی مجھے پتا ہونا چاہیے؟''

''ہم نے ''اہم'' باتوں کا ذکر کیا ہے ان سے...... غیر اہم باتوں اور لوگوں کے متعلق بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔'' ارسلہ تمسخرانہ ہنستے ہوئے کچن میں داخل ہوئی اور سعدیہ بیگم نے بھی در آتی ہنسی کو مشکل سے کنٹرول کرتے بیٹی کو دیکھا۔

''کہاں کی تیاری ہے میری جان......؟''

''میں اور دارین ذرا لانگ ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔وہ بری طرح تھکے ہوئے سے لگ رہے تھے۔میں نے مشورہ دیا تو خوش ہوگئے۔اچھا مجھے بتائیں ناں......'' وہ اُن سے دور ہو کر سامنے کھڑی ہوئی۔

"یہ ڈریس صحیح ہے؟" وہ اس وقت بلیک ڈریس میں تھی، سعدیہ نے ناقدانہ دیکھا۔

"یہ بھی اچھا ہے لیکن کوئی کھِلا ہوا سا رنگ..... ارے وہ ریڈ ڈریس جو اس روز نئی....." اور میرب مزید ایک بھی لفظ نہ سننے کا ارادہ کرتے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"ارے آنٹی آپ..... آیئے....." دارین اس وقت نہا کر نکلا تھا۔ جب صبح صبح ہی سعدیہ آنٹی اس طرف آنکلیں، ماجدہ ابھی کچھ دیر پہلے صفائی کر کے گئی تھی۔

"میں نے سوچا خود دیکھ آؤں یہ نئی لڑکی صفائی تو اچھی طرح کرتی ہے ناں....." وہ خود ہی ہر طرف کا جائزہ لینے لگیں۔

"یہاں آرام سے تو ہو ناں بیٹا... کسی چیز کی کمی تو نہیں؟"

"کیسی بات کرتی ہیں آنٹی، مجھے تو آپ نے گھر سے بھی زیادہ اچھا ماحول دے رکھا ہے، سب کچھ ایک دم پرفیکٹ ہے۔" وہ ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بیڈ شیٹس، پردوں، میز کی گرد غرض ہر چیز کا واقعی خوب باریکی سے جائزہ لینے آئی تھیں۔

"مجھے خوشی ہے ہماری یہ چھوٹی سی انویسٹمنٹ آج ہمارے بڑے کام آئی۔" وہ نرم مسکراہٹ سے نوازتے اسے خوب محبت سے دیکھ رہی تھیں اور دارین کے لیے اب ایسے لمحے تکلیف کا باعث بن رہے تھے، وہ منافقت کر رہی تھیں اور وہ سمجھ کر بھی لاچار تھا۔

"اچھا وہ کتابوں کا کیا مسئلہ تھا مل گئیں؟" سعدیہ آنٹی نے ایک دم ہی سوال کر دیا تو وہ بری طرح بوکھلایا، البتہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دل میں میرب پر شدید غصہ آیا جس سے اتنی سی بات دل میں نہیں رکھی گئی۔

"جی، جی وہ مجھے غلط فہمی ہوگئی تھی۔ میری کتابوں میں کچھ اور غیر متعلقہ کتابیں مکس ہوگئیں تو مجھے لگا شاید کوئی آیا تھا۔"

"ماجدہ نے مجھے بتایا تو میں نے خوب ڈانٹ دیا اسے۔" وہ اپنی بات کی وضاحت کر رہی تھیں اور دارین کے ہونٹ مسکرا دیے تو آنٹی کو ماجدہ سے پتا چلا... اور بلاوجہ اس نے میرب سے بدگمان ہونے میں جلدی کر دی۔

"جی معافی چاہتا ہوں، میری وجہ سے انہیں زحمت ہوئی، وہ مجھے ایک بار یہاں دکھائی دی تھیں... سوری نام نہیں معلوم وہ....."

"ہاں میرب....." سعدیہ بیگم کے چہرے پر صاف ناگواری جھلکی تھی۔ "میری نند کی بیٹی ہے..... ان کی وفات کے بعد ہم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اب کوشش تو کرتے ہیں گھل مل جائے ہمارے ساتھ لیکن اللہ بخشے اس کی ماں کو، بس وہی مزاج پایا ہے، روکھا سا، ہا..... اللہ بیچاری کے نصیب اچھے کرے۔" انہوں نے ایک مصنوعی آہ بھری۔ "میں تو چاہتی ہوں ارسلہ سے کچھ سیکھے، اس جیسی بننے کی کوشش کرے لیکن مزاج کا کیا کریں، بھئی ارسلہ کی خوش مزاجی سے کیا مقابلہ اس کے مزاج کا... ارے میں بھی کیا بور کرنے لگی تمہیں....." وہ خود ہی ہنس پڑیں۔

"چلو تم اپنی پڑھائی کرو، ارے ہاں....." انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "ادھر تو ناشتا تیار ہے، آؤ..... ساتھ چلتے ہیں۔"

"جی۔" وہ انکار کی گنجائش نہ پاتے آخر میں بس اتنا کہہ کر پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆

"بھئی دارین تمہاری سعدیہ آنٹی جیسا کابلی پلاؤ اور کوئی نہیں بنا سکتا۔"

"جی بالکل انکل، آنٹی کی کوکنگ لاجواب ہے۔" وہ مسکرا دیا۔

"بھئی کسی شام باربی کیو کا پروگرام بناؤ۔"

"جی، بالکل ارسلہ بھی یہی کہہ رہی تھی..... بس کل شام ہی بنا لیتے ہیں۔" سعدیہ آنٹی نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا، ارسلہ بھی پلیٹ پر جھکی تھی۔ دارین نے چپکے سے رائتہ اپنی آستین پر گرایا۔

"اوہ نو....." وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھا، سب ایک

ساتھ متوجہ ہوئے۔

''اوہو، یہ ٹشو پیپر......'' ارسلہ نے ڈبا آگے کیا۔

''نہیں بس دھو لیتا ہوں، یہیں کچن میں ہی......''

وہ معذرتی نظروں سے سب کو دیکھتے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ پلیز کھانا کھائیں۔'' ہلکا سا مسکرا کر دارین بنا کسی کو کچھ کہنے کی مہلت دیے عجلت میں کچن کے اندر آیا تو پہلا شکر میرب کی وہاں موجودگی پر ادا کیا۔ وہ کچن کی چھوٹی ٹیبل کے پاس بیٹھی رغبت سے پلاؤ کھا رہی تھی۔ دارین کو دیکھ کر البتہ اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ بھی سنجیدہ صورت لیے سنک کی طرف بڑھا۔ پانی ڈال کر دہی ہٹایا اور پلٹ کر متلاشی نظروں سے کچھ دیکھنے لگا۔ میرب نے اپنی کرسی کی بیک سے چھوٹا تولیا اتار کر آگے کیا، دارین مسکراتے ہوئے قریب آیا۔ آرام، آرام سے ہاتھ صاف کرتے وہ اسے دیکھنے لگا۔ وہ نروس ہو کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''پروین شاکر کی بک، میرون کور......''

''ہوں......؟'' وہ متحیری واپس پلٹی، کچھ سمجھ نہیں آئی اس نے یہ کیا بولا جبکہ وہ متواتر مسکرا رہا تھا۔

''لائبریری میں بک کے اندر، تمہارے لیے کچھ ہے۔'' وہ ناول اس کے اوپر پھینک کر اسی تیزی سے واپس نکل گیا اور میرب کا بے یقینی سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور پھر کچن کے دوسرے دروازے سے اس نے سیدھے لائبریری کا رخ کیا۔ پتا نہیں ایسا کیا تھا اس کے لیے... کسی اور نے دیکھ لیا تو...... وہ پھولی سانسوں کے ساتھ لائبریری میں آئی۔ بائیں ہاتھ کا چھوٹا ریک ان نئی کتابوں سے سجا ہوا تھا جس میں سارا ادبی مواد تھا، میرب نے کانپتے ہاتھوں سے مطلوبہ کتاب باہر نکالی اور وہ صفحہ خود بخود ہی سامنے کھل گیا جس میں دبا کیا ہوا پیپر رکھا تھا۔

''دور اک فاختہ بولی ہے، بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے''

میرب کے ہاتھوں کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ صفحے کو تہیں لگا کر مٹھی میں بند کرتے اس نے کتاب واپس رکھی، دماغ بالکل سُن تھا، کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے سے معذور۔

☆☆☆

وہ اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی جب اس کے ابو ایک ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے تھے۔ میرب اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ دادا ابا حیات تھے اور انہوں نے اس کی امی کا نکاح بڑے بیٹے تنویر سے کرنا چاہا لیکن اس کی امی اس فیصلے سے ہرگز متفق نہ ہوئیں تو ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی اظہر کے پاس آگئیں۔ اظہر کے علاوہ دنیا میں اب ان کا کوئی سگا رشتہ نہ رہا تھا۔

یہاں آکر تہمینہ بیگم نے بھائی سے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر والد کی جائداد میں اس کا کوئی حصہ ہے تبھی وہ یہاں رہنے کو تیار ہوں گی، احسان لینا اور بھائی بھابی پر بوجھ بننا انہیں گوارا نہ تھا اور چونکہ یہ آبائی مکان اظہر کو والد کی طرف سے ہی ملا تھا تو بہن کا اس میں حصہ تو تھا۔ لیکن مجبوری یہ بن گئی کہ ابھی کچھ سال بھر پہلے ہی انہوں نے پرانے طرز تعمیر کو ختم کر کے اس پر اپنا جدید طرز کا نیا بنگلا بنایا تھا۔ اس نئے تعمیر شدہ مکان میں تہمینہ کو حصہ دینے کے لیے سعدیہ نے صاف منع کر دیا تھا۔ اور جائداد کے حصے جتنی رقم بیوہ بہن کے ہاتھ پر رکھ کر اسے کہیں اکیلا چھوڑ دینا بھی مناسب نہ تھا۔ تبھی بہت سوچ بچار کے بعد بنگلے سے ملحقہ ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید کر بہن کو مکان بنوا دیا، البتہ اس کی تعمیر میں رقم تہمینہ کے مرحوم شوہر ساجد کی لگی تھی۔ تہمینہ کو اپنے اور بچی کے لیے ایک محفوظ ٹھکانا میسر آگیا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھیں۔

میرب کا داخلہ بھی ارسلہ کے اسکول میں کروا دیا گیا۔ دونوں ہم جماعت تھیں۔ عادتاً البتہ ارسلہ کم گو اور خشک مزاج تھی جبکہ میرب نہایت خوش اخلاق اور دوست مزاج تھی۔ سعدیہ ممانی کو اس کی زندہ دلی کھلتی ضرور تھی لیکن انہوں نے اسے اپنے لیے خطرہ کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ لیکن آنے والے وقت میں یہ خوش مزاجی ان کے لیے وبال بننے والی تھی، یہ تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اظہر حسین کی بڑی بیٹی جمیلہ کی جس وقت شادی ہوئی دوسری بیٹی کنول فورتھ ایئر میں تھی جبکہ ارسلہ اور میرب دونوں سیکنڈ ایئر میں تھیں۔ شادی کی تمام تقریبات خوب اچھے طریقے سے انجام پائیں اور جمیلہ بیاہ کر ملائشیا چلی گئی لیکن پھر کچھ ہی دنوں بعد اس کی سسرال سے میرب کے لیے رشتہ آگیا اور سعدیہ بیگم کے پہلی مرتبہ تب کان کھڑے ہوئے۔ وہ تو نئے لوگوں سے مراسم کے نتیجے میں اپنی کنول کی راہ ہموار سمجھ رہی تھیں لیکن یہ کیا ہوا۔ انہیں محسوس ہوا کہ جب سے یہ میرب آئی تھی اوڈگے بوتھے فیشن کرنے والی ان کی بیٹیاں ہر جگہ انہیں شرمندہ کروا دیتیں جبکہ میرب مشہور ہی اپنے اسٹائل کی وجہ سے تھی۔ انہوں نے اب کنول اور ارسلہ پر خصوصی توجہ دینا شروع کی۔ میرب کا عمدہ ذوق اس کے ہر ہر انداز سے جھلکتا تھا۔ اور اب وہ اسے تو نہیں روک سکتی تھیں..... انہوں نے کنول اور ارسلہ کو نئی لک میں ڈھالنا شروع کر دیا..... سعدیہ نے جمیلہ کے سسرالی رشتے داروں کو خود ہی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تہمینہ ابھی بچی کو پڑھانا چاہتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک بہت ہی اچھا اور آئیڈیل رشتہ تھا، لڑکا ڈاکٹر بن رہا تھا۔ لیکن سعدیہ نے نند کو اس کی بھنک بھی پڑنے نہ دی۔ انہیں تو آج کل بس کنول کی فکر تھی۔ جمیلہ نے بھی ماں کا کہنا مانتے جیٹھانی سے کہہ دیا کہ ارسلہ اور میرب ابھی چھوٹی ہیں، گھر میں اس وقت کنول کے رشتے ڈسکس ہو رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں جمیلہ نے اس کے ڈاکٹر بھائی کے لیے اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کی لیکن جیٹھانی نادیہ نے کنول کے رشتے میں خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی بالآخر جمیلہ کو یہ سن کر شاک لگا کہ نادیہ کے بھائی کو شادی میں میرب اچھی لگی تھی اس لیے انہوں نے رشتہ مانگا تھا۔ جمیلہ نے جب یہ بات ماں کو بتائی تو ان کے دل میں میرب کے خلاف ایک اور گرہ مضبوط ہو گئی۔ میرب کا وجود سعدیہ کو سوئی سا چبھنے لگا تھا۔

اور پھر میرب کی زندگی اپنی امی کی وفات کے بعد ایک انقلاب سے ٹکرا گئی۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ماں کا اچانک دنیا سے چلے جانا اس کے لیے کتنا بڑا جذباتی دھچکا ثابت ہوگا۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ چپ چاپ گم صم پہروں ماں کو یاد کرتے دھیرے، دھیرے وہ اس تنہائی کی عادی ہونے لگی۔ اظہر ماموں اسے اپنے بنگلے میں بلاتے لیکن وہ اپنی امی کی یادوں سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ تبھی تنگ کی ہوری لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ بنگلے میں اس کے خلاف کوئی کھچڑی پکنا شروع ہو چکی تھی..... جو چند دنوں کے اندر کھل کر سامنے آگئی۔ ممانی اب اسے مارکیٹ نہ لے جاتیں، وہ اس کی شاپنگ خود کرتیں، روکھے پھیکے بدرنگ سستے کپڑے سلوا کر اس کو پہننے کے لیے دے دیے جاتے، وہ اپنے ڈیزائن کیے اپنے فیورٹ ڈریسز میں سے کچھ پہن لیتی تو کچھ ہی دنوں میں اس کے کپڑوں میں سے کئی ایک کو پرانا قرار دے کر ڈھیرو کے حوالے کر دیا جاتا۔ وہ اگر اچھے کپڑے پہن کر کبھی بھی کر لیتی تو سعدیہ ممانی ٹوکنے آجاتیں کہ ابھی تو لوگ تمہاری امی کے افسوس کے لیے آ رہے ہیں۔ ابھی اپنا حلیہ سادہ رکھو۔ ہلکے رنگوں کے سادہ ڈریسز بھی یہی کہہ کر اس پر لاد دیے گئے کہ سال بھر اسے شوخ رنگوں سے دور رہنا چاہیے۔ ماں کے مرنے پر بیٹیاں آئے گئے کے سامنے شوخ رنگ نہیں پہنتیں۔ میرب چپ چاپ سن کر کہا مان لیتی۔

جب تک امی زندہ تھیں ان کا کھانا پینا الگ تھا، اس کی امی ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھیں اس لیے گھر کا خرچ آسانی سے چل رہا تھا لیکن ان کے بعد وہ ماموں ممانی کے زیر بار ہوگئی۔ تینوں وقت کا کھانا ان کی طرف کھانے سے خیالات اور مزاج بھی فرمانبرداری کی طرف مائل ہونے لگے۔ وہ چپ چاپ اسی رنگ میں ڈھلتی گئی جیسا وہ چاہتے تھے، البتہ خلاف مزاج بات آج بھی میرب کو کچھ نہ کچھ سنانے پر مجبور کر دیتی۔ سعدیہ ممانی ہر آئے گئے کے سامنے یہ احسان جتانے سے نہ چوکتیں کہ انہوں نے ترس کھا کر بیوہ نند کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ ان کے فرضی احسانوں کی لسٹ

بہت لمبی تھی جو اپنی دانست میں انہوں نے تہمینہ اور میرب پر کیے۔

اِدھر کنول کا کہیں اچھی جگہ رشتہ نہیں ہو رہا تھا اور یہ بات سعدیہ کی پریشانیوں میں کچھ اور اضافہ کرتی، ڈاکٹرز کا رشتہ ہاتھ سے نکل جانے پر وہ ہمیشہ ہی ہاتھ ملتیں اور میرب کے لیے ان کے دل میں نفرت کچھ اور بڑھ جاتی۔ اُدھر میرب کی بدقسمتی بھی شاید پیچھا چھوڑنے کو ابھی تیار نہ تھی، تبھی سعدیہ ممانی کی ایک دوست کے توسط سے جب کنول کو دیکھنے کچھ لوگ آئے تو عین اسی وقت میرب تیار ہو کر اپنی سہیلی ثمرہ کی سالگرہ اٹینڈ کرنے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی۔ تمن بد خواتین سے گھر کے گیٹ پر سامنا ہوا تو وہ نہایت تپاک سے مل کر انہیں اندر تک لے آئی اور پھر ثمرہ کے گھر چلی گئی۔ خواتین نے اس کے بعد کنول کو بھی دیکھا تو ضرور لیکن آنکھوں میں وہ پرپل ڈریس میں کھلتی رنگت اور پرکشش مسکراہٹ والی لڑکی بس چکی تھی۔ واپس آکر سعدیہ کی دوست رخشندہ نے میرب کے لیے پسندیدگی ظاہر کر دی۔ اور یہ واقعہ سعدیہ کے لیے دوسرا جھٹکا ثابت ہوا تھا۔ لگاتار میرب ان کی کنول کی راہ میں رکاوٹ بن کر آ رہی تھی۔ غضب ناک ہونا جائز تھا شاید اس مرتبہ تو شوہر کو بھی خوب کھول، کھول کر اس کے مشکوک کردار کے متعلق بتایا کیونکہ سعدیہ کا اپنا دماغ یہ بات تسلیم کر چکا تھا کہ بنا کسی قسم کا اشارہ دیے آپ اگلے کی توجہ بھی نہیں پا سکتے۔ اور بدقسمتی سے میرب عین اس مقولے پر فٹ آنے کے لیے چھری کے نیچے کھڑی ملتی۔ سعدیہ نے اس مرتبہ ہار نہ مانتے ان لوگوں کو کہلوا بھیجا کہ میرب کی منگنی اس کی پھوپھو زاد کے ساتھ طے پا چکی ہے اور شادی بھی عنقریب ہونے والی ہے۔ یوں اسی رشتے کو کنول کے لیے دوبارہ بلوا لیا گیا۔ البتہ کنول کی شادی ہو جانے تک سعدیہ اندر ہی اندر ہولتی ہی رہی تھیں۔ اور اب...... اب معاملہ ارسلہ کا تھا جو ویسے بھی میرب کی ہم عمر تھی اور سعدیہ ہر معاملے میں اس کا۔ مقابلہ میرب سے کرنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ارسلہ کی باری انہوں نے ممتا کی عینک اتار کر بیٹی کو ایک ناقد کی نظر سے دیکھتے اس میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا ارادہ کیا، سوچ سطحی ہو تو دید کا دائرہ بھی محدود ہو کر صرف ظاہر کی اچھائی برائی دکھا پاتا ہے۔

میرب کو فیشن ڈیزائننگ سے قدرتی لگاؤ تھا، جاذب نظر تو وہ تھی ہی، خوش لباس بھی مشہور ہو گئی۔ فیشن ڈیزائننگ کا کورس اس کا جنون تھا۔ لیکن امی کی وفات کے بعد تو کبھی ٹمٹماتے دیے بھی بجھ گئے۔ اُدھر میرب کا استحصال کرتے، کرتے سعدیہ نے ارسلہ کو ابھارنا شروع کر دیا۔ میرب سے سن، سن کر لفظ ڈیزائننگ ان کے دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔ ارسلہ کی دبی رنگت تو کریمیں رگڑ، رگڑ کر چودھویں کا چاند بنا ہی چکی تھیں۔ دارین کی آمد کا سنا تو اپنی ایک سہیلی کی مدد سے ارسلہ کے لیے باقاعدہ ڈیزائنر سے ڈریسز تیار کروائے۔ بیوٹی پارلر کے صبح شام چکر لگوا کر ارسلہ کے بالوں، ہاتھوں، پیروں اسٹائل بھی کچھ ایک دلہن کی طرح محنت کروائی گئی۔ حتیٰ کہ دارین کی آمد کے بعد وہ بنا مکمل تیاری کے کبھی ایک بار بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ دارین کے سامنے اس فل ہتھیاروں سے لیس ارسلہ کو نیچرل بیوٹی کے طور پر پیش کیا گیا...... جبکہ وہ خود باوجود گھر کی ایک عدد بی جی ہونے کے آیا سے زیادہ بدتر حلیے میں ڈھال دی گئی تھی...... اور اسے اس زیادتی پر شکایت بھی کوئی نہ تھی۔ کنول کے معاملے میں بے قصور دھر لیے جانے کے بعد اس کے اندر باغی لہر نے ابھرنے کی جرأت ہی نہیں کی، اس کی کوشش اور دعا بھی یہی تھی اس مرتبہ سیدھے، سیدھے ارسلہ کی کہیں بات طے ہو جائے تاکہ اس کے دامن پر لگا داغ کسی حد تک دھل جائے......
لیکن قدرت اس مرتبہ چھری نہیں بارود کی فیکٹری لیے اس پر حملہ آور تھی مطلب بچنے کا چانس ندارد!

اختتامی حصہ اگلے ماہ

حسبی اللہ ونعم الوکیل

وردہ بخاری

میں اپنے پورشن سے نیچے اتری ہی تھی کہ دیورانی کا خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ نظر آیا۔

”بھائی آئے ہیں۔“ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا۔ آج ”شب برات“ ہے ناں......“ وہ خوشی سے بولی اور میری نظریں کچن کے کاؤنٹر پر پھیلے ہوئے سامان پر پھسلنے لگی۔

پانچ کلو مٹھائی کا ٹوکرا، کیلے، چینی کے علاوہ ایک خوب صورتی سے سجی فروٹ باسکٹ بھی تھی۔

''ہاں یہ بھائی لائے ہیں......'' میری نظروں کے تعاقب میں دیکھتی شہرینہ بولی تھی۔ ''میرا اور عاقب کا سوٹ بھی لائے ہیں۔ آپ آئیں ناں اندر، آپ کو دکھاتی ہوں۔'' وہ سرشار تھی۔

''ہاں کیوں نہیں، تم چلو میں آتی ہوں......'' میں کچھ بے دلی سے بولی تھی۔ نظروں میں اپنے بھائی کا چہرہ [illegible] تھا۔ فراز کو تو شاید یاد بھی نہ ہو کہ آج شب برات ہے اور اگر ہوا بھی تو کیا [illegible] بیوی کے سوا کسی کا ہوش ہو تب ناں [illegible] کڑوی کسیلی سوچ ذہن میں لہرائی تو مجھے شب برات کی ساری خوشی ماندی پڑ گئی۔

''شہرینہ کس قدر خوش قسمت ہے کہ اتنے چاہنے والے بھائی ملے ہیں......'' دل میں رشک اور حسد کے [illegible] جذبات لیے [illegible] وہ سوچنے لگی۔

☆☆☆

''ارے بہو......ابھی تک چائے نہیں بنی......'' دفعتاً ساس کی آواز پر وہ چونکی۔

''آئی اماں......بس دو منٹ......'' وہ جلدی جلدی سامان سمیٹتے ہوئے چائے کا پانی رکھنے لگی تھی۔ ان دیورانی، جیٹھانی کا اتنا سلوک تو تھا کہ ایک دوسرے کے مہمان اچھی طرح دیکھ لیتی تھیں۔ اس طرح اپنے، اپنے مہمانوں کے ساتھ زیادہ بیٹھنے کا موقع بھی مل جاتا۔

☆☆☆

نوید اور شہزاد عطیہ خاتون کے دو ہی بیٹے تھے۔ جن کے لیے وہ صائمہ اور شہرینہ کو یکے بعد دیگرے بیاہ لائی تھیں۔ کچھ عطیہ خاتون کی معاملہ فہمی تھی اور کچھ دونوں بہویں دل کی اچھی تھیں کہ گھر میں کبھی جھگڑے نے طول نہ پکڑا تھا۔ ہاں چھوٹی، چھوٹی باتیں کہاں نہیں ہوتیں۔ جس میں زیادہ تر عطیہ خاتون دخل نہ دیتیں اور بہوؤں کو بھی درگزر کرنے کا درس دیتیں۔ ان کا ہمیشہ سے ماننا تھا کہ انسان چاہے تو چھوٹی سی بات پر جھگڑے اور چاہے تو بڑی سے بڑی بات اپنے صبر اور برداشت سے رفع دفع کر دے۔ بیٹے بھی ان جیسی سوچ کے حامل تھے سو صائمہ اور شہرینہ کا ایک ہی گھر میں خوش اسلوبی سے گزارہ ہو رہا تھا۔

صائمہ کو اوپر کے پورشن کے دو کمرے حاصل تھے۔ چھوٹا سا کچن بھی تھا جو ناشتے کے لیے استعمال ہو جاتا۔ شہرینہ نیچے والے پورشن میں سکونت پذیر تھی۔ کھانا پکانے کے لیے نیچے والا کچن استعمال ہوتا اور سب اکٹھے کھایا کرتے۔ عطیہ خاتون کا کمرا بھی نیچے والے پورشن میں تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد زیادہ تر عبادت میں مصروف رہتیں اور گھر کے مسئلوں میں حتی الامکان غیر جانبداری سے کام لیتیں [illegible] سو زندگی اپنی روایتی تھوڑی بہت نوک جھوک کے ساتھ سکون سے رواں دواں تھی۔

آج بھی صبح سے صائمہ اور شہرینہ شب برات کے لیے خاص اہتمام میں مصروف تھیں۔ درود فاتحہ کے لیے حلوہ اور میٹھا بنایا گیا تھا اور صفائی ستھرائی کا بھی خوب دھیان رکھا گیا تھا کہ عطیہ خاتون کی اس بارے میں خاص تاکید تھی۔ اور آج تو کرموں، مرادوں والی رات تھی سو شہرینہ اور صائمہ نے زیادہ تر کام دن میں ہی ختم کر لیے تھے کہ رات سکون سے عبادت کی جا سکے۔

صائمہ ابھی مغرب کی نماز کے بعد سب کو شب برات کی مبارک باد دینے ہی نیچے اتری تھی کہ شہرینہ نے بھائی کے آنے کی اطلاع دی۔ شہرینہ کے دو بھائی تھے اور دونوں ہی ماشاء اللہ سلجھے ہوئے اور رشتوں کا احترام کرنے والے تھے۔ وہ ہر عید، بقرعید، شب برات پر اپنی چھوٹی اور اکلوتی بہن کو ہمیشہ یاد رکھتے اور اس کا مان بڑھانے کو کچھ نہ کچھ سوغات لے کر ہمیشہ اس کی سسرال آتے رہتے۔ یہ وقت صائمہ پر ہمیشہ ہی کڑا گزرتا......کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بھائی سے گلہ ہونے لگتا۔ فراز شروع ہی سے بے پروا طبیعت کا تھا اور کچھ گھر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے طبیعت میں بچکانہ پن بھی تھا۔ صائمہ بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ ہی اس کا زیادہ خیال رکھتی آئی تھی۔ سو پیار تو تھا مگر فراز میں احساس ذمے داری کا فقدان تھا۔ شادی ہو گئی تھی مگر وہی کہ کبھی تو ہر وقت بہن

کا خیال اور بھی مصنوں گزر جاتے خیر خبر لیے۔ پوچھنے پر اپنی مصروفیات کا رونا تھا۔ ماں جی بوڑھی ہو گئی تھیں اور بہو بیٹا کے ساتھ خوش بھی تھیں۔ سو ایسی معمولی باتوں پر ان کا دل کیا جلاتا...... مگر پھر بھی ہر عید، شب برات پر صائمہ کو انتظار سا رہتا۔ کچھ شہرینہ کے بھائیوں کے اٹھائے گئے لاڈ اس احساس میں شدت لے آتے تھے۔

خیر اپنے دل کو بہلاتی وہ دیورانی کی خوشیوں میں شریک تھی اور اس کے لیے لائے گئے تحفوں کی دل سے تعریف بھی کر رہی تھی۔

اگلا دن معمول کا تھا اور کچھ رات میں دیر تک عبادت کرنے سے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ طبیعت کچھ ست تھی۔ نوید صبح سے اس کی بے دلی محسوس کر رہے تھے۔

''کیا ہوا صائمہ......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ رات میں بھی تم ٹھیک سے سوئی نہیں......'' وہ کچن میں ناشتا بناتی صائمہ سے فکرمندی سے مخاطب ہوئے تھے۔

''کچھ نہیں بس کچھ سر میں درد ہے۔'' ان کی فکرمندی محسوس کر کے اس کے ہونٹ ذرا کے ذرا پھیلے تھے۔

''ارے طبیعت ٹھیک نہیں تو چھوڑو ناشتا، میں آفس میں کرلوں گا بلکہ شہرو میں بناتا ہوں...... آج پھر اکثر دس ہاس بھی چھٹی پر ہے تو کچھ دیر تو چل جائے گی۔'' انڈا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بڑے پیار سے اسے کرسی پر بٹھایا تھا۔

''ارے نہیں آپ کیسے......'' اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں کیسے نہیں...... بس آرام سے بیٹھیے آپ...... ذرا اپنا خیال نہیں رکھتیں۔ چہرہ کیسا زرد ہو رہا ہے۔'' وہ بالکل اس کی اماں کی طرح اس کے لیے فکرمند ہوتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔

''اچھا جناب، بنائیے پھر میرے لیے اچھا سا آملیٹ......'' اس نے چمکتی آنکھوں سے اپنے تک سک سے تیار شوہر کو انڈا پھینٹتے دیکھا تھا۔ نوید ہمیشہ سے ایسے ہی تھے، اس کے نبض شناس، لوگ اکثر اس پر رشک کیا کرتے۔ یونہی مسکراتے اس کی نظر دروازے پر بت بنی شہرینہ پر پڑی تھی۔

''وہ بھابی انڈے ہوں گے آپ کے پاس......؟ میں رات کو منگوانا ہی بھول گئی۔'' وہ کچھ شپٹا کر بولی تھی۔

''ہاں، ہاں یہ رہے فریج میں۔'' اس نے انڈے نکال کر پکڑا دیے تھے۔

''ارے شہرینہ، آپ بھی تو ہمیں جوائن کریں ناں...... اٹالین آملیٹ میری ریسپی ہے......'' نوید نے کالر اکڑائے تھے۔

''نہیں بھائی پھر کبھی......'' شہرینہ بدقت مسکرائی تھی۔ ''ابھی بھابی کو کرائیں آپ...... ہم پھر سہی......'' مجھے آنکھ مارتی مسکراتی وہ کچن کی طرف دوڑی تھی۔

''یہ دیکھیں میڈم...... شیف نوید کا مشہور اٹالین آملیٹ تیار ہے۔'' نوید ایک ترنگ میں تھے۔

''بلکہ شہرو یار، یہ نیچے شہزاد اور بھابی کو بھی ٹیسٹ کرواؤ...... تمہیں پتا ہے شہزاد ناشتے میں اہتمام پسند کرتا ہے۔'' وہ بردبارانہ شفقت سے بولے تھے۔

''اوکے باس......'' موڈ خوشگوار ہو چکا تھا۔ سو وہ پلیٹ اٹھاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ابھی کچن میں سیڑھیاں اترتے اس کے کانوں میں شہزاد کی تیز آواز پڑی تھی۔

''انتہائی پھوہڑ عورت ہو تم...... پہلے انڈے بھابی سے مانگتی پھر رہی ہو اور اب اطلاع دے رہی ہو...... کہ مکھن بھی نہیں ہے۔ دھیان کہاں رہتا ہے تمہارا......''

''وہ کل شب برات تھی ناں پھر بھائی بھی آ گئے تو دھیان نہیں رہا......'' وہ منمنائی تھی۔

مگر فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی شہزاد دہاڑا تھا۔

''ایک تو میں تمہارے بھائیوں سے بہت تنگ ہوں...... کبھی ایک منہ اٹھا کر آ جاتا ہے کبھی دوسرا...... گھر میں دل نہیں لگتا ان کا یا بیویوں سے کوئی مسئلہ ہے۔'' وہ طنزیہ مسکرایا تھا۔

''پلیز شہزاد...... ایسے تو نہ کہیں۔ وہ میری محبت میں آتے ہیں۔''

''ہاں محبت...... مجھے تو بس شو آف لگتی ہے۔ چار

پیسے کیا آگئے لوگ دکھاوا کرنے سے باز نہیں آتے۔“ وہ آفس بیگ اٹھاتے بولا تھا۔

”ارے ناشتا تو.......“

”رکھو اپنے پاس اپنا سڑا ہوا ناشتا...... کھالوں گا باہر میں......“ وہ بکتا جھکتا باہر کی طرف چل پڑا۔ اور شہرینہ ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے ناشتے سے بھری ٹیبل کو دیکھے گئی۔

صائمہ سُن سی کھڑی تھی۔ آج اس پر آگاہی کا ایک اور در وا ہوا تھا۔ کیا زندگی کسی کی مکمل بھی تھی؟ کوئی کہیں سے محروم تھا اور کوئی کہیں سے نوازا گیا تھا۔

”یہ میرے رب کی تقسیم ہے۔“ اندر کوئی بولا تھا۔ اور اس کے ایک دم رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔

”مال، دولت، محبت، رشتے یہ سب رزق میں آتے ہیں جس کے بارے میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مفہوم...... ”میں جسے چاہے بے شمار دوں اور جس کو چاہوں قلیل......“ (آل عمران)

پھر ہم انسان کیوں سوال کرتے ہیں... کیوں ایک دوسرے سے رشک اور حسد میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہم رب کی تقسیم پر راضی کیوں نہیں ہو جاتے۔ جو قادرِ مطلق ہے اور جس کی مصلحتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔“ اس نے بے اختیار گہری سانس کھینچی تھی اور بغیر آہٹ پیدا کیے وہاں سے واپس مڑی تھی کہ وہ شہرینہ کو شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا دل خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔ اسے بے اختیار رب کی محبت پر پیار آیا تھا جو سب کے لیے برابر تھی... وہ سب کو نوازتا ہے اور سب کو آزماتا ہے۔ فرق صرف دیکھنے والی آنکھ کا ہے۔

”اے اللہ ہمیں شکر کرنے والے دل سے نواز......“ اس کا رواں، رواں دعا گو تھا۔

”کہ دنیا دی چمک دمک ہماری نظروں میں ہیچ ہو جائے اور تو ہمیں کافی ہو جائے......“ بے شک خوشی، شکر میں ہے اور حرص اور ناشکری غم کا موجب ہیں۔

❁❁❁

کام کی باتیں

۱۔ بڑا احمق ہے وہ شخص جو دوسروں کی برائیوں کو سمجھے اور خود ان پر جما رہے۔

۲۔ مرنے والوں سے عبرت حاصل کرو۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہ رکھو۔

۴۔ ندامت کے آنسو غرور کی ہنسی سے بہتر ہیں۔

۵۔ معافی نہایت اچھا انتقام ہے۔

۶۔ میٹھی بولی سب سے اچھی مٹھاس ہے۔

۷۔ خودکشی نہ کرنا چاہو تو اپنے آپ کو مصروف رکھو۔

۸۔ کسی کو بیوقوف بنانے کی تدبیر یہ ہے کہ اس کو عقلمند کہو۔

۹۔ جاہل کے لیے سب سے اچھی بات خاموشی ہے۔

۱۰۔ ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے موت۔

از: نادیہ فاطمہ، کراچی

غزل

خزاں کی رُت میں لحظہ جمال کیسے آگیا
آج پھر سنگار کا خیال کیسے آگیا
ہنسی کو سن کر اپنی ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا
وہ رسم چارہ سازیٔ جنوں تو ختم ہو چکی
یہ دل کے تار تار حرفِ اندمال کیسے آگیا
ابھی تو دھوپ روزنِ قفس سے کوسوں دور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آگیا
جدائیوں کے زخم تو سنا کہ بھر چلے تھے پھر
بدن کے ہاتھ ناخنِ وصال کیسے آگیا
تمام کائنات ازل سے آئینوں کی زد پہ تھی
ہجومِ عکس میں یہ بے مثال کیسے آگیا

از: کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص

خواب

زندگی میں بہت سی چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہیں اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم بے چین ہو جاتے ہیں مگر وہ چیز ہمارے لیے نہیں ہوتی۔ اسی طرح بہت سے خواب محض خواب ہوتے ہیں پلکوں پر سجنے کے لیے دل میں اترنے کے لیے مگر ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

مرسلہ: عائشہ کرن، کراچی

مکمل ناول

محرومِ تمنا

فرح طاہر

اس نے دھیرے سے آنکھوں کو کھولا اور سامنے نظر آتی سفید پینٹ شدہ چھت پر ٹکا دی۔ ہر احساس سے عاری، خالی آنکھیں لیے وہ کچھ دیر یونہی چت لیٹی چھت کو گھورتی رہی...... پھر جب اس کے حواس بیدار ہونا شروع ہوئے تو اس نے گردن گھما کر پہلے دائیں پھر بائیں طرف دیکھا...... چند لمحوں بعد آنکھوں نے دماغ سے رابطہ بحال کرتے ہوئے اطراف کے ماحول سے شناسائی کا احساس دلایا تو اسے یاد آیا...... وہ اسپتال میں تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک اور احساس نے فوری سر اٹھایا تو آہستہ آہستہ احساسات مکمل طور پہ بیدار ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا...... مگر کراہ کر اپنی جگہ گری تھی...... اس کے کراہنے کی آواز سن کر بیڈ سائیڈ ٹیبل کے قریب کھڑی فائل چیک کرتی سسٹر نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھتی ہوئی شائستگی سے بولی۔

"آپ پلیز لیٹی رہیں......"

''میرا بچہ......'' سسٹر کی تاکید کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بے تابی سے استفسار کیا تو وہ اس کی... بےتابی کو سمجھتے ہوئے ذرا سا مسکرائی پھر پلٹ کر چند قدم کے فاصلے پر موجود بے بی کاٹ سے اس کا بچہ اٹھا کر لائی اور اس کے برابر میں لٹاتے ہوئے نرمی سے مسکرا کر بولی۔

''یہ آپ کی بیٹی......''

''بیٹی......'' اس نے بے یقینی سے اس کے ادا کیے لفظوں میں سے لفظ بیٹی کو دہراتے ہوئے اپنے اندر جھانکا جہاں ذرے جیسے بہت سے خیالات میں سے ایک نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

''من کی مراد پانے والی امروز پیرزادہ آج خدا تم پر مہربان ہو گیا ہے۔'' نرم گرم سے بھیگے احساس نے سر اٹھا کر اسے گدگدایا تو ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔ ایسے میں بہت ساری توانائی برق کی طرح اس کے بدن میں دوڑی تو اسے لگا اب وہ ذرا سی مدد کے سہارے اٹھ کر بیٹھ سکتی ہے۔ اس نے مدد کے لیے سامنے کھڑی سسٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا تم بیٹھنے میں میری مدد کر سکتی ہو؟''

''جی مگر...... تمہارے لیے ابھی لیٹنا بہتر ہے۔''

''تو...... پھر میری پوزیشن کو ایسا کوئی رخ دے دو کہ میں نظر بھر کر اس کو دیکھ تو سکوں......'' اس نے برابر لیٹی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اشتیاق سے لبریز خواہش کا اظہار کیا تو سسٹر نے سر ہلا کر اس کے جذبات کو سمجھا اور آگے بڑھ کر اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے قدرے نیم دراز پوزیشن میں بٹھاتے ہوئے تکیوں کو اس کی کمر کے پیچھے کچھ اس طرح سیٹ کر دیا۔ اب وہ ذرا سا جھک کر اس کو دیکھ سکتی تھی...... وہ جو اس کی بچی تھی۔ اس کی اپنی بچی...... جس کے لیے اس نے خدا کو

پکار کر کہا تھا۔

"بیٹی ہونے کی صورت جو غلطیاں، گستاخیاں میری ذات سے سرزد ہوئی ہیں۔ اس کے کفارے کے لیے چاہتی ہوں آپ میری اولاد میں پہلے مجھے بیٹی سے نوازیں۔" اور اب جب اسے نواز دیا گیا تھا تو خوش آئند امید کے چراغ کی ٹمٹماتی لو جوبن پر لہرا لہرا کر ان لفظوں کی روشنی بکھیرنے لگی۔

"آج نوازنے والے نے قبولیت کی صورت اسے معافی کا پروانہ جاری کیا ہے۔ تو کل وہ اسے اپنے بندوں سے بھی سرخروئی عطا کروادے گا۔" اطمینان کی بہت سی لہریں سانسوں کے ساتھ دوڑتے لہو میں اتریں تو وہ پُرسکون ہو کر اپنے وجود کے اس حصے کی طرف دیکھنے لگی جو ہر بات سے بے خبر آنکھیں موندے سو رہی تھی...... اس نے ہاتھ بڑھا کر انگلی سے اس کے چھوٹے سے گلابی لبوں کو چھوا۔

گدگداتی سرسراہٹ نے بچی کو مسکرانے پر مجبور کیا تو بے انتہا خوب صورت مسکان اس کے چہرے پر بکھری اور اس کی پلکوں نے ذرا سی حرکت کی۔

چھوٹی، چھوٹی بند آنکھوں پر بھی، گہری سایہ فگن پلکیں...... چھوٹی سی کھڑی ناک، گول سپید چہرہ...... وہ بالکل اس کی فوٹو کاپی تھی۔ بے انتہا خوب صورت نرم و نازک...... اس نے ممتا بھری توجہ کا ہر رنگ اپنی نظر میں سمو کر اک مٹھاس سے گویا اس کی نظر اتاری۔ اور پھر اس کے چھوٹے سے ہاتھ کو اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے انگشتِ شہادت سے اس کی چھوٹی سی ہتھیلی پر واضح ہوتی لکیروں کو چھوتے ہوئے بولی۔

"سنا ہے بیٹی کا نصیب، ماں کے نصیب سے جڑا ہوتا ہے۔ اختلاف نہیں کر رہی جڑا ہوتا ہوگا...... مگر میں وہ ماں بننا چاہتی ہوں جو اپنی بیٹی کا نصیب خود اپنے ہاتھوں سے سنوار سکے...... بہت محبت بہت توجہ کے ساتھ...... ایسی محبت اور توجہ جس کو پا کر تم کسی چور راستے کی طرف قدم رکھنے کا سوچ بھی نہ سکو......" اتنا بول کر وہ ذرا دیر کو چپ ہوئی پھر لب کچل کر بولی۔

"اعتراف کرتی ہوں میں اچھی بیٹی نہیں تھی...... مگر تم میری ایسی اچھی بیٹی بنو گی جو بری بیٹی کے لیے ایک اچھی مثال ہوگی......" چند گھنٹوں کا وہ وجود اس کی باتیں نہ سن رہا تھا نہ سمجھ رہا تھا پھر بھی وہ کہہ رہی تھی۔

"تم میری ایسی بیٹی بنو گی ناں جس میں صبر ہوگا...... جس میں سمجھ ہوگی۔ جو اپنے گھر کے بند دروازے دیکھ کر چور دستوں کی طرف جانے کے بجائے بند دروازوں کو کھولنے کی کوشش کرے گی......" بے ربط، غیر مبہم باتیں کرتی وہ اضطراری انداز میں بہک کر اس سے پوچھنے لگی تھی۔

"سنو...... تم میری ایسی اچھی بیٹی بنو گی ناں؟"

اس سوال کے ساتھ اندر کہیں دبی سسکاری درد کی صورت بلند ہو کر اس کے لبوں سے ابھری تو دو آوارہ آنسو ضبط سے ہاتھ چھڑا کر پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر اس کے رخساروں کی زمین پر اتر آئے جنہیں صاف کرنے کو اس نے ہاتھ اٹھایا تو ماضی کی لپکتی یادوں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور اسے اس کی زندگی کے اس حصے کی طرف دھکیل دیا جہاں کھڑی وہ مسلسل اپنی ماں کو پکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"امی...... امی آپ سن رہی ہیں، میں کب سے آپ کو پکار رہی ہوں......" اور ماں جو موبائل کان سے لگائے پورے زور و شور سے بولتی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھی۔ اس کی پکار اور اس کی آواز کو مسلسل نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ ڈھیٹ بنی چند قدم کے فاصلے پر کھڑی پکارتی رہی...... کیونکہ وہ ان سے اسی وقت بات کر کے ہی وہاں سے ہٹنا چاہتی تھی...... جانتی تھی کہ اس کے بعد پھر سارے وقت اس کی ماں کو بھائیوں نے گھیرے رکھنا تھا...... اور ان کی موجودگی میں وہ کسی صورت بھی امی سے اپنی وہ بات کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس وقت وہ ہر صورت ان سے بات کر کے یہاں سے ہٹنا چاہتی تھی...... اسی لیے اس نے ان کو دوبارہ پکار کر کہا۔

"امی...... دو منٹ کی بات ہے، پلیز پہلے مجھے سن لیں......" قدرے جھنجھلائے انداز میں بولتی وہ ان کے سامنے ہوئی تو ماریہ بیگم نے پہلے گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر جھنجلا کر کال ڈسکنکٹ کرتے ہوئے سیل کو سائڈ پر پٹخ کر اس کی طرف مڑ کر کہا۔

"کون سی آفت آگئی ہے تم پر جو سکون سے بات

کرنا حرام کر دیا ہے؟''

''میں نے انتظار کیا تھا مگر آپ کی کال مسلسل لمبی ہوتی جارہی تھی۔'' اپنی طرف سے وہ اپنی صفائی میں بولی تھی مگر ماریہ بیگم کو سخت ناگوار گزرا۔جبھی غصے سے بولیں۔

''بکواس کم کیا کرو..... ہر وقت زبان چلاتی رہتی ہو۔''

''زبان کب چلائی.....؟'' امی کی یہ لعن طعن پرانی تھی مگر امروزیہ ہر بار نئے سرے سے حیران ہوتی تھی..... اور ماریہ بیگم ہمیشہ ایسے موقعوں پر اس کی حیران صورت دیکھ کر تپ کر اسے کچھ دے مارتی تھی..... مگر اس وقت آس پاس کچھ موجود نہ پاکر انہوں نے تپ کر کہا تھا۔

''اب بکو گی بھی کیوں سر کھا رہی ہو میرا.....؟''

انداز بہت تیکھا تھا مگر سوال اس کے مطلب کا تھا اس لیے معلوم سمجھ کر وہ فوراً بولی۔

''امی پچھلی بار بھی پارٹی کے وقت آپ نے مجھے منع کر دیا تھا..... مگر یہ اس بار میری آخری پارٹی ہے۔آخری سال ہے کالج میں میرا..... اس کے بعد آپ لوگوں نے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت بھی نہیں دینی..... اس لیے پلیز مجھے میری یہ آخری پارٹی اٹینڈ کرنے کی اجازت دے دیں.....'' درخواست گزار انداز میں اس نے اپنی درخواست ان کے گوش گزار کی تو وہ ایک دم قطعی انداز میں انکار کرتی بولیں۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی..... جانتی بھی ہو تمہاری ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے کتنی مشکل سے کالج میں پڑھنے کی اجازت ملی تھی تمہیں لیکن اب پڑھائی سے ہٹ کر تمہارا باپ، بھائی اس طرح کی لغویات کی تمہیں اجازت نہیں دے گا..... اور سب جانتے کے باوجود بھی نہ جانے کیوں ہر بار نیا تماشا لے کر کھڑی ہو جاتی ہو تم.....'' انہوں نے اسے اچھا خاصا جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس نے ہمت جمع رکھ کر دوبارہ کہا تھا۔

''امی پلیز..... بس ایک گھنٹے کی تو بات ہے۔دو بجے جائیں گے تین بجے واپس بھی آجاؤں گی۔اور پھر میں اکیلی تھوڑی نہ ہوں گی..... پوری کلاس ساتھ ہوگی۔ سب ٹیچرز ہوں گے، میڈم ہوں گی.....'' اجازت مل جانے کی خواہش میں وہ ان کو ہر طرح سے مطمئن کر لینا چاہتی تھی مگر ان کی نہ، ہاں میں بدل جائے یہ ناممکن تھا۔

یہی وجہ تھی اس کی باتوں پر توجہ دیے بنا اس بار انہوں نے پہلے سے زیادہ قطعی انداز میں انکار کرتے ہوئے کہا۔

''وہاں موجود لوگوں کی گنتی مت کرواؤ مجھے..... وہ لوگ اگر کنویں میں گریں تو کیا تم بھی ان کے ساتھ کنویں میں گرو گی.....؟'' انہوں نے تیز نظر سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور اب اس بات کی رٹ لگا کر پھر سے میرا سر مت کھانا..... ایک بار واضح کہہ دیا ہے کہ نہیں جانا تو بات کو یہیں ختم کرو اور جا کر ثمرانہ کو دیکھو..... کب سے سبزی بنانے کو دی ہوئی ہے..... اسی کو لے کر بیٹھ گئی ہے کام چور کہیں کی۔''

زبان کے آگے تو گویا ان کے خندق تھی..... جس کے لیے بھی بولتی تھیں تاڑ کر رکھ دیتی تھیں..... اب جو اس کے ساتھ ثمرانہ کا خیال آیا تو اس کے لیے بھی تلخ ہو گئیں..... امروزیہ نے لبوں کو بھینچا اور پھر بس چند پل وہاں کھڑی رہ کر کچھ سوچا اور وہاں سے پلٹ آئی۔

☆☆☆

بیٹیاں شاید سن لیتی ہیں اس لیے ان کو سنا، سنا کر دبا دیا جاتا ہے، بیٹے منہ زوری کرتے ہوئے دہاڑتے ہیں اس لیے ان کی منہ زوری کو لگام ڈالنے کے بجائے رسی توڑ کر آزادی دے دی جاتی ہے۔ایسا کہیں تھا یا نہیں مگر اس کے گھر میں ہر لمحہ ایسا ہی تھا جہاں حکمران مرد تھے۔ جن میں سے ایک مرد اس کا جڑواں بھائی بھی تھا..... جس نے دنیا میں آنکھ اس سے بس پانچ منٹ پہلے ہی کھولی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ اس سے اعلیٰ و ارفع درجہ رکھتا تھا۔شاید اس لیے کہ وہ ایک مرد تھا؟ اور اب اپنی اس مردانگی کے زعم میں وہ ماریہ بیگم کے سامنے کھڑا بے پروائی سے بتا رہا تھا۔

''امی صبح مجھے جلدی جگا دیجیے گا..... میں نے ٹرپ کے لیے سات بجے نکلنا ہے۔'' پوچھ تو وہ ہرگز بھی نہیں رہا تھا اور انداز اس کا بتانے والا بھی نہیں تھا۔تو پھر ماریہ بیگم کو خود اس سے پوچھ لینا چاہیے تھا مگر وہ کہہ رہی تھیں۔

''کہاں جا رہا ہے تمہارا ٹرپ.....؟''

''فورٹ منرو.....'' جیکٹ کے شولڈر کو جھٹکے سے سیدھا کرتے ہوئے اطلاع بم پہنچائی گئی تھی جسے سن کر

ماریہ بیگم نے فکرمند انداز میں تلقین کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ ..... وہ بہت خطرناک جگہ ہے زیبی ..... جا رہے ہو تو بہت خیال رکھنا۔'' ان کے انداز اور فکر کو محسوس کرتے ہوئے پاس بیٹھی امروزیہ بری طرح کلس کر بڑبڑائی تھی۔

''فکر میں تو یوں گھل رہی ہیں جیسے ہونہار سپوت [illegible] کی حفاظت کے لیے جنگ کرنے [illegible] ہو [illegible] ''اور سپوت کہہ رہا تھا۔

''ہاہا..... امی میری فکر کرنا اب چھوڑ دیں..... بڑا ہو گیا ہوں میں اب..... اپنا خیال رکھنا آتا ہے مجھے۔'' [illegible] قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے بڑا لطف لے کر ماں کو [illegible] دیکھا [illegible] تھا، چاہا تو پہلے سے جلتی کلستی [illegible] امروزیہ مزید [illegible] بڑبڑائی۔

''جیسے [illegible] میں [illegible] نہیں ہوں ..... پھر میرے ساتھ فرق روا کیوں رکھا جاتا ہے [illegible]'' وہ لبوں پر [illegible] تھی مگر اندر بہت سے سوال اور غم [illegible] تھے..... [illegible] تھا [illegible] اور وہ وہاں رکتی تو [illegible] ب سے تلوار بن کر آواز نکلتی اور اس کی موت کی وجہ بن جاتی اسی لیے وہ اندر مچلتے سوالوں کے اور غم کا گلا دبا کر وہاں سے اٹھی اور ڈرائنگ روم میں آ گئی جہاں ابو ہر فکر سے آزاد ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے بیٹھے تھے ..... وہ بھی جلے دل کے ساتھ وہیں ایک کونے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ جب اس نے برابر والے کمرے سے حدید کے غصے سے چنگھاڑنے کی آواز سنی۔

''سارا دن گدھوں کی طرح مشقت کر کے اس گھر کے لیے کما کر لاتا ہوں..... تین ٹائم میں سے ایک ٹائم یہاں آ کر کھانا کھاتا ہوں..... اور اس ایک ٹائم کے کھانے میں تم میرے لیے سالن کے جو ہڑ میں تیرتی یہ ٹھنڈی ٹھار دو ہڈی والی بوٹیاں لے کر آئی ہو؟''

''نہیں، بھائی سالن گرم ہے..... آپ کھا کر تو دیکھیں.....'' بیچاری ہمیشہ کی خاموش طبع ثمرانہ نے بھائی کے بے انتہا غصے کو دیکھ کر بے حد ڈرے، سہمے انداز میں اپنی صفائی دے کر اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا تھا..... مگر پہلے سے بھڑکا حدید مزید بھڑک کر بہت اونچی آواز میں حلق پھاڑ کر چلایا۔

''چپ کرو مصیبت کی دکان ..... سامنے آتی ہو تو خون جلاتی ہو میرا..... میرے لیے عذاب ہو تم ..... اور وہ امروزیہ بھی ..... ایک کے بجائے دو، دو عذاب پیدا کر کے میرے سر چھوڑ دیے تمہارے باپ نے۔ خود سارا دن گھر میں چارپائی توڑتا ہے اور میں جانوروں کی طرح کما، کما کر پاگل ہوا جاتا ہوں..... اور بدلے میں یہ سالن [illegible] کھانے کو ملتا ہے مجھے۔'' [illegible] بے قابو ہوتے ہوئے اس نے ہاتھ مار کر سامنے رکھی سالن کی پلیٹ گرا دی۔ سر جھکا کر کھڑی ثمرانہ نے خاموشی سے سب بنا ضبط سے سب سہا اور پھر فرش پر دور تک گرے سالن کو صفائی سے صاف کر کے برتن اٹھا کر باہر آ گئی جہاں ماریہ بیگم اس کے مزید لتے لینے کو تیار کھڑی تھیں۔

''میسنی [illegible] ..... خود چپ رہتی ہے مگر صلواتیں ماں، باپ کو سنواتی ہے..... جب معلوم ہے وہ شوربے والا سالن پسند نہیں کرتا تو اس کے سالن کو کچھ دیر چولہے پر رکھ کر شوربے کو خشک نہیں کر لی تھی کیا.....؟ چاہتی ہو تم [illegible] مگر نہیں۔ تم کیوں کرتیں ایسا..... تمہیں تو [illegible] کو ذلیل کروانے میں مزہ آتا ہے ناں..... تو [illegible] ذلیل کرواتی ہو [illegible] دکھی کر کے تمہیں تم بھی چین نہیں رہو گی.....'' [illegible] ماریہ بیگم اپنی بھڑاس اس [illegible] میں [illegible] اور اب انہوں نے بہت دیر تک [illegible] بند [illegible] ان کا لاڈلا بیٹا [illegible] سے بھلے سے وہ [illegible] اگلی جان کی بدولت اس کے بھوکے رہنے کے خیال نے اب ان کی جان کو ہلکان کیے رکھنا تھا ..... اور وہ قہقہے، وہ بے شامت ثمرانہ کی آئی رہتی تھی۔ جس کی پہلی شفٹ لگا کر ماریہ بیگم جا چکی تھیں ..... جبکہ ثمرانہ نے ابھی وہیں رک کر کچن کی پھیلی بے ترتیبی کو سمیٹنا تھا ..... چنانچہ آگے بڑھی اور کام میں لگ گئی۔ پھر جب وہ سب سمیٹ چکی تو دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی اپنے اور امروزیہ کے کمرے میں چلی آئی..... یہاں امروزیہ اس کی آمد کی منتظر تھی..... وہ سامنے آئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کر بولی۔

''ثمرانہ کیا تم مجھے اپنا منہ کھول کر دکھا سکتی ہو.....؟''

''ہاں..... مگر کیوں.....؟''

"دیکھنا چاہتی ہوں...... تمہارے منہ میں زبان ہے یا نہیں......" اس کے سادہ سے انداز پر وہ دانت پیس کر بولی تو ثمرانہ اس کی بات کا مفہوم سمجھتی ہوئی گہری سانس بھر کر پہلے کچھ پل خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"منہ میں زبان ہے میرے......"

"تو پھر غلط کو غلط کیوں نہیں کہتی ہو تم......؟ اب اتنا کچھ سنتی رہیں، کچھ کہا کیوں نہیں کہ گیس نہیں تھی تو سالن کیسے خشک کرتی؟"

"میں کیا بتاتی...... ان کو خود معلوم نہیں ہے گیس کا مسئلہ کس قدر بڑھا ہوا ہے...... پھر سب جانتے ہوئے بھی میں ہی بتا کر بات کو بڑھاتی...... اور پھر میں بتا بھی دیتی...... غلط کو غلط بول دیتی تو پھر بھی کیا ہو جاتا تھا؟"

"پہلے سے کچھ نہ ہوتا...... مگر کم از کم غلط کو غلط بول کر تمہارا ضمیر تو مطمئن ہو جاتا کہ تم اپنے حق کے لیے بولیں۔" امروزیہ نے دوبدو جواب دیا تو ثمرانہ سر ہلا کر بولی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... مگر میں اس حق کے لیے بولنا ہی نہیں چاہتی جس کے لیے بول کر پہلے سے زیادہ ذلت میرا مقدر بن جائے......" اس نے نفی انداز میں کہا۔

"تم جیسے لوگ ہی ظالموں کو اپنی چپ سے شہہ دے کر ان کو ظلم کی انتہا تک لاتے ہو......" امروزیہ نے بہت مایوسی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں...... یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر مجھے یہ بتا دو تم جو بول لیتی ہو، تمہیں کیا مل جاتا ہے بول کر......؟ سوائے مار اور دھتکار کے...... اور اس کے بعد پھر نہ کوئی تمہیں دیکھنا پسند کرتا ہے نہ سننا چاہتا ہے۔ مجھے کم از کم سامنے برداشت تو کر ہی لیا جاتا ہے ناں۔" ثمرانہ کے صبر وضبط کی انتہا پر امروزیہ بری طرح بھنا گئی۔

"واہ...... بہت اچھے...... تمہارے اس اعزاز کے لیے تمہیں تو تمغے سے نوازنا چاہیے...... مگر ابھی مل نہیں رہا ناں تو اس تمغے کے ملنے تک مری رہو تم...... ان خود غرض لوگوں کی جوتیاں کرتی رہو سیدھی۔ مجھے نہیں پسند یہ سب...... گھٹن ہوتی ہے مجھے یہاں اس منافقانہ ماحول سے، ان خود غرض لوگوں سے۔ دیکھ لینا جس دن میری برداشت ختم ہوئی میں اپنے ساتھ کچھ کر لوں گی......"

ہمیشہ کی طرح اندر سے گھٹن نکالتی وہ اپنے عزائم سے آگاہی دیتی ہوئی اسے وہیں چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی چھت پر چلی آئی...... جہاں زیادہ دیر نہ سہی مگر کچھ وقت نیچے کے گھٹن زدہ ماحول سے چھٹکارا پا کر وہ سکون سے گزار لیا کرتی تھی۔ اور یہ پل اس وقت زیادہ خوب صورت محسوس ہوتے تھے جب برابر کے گھر کی چھت پر حاشدہ بھی چلی آتی۔ حاشدہ بہت زیادہ ہنسا کرتی تھی کہ وہ اس کی اتنی زیادہ ہنسی پر رشک کیا کرتی تھی۔ اس کی باتیں اس قدر خوب صورت ہوتی تھیں کہ وہ خواہش کرتی کہ حاشدہ اسی طرح اس کو محبت کی خوب صورت باتیں بتاتی رہے اور عمر تمام ہو جائے۔

اب بھی وہ اوپر آئی تو حاشدہ کا خیال تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند اس کے دماغ کو تر و تازہ کرتا محسوس ہونے لگا۔ وہ ہلکا سا مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور دونوں چھتوں کی درمیانی منڈیر سے برابر کی چھت پر جھانکنے لگی...... جہاں حاشدہ موبائل کان سے لگائے ٹہل ٹہل کر کسی سے باتیں کرتی عادت کے مطابق اونچا اونچا ہنس رہی تھی۔ اس پر نظر پڑی تو اسے اشارے سے دو منٹ ویٹ کا کہہ کر موبائل پر جلدی جلدی بات ختم کی اور پھر مسکراتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔

"اف...... تمہارے انتظار میں ٹہل ٹہل کر میری ٹانگیں درد کرنے لگیں......"

"میرا انتظار...... خیر ہے......؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"ہاں...... سب خیر......" اس نے سر ہلایا تو امروزیہ نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تو پھر......؟"

"تو پھر یہ کہ تمہیں بہت شوق تھا ناں میرے بہنوئی سے ملنے کا......؟" وہ ضرورت سے زیادہ پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں...... میں اس شخص کو دیکھنا چاہتی ہوں جو بے حد...... لونگ ہے، کیئرنگ ہے، جو خود سے زیادہ خود سے جڑے لوگوں کا خیال رکھتا ہے...... اور جو اپنی بیوی سے عشق والی محبت کرتا ہے۔" امروزیہ نے کہا۔

حاشدہ کا بہنوئی اس کے لیے وہ شخصیت تھا جس کے لیے اس کے دل میں عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا

تھا...... اس کی اس قدر عقیدت کی سراسر وجہ حاشدہ تھی جو ہر وقت اس کے سامنے اپنے بہنوئی کی ہر عادت کا، اس کی اپنی بہن سے بے انتہا محبت کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے اس کا اس قدر ذکر سن کر وہ عقیدت مندوں میں شامل ہو گئی...... اور اسے اس شخص کو دیکھنے کی خواہش کچھ اس لیے بھی تھی کیونکہ اس کے نزدیک یہ ایسی خصوصیات کا حامل پہلا شخص تھا جو اس کے گھر کے مردوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی، عزت دیتا مرد کیسا ہوتا ہے...... اور آج حاشدہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ اس کے بہنوئی سے ملنا چاہتی ہے؟

اور وہ اگر ملنا نہیں تو کم از کم اس عظمت کے مینارہ شخص کو دیکھنا ضرور چاہتی تھی چنانچہ اس کے پوچھنے پر بلا جھجک اقرار میں سر ہلا کر بولی۔

"ہاں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تو بس پھر تم اپنی تیاری پکڑ لو...... میرے بہنوئی کل کی فلائٹ سے پاکستان آ رہے ہیں۔" حاشدہ بے حد خوش تھی...... یہ سن کر خوشی اسے بھی ہوئی تھی جبھی بولی تھی۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

"ہاں...... اور ہم نے یہ بات ابھی تک آپی کو نہیں بتائی ہے...... بھائی نے بتانے سے منع کیا ہے...... کیونکہ تمہیں معلوم ہے ناں وہ آپی کے...... کس قدر دیوانے ہیں...... تو اب آپی کی ڈلیوری قریب آ رہی ہے تو سب چھوڑ چھاڑ کر آپی کے پاس آ رہے ہیں...... اور پھر کل آپی کا برتھ ڈے بھی ہے۔ اب دیکھو بھائی بھلے سے یہاں نہیں ہیں مگر انہوں نے آپی کی سرپرائز برتھ ڈے پارٹی کی سلیبریشن کے لیے تمام ارینجمنٹ وہیں سے کر لی ہے۔ اب بس کل جب وہ آئیں گے تو خوشگوار دھماکے ہوں گے...... اور میں چاہتی ہوں ان دھماکوں میں تم بھی شرکت کر لو...... اس لیے تم کو ابھی سے آپی کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے انوائٹ کر رہی ہوں...... تم لازمی آنا سمجھیں۔" جوش و خروش میں بے ربط سا مسلسل بولتے ہوئے آخر میں اس نے پارٹی انویٹیشن دیا تو امروزیہ ایک دم چپ سی ہو گئی تھی پھر ذرا جھجک کر بولی۔

"مگر میں کیسے آ سکتی ہوں حاشدہ......"

"کیوں نہیں آ سکتیں...... تم ضرور آؤ گی۔ میں نے اپنے سب کزنز اور فرینڈز کو بھی انوائٹ کیا ہے...... سب ہوں گے، تم بھی آ جانا......" اس نے چٹکی بجا کر اپنے جوش کا اظہار کیا۔

"مگر میں نہیں آ سکتی...... تمہیں تو معلوم ہے ناں میرے بھائی...... وہ کبھی اجازت نہیں دیں گے۔" اس نے مختصراً بتا کر اس کی توجہ اپنی اس پرابلم کی طرف کروائی جو وہ اکثر اس کے ساتھ شیئر کرتی رہتی تھی۔ حاشدہ سے پہلے اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ اسٹوڈنٹ لائف میں سب سے ہائے ہیلو تو رہی مگر بات کبھی دوستی تک نہیں آئی...... نہ جانے ایسا کیوں تھا، وہ سب کو سن لیتی تھی مگر جب اپنی سناتی تو لوگ اسے اوائڈ کرنا شروع کر دیتے۔ اس لیے اس نے لوگوں کو سننا اور اپنی سنانا دونوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو حاشدہ ہی تھی، پہلے خود بلا تکان بولتی...... مگر اتنا اچھا بولتی کہ وہ اس کی باتوں کو سن کر فیسی نیٹ ہونے لگتی۔ حاشدہ کی دنیا اسے رنگین خواب کے مانند جب اپنے رنگوں کی طرف اٹریکٹ کرتی تو وہ بنا کسی مزاحمت کے آگے ہو کر یاسیت سے اپنی تاریکی اس کو دکھاتی تو حاشدہ اس کو چپ کر کے سن لیا کرتی تھی۔ سن لیتی اور پھر سن کر سر جھٹک کر سمجھاتے اپنی رنگین دنیا کی سیر کرانے ساتھ لے چلتی تو وہ بھی ساتھ چل پڑتی۔ اس لیے اس کی اور حاشدہ کی بہت اچھی نبھ رہی تھی...... مگر اب آج سب جاننے کے باوجود حاشدہ نے اس کو اپنی رنگین دنیا کا حصہ بننے کی دعوت دی تو مایوسی سے اس کا منہ لٹک گیا۔ حاشدہ نے کچھ محسوس کیا۔

"ارے یار...... تم ذرا دیر کے لیے آ جانا...... بھائی کو دیکھنا، ملنا اور واپس چلی جانا۔ اور رہی اجازت...... تو اس اتنی سی دیر کے لیے اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے...... تم نے بتایا تھا تمہارے بھائی رات سے پہلے گھر نہیں آتے...... ابو سارا دن ٹی وی یا دوستوں میں مصروف رہتے تھے، امی تمہاری سارا دن موبائل کو یا نیند کو پیاری رہتی ہیں بہن تمہاری ویسے ہی بے زبان بندی ہے...... تو سارے کا سارا راستہ صاف ہی تو ہے، تم بغیر اجازت بھی آ سکتی ہو...... آ جانا پھر جلدی چلی جانا...... کون سا دور جانا ہے۔" اس کے نزدیک اجازت کا نہ ملنا گویا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا...... اس لیے کندھے اچکا کر حل

پیش کیا اور پھر لفظوں پر زور دیتی دوبارہ بولی۔

''دیکھو تمہاری دوست ہوں...... تمہارا خیال تھا مجھے اس لیے میں نے تمہیں اپنی خوشی میں شریک ہونے کا دعوت نامہ بھی دیا اور ساتھ ہی آنے کا حل بھی پیش کر دیا۔ اب تم پر ڈیپنڈ کرتا ہے کہ تم نے کیسے آنا ہے...... اگر آ جاؤ گی تو مجھے اچھا لگے گا۔'' وہ جانے کو دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''تم ضرور آنا میں انتظار کروں گی یہاں سیڑھیوں پر...... تم آؤ گی تو ساتھ لے چلوں گی......'' اس نے کہا اور کہہ کر جانے کو پلٹ گئی۔

وہ چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی اور وہ مزید قدم اٹھا کر اس سے دور ہوئی اور پھر سیڑھیاں اتر کر نظروں سے اوجھل ہو گئی...... جبکہ اپنی منڈیر سے جھک کر کھڑی امروزیہ کتنی ہی دیر بلا مقصد اس کے کلف لگے پا کو گھورتی رہی جب تھک گئی تو ڈھیلے قدموں سے پلٹ کر خود ہی نیچے آ گئی جہاں ماریہ بیگم فون پر کسی سے الجھ رہی تھیں...... ابو ہمیشہ کی طرح ٹی وی فل والیوم میں کھولے سامنے جم کر بیٹھے تھے۔ ثمرانہ دوپہر سے شام تک جمع ہوئے برتن دھو رہی تھی۔ اس نے ایک نظر سب پر ڈالی اور اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں کچھ دیر یونہی کند ذہنی سے بیٹھی غیر مرئی نقطے پر نظر جما کر کچھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی، ہر سوچ کا الجھا سرا مزید الجھا محسوس ہونے لگا تو سر جھٹک کر بیگ سے کتاب نکالی اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنی اس کوشش کو اس نے اس وقت تک جاری رکھا جب تک ثمرانہ اپنے ہر کام سے فارغ ہو کر اس کے برابر آ کر نہیں بیٹھ گئی۔

''بہت تھک گئی ہو......؟'' کتاب بند کر کے اس نے ساری توجہ انگلیوں سے کنپٹیاں دباتی ثمرانہ کی طرف مبذول کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی انگلیوں کی گردش رکی...... اور اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میری تھکن کا اگر تمہیں اتنا ہی احساس ہوتا تو تم میری تھوڑی سی مدد ہی کروا دیا کرتیں۔''

''ضرور کروا دیتی...... مگر میرے پیپر ہونے والے ہیں ناں...... مجھے پڑھنا ہوتا ہے......'' اس کے پیش کیے جواز پر ثمرانہ نے منہ بنا کر کہا۔

"جب فضول کے اتنے گھنٹے چھت پر گزار کر آتی ہو تب تمہیں یہ سب یاد نہیں آتے؟"

"آتے ہیں... لیکن اگر سارا دن یہاں کے ماحول سے بھاگ کر کچھ دیر اوپر بھی نہ گزاروں تو شاید پاگل ہی ہو جاؤں۔"

"میں تو پاگل نہیں ہوئی..." ثمرانہ کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے امروزیہ نے تیزی سے پرتجسس انداز میں کہا۔

"اور کیسے پاگل ہوا ہے تم نے... ہو تو گئی ہو پاگل۔"

"اچھا..." ثمرانہ نے لفظ اچھا کو کھینچ کر بولتے ہوئے سر کو ہلایا اور مزید کہنے لگی۔ "جس روز تمہاری وقت گزاری کا سبب ختم ہو گیا تو تم بھی پاگل کر دی جاؤ گی۔"

"تم بتاؤ نا..." امروزیہ نے اصرار کیا۔

"جن باتوں کا کوئی مطلب نہ ہو... ان کی بات ہوتی ہے وہی باتیں سب سے زیادہ دکھ دیتی ہیں... تمہارا دل ہونی راز افشا کرتی ہیں۔" اس کی بات پر امروزیہ اسے گھورتی رہی جو لائٹ بند کر کے اب بستر پر لیٹ گئی تھی۔

"ثمرانہ... کل حاشدہ کے گھر پارٹی ہے۔ اس نے مجھے بھی دعوت نامہ دیا ہے..." امروزیہ نے لیٹتے ہوئے کہا۔ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری کی تھی... تاکہ مکمل جاننے کے لیے ثمرانہ خود اس سے سوال کرے مگر ثمرانہ نے اس کی بات کو غیر ضروری سمجھ کر کوئی رسپانس دیے بنا اپنی چپ کو ہنوز قائم رکھا تو اس نے منہ بنا کر کروٹ اس کی طرف لی اور اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔

"تم سن رہی ہو ناں......؟"

"ہاں..... مگر تمہاری فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں، اس لیے چپ ہوں....." اندھیرے میں تاثرات واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر لہجے کے تاثرات ضرور محسوس ہوئے تھے۔

"میں نے کون سی فضول بات کی ہے....." امروزیہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "بتا رہی ہوں حاشدہ نے کل اپنے گھر پارٹی کا دعوت نامہ دیا ہے...... اس کا بہنوئی قطر سے اپنی بیوی کی متوقع ڈلیوری اور اس کی آنے والی سالگرہ پر سرپرائز سلیبریشن کے لیے خود سرپرائز بن کر آ رہا ہے..... حاشدہ چاہتی ہے میں بھی اس پارٹی میں شرکت کروں..... اور میں خود بھی وہاں جانا چاہتی ہوں... میں وہاں جا کر اس شخص کو دیکھنا چاہتی ہوں جو سراپا محبت ہے...... جو بولتا ہے تو لفظ محبت بن جاتے ہیں جو دیکھتا ہے تو نگاہوں سے احترام جھلکتا ہے۔" عجیب سے احساسات میں گھری ابھی وہ مزید بول رہی تھی کہ ثمرانہ نے سرعت سے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اس شخص کے لفظوں کی محبت اور نگاہوں کا احترام اس کی بیوی کا نصیب ہے، تمہیں کیا ضرورت ہے یہ سب دیکھنے کی۔"

"ضرورت نہیں.... بس یہ میری خواہش ہے...... دیکھنا چاہتی ہوں محبتوں سے گندھا شخص کیسا ہوتا ہوگا۔" اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی وابستگی تھی ثمرانہ نے بھی واضح محسوس کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"امروزیہ تم پاگل ہو گئی ہو...... کتنا میں نے تمہیں منع کیا مت ملا کرو اس حاشدہ سے مگر تم ملتی رہیں اور اس کی باتیں سنتی رہیں اور اب آج..." اس نے بے بسی سے لب بھینچے..... پھر اس نے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"امروزیہ میری بہن، محبتوں سے گندھا شخص جیسا بھی ہوتا ہے، وہ انہی کے لیے ہوتا ہے جن کا وہ نصیب ہوتا ہے..... اور کسی کے نصیب کو یوں دیکھنے کی تمہاری چاہ اس کے لیے حسد بنے نہ بنے مگر تمہارے لیے بربادی کا آغاز ضرور بن سکتی ہے...... اور پھر کیا ضرورت ہے پرائی آگ میں ہاتھ سینکنے کی..... تم نے تو یہیں رہنا ہے...... اسی گھر میں، انہی لوگوں میں جو تمہارے نصیب میں لکھ کر تمہیں دے دیے گئے ہیں۔" وہ ہر ممکن صورت اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اگر تم بول چکی ہو تو اب چپ کر جاؤ..." وہ جو لجاجت سے بولتی اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبا کر اپنے ہونے کا احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی اس کی بات سن کر بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی جس نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ کو اس کی ہاتھوں کی گرفت سے نکال کر کہا تھا۔

"ہر وقت بھاشن دینے مت بیٹھ جایا کرو ثمرانہ...... میں کہیں نہیں جا رہی ہوں، نہ اس گھر سے نہ اس گھر کے لوگوں سے...... اپنے نصیب کی اس کالک کو میں تم سے پہلے قبول کر چکی ہوں۔ مگر انسان ہوں تھوڑی سی آزاد فضا میں سانس لے کر دنیا کے اس رنگ کو دیکھ لینا چاہتی ہوں جسے ہمارے نصیب کی کالک نے ہمارے لیے بدرنگ کر دیا ہے۔ بس میں صرف دیکھنا چاہتی ہوں...... سنا تم نے۔ چھونے کی تمنا کروں تو خدا کرے اپنی خلش کی تمنا میں جل مروں......" لفظوں کی تلخی میں آخر میں نمی چھلکی تو ثمرانہ کا دل سینے کے پنجرے میں بری طرح تڑپا تھا۔

"خدا نہ کرے امروزیہ...... ایسی باتیں مت کرو...... میں دعا کرتی ہوں میرے نصیب میں اگر کوئی ایک خوشی بھی ہو تو خدا وہ بھی تمہیں عطا کر دے...... تم میری بہت اچھی بہن ہو......"

وہ واقعی اس کی بہت اچھی بہن تھی...... اس کا خیال رکھتی تھی...... اس کے لیے لڑ لیتی تھی، بول لیتی تھی اور جہاں اس کا بس نہ چلتا تو اور کچھ نہیں تو اس کے لیے جل کڑھ لیتی تھی اور وہ احساس سے عاری لوگوں میں اپنے لیے محسوس کی جانے والی اس ہمدردی کو محسوس کر کے خوشی محسوس کرتی تھی۔ وہ اس سے خوش تھی مگر وہ...... اس سے چھوٹی بلکہ ان سب میں چھوٹی...... اپنے جڑواں بھائی سے بھی پانچ منٹ چھوٹی...... ان سب میں زیادہ جذباتی تھی۔ اس کے لیے اسے ڈر لگتا تھا کہ گھر کا ماحول اسے باغی کر کے کسی غلط راہ کی طرف راغب نہ کر دے اس لیے اسے جب جہاں لگتا امروزیہ کمزور پڑ رہی ہے، ثمرانہ اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش ضرور کرتی۔ وہ الگ بات کہ امروزیہ اس کی اس کوشش کو بڑے آرام سے کچل کر اپنی سی کر جاتی تھی۔ جیسے اب سر جھٹک کر بے پروا انداز میں اس کی سب سن کر پھر اپنی کہنے کو لب کھولے۔

"اپنے نصیب کی جس ایک خوشی کو تم مجھے دینے کے لیے اللہ سے کہتی ہو...... تمہارے اس نصیب کے لیے میں اللہ سے بہت پہلے کہہ چکی ہوں کہ وہ تم جیسی...... بے زبان، چپ رہ کر سب سہنے والی لڑکی کے نصیب میں مجھ جیسی لڑ مر کر حق وصولنے والی لڑکی کے نصیب کی ہر خوشی لکھ دے...... اور دیکھ لینا اس نے لکھ دی ہو گی......" یقین کی چمکی نے ثمرانہ کو اتنا شاکڈ کیا تھا کہ زبان پتھر کی محسوس ہونے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ جواباً کچھ بھی نہ بول سکی۔

"بدلے میں اب بس تم یہ کرنا کہ اپنی زبان کو مزید بند رکھنا...... باقی مجھے کسی کی فکر نہیں ہے۔ زبیر ٹور پر جا رہا ہے...... جو پرسوں رات سے پہلے گھر نہیں آئے گا...... امی ابو کو اپنی مصروفیات سے فرصت نہیں ہو گی۔ میرا جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے کام میں جاؤں گی بھی اور جلد واپس بھی آ جاؤں گی۔"

گناہ خوب صورت ہوتا ہے گو کہ راستہ بہت سہل دکھائی دے رہا تھا مگر اکثر سہل راستے اپنے مسافر کے پاؤں میں سفر کی ایسی بیڑیاں ڈال دیتے ہیں کہ چل چل کر پاؤں آبلہ زدہ ہو جاتے ہیں مگر منزل نہیں ملتی......

امروزیہ بھی غلط راستے کا انتخاب کر رہی تھی۔ ثمرانہ نے اسے باز رکھنے کو پھر سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر امروزیہ نے ذرا سا اٹھ کر تکیے کو درست کیا پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولی۔

"میں سو رہی ہوں اب تم بھی سو جاؤ......" اور تھوڑی دیر تک وہ واقعی سو بھی گئی تھی مگر ثمرانہ بہت دیر تک اس کے لیے جاگتی رہی تھی۔

اگلے روز وہ معمول کی طرح جاگی...... روٹین کے کام میں ثمرانہ کی تھوڑی سی مدد کی۔ کچھ کھنٹے پڑھائی کی نذر کیے اور پھر مقررہ وقت پر قدرے بہتر کپڑے زیب تن کیے بالوں کو نئے سرے سے کنگھا کر کے چوٹیا کے بل ڈالے اور دوپٹا سر پر درست کرتی اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اوپر کے راستے سے جا رہی ہوں...... واپس بھی وہیں سے آ جاؤں گی...... کوئی مسئلہ ہو تو سنبھال لینا...... بس زیادہ دیر وہاں نہیں رکوں گی۔" بات کو مکمل کرتے اس نے صحن کی جانب قدم بڑھا دیے...... پیچھے چپ کھڑی ثمرانہ بے بسی سے چپ کھڑی اسے خود سے دور ہوتا دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

جب اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر وہ عاشدہ کی چھت پر اتری تو عاشدہ اپنے گھر کی اترتی سیڑھیوں پر اس کی منتظر تھی...... وہ کنفیوژ سی اس کی طرف بڑھی تو وہ پرجوش سی اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے لے آئی جہاں سب جمع

ابھی وہ پسیجی ہتھیلیوں کی نمی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو قمیص کے دامن سے رگڑ کر خود کو پوری طرح باور کرا بھی نہ سکی تھی جب اس نے اپنے برابر کی دو کرسیاں چھوڑ کر تیسری کرسی پر کسی کو براجمان ہوتے محسوس کیا...... تو گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ مقابل نے بہت خوب صورت مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی، وہ ایک دم ٹپٹائی۔

"امروزیہ ہو ناں......؟" دوسرا جملہ پہلے جملے سے زیادہ دھماکا خیز تھا اس کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔ اور مقابل محسوس کر کے چھت پھاڑ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"سچ کہا تھا حاشدہ نے تمہاری آنکھیں صحرائی ہیں...... دیکھنے والے کی نگاہ کو اپنے دیدار کی پیاس دے کر باقی ہر احساس سے بنجر کر دیتی ہیں۔ اور تم یہ کر رہی ہو مگر دیکھو میں بڑا کمزور دل بندہ ہوں میرے حال پر رحم کرو......" وہ جی بھر کر حظ لے رہا تھا...... جبکہ اس کی آنکھوں کے ساتھ منہ بھی پورے کا پورا کھل گیا تھا۔ وہ ایک دم بہت گھبرائی۔

"اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے......" اپنی سوچ پر فوری عمل درآمد کے لیے اس نے قدموں کو سمیٹ کر اٹھنے کی کوشش کی تو مقابل نے ہنسی کے فوارے وقتی میں اتارتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر تیزی سے کہا۔

"اچھا...... اچھا سوری...... اب اور تنگ نہیں کروں گا......" انداز اتنا بے ساختہ تھا وہ ذرا سا رک سی گئی مقابل نے محسوس کیا تو فوراً بولا۔

"حاشدہ کے ماموں کا بیٹا ہوں...... اور اس کا بیسٹ فرینڈ بھی ہوں...... میڈم کی باتوں میں تمہارا اس قدر ذکر ہوتا ہے کہ سننے والے کو تم حفظ ہو جاتی ہو...... بہت انوسنٹ لگتی ہو تم اسے...... اس جہان میں موجود کسی دوسرے جہاں کی بے قرار روح......" ہر زبان پر اس کا ایک الگ اور اچھا تعارف تھا...... حاشدہ کی اس قدر محبت پر اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں جبکہ مقابل اس کی کیفیت سے بے خبر اب اپنی کہہ رہا تھا۔

"تمہارے اتنے ذکر کے بعد...... اب تو میری بھی خواہش تھی کہ تمہیں دیکھوں اور میں دیکھ رہا ہوں تم یہاں موجود لوگوں میں سب سے الگ ہو...... اور خوب صورت اتنی ہو کہ میرا دل تمنا کر رہا ہے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہاری الگ دنیا میں تمہارے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلوں اور عمر تمام کر دوں......"

اُف پہلی بار مل رہا تھا اور کس قدر بول رہا تھا وہ...... اور نہ جانے کیا، کیا بول رہا تھا...... اس کے حواس ایک بار پھر ساتھ چھوڑنے لگے تھے...... ہاتھ پاؤں پر اس قدر لرزہ طاری ہوا کہ اسے لگا کہ وہ ابھی چکرا کھا کر گر ہی جائے گی بلکہ مر جائے گی...... اور واقعی وہ مر ہی جاتی جو اگر اس وقت حاشدہ اور بھابیاں وہاں چلے نہ آتے۔

"اوئے مستبد...... تم کیا یہاں بیٹھے ہماری لڑکی کو خوفزدہ کر رہے ہو......" ان کے انداز میں امروزیہ کے لیے محسوس کی جانے والی شفقت تھی مستبد بہت اونچا قہقہہ لگا کر بولا تھا۔

"لڑکی نہیں ہرنی بولیں بھابیاں...... سنتی ہے اور بس سننے میں ہی ڈر کے بدک جاتی ہے......" وہ اس کی حالت سے لطف لے رہا تھا...... اسے ایک دم شدید تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ جسم کا سارا خون سمٹ کر گویا اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ سامنے کھڑی حاشدہ نے بھی اس کے لال بھبھوکا چہرے کو غور سے دیکھا تھا...... پھر بات کے اثر کو زائل کرنے کی نیت سے اسے ساتھ لگا کر پیار سے بولی۔

"مستبد شرم کرو...... تمہیں بتایا بھی تھا ناں کہ یہ اس سب کی عادی نہیں ہے۔ اسے تنگ مت کرنا۔"

"قسم لے لو...... جو میں نے ذرا بھی تنگ کیا ہو......" اس نے فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے گلے کی کھال کو سامنے سے پکڑ کر گویا قسم دی تو اس کی اداکاری پر بھابیاں نے زور کا ہاتھ اس کے کندھے پر مار کر کہا۔

"بند کرو اپنا ڈراما...... اور ادھر سے چلو...... اب ہم کیک کاٹنے لگے ہیں......"

"جو حکم......" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کورنش بجا لایا تو حاشدہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم بھی چلو امروزیہ...... وہاں امی اور آپی تمہارا انتظار کر رہی ہیں...... اور بھابیاں کی تیلی سے بھی تو تمہیں ملوانا ہے۔"

حاشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑا...... امروزیہ نے بوکھلا کر تیزی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا...... حاشدہ نے اس کی حرکت پر حیرانی سے اس کی

طرف دیکھا تو وہ بنا کچھ بھی سوچے تیزی سے بولی۔
"بہت دیر ہو گئی...... بس اب گھر جا رہی ہوں......"
اس نے بات مکمل کی اور پلٹ کر اتنی تیزی سے قدم اٹھاتی وہاں سے بھاگی جیسے اب اگر ایک پل بھی وہاں رکی...... تو اس کی واپسی قیامت بن کر اس پر ٹوٹ پڑے گی...... وہ قیامت ٹوٹنے سے پہلے پلٹ تو آئی تھی مگر اپنے قدموں میں قیامت کی گرد جو لپیٹ لائی تھی اس کا کیا......؟

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی...... اسے سو جانا چاہیے تھا مگر وہ جاگ رہی تھی...... اور شاید اسے اب جاگتے ہی رہنا تھا۔ ان لمحوں میں جہاں وہ اپنی جگہ کھڑی پتھر کی ہو گئی تھی...... اس بوجھ کی بدولت جو اس کے سر پر رکھ دیا گیا تھا۔ ان لمحوں میں سانس لیتی امروزیہ نے ایک بار پھر بے حد وزن کی بدولت اپنی گردن کو ٹوٹتا محسوس کیا تو سر اٹھا کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی...... جہاں اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑا شخص شفقت سے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ وہ شخص اس کا کون تھا......؟ کوئی بھی تو نہیں...... پھر بھی اس کی شفیق مسکراہٹ پر اس نے اپنے دل کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کیا تھا۔

گھبرا کر ان لمحوں میں اس نے ان کو تلاشنے کی کوشش کی جو اس کے اپنے تھے...... مگر اس کے اپنوں میں سے کوئی بھی تو وہاں نہیں تھا...... اسے مایوسی ہونے لگی تو اس نے سر جھٹک کر گویا اپنے خیال کو بھی جھٹکا اور سختی سے آنکھیں میچ کر خود کو کھینچ کر ان لمحوں میں واپس لے آئی۔ جہاں سب اس کے حقیقی اپنے تھے۔ اس کے ابو، امی، ثمرانہ، زبیق اور حدید پر اور وہ خود امروزیہ مگر اپنا آپ تو کہیں نہیں دکھائی دیا۔ اس نے اس امروزیہ کو تلاشنے کی خاطر یہاں وہاں نظر دوڑائی تو چھوٹی سی امروزیہ کو پلنگ کے نیچے سے ذرا سی گردن نکال کر جھانکتے ہوئے پایا تو اپنی جگہ رک گئی...... تبھی اس کی سماعتوں نے ابو کی چنگھاڑتی آواز سنی۔

"جاہل عورت...... اتنا معلوم نہیں کہ سارے دن کے بعد جب شوہر گھر آتا ہے تو اپنی فضول چخ، چخ سے اس کا دماغ خراب نہیں کرتے......"

"ہاں شوہر تو جیسے سارا دن محنت مزدوری کے بعد اب جیسے بھر کے کمائی کر لایا ہے ناں جو تابعدار بن کر اس کی خدمت کے لیے ایک پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں......" ماریہ بیگم نے سر درد کی بدولت سر پر بندھے دوپٹے کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر مزید کستے ہوئے شوہر کو کھرا توڑ جواب دیا تو وہ پہلے سے زیادہ بھڑک کر بولے۔

"تم جیسی جہنمی عورت کا پیٹ بھر کمائی سے بھی بھرا نہیں ہوگا......"

"میں کیوں ہوں گی جہنمی...... تم خود ہو جہنمی...... اور تم جیسے جہنمی سے جڑ کر میری پوری زندگی جہنم بن گئی ہے...... سارے جہاں کے نکمے، نکھٹو انسان......" ماریہ بیگم نے تلملا کر شوہر کے اوصاف گنوانا شروع کیے تو اس نے جواباً ان کو گندے القابات اور گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ جسے سن کر زبیق اور حدید تو دانت نکال کر مسلسل ہنس رہے تھے۔ ثمرانہ، امی کے پیچھے سر جھکا کر بیٹھی تھی اور چھوٹی امروزیہ دہشت زدہ ہو کر پلنگ کے نیچے مزید اندر کی طرف گھس گئی تھی۔

چھوٹی امروزیہ کی دہشت چبھن بن کر اس کی تختی سے بھینچی آنکھوں کو پھوڑ دینے کے درپے ہوئی تو اس نے تڑپ کر آنکھوں کو کھول دیا...... اور پھر اس نے کھلی آنکھوں سے خود کو ان لمحوں کے بند دروازوں کو دھکیلتے دیکھا جہاں چھوٹی امروزیہ اپنے بچپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز سے ذرا پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے قدموں نے چوکھٹ پار کی اور وہاں آ رکی...... جہاں وہ تھے جن کو وہ جانتی تھی...... مگر وہ سب کہاں تھے؟ اس نے متلاشی نگاہوں سے باری، باری سب کو کھوجنے کی کوشش کی......

عین اسی پل اسٹیل کا گلاس لڑھکتا ہوا اس کے قدموں کے پاس آن رکا۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رکی اور گہری سانس بھر کر سامنے دیکھنے لگی جہاں غصے سے کچھ بھی بولتی ماریہ بیگم کمرے سے نکل رہی تھیں اور ان کے پیچھے لپک کر ان کو مارنے کی کوشش کرتے ابو تھے۔ وقت نے پانسہ پلٹ کر اب بس اتنا کیا تھا کہ ماریہ بیگم پہلے سے زیادہ تلخ بولنے لگی تھیں، اتنا زیادہ تلخ کہ ابو ان کی باتوں کا مقابلہ باتوں سے کرنے کے بجائے ہاتھ پاؤں کے ساتھ آس پاس پڑی ہر چیز سے ان کی دھلائی لگانے لگے تھے۔ ثمرانہ

اس ماحول سے فرار کی خاطر ہر وقت کچن میں پناہ لیے رہنے لگی تھی۔ زینی اور حدیقہ ماں کے برابر کھڑے ہو کر ابو کا مقابلہ کرنے لگے تھے اور جوانی کی دہلیز کو چھوتی امروزیہ پلنگ کے نیچے چھپنے کے بجائے چھت کو اپنی پناہ گاہ بنانے لگی تھی۔ وہ حوصلے سے گزرے لمحوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی مگر بہت حوصلے اور ضبط کے باوجود ایک سسکاری اس کے لبوں سے [illegible] نکلی تو دو آنسو آنکھوں کی نوک سے ہتھیلی پر اتر آئے۔ گزرا ہر لمحہ عذاب ہی تھا...... مگر پھر اب یہ کون سا ایسا لمحہ مقابل ہوا تھا جو مسلسل اس کو دہرے عذاب میں مبتلا کر رہا تھا۔ ایسا عذاب جس میں گھبرا کر اپنے دل کی جگہ درد محسوس ہونے لگا تو تکلیف کی شدت میں اس نے سر گھما کر بے بسی سے اپنے برابر لیٹی ثمرانہ کی طرف دیکھا۔ جو ہر احساس سے بے نیاز بے خبر سو رہی تھی...... اسے اس سے ثمرانہ پر رشک محسوس ہو رہا تھا۔

پتا نہیں وہ اس کے جیسی کیوں نہیں تھی......؟ اس کی سوچ اس سے الگ کیوں تھی؟ اسے ان کے جیسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ......؟ وہ اپنے سوالوں سے پریشان ہونے لگی تو ہاتھوں پر زور ڈال کر آہستہ سے ذرا سا اٹھی اور اپنی جگہ پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس کے پاس ہر رشتہ موجود تھا...... اس کے امی، ابو اس کے بھائی، بہن مگر ان رشتوں کا تقدس، احترام اور مان کہاں تھا......؟ مسلسل اودھم مچاتے سوالوں نے سر کے بوجھ کو مزید بڑھا دیا تو درد کی شدت سے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ کس قدر تکلیف دہ لمحات تھے...... اس نے تھک کر چپکے سے اپنے اندر جھانکا اور...... پھر خود سے اعتراف کیا۔

اسے اپنے لیے جس چاہ کی تلاش تھی وہ وہاں حاشدہ کے گھر میں اس کے لیے موجود تھی۔ جس مان و احترام کے لیے وہ یہاں اپنے گھر میں اپنوں سے لڑتی تھی وہ آج اسے بن مانگے وہاں حاشدہ کے گھر میں مل رہا تھا۔ لفظوں کے اعتراف نے من کے بوجھ کو کم کیا تو گزرے لمحوں کو ٹٹولتی امروزیہ کی آنکھیں یک دم ایک نقطے پر سکڑیں اور دھیان کا پنچھی اڑ کر وہاں جا ٹھہرا جہاں اس سے فاصلہ بنانے کی غرض سے وہ چیئر چھوڑ کر مستبد بیٹھا تھا۔ اندھیرے میں چلتی لمحوں کی فلم کے اس منظر میں اس وقت امروزیہ کو اس کا اس سے یوں فاصلہ کر کے بیٹھنا بہت اچھا محسوس ہوا تھا۔ اتنا اچھا کہ اس کے لبوں نے سرگوشی میں کہا تھا۔

"مستبد اچھا لڑکا ہے......" اور اس اچھے لڑکے نے کہا تھا۔

"امروزیہ تم یہاں موجود لوگوں میں سب سے الگ ہو اور خوب صورت اتنی ہو کہ میرا دل تمنا کر رہا ہے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہاری الگ دنیا میں تمہارے سنگ قدم ملا کر چلوں اور عمر تمام کر دوں......"

گزرے لمحوں کے ابھرتے لفظوں کی بازگشت اس کی سماعتوں میں نئے سرے سے گونجی تو اس کا دل ایک دم بالکل نئی لے پر زور سے دھڑکا...... اس زور سے کہ اس نے دہل کر اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کو جمایا اور گھبرا کر اپنے اطراف دیکھا۔ جہاں کھڑکی سے نظر آتے کالے آسمان کو نیلگوں سویرا اطراف سے اپنی لپیٹ میں لے کر ایک نئی صبح کے آغاز کی نوید دے کر بتا رہا تھا کہ اس نے کالی رات ہانک کر صبح کر دی ہے۔ ایک ایسی صبح جس کے چہرے میں واضح ہوتا ایک نیا پن تھا جس نے صبح [illegible] اور رات اترنے کے مانند مراحل طے کرتے اپنا آپ واضح کر رہا تھا...... مگر اس کے واضح ہونے تک اسے اس بے خبر [illegible] نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جس میں [illegible] لوٹ لیا تھا...... جس کے بعد اس نے ثمرانہ کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

اور ثمرانہ کوئی من نہ لے "[illegible]" ذرے سے کچھ پوچھ نہیں رہی تھی...... دونوں چپ تھیں مگر دن معمول کی طرح گزر رہے تھے۔ خود کو نارمل رکھ کر اس نے بھی اپنی روٹین نبھائی اور پھر مخصوص وقت پر اس کے قدم اسے وہاں لے آئے جہاں حاشدہ پہلے سے اس کی منتظر تھی۔

"بدتمیز لڑکی...... میں ناراض ہوں تم سے......" اسے سامنے دیکھتے ہی اس نے منہ پھلا کر شکوہ کیا۔

"ارے مگر کیوں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"ہاں، تمہیں تو جیسے معلوم ہی نہیں......" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"نہیں معلوم...... جبھی تو پوچھ رہی ہوں...... بتاؤ

کیوں خفا ہو؟'' اس کے سوال پر وہ ذرا دیر اسے گھورتی رہی پھر پہلے کی طرف منہ پھلا کر بولی۔

''پارٹی سے ایسے بھاگی ہو جیسے ہم نے تمہیں قید کر لیا تھا۔''

''ارے...... نہیں پاگل...... ! مجھے دیر ہو رہی تھی......'' اس نے اپنی صفائی میں بول کر اس کا شکوہ دور کرنے کی کوشش میں مزید کہا۔

''اور پھر تم نے آنے سے پہلے خود بھی کہا تھا آجاؤں بھلے سے ذرا دیر کے لیے ہی سہی......'' اس نے اسے اس کی بات کی یاددہانی کروائی تو حاشدہ مصنوعی ناراضی دکھانے لگی۔

''ہاں یاد ہے مجھے...... مگر جتنی دیر کا میں نے کہا تھا تم اتنی دیر بھی نہیں رکیں...... کم از کم کیک کٹنے تک تو رکی رہتیں......'' اس کا ملال مسلسل بڑھ ہی رہا تھا امروزیہ نے محسوس تو کیا مگر اپنی صفائی میں مزید کچھ نہیں بولی۔ اور بولتی بھی تو کیا...... کیا بتاتی کہ وہ کیوں وقت سے پہلے بھاگ آئی تھی؟ نہ بتانے میں اپنا بھرم محسوس کر کے وہ اپنی جگہ چپکی رہی جبکہ حاشدہ پُر ملال انداز میں مزید کہہ رہی تھی۔

''میں نے کتنے سارے لوگوں سے تم کو ملوانا تھا...... مگر تم ناں......'' اس نے ناک چڑھا کر بات کو ادھورا چھوڑا تو اس کی بات سنتی امروزیہ کو فوراً اس سے کچھ پوچھنے کا خیال آیا۔

''جتنے سارے لوگوں سے تم نے مجھے ملوانا تھا ان کو میرے متعلق کیا بتایا ہوا تھا...... جو وہ مجھ سے ملے بنا مجھے جانتے تھے؟''

''یہی بتایا کہ ایک لڑکی امروزیہ ہے جو میری اچھی دوست ہے...... اور جو اتنی خوب صورت ہے کہ نظر اس پر ٹکتی نہیں ہے......'' اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے آخر میں آنکھ دبا کر اس کے سرخ و سپید گال پر چٹکی کاٹی تو وہ بلبلا کر اپنی جگہ سٹ گئی۔ اس کے اس طرح جزبز کرنے پر حاشدہ کھلکھلا کر ہنسی پھر کھلکھلاتے ہوئے انداز میں بولی۔

''اور اب وہ سب جو تم سے ملاقات نہیں کر سکے اس ملال میں ہیں کہ وہ ایک خوب صورت لڑکی کے دیدار سے محروم رہ گئے۔'' اس کے شرارتی انداز کی بدولت ایک

بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر چمکی تو وہ لب دبا کر بے نیازی سے بولی۔

''لوگوں کی چھوڑو تم۔ مجھے بس بھابیاں کو دیکھنا تھا۔ میرے لیے یہی کافی ہے میں نے ان کو دیکھ بھی لیا...... اور ان سے مل بھی لیا۔''

''ہاں، ہاں جی، صرف ان سے ہی نہیں اس بدتمیز مستبد سے بھی مل لیا۔'' اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے آخر میں اس نے ناک چڑھا کر مستبد کا نام لیا تو امروزیہ کے دل نے خوامخواہ ویسے اس کی جگہ نہ ہاں کہہ دی تھی۔

''میں تو اسے نہیں جانتی......''

''مگر وہ تمہیں جانتا ہے۔ بیسٹ فرینڈ والا کزن ہے وہ میرا۔ جتنا میں نے تمہارا ذکر کیا ناں اس سے اس کو اتنا ہی شوق تھا تم سے ملنے کا۔ اور اب مل لیا ہے تو کل سے اتنا ڈلا ہوا بیٹھا ہے۔'' بہت نارمل سے انداز میں وہ اپنی طرف سے جیسے بہت عام سی بات کر رہی تھی جبکہ امروزیہ کا دل اس کے کہے ہر لفظ پر بیٹ مس کر رہا تھا۔

''پتا نہیں کیا کہہ رہی ہو تم۔'' اس نے بھیگی ہتھیلیوں کی مٹھی بنا کر بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو ترتیب میں رکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا تو حاشدہ نے مزید انکشاف کر کے اس کی دھڑکنوں کو اور منتشر کر دیا۔

''بات کرنا چاہتا ہے تم سے......''

''مگر میں اس سے کیوں بات کروں؟'' دل کی بدلتی کیفیت اپنی جگہ...... مگر حاشدہ کی اس بات پر اس کی گھبراہٹ بہت حقیقی سی تھی۔

''ہاں تم بات نہیں کرنا...... بات وہ کرے گا تم بس اس کو سن لینا۔'' حاشدہ اس کی گھبراہٹ کی وجہ سمجھ سکتی تھی اسی لیے اس کا ہاتھ پکڑ کر تسلی آمیز انداز میں بولی۔

''نہیں...... میں سنوں گی بھی نہیں......'' شدید گھبراہٹ کے عالم میں اسے اپنا دل کانوں میں دھڑکتا محسوس ہونے لگا تھا جبکہ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے حاشدہ سے دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

''مجھے معلوم تھا تم سنو گی بھی نہیں...... مگر وہ بدتمیز صبح سے ہزار فون کر کے میرا سر کھا چکا ہے...... کہہ رہا تھا کہ بس ایک بار تم سے بات کروا دوں......'' اتنا کہہ کر اس نے ایک نظر امروزیہ کی طرف دیکھا پھر اپنی بات کی

وضاحت میں مزید بولی۔

"تم اس کے لیے کچھ غلط مت سوچنا پلیز...... مستبد بہت اچھا لڑکا ہے۔ کل تم سے ملا تم اچھی لگیں اسے...... بتا رہا تھا کہ تم کو تنگ کیا اس نے...... بس اس لیے اب تم سے بات کر کے سوری کرنا چاہتا ہے۔" اس نے بات مکمل کی تو امروزیہ نے فوراً کہا۔

"ہاں...... بس ٹھیک ہے تم نے بتا دیا...... ہو گئی سوری......" اسے سچ میں بہت ڈر لگ رہا تھا۔ جبکہ عاشدہ نے بڑے ریلیکس انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑا اپنا فون اسے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

"کھا نہیں جائے گا تم کو...... دو منٹ کی بات کرے گا...... چپ کر کے سن لو......"

"عاشدہ میں......" اس نے ہکلا کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو عاشدہ نے فوراً کہا۔

"میسج کر دیا ہے وہ ابھی کال بیک کرے گا......"

ابھی وہ بات مکمل کہہ بھی نہ سکی تھی کہ امروزیہ کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی ٹیون بجنی شروع ہو گئی......

امروزیہ نے لرز کر بالکل رو دینے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا جو اس کو کال پک کرنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے سر نفی میں ہلا کر موبائل دوبارہ اس کی طرف واپسی کے لیے بڑھایا تو اس نے فنگر کا ٹچ دے کر کال کو پک کیا موبائل کو پکڑے اس کے ہاتھ کو اس کے کان کے پاس کیا اور خود میں ابھی آئی کہہ کر وہاں سے فرار ہو گئی...... جبکہ کال پر موجود مستبد کہہ رہا تھا۔

"ہیلو امروزیہ تم سن رہی ہو......؟"

ہاں وہ سن رہی تھی اس مرد کی آواز جو کل سے اس سے بات کرنے کو اتاؤلا ہو رہا تھا اور اب بے تکلفی سے اسے پکار رہا تھا۔

"روزی......" آواز کا لوچ اور لفظوں کی تپش سیسہ بن کر اس کی سماعتوں میں اتری اور چاشنی بن کر اس شدت سے لپٹی کہ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ جبکہ سینے کے پنجرے میں مقید دل نے اودھم مچا دیا تھا۔ سانس اندر کہیں رک سی رہی تھی۔ مختلف کیفیات میں گھری وہ گویا قیامت کے زیرِ اثر تھی جس سے بے خبر مستبد پکار کر کہہ رہا تھا۔

"روزی بس پانچ منٹ پلیز......" نرم گرم سے انداز میں پکار کر کی گئی التجا اثر کر رہی تھی۔ جبھی بدن میں دوڑتی سنسناہٹ کے باوجود اس کے قدم اپنی جگہ سے اٹھے اور چلتے ہوئے وہاں آن رکے جہاں اس کی نگاہ کے سامنے اوپر آنے والا راستہ واضح تھا۔ گویا اب مستبد کو سن لینے تک اس کی نگاہوں نے چور راستوں کا پہرے دار بن کر رہنا تھا۔ موم کی بنی عورت کو ہمیشہ کی طرح جذبوں کی تپش نے پگھلنے پر مجبور کیا تھا اور وہ خود کو پگھلتا ہوا محسوس کر رہی تھی جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔

"تمہارا ذکر سن، سن کر پہلے دیکھ لینے کا اشتیاق تھا اب دیکھ لیا ہے تو بات کرنے کا من ہے۔ تم بات کرو ناں مجھ سے پلیز...... تم سن رہی ہو مگر...... تم کچھ بول کیوں نہیں رہی ہو......؟" مسلسل پکار، پکار کر اس کے انداز میں آخر مایوسی نمایاں محسوس ہونے لگی تو اس نے لبوں کو زبان سے تر کیا اور آہستہ سے بولی۔

"سن رہی ہوں......"

اس کی طرف سے رسپانس ملنے پر وہ ایک دم بہت خوش ہو کر تیزی سے بولا۔

"میں کب سے بول رہا تھا؟"

"میں بھی کب سے سن رہی تھی۔"

"تو پھر بول کیوں نہیں رہی تھیں۔"

"پتا نہیں......" اس نے گہری سانس بھر کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا اور خود میں جما لیا...... اندر سب طرف اب گہری خاموشی تھی کہیں کوئی ایسا جذبہ موجود نہیں تھا...... جس سے وہ معلوم کر سکتی کہ وہ پہلے بول کیوں نہیں رہی تھی۔ اور اب اگر بول رہی ہے تو کیوں بول رہی ہے...... ہاں بس اسے یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ وہ اس شخص کو شدت سے جھڑک دینا چاہتی تھی مگر اس کا دل اس کی طرف اس بری طرح کھنچا جا رہا تھا کہ وہ اسے ہلکا سا بھی جھڑک نہیں سکی تھی۔ اور اب...... وہ اس کو سن رہی تھی...... اور اسے سن لینا چاہتی تھی جو کہہ رہا تھا۔

"بہت بے بسی محسوس کر رہا ہوں......"

"کیوں......؟" مستبد کے الفاظ و انداز اس کو بول لینے کی جرأت بخش رہے تھے۔ وہ پوچھ رہی تھی اور وہ لاچاری کا اظہار کرتا ہوا بتا رہا تھا۔

"پتا نہیں...... ہاں مگر یہ پتا ہے کہ جب سے تم سے

دفاتر میں ذہنی دباؤ

آج کل لوگوں کو دفاتر اور کام کی دیگر جگہوں میں اکثر شدید دباؤ کا سامنا ہوتا ہے اور کافی دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی قوتِ برداشت میں کمی آتی جارہی ہے۔ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے ہیں اور بات بات پر ایک دوسرے پر غصہ نکالتے ہیں۔

ایک تحقیقی مطالعے میں بہت سے ایسے لوگوں سے سوالات کیے گئے جو ملازمت پیشہ تھے یا کچھ اور کام کرتے تھے۔ ان میں سے پچیس فی صد سے زیادہ افراد نے یہ تسلیم کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے جھگڑے کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ تقریباً ایک تہائی افراد نے یہ بات کہی کہ دوسرے لوگوں کا نامناسب رویہ ان کے ذہنی دباؤ کا سبب ہے جب کہ بیس فی صد کا یہ کہنا تھا کہ دفتروں وغیرہ میں اپنے ساتھیوں کی وجہ سے انہیں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں انہوں نے ان کی زندگی عذاب بنادی ہے۔

تحقیقی مطالعے سے پتا چلا کہ گو مرد اور عورت یکساں طور پر ان مسئلوں سے دوچار ہیں تاہم ان کا ردِعمل مختلف ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ اس مطالعے میں شامل مردوں میں 16 فی صد اور عورتوں میں 9 فیصد ایسے تھے جو اپنے ساتھیوں پر چیخ پڑے جب کہ 6 فی صد عورتیں اور ایک فی صد مرد ایسے تھے جو دفاتر میں ذہنی دباؤ کے باعث رو پڑے۔

تحقیقی مطالعے میں شامل لوگوں میں سے 66 فی صد نے بتایا کہ وہ دفتری دباؤ سے خاصے متاثر ہوئے

ملا ہوں اس کے بعد کے کسی بھی لمحے میں تمہیں ذہن سے جھٹک نہیں سکا ہوں...... تم بھول ہی نہیں رہی ہو مجھے...... اور وہ تمہاری ہرنی جیسی حیران آنکھیں اور ان کی چمک کیسے بھلادوں......؟'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھا یا پھر لفظوں سے کھیلنے کے ہنر سے اچھے سے واقف تھا۔ مگر جو بھی تھا...... سچ یہ ہی تھا کہ وہ اپنے انداز و الفاظ سے امروزیہ کے کورے دل پر گہرا اثر چھوڑ رہا تھا۔ ایک ایسا احساسِ تفاخر اس کے اندر جگا رہا تھا جس سے وہ مغرور ہوتی جا رہی تھی۔

''بس بول لیا......؟''

''ہاں...... نہیں ابھی میں نے تم سے سوری بھی تو کرنی ہے۔''

ایک طرف انداز میں لگاوٹ بھری شرمندگی ابھری تھی تو دوسری طرف اہم ہونے کے احساس نے سر اٹھا کر اٹھلا کر لفظ ادا کروائے تھے۔

''تو کرو......''

''ہم...... ہم...... حضورِ اعلیٰ...... بندۂ ناچیز نے کل آپ کو بہت ستایا اور اس کے لیے آج دست بستہ معافی کا طلب گار ہے...... معافی عنایت کرکے پُرسکون عنایت فرمادیا جائے......'' متبسم انداز میں ہوا کے دوش پر لہرا کر اس کی سماعتوں تک آتے معافی نامے نے اس کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی...... کیونکہ اب اسے مسکرانا ہی تھا۔ لفظوں کی اس چوری پر جس میں بنت حوا کی ترستی ہوئی تسکین پر ابن آدم کی چاہ کا پھایا مرہم بن کر ہر زخم کو بھرنے کی تاثیر بخش دیتا ہے۔ اسے بھی تاثیر مل گئی۔

اس نے بات کرلی...... کرچکی تو حاشدہ کو اس کا موبائل واپس کردیا۔ اور پھر وہاں آگئی جہاں کے لوگ اس پر گزری واردات سے بے خبر اپنی خبریں کہنے اور سننے میں مصروف تھے۔ زبیق اپنے ٹرپ سے لوٹ آیا تھا۔ ماریہ بیگم اس کے پاس بیٹھی اس کے ٹرپ کا احوال سن کر خوش ہورہی تھیں۔ ابو ہمیشہ کی طرح دوستوں کی محفل سے لوٹ کر اب ماریہ بیگم کی سوتن یعنی ٹی وی کے ساتھ

ہیں اور ان میں آدھے سے زیادہ افراد ایسے تھے جن کی نیندیں اڑ گئی تھی۔ 12 فی صد افراد نے تو دفتری دباؤ کے آگے ایسے ہتھیار ڈالے کہ دفتر سے یا کام کی جگہ سے فرار اختیار کیا اور استعفے تک دے بیٹھے۔

بہر حال ان افراد میں سے 75 فی صد نے یہ رائے ظاہر کی کہ دوپہر کو کام میں ایک گھنٹے کا وقفہ کر دینے سے اپنے ذہنی دباؤ میں انہیں کافی افاقہ محسوس ہوا۔

برطانیہ میں نفسیات سوسائٹی کی ترجمان Sue Keane نے بتایا کہ آج کے تیز رفتار اور مادہ پرست دور میں ایک طرف تو کام کی زیادتی اور مقررہ وقت کے اندر کام پورا کرنے کی پابندی ہے، پھر وہ جھگڑے جو ساتھیوں میں آپس میں ہو جاتے ہیں یا دفتروں کے ملازمین اور دفتر میں آنے والوں کے درمیان ہو جاتے ہیں۔ ان سب نے مل کر دفتری ماحول کو بوجھل بنا دیا ہے۔ چنانچہ اگر دوپہر میں پابندی سے وقفہ کیا جائے اور مکمل طور پر کام چھوڑ کر جسم و ذہن کو آرام دیا جائے تو خاصا فرق پڑ جاتا ہے۔

مذکورہ تحقیقی مطالعے میں شامل پونے سات سو لوگوں میں سے صرف 17 فی صد لوگ ایسے تھے جنہوں نے یہ بتایا کہ وہ دفتر میں کام کے دوران پابندی سے دوپہر کو کھانے اور آرام کا وقفہ کرتے ہیں۔ اسلام میں ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد قیلولہ دفتری پریشانیوں سے نبرد آزما ہونے اور سکون حاصل کرنے کا بہترین اور موثر ترین ذریعہ ہے۔

مرسلہ: ماہین ضیا، کوہاٹ

مصروف ہو چکے تھے۔ کچن کے دروازے میں کھڑی ثمرانہ ذرا سا مسکرا کر زینی سے فورٹ منرو کی تفصیل سن کر تصور میں فورٹ منرو کے اونچے، نیچے راستوں پر گھوم رہی تھی۔ اس نے باری، باری سب کو دیکھا...... سر کو جھٹکا اور کمرے میں آ گئی۔

یہ آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایسے دل جلے منظر سے اس نے اپنے دل کو جلتا ہوا محسوس نہیں کیا تھا...... کیونکہ اب آج سے اس کا دل کسی اور جذبے کے زیر اثر دھڑکنے کا آغاز کر چکا تھا...... اب سے کسی نے اسے بھی اس کی ذات کے اہم ہونے کا ایسا احساس بخش دیا تھا کہ جس نے اس کے جذبات کے ساتھ خیالات بھی بدل ڈالے تھے...... چنانچہ ہمیشہ دل کو جلاتے منظر کے باوجود اس نے آج کچھ بھی برا محسوس کیے بنا ایک سرسری نظر اس منظر کے حوالے کی اور پھر کچھ پڑھ لینے کا ارادہ کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

پیپرز ہونے میں ہفتہ باقی تھا اور اس کی تیاری نہ ہونے کے برابر تھی...... وجہ یہی تھی وہ جب بھی پڑھنے کے لیے کتاب اٹھاتی کتاب کے لفظ اپنے مطالب بدل کر مستبد کے بول سے نکلے لفظوں کے مفہوم کی صورت اس کی سوچ کو ایسے جکڑ لیتے کہ پھر وہ کتاب کے کسی بھی لفظ کو پڑھنے سے خود کو قاصر محسوس کرنے لگتی تھی۔ تب لفظوں کی اس آنکھ مچولی سے اکتا کر وہ کتاب کو بند کر کے گود میں رکھتی اور گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھ کر گزار دیتی۔ ثمرانہ اس کی بدلی کیفیت کو بہت دنوں سے نوٹ کر رہی تھی مگر یہ سوچ کر چپ تھی کہ اس سے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات شیئر کرنے والی امروزیہ اس بار بھی خود اس سے اپنی پریشانی شیئر ضرور کرے گی...... مگر اس بار اس نے اپنے خیال کو غلط ہوتے دیکھا تو خود امروزیہ کے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''امروزی...... تم پریشان ہو......؟'' اس کے سوال پر امروزیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کس نے کہا......؟'' وہ پوچھ بیٹھی۔

''میں نے محسوس کیا......'' ثمرانہ کا انداز پریقین ہونے کے باوجود امروزیہ بہت زور سے ہنس کر استہزائیہ بولی۔

''اچھا...... یہ تمہیں کب سے احساسات محسوس ہونے لگ گئے؟''

''تم کچھ بھی کہہ لو، میں برا نہیں مناؤں گی......'' اس کی بات پر ثمرانہ مسکرانے لگی......امروزیہ نے دیکھا تو چڑ کر بولی۔

''تم برا منا بھی سکتی ہو بے حس لڑکی......''

''میں بے حس نہیں ہوں...... محسوس کیا ہے تبھی تو پوچھ رہی ہوں تم اب کچھ کہتی کیوں نہیں ہو......'' وہ بچھ رہی کی امروزیہ اس کو ٹالنے کے لیے بات گھما پھرا رہی ہے۔ اس لیے اس کے لفظوں کے گھوم پھیر کے ساتھ اس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو امروزیہ نے خواہ مخواہ زچ ہو کر کہا۔

''کیا سننا چاہتی ہو تم......؟''

''وہی سب جو تم پہلے سنایا کرتی تھیں......اپنی ہر چھوٹی بڑی بات، اپنی پسند، ناپسند اور وہ بھی جو چھپا کر اکیلے خود کو پریشان کر رہی ہو......''

''مجھے کچھ نہیں کہنا......'' ثمرانہ کا انداز بہت نرم تھا اس کے باوجود وہ مسلسل سخت رویہ اپنائے ہوئے تھی...... اس کے ترش انداز کے باوجود ثمرانہ نے ہمت ہارے بنا دوبارہ کہا تھا۔

''وہی تو پوچھ رہی ہوں...... کیا ہوا ہے...... کیوں کچھ نہیں کہنا ہے؟ اور کب سے دیکھ رہی ہوں ہر طرف سے بے پروا ہوتی جا رہی ہو تم......اب تو ابو، امی کے جھگڑوں پر بھی جلتی کڑھتی نہیں ہو...... زبیق اور حدید کی باتوں کو سرے سے سنتا ہی چھوڑ دیا ہے تم نے......اور اب تو تمہیں یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ کب کس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ حدید نے کپ گلاس اٹھا کر مجھے دے مارا......اور اب تو تم امی کے ہم سے بے پروا رہنے پر بھی اعتراض نہیں کرتی ہو......'' اتنے دنوں سے اس میں محسوس ہوتی تبدیلیوں کو نوٹ کرتی ثمرانہ نے ایک سانس میں سب کہہ ڈالا تھا...... جسے سن کر امروزیہ خواہ مخواہ ہی تلخ ہو رہی تھی۔

''پہلے ان سب تماشوں پر جل بھن کر اپنی عمر اس نکالتی تھی تو بھی تمہیں مسئلہ ہوتا تھا...... ہمیشہ میرے بھڑ کنے پر سمجھانے بیٹھ جایا کرتی تھیں......اب چپ ہو گئی ہوں تو بھی تمہیں مسئلہ ہو رہا ہے...... کسی حال میں خوش نہیں رہتا تم نے......''

وہ پہلے ہی پڑھائی نہ کر سکنے کی وجہ سے اکتائی بیٹھی تھی اب اس کے سوالوں سے مزید زچ ہو کر کتاب پٹخ کر وہاں سے اٹھ گئی......اور اسے وہاں سے اس لیے بھی اٹھنا تھا کیونکہ اس نے اپنے اندر در آئی تبدیلیوں کی اصل وجہ ثمرانہ کو نہیں بتائی تھی۔ پتا نہیں کیوں مگر اس بار وہ بچ میں اسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی...... وہ کچھ جو وہ خود سے بھی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی...... مگر شاید اسی کوشش میں وہ ذرا، ذرا عیاں ہونے کی ابتدا خود ہی کر چکی تھی۔ جس کا عملی ثبوت اگلے روز اس وقت سامنے آیا جب وہ معمول کی طرح منڈیر سے لگی عاشدہ سے باتیں کر رہی تھی...... ان باتوں کے دوران اسے عاشدہ کی زبانی بھایاں کے کل واپس جانے کا علم ہوا تو اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''بھایاں واپس جا رہے ہیں......تم ان کو بھی ساتھ لے آتیں، میں خدا حافظ ہی کر دیتی......'' اس نے ابھی ہنس کر بات مکمل کی ہی تھی کہ عاشدہ ''اچھا تو یہ بات ہے......'' کہہ کر ذرا اچھلی اور دوسری منڈیر سے جھانک کر بھایاں کو آواز دے کر اوپر آنے کا کہا اور سیڑھیوں کے پاس ان کے انتظار میں کھڑی ہو گئی...... چند ثانیے بعد بھایاں بچ میں سیڑھیاں پھلانگتے اوپر آ بھی گئے...... انہیں بیچ بچ میں سامنے دیکھ کر امروزیہ ذرا سا کنفیوژ تو ہوئی مگر مسکرا کر قدرے اعتماد سے ان کو سلام کیا تو انہوں نے شفقت سے جواب سے نوازتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

''سوری بھئی امروزیہ......تم سے گفٹ کا وعدہ کیا تھا مگر جب سے آیا تھا عزیز و اقارب سے ملاقات کا سلسلہ ہی چل رہا تھا۔ مارکیٹ جانے کا موقع ہی نہیں ملا......اور اب واپسی کے اچانک ہی آرڈر آ گئے کہ فوری جانا پڑے گا...... مگر گفٹ ڈیو رہا تمہارا......اب تو مجھے بھولے گا بھی نہیں...... اگلی بار آؤں گا تو تمہارا گفٹ وہیں سے لے کر آؤں گا......'' وہ معذرت بھی اس قدر

ملے انداز میں کر رہے تھے کہ سامنے کھڑی امروزیہ کا سیروں خون بڑھ گیا...... اس کا دل اعتراف کر رہا تھا حاشدہ سمیت اس سے جڑا ہر شخص محبتوں کی خاص مٹی سے گندھا ہوا تھا...... جبھی وہ ہر طرف محبت بانٹتے تھے بدلے میں محبت وصولتے تھے...... امروزیہ کو محبت ملی تو وہ محبت لٹانے کو اترا مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

''آپ نے مجھے ابھی تک یاد رکھ کر تحفے کا کہا...... میرے لیے یہی سب سے بڑا تحفہ ہے بھابیاں...... اس سے زیادہ کی مجھے تمنا ہی نہیں ہے......'' وہ مسکرا کر بات مکمل کر رہی تھی...... جب ناگہانی آفت کی طرح اچانک ہی زبیق وہاں چلا آیا۔ اس کے چلتے قدم عین اس کے سامنے آ کر رکے تھے۔ امروزیہ کے لبوں پر چھتی ہنسی سمٹ کر حلق میں اتری...... اور سانس اندر کہیں رک کر اسے ساکت کر گئی۔ زبیق پتھریلے تاثرات چہرے پر سجائے اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی تھی......

اس وقت اس کی حالت رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے چور کے مانند ہو رہی تھی...... جبکہ زبیق لبوں پر قفل ڈال کر لال انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا...... سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ کوئی بھی کسی بھی قسم کی وضاحت میں کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔ زبیق نے لبوں کو بھینچ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا اور سخت غصیلی نگاہ اس کے حوالے کر کے جیسے آیا تھا ویسے ہی دھڑ دھڑ کرتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ گیا تو اس کی رکی سانس مشکل سے ہی سہی مگر ذرا سی بحال ہوئی...... تو اس نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر چپ کھڑی بھابیاں اور حاشدہ سے کہا۔

''یہ اس وقت بھی گھر نہیں آتا تھا آج نہ جانے کیوں آ گیا...... اور وہ بھی یوں اوپر...... میں جا کے دیکھتی ہوں نیچے ضرور شور کر رہا ہوگا......'' وہ لاکھ خود کو نارمل ظاہر کر رہی تھی مگر حقیقتاً وہ اندر سے بے حد پریشان ہو چکی تھی۔ زبیق نے بالکل غلط وقت پر، غلط انداز میں اس کو موقع پر پکڑا تھا۔ اب نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ لبوں کو بھینچ کر وہ پریشان سے دھڑکتے دل کے ہمراہ بے جان قدم اٹھاتی واپسی کے لیے پلٹی...... اور محتاط انداز میں نیچے آ گئی...... جہاں زبیق مٹھیاں بھینچے صحن میں ٹہل رہا تھا...... ماریہ بیگم بار بار اس سے اتنے غصے کی وجہ

دریافت کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں اور ثمرانہ ہمیشہ کی طرح ایسی صورتِ حال میں اپنی مخصوص جگہ کچن کے دروازے میں کھڑی خاموشی سے سب ملاحظہ کر رہی تھی۔

وہ قدم اٹھاتی ثمرانہ کے برابر آن کھڑی ہوئی...... جب چکر پر چکر کاٹتے زبیق کی پلٹتے ہوئے نگاہ اس پر پڑی تو چیل کی طرح جھپٹ کر اس کے قریب آیا...... اور جارحانہ انداز میں اسے بازو سے پکڑ کر صحن کے عین بیچوں بیچ ماں کے سامنے پٹخنے کے انداز میں چھوڑ کر بولا۔

''اس سے پوچھیں اوپر کیا گل کھلا رہی تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا......'' ماریہ بیگم کے ماتھے پر سلوٹ ابھری تھی...... جسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ ایک دم پلٹ کر ثمرانہ کے سامنے جا کر بولا۔

''تمہیں معلوم تھا ناں یہ چھت پر جاتی ہے؟'' اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ بولتی...... ماریہ بیگم نے تیزی سے کہا۔

''معلوم تو مجھے بھی تھا...... بتایا تھا ثمرانہ نے مجھے اس کی برابر والی حاشدہ سے دوستی ہے......'' ماریہ بیگم کی بات سن کر وہ پلٹ کر ان کے سامنے آ کر بولا تھا۔

''پھر یہ معلوم کیا آپ نے کہ حاشدہ کی آڑ میں اور کن، کن لوگوں سے دوستیاں چل رہی ہیں اس کی......''

اس نے زہر اگلا تو کب سے چپ کھڑی امروزیہ ایک دم بھنا کر بولی تھی۔

''بات کو غلط رنگ دے کر الٹی سیدھی بکواس مت کرو زبیق...... وہ حاشدہ کا بہنوئی ہے اور مجھے بھی حاشدہ کی طرح بہن ہی کہتا ہے...... ملک سے باہر رہتا ہے...... کل واپس جا رہا ہے تو اس لیے میں آخری سلام کر رہی تھی......'' اپنی صفائی میں یہاں تک وہ تقریباً چیخ ہی بول رہی تھی...... مگر یوں اس کی ذات کے ساتھ غیر مرد کا ذکر سن کر ماریہ بیگم کے ساتھ، ساتھ ثمرانہ بھی دنگ ہوئی تھیں...... جبکہ اس کے زرخ کے بدتمیزی سے بولنے پر زبیق نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا تھا کہ وہ الٹ کر نیچے گری اور قریب رکھی پانی کی ٹنکی سے منہ کے بل ٹکرا گئی۔ نتیجتاً اس کا زیریں لب بری طرح پھٹ کر چہرہ لہولہو کر گیا...... مگر وہ پروا کیے بنا تیزی سے کھڑی ہوئی تھی...... اسی پل جنون میں پاگل ہوتا

زہیق دوبارہ اس کے سامنے آکر چلایا تھا۔
''تمہارا مطلب کیا تھا اس آدمی سے جو تم اس کو آخری سلام کر رہی تھیں..... ''
''مطلب' مطلب تم جیسے لوگ رکھتے ہیں میں نہیں...... اس آدمی نے مجھے بہن بولا ہے اور میں نے اسے بھائی...... اس لیے اپنی گھٹیا سوچ صرف اپنے تک محدود رکھو...... ''

ہمیشہ سے گھٹ، گھٹ کر جیتی امروزیہ دو بدو جواب پہلے بھی دے دیا کرتی تھی مگر اب غیروں کے ہاتھوں ملتی عزت و چاہ کے بعد اپنوں کی زبان سے نکلتے زہر کو سن کر وہ پھٹ ہی پڑی تھی۔ ایک دم سب ڈر، خوف بغل مار کر جانے کس کونے میں جا چھپے تھے اور وہ زہیق کے سامنے کھڑی برابر سے جواب دے رہی تھی...... اور اس کا یہ انداز زہیق کو مزید بھڑکانے کو کافی تھا...... چنانچہ وہ مزید آگ بگولہ ہو کر غرایا۔
''سن رہی ہیں امی...... سگے بھائی کی سوچ اسے گھٹیا لگ رہی ہے...... اور اس غیر مرد کی باتیں اس کو اتنی اچھی لگ رہی ہیں کہ اس کو خاص طور پر آخری الوداعی سلام ہو رہے ہیں.... '' غصے سے پھڑ پھڑاتے نتھنوں سے اس نے پلٹ کر ساکت کھڑی ماریہ بیگم سے کہا اور پھر انگلی اٹھا کر بولا۔
''اس کے رنگ ڈھنگ بتا رہے ہیں یہ ضرور کوئی گل کھلائے گی مگر اس سے پہلے کہ کوئی گل کھلا کر ہماری عزتوں کو نیلام کرے میں اس کو جان سے مار دوں گا۔''
اس کی آنکھوں میں ایک دم خون اترا تو پلٹ کر اس نے امروزیہ اور اپنے درمیانی فاصلے کو طے کیا اور اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ کر اس زور سے دبایا کہ اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں...... وہ مرجانے کو تھی جب امی، اپنی جگہ ساکت کھڑی ماریہ بیگم اور ثمرانہ ایک دم بھاگ کر ان کے قریب آگئی تھیں...... دونوں نے بیک وقت امروزیہ کی گردن پر جمے اس کے ہاتھوں کی گرفت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔
''زہیق چھوڑ دو ورنہ مرجائے گی یہ......''
''میں آج اس کو مار ہی دوں گا......''
اس کے سر پر خون سوار تھا امروزیہ بیچ میں آخری سانس لیتی محسوس ہونے لگی تھی جب ثمرانہ نے اس کی حالت دیکھی تو زہیق کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی۔
''کچھ نہیں کرے گی یہ چھوڑ دو اسے......'' زہیق کی انگارہ آنکھوں نے اس کے بہتے آنسو دیکھے تو سفاکی سے بولا۔
''تم بھی ملی ہوئی ہو ناں اس کے ساتھ...... دونوں مل کر ہماری عزتوں کو نیلام کرنا چاہتی ہو......'' اس کی توجہ ثمرانہ کی جانب ہوئی تو امروزیہ کی گردن پر جمے اس کے ہاتھوں کی گرفت ذرا سی ڈھیلی پڑی تو ماریہ بیگم نے فوراً اسے دھکا دے کر پیچھے کیا...... جھٹکا لگنے سے وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور امروزیہ اس کی گرفت سے نکل کر بے جان سی زمین پر گر پڑی۔ ماں اور بہن بیک وقت اس کے اوپر جھکے تھے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی...... ثمرانہ نے جلدی سے اس کا سینہ مسل کر اس کی سانس کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ ماریہ بیگم نے ٹنکی کے قریب ہونے کی وجہ سے ہاتھ کی کٹوری میں ذرا سا پانی لے کر اس کے حلق میں ڈالا تھا...... جس کے بعد وہ ایک دم کھینچ کر لمبی سانس لیتی اٹھی تھی...... زہیق ذرا سے فاصلے پر کھڑا اس کو خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا...... اس کو اٹھتے دیکھا تو غرا کر بولا۔
''اس کی قسمت اچھی ہے جو حدید شہر سے باہر گیا ہوا ہے...... وہ ہوتا تو اب تک اس کو گولی مار چکا ہوتا۔''
''زہیق تم ابھی یہاں سے جاؤ باقی کی بات حدید کے آنے پر کر لینا......'' اس کا غصہ کسی صورت کم نہ ہوتا دیکھ کر ماریہ بیگم نے کہا۔ گو کہ انہوں نے اسے ٹالنے کو ایسا کہا تھا مگر وہ ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔
''حدید کے آنے تک خیر منالے یہ...... وہ آجائے گا تو اس کے ساتھ مل کر اسے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔''
وہ ایسا ہی تھا غصے میں قتل و غارت کر دینے والا...... اتنا کچھ تو کر لیا تھا نہ جانے ابھی اور کیا کرنے والا تھا......
ماریہ بیگم نے فی الحال سر ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا تو اپنی جگہ سے ہلا اور پلٹ کر چند قدم چلا پھر اک قدم رک کر جھکا پلنگ پر پڑا اسٹیل کا گلاس اٹھایا اور پوری قوت سے امروزیہ کی طرف دے مارا۔ اس کا نشانہ اتنا بھرپور تھا کہ گلاس پوری قوت سے آکر امروزیہ کی پیشانی سے ٹکرایا...... نتیجتاً اس کی حلق پھاڑ کر ابھرتی چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپ کر بولی۔

''خدا کرے تم مر جاؤ زیبی......'' وہ درد سے دُہری ہو کر جھکی تھی...... ماریہ بیگم اسے چھوڑ کر پھر سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے زیبی کو پکڑنے کے لیے اٹھی تھیں...... جبکہ ثمرانہ نے جھکی ہوئی امروزیہ کو سیدھا کیا تو پوری انگلی کے برابر پھٹی ہوئی پیشانی سے بُجل بُجل بہتا خون اس کے پورے چہرے کو رنگین کر رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ گھبرا کر اپنے دوپٹے کا پلو اس کی پھٹی ہوئی پیشانی پر رکھا تھا...... ماریہ بیگم، زیبی کو وہاں سے بھیج کر اس کی طرف پلٹ کر غصے سے بولیں۔

''جب غلطی کی تھی تو زبان کو دانتوں تلے دبا کر رکھنا تھا...... تاکہ اتنا سب تماشا نہ بنتا......'' ان کی بات سن کر اس نے سر اٹھا کر ایک نظر ان کی طرف دیکھا...... پھر ایک دم درد کی پروا کیے بنا اپنی جگہ کھڑی ہوئی اور ہر احساس سے عاری انداز میں بولی۔

''زبان کو دانتوں تلے رکھنا نہیں سکھایا گیا مجھے...... سب کی زبانوں کو یہاں چلتے ہی دیکھا ہے۔ اس لیے میری زبان بھی سب کی طرح چلتی ہی رہے گی...... اور رہی غلطی...... تو وہ تو ابھی تک میں نے کی نہیں تھی...... ہاں مگر آگے اگر ہو گئی تو اس کا قبل از وقت میں کہہ نہیں سکتی......'' اس کی زبان سے ادا ہوتا ہر لفظ اس کی پھولتی سانسوں کی بدولت لڑکھڑا رہا تھا۔ مگر اس نے پھولتی سانسوں میں لفظوں کو چبا، چبا کر بات کو مکمل کیا تھا اور پھر بنا کسی کی بھی طرف دیکھے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ثمرانہ نے اس کے زخموں کی صفائی کر کے مرہم پٹی کر دی تھی...... امروزیہ اس قدر چپ تھی کہ نہ چاہنے کے باوجود وہ بھی اپنی جگہ چپکی سی رہی۔ چنانچہ دونوں طرف مسلسل گہری خاموشی تھی...... رات آہستہ، آہستہ بیت رہی تھی مگر آج نیند دونوں کی آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی۔ دونوں اپنی، اپنی جگہ سوچوں میں گم جاگ رہی تھیں...... فرق بس یہ تھا کہ ثمرانہ اس کو سوچ رہی تھی اور وہ خود کو......

وہ امروزیہ راحب تھی...... جس نے روٹی کی عمر میں روٹی کے بجائے محبت کی چاہ کی تھی...... ایسی محبت جس میں اس نے چاہا کہ جب ابو گھر آئیں تو وہ اور ثمرانہ مل کر ان کے لیے دروازہ کھولیں۔ ایوان کو سامنے دیکھیں

انتظار

اسے کہنا
اب تو لوٹ آئے
کہ ہتھیلی پر اس کے نام کی
حنا رچانے کی خواہش میں
اب بالوں میں
مہندی رچا رہی ہوں میں

شاعرہ: تابندہ جبیں

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

خوب صورت باتیں

☆ انسان کے کردار کی دو ہی منزلیں ہیں دل میں اتر جانا یا دل سے اتر جانا۔

☆ انسان دو وجہ سے بدل جاتا ہے اک جب کوئی بہت خاص اس کی زندگی میں آجائے یا بہت خاص اس کی زندگی سے چلا جائے۔

☆ موت تو نام سے بدنام ہوئی ورنہ تکلیف تو زندگی بھی بہت دیا کرتی ہے۔

☆ انسان بھی کسی کے لیے اتنا ضروری نہیں ہوتا جتنا وہ گمان کر لیتا ہے۔

از: اقرا منصور، کوٹ مومن

تو جھک کر دونوں کو شفقت سے بوسہ دے کر ان کے ننھے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال کر ساتھ لیے آگے بڑھیں تو کمرے کے دروازے سے امی محبت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجائے ان کے استقبال میں سلام کرتی ان کے قریب آئیں۔ ابو محبت پاش نظروں سے انہیں تکتے ہوئے سلام کا جواب دے کر ان کے ہمراہ وہاں چلے آئیں جہاں حدیہ اور زیبی ان کے انتظار میں کھانے سے ہاتھ کھینچ کر بیٹھے اُن کے منتظر ہوں۔ ایوان کو اپنا منتظر پا کر ان کی طرف بڑھیں، پدرانہ شفقت سے ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر ان کے درمیان بیٹھ جائیں۔ امی سب کے لیے گرم، گرم روٹی بنا لائیں تو وہ سب مل کر ایک دسترخوان پر دن بھر کی اپنی اچھی، اچھی باتیں آپس میں شیئر کرتے ہوئے کھانا کھائیں...... اور پھر کھانے کے بعد جب سب اپنی مصروفیات کی طرف بڑھنے لگیں تو وہ

اپنی ہر مصروفیت کو پس پشت ڈال کر ابو کے پاس آئے اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ان سے لاڈ کرتی آنکھیں موندے بے خبر نیند کے سفر پر نکل جائے۔

اس نے چھوٹی عمر سے چھوٹے، چھوٹے خوابوں کو سینچ کر اپنے ساتھ جوان کیا تھا...... مگر عمر کی ہر منزل پر اس کے ہر خواب نے تلوار کی نوک بن کر اس کی بینائی کو چھین دی تھی...... اسے چبھتا تھا جب ابو کمائی کے نام پر دن بھر آوارگی کر کے خالی ہاتھ گھر لوٹتے تھے...... اور امی سارے دن کے انتظار کے بعد خالی ہاتھوں کو دیکھ کر طوفان بدتمیزی مچا کر گھر کے سکون کو درہم برہم کرتیں تو اس کی آنکھوں کی چبھن مزید بڑھ جاتی تھی...... اور اس کی آنکھیں اس وقت چبھن سے پھوٹنے لگتی تھیں جب بڑے ہوتے ہوئے جدید نے گھر کی ذمے داری سنبھال کر نمرانہ اور اس کی ذمے داری کو بوجھ کہہ کر کوسنا شروع کیا تھا۔ اور جب اس کے ساتھ دنیا میں آنے والا زبیح مرد ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے حقیر نظر سے دیکھتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس کی حقارت بھری نگاہ والی آنکھیں خود اپنے ہاتھوں سے پھوڑ ڈالے۔ اس کا دل اپنی آنکھیں اس وقت بھی پھوڑ لینے کو کرتا تھا جب وہ امی کو بیٹیوں اور بیٹوں کے درمیان فرق کرتا دیکھتی تھی...... اس کے ہر خواب نے اسے تھکا کر زندگی سے بیزار کرنے کی ہر کسر پوری کی تھی۔ اور جب وہ بیزاریت کی آخری حد پر گئی تب زندگی نے اسے حاشدہ سے ملا دیا۔ وہ حاشدہ جو محبتوں سے گندھی تھی...... وہ حاشدہ جو نصیبوں میں ملی محبتوں کی حقدار تھی۔ اور وہی حاشدہ جو اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نصیب کی محبتوں میں اس کا حصہ ڈال کر اسے بھی نصیبوں کی محبت کا امین کر رہی تھی۔ ایسی امین...... جس نے محبتوں کی فصیل کو ابھی چھو کر محسوس کرنا ہی شروع کیا تھا کہ اس کے نصیب کی سیاہی نے اسے پھر سے بدبختی کی پگڈنڈی پر پٹخ دیا تھا...... وہ بھی اس بری طرح کہ اس کا جوڑ، جوڑ دکھ رہا تھا...... من کا دکھ جاگا تو تن کے درد کے احساس نے بے حسی کے خول کو چٹخا کر تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں کو بھگو کر پھر سے اس لمحے میں لے جا کھڑا کیا جہاں زبیح نفرت کی شدت سے چلا کر ماں سے کہہ رہا تھا۔

''جب یہ پیدا ہوئی تھی اسی وقت اس بے غیرت کا گلا دبا کر مار دیتیں تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا......''

وہ اسے بے غیرت کہہ رہا تھا...... اور خود چڑھتی جوانی کے نشے میں جو من مانیاں کرتا پھرتا تھا اس کا حساب کہاں تھا...... ایک دم تنفر کی بہت ساری لہریں اس کے وجود میں دوڑیں تو نفرت کی آگ نے اسے سر تا پیر جھلسانا شروع کر دیا...... وہ خود کو نفرت کی آگ میں جلتا محسوس کر رہی تھی جبھی کہیں سے مستبد کی بھاری آواز نے شبنمی لفظوں کی پھوار سے بھگونا شروع کر دیا۔

''جانتی ہو امروزیہ...... کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے میں تمہیں بہت چاہوں گا......''

''بہت چاہوں گا کا مطلب...... کب چاہو گے؟'' وہ ٹھنک کر بولی تو اس نے کہا تھا۔

''جب تم کہو گی......''

''اور اگر میں ابھی کہوں تو......؟''

''تو میں کہوں گا چلو کہہ دو......''

وہ اس کے انداز پر بہت دیر تک کھلکھلا کر ہنستی رہی تھی۔ وہ ایسے ہی تھا بولتا تھا اور مان بڑھا دیتا تھا...... بلکتے لمحوں میں اس کے خیال نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیری تو وہ اپنے ہی خیال سے چونک کر بڑبڑائی۔

''اور اگر زبیح کو پتا لگے کہ وہ مستبد سے بات کرتی ہے تو...... وہ اسے مار ہی ڈالے گا...... اور مار دینے کے بعد بھی وہ اس سے نفرت کرے گا...... اور نفرت تو وہ اب بھی اس سے کر رہا تھا...... اور اپنی نفرتوں کے ساتھ وہ جدید اور ابو کو بھی اس سے نفرت کرنے پر راضی کر لے گا...... اسے اب زندگی بھر ان سے نفرت ہی ملنی تھی...... اور وہ...... ان لوگوں کی نفرت بھی نہیں لینا چاہتی تھی جنہوں نے ہمیشہ اسے محبت کے لیے ترسایا تھا...... وہ اب انہیں اپنے لیے ترسا دینا چاہتی تھی...... اگر وہ ان کے لیے اہم نہیں تھی تو اب وہ ان کو غیر اہم کر دینے والی تھی...... اسے اب ان کے ساتھ نہیں رہنا تھا......! ایک دم وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچی تو اس کی بھیگی آنکھوں میں پتھریلی سی سفاکیت اتر آئی تھی۔ جس کے بعد اس نے کروٹ بدل کر خود کو اپنے برابر لیٹی نمرانہ سے دور کر لیا۔

☆☆☆

اگلے روز زیتی گھر پر رہ کر شاید سارا دن اس کے پہرے پر رہا...... ماریہ بیگم نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس کو دیکھا تھا...... جبکہ ابو نے آ کر اسے دیکھنے جیسی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ شاید امی اور زیتی کی بدولت وہ بھی اس کے کارنامے سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ جس کے بعد اب ان کے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت بھر چکی تھی کہ وہ زندگی بھر شاید اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کریں...... البتہ ثمرانہ ناشتے کے بعد، دوپہر کا کھانا بھی اس کے لیے کمرے میں لے آئی تھی جسے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس لیے سائڈ پر کر دیا تھا...... کیونکہ کل اسے کھانے میں گھونسوں، لاتوں اور تھپڑوں کے ساتھ گلاس کی وہ مار پڑی تھی جس نے اس کی بھوک، پیاس کے ساتھ نیند بھی ختم کر دی تھی۔ ہر احساس سے عاری وجود لیے اس نے ایک جگہ بے حسی سے پڑے رہ کر دن گزار کر اگلا دن کر دیا تھا۔ زیتی نے اگلا سارا دن بھی گھر پر ہی گزارا تھا...... اور امروزیہ نے اگلا پورا دن بھی کمرے میں بند رہ کر گزارا...... تیسرے دن کہیں جا کر زیتی کو کسی ضروری کام سے گھر سے جانا پڑا...... مگر جانے سے قبل اس نے اس کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر اسے سنانے کو بہت اونچی آواز میں کہتے سنا۔

"امی تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں...... بی بی کو سنبھال کر رکھنا، یہ نہ ہو پھر اوپر پہنچ کر کوئی نیا کارنامہ سر انجام دے رہی ہو......" امی کو اس کی نگرانی کی تاکید کے ساتھ اس نے دانت پیس کر مزید کہا تھا۔

"کل تک برداشت کر رہا ہوں اس کو...... کل حد یہ آ جائے گا تو عذاب کی اس پوٹلی کو کسی ٹھکانے لگا کر ہی سکھ کی سانس لوں گا......" ابھی تو وہ متسبد سے بے خبر تھا...... جب اس کے ساتھ اس قدر رنجش برت رہا تھا جو اگر متسبد کا جان لیتا تو شاید اس کو مہلت کے اتنے دن بھی نہ دیتا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ کیا کرنے والا ہے...... مگر وہ اپنا ضرور جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

زیتی بول کر جا چکا تھا...... ماریہ بیگم باہر صحن میں موجود تھیں...... ثمرانہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کی خاطر کچن میں مصروف تھی...... اور خود وہ جو روز کمرے میں بند اب اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں یہاں وہاں چکر کاٹ رہی تھی...... زیتی کے واپس آنے سے پہلے وہ کسی بھی صورت عاشدہ سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ عاشدہ اس کے لیے پریشان ہو رہی ہو گی...... کیونکہ اب سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کوئی ایک بھی دن اس سے ملاقات کے بنا گزارا ہو...... اور اب تو وہ روز عاشدہ کے موبائل سے متسبد سے بھی بات کر لیا کرتی تھی...... اب صرف عاشدہ ہی نہیں متسبد بھی اس کے لیے پریشان ہو رہا ہو گا۔ متسبد کے خیال نے اس کے اندر بہت سا ہیجان بپا کیا تھا...... وہ کسی بھی طرح ابھی کے ابھی اس سے بات کرنا چاہتی تھی...... مگر...... باہر ماریہ بیگم کی موجودگی کی بدولت وہ خود کو ایسا کچھ بھی کرنے سے روکے ہوئے تھی۔ جس کے بعد اس کی وجہ سے عاشدہ کے لیے پریشانی ہوتی۔ وہ چاہتی تو ابھی کہ ابھی جا کے علی الاعلان عاشدہ سے بات کر سکتی تھی...... مگر اپنے لیے وہ عاشدہ کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی...... سو لب بھینچ کر خود پر ضبط کیے موقع کی تلاش میں بار بار دروازے تک چکر لگا رہی تھی...... اور پھر موقع اسے قدرت نے فراہم کر ہی دیا...... ہوا بس یہ تھا کہ ثمرانہ سے سالن میں مرچی زیادہ ہو گئی تھی...... اور وہ مرچی سے لال ہوتے اس سالن کو ابا کے پاس لے کر گئی تو بجائے تھے کے بعد انہوں نے سالن سمیت سارے برتن پٹخ دیے تھے۔ ماریہ بیگم صورت حال کو دیکھنے کی نیت سے اندر گئیں تو وہ ثمرانہ کے ساتھ ان پر بھی الٹ پڑے۔

امروزیہ کی وجہ سے وہ کل سے ویسے ہی بھرے بیٹھے تھے اب موقع ملا تو ماریہ بیگم پر اس لیے برس پڑے کہ انہوں نے ان کے گھر کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کی اولادوں کی تربیت ڈھنگ سے نہیں کی۔ تبھی آج ان کی بیٹیاں ان کی عزتوں کو نیلام کرنے کی حد تک آ گئی ہیں...... انہوں نے سارا ملبہ بیوی پر ڈالا...... تو سدا کی تیز طرار ماریہ بیگم نے برداشت پر تین حرف بھیجتے ہوئے میدان میں اتر کر دو بدو ان سے مقابلے بازی شروع کر دی...... اب یہ لڑائی بہت دیر تک چلنی تھی۔ امروزیہ کے لیے راستہ بالکل صاف تھا...... اس نے تیزی سے کمرے کے دروازے کو پار کیا اور چھت تک جاتی سیڑھیوں کو پھلانگتی اوپر چلی آئی...... عاشدہ وہاں نہیں

تھی..... اس نے بنا کچھ بھی سوچے آج دوسری بار اپنی اور حاشدہ کی چھت کی مشترکہ منڈیر کو پھلانگا اور نیچے جاتی سیڑھیوں کو پھلانگتی چلی گئی۔ اب وہ حاشدہ کے صحن میں کھڑی یہاں وہاں نظر دوڑا کر تلاش کر رہی تھی ..... جب اس نے سامنے کے کمرے سے نکل کر حاشدہ کو برابر کے کمرے میں جاتے دیکھا وہ بھی تیزی سے قدم اٹھا کر اس کے پیچھے چلی آئی..... صد شکر کہ وہاں اس کمرے میں حاشدہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا..... اس نے تیزی سے دروازہ بند کیا تو حاشدہ نے پلٹ کر دیکھا اور اسے اپنے سامنے دیکھ کر بہت حیران سی اس کی طرف بڑھتی بولی۔

''اوہ امروزیہ..... تم کہاں تھیں دو دن سے..... تمہیں اندازہ بھی ہے میں اور مستبد تمہارے لیے کس قدر پریشان ہو رہے تھے..... تم اگر آج مجھ سے نہ ملتی تو میں تمہاری امی کی پروا کیے بنا آج تم سے ملنے تمہارے گھر آنے والی تھی۔''

اس نے ایک سانس میں دو دن کی مختصر روداد سنانے کے بعد اپنے ارادے سے باخبر کیا تو امروزیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم لوگ پریشان ہو رہے ہو گے۔ اس لیے میں تم سے ملنے یہاں چلی آئی ہوں۔'' ذرا توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔

''میں مستبد سے بات کرنا چاہتی ہوں کیا تم ابھی میری اس سے بات کروا دو گی.....؟''

''ہاں، ہاں میں ابھی تمہاری اس سے بات کروا دیتی ہوں..... مگر پہلے تم بیٹھو..... اور یہ تمہیں چوٹ کیسے آئی.....؟'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے کے ایک طرف بٹھایا اور اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اس کے زخموں کے متعلق سوال کیا تو اس نے عجلت میں مختصراً سب بتا دیا۔

''سنو میرے پاس ٹائم بہت کم ہے..... ابھی اگر امی کو میری غیر موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ سیدھی یہاں تمہارے گھر آ کر طوفان مچا دیں گی..... اس لیے میں تم سے باقی کی باتیں بعد میں کروں گی۔ پہلے تم ابھی میری مستبد سے بات کروا دو پلیز.....'' اس نے ملتجی انداز میں گزارش کی تو حاشدہ نے مزید وقت ضائع کیے بنا مستبد کا نمبر ملا کر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تم بات کرو..... میں باہر جا کر دیکھتی ہوں کوئی اس طرف نہ آ جائے.....'' بات مکمل کر کے وہ کمرے سے چلی گئی تھی..... اس نے موبائل کان سے لگایا بیل جا رہی تھی..... تیسری بیل پر مستبد نے کال پک کی۔ اس کی آواز سن کر اس کا لرزتا دل تھمیں کر اپنی جگہ ٹھہرا تھا۔ اس نے گہری سانس بھر کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ دوسری طرف موجود مستبد اپنی ہیلو، ہیلو کے جواب میں خاموشی پا کر پوچھ رہا تھا۔

''حاشدہ کیا ہوا..... تم بول کیوں نہیں رہی ہو؟''

''میں..... بات کر رہی ہوں امروزیہ.....'' اس نے دھیمے سے انداز میں لفظوں کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا تھا جبکہ دوسری طرف مستبد اس کی آواز سن کر ایک دم بہت..... بے چین ہو کر بولا۔

''اوہ..... امروزیہ..... یہ تم ہو..... کہاں تھیں تم..... جانتی بھی ہو میں کس قدر پریشان تھا.....''

''ہاں، مجھے اندازہ تھا تبھی تو اب بات کرنے آئی ہوں.....''

''مگر تم کہاں چلی گئی تھیں.....؟'' اس کے جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی تبھی جواب پر پھر سے سوال کیا تو وہ بولی۔

''تم نے اسی لیے جانا تو رشتہ بھیجا ہے ناں.....'' مبہم سا جواب تھا وہ الجھ گیا۔

''یہ آج کیسی باتیں کر رہی ہو تم.....؟'' وہ الجھن بھرے لہجے میں بولا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہوں میں.....؟ بتا رہی ہوں کہ تم پریشان ہو رہے تھے اس لیے اب میں آ گئی ہوں.....'' اسے گزرتے وقت کا احساس بھی تھا اور مستبد کے ساتھ کا یقین بھی درکار تھا تبھی بہت سنجیدگی سے مختصر اور بہت ادھورا سا بول رہی تھی..... جبکہ مستبد کہہ رہا تھا۔

''ہاں..... تم جو بنا بتائے اچانک غائب ہو گئیں تو میں نے پریشان تو ہونا ہی تھا.....'' اس نے اپنی پریشانی کا اعتراف کیا تو امروزیہ نے انداز میں پہلی سی سنجیدگی لیے سوال کیا۔

''اور اگر میں اچانک سے ہمیشہ کے لیے آ جاؤں تو؟''

''تو کیا..... پھر آ جاؤ.....'' مستبد ہنسا تھا..... اس

کی ہنسی چھنکار بن کر امروزیہ کی سماعتوں کو سیراب کرتی محسوس ہونے لگی تو اس نے نرم سے لہجے میں پوچھا۔

''سنبھال لو گے.....؟''

''ہاں.....!''

ہمیشہ یہ ہوتا تھا وہ بولتا تھا امروزیہ سنتی تھی..... آج وہ پوچھ رہی تھی وہ بتا رہا تھا۔ اور جب بتا چکا تو امروزیہ نے بات سمیٹ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر میں آرہی ہوں..... اب سے ٹھیک پندرہ منٹ بعد تم کو پبلک پارک میں ملوں گی..... تم وہاں آجاؤ.....'' بات مکمل کر کے اس نے کال ڈسکنکٹ کی موبائل صوفے پر ڈالا اور دھڑکتے دل کی پروا کیے بنا تیزی سے جگہ چھوڑ کر باہر کی طرف لپکی۔

جہاں حاشدہ دروازے کے ایک طرف اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں منتظر کھڑی تھی..... اسے سامنے دیکھا تو اس کی طرف بڑھی۔ اس نے دو قدم اٹھائے امروزیہ چار قدم اٹھا کر اس سے پہلے اس تک پہنچ کر اس سے بغل گیر ہوئی پھر گلوگیر انداز میں بہت جذباتی سا ہوتی ہوئی بولی۔

''تم بہت اچھی ہو حاشدہ..... میں زندگی میں ہمیشہ تم سے ملتے رہنے کی دعا کروں گی.....'' اس کے گال پر بوسہ دے کر وہ اس سے الگ ہوئی پھر اس کے ہاتھ پکڑ کر بولی۔

''میں چاہتی ہوں میری وجہ سے تمہیں کبھی کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے..... اس لیے میرے بعد اگر کوئی تم سے کچھ بھی پوچھنے آئے تو تم کسی کو کچھ بھی مت بتانا.....''

آج اس کی ہر بات ادھوری تھی..... تکمیل کی چاہ میں سامنے والا سوال کرتا تو وہ اپنے جواب سے بات کو مزید ادھوری سی تشنگی سے بھر دیتی..... اب بھی اس کی ادھوری بات سے حاشدہ نے پریشان ہو کر کچھ کہنا چاہا تو اس نے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی عجلت میں ہوں..... زندگی اعتدال میں آکر جب میرے وقت کو معتدل کر دے گی تو فرصت میں مل کر تمہیں سنوں گی بھی..... اپنی سناؤں گی بھی۔ تب تک کے لیے چپ رہ کر میرے لیے دعا کرتی رہنا۔'' اس نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر دبایا پھر اپنی نظر میں اس کو بھر کر اس کے ہاتھوں کو چھوڑا..... مسکرائی اور پلٹ کر اس سے فاصلہ کرتی اس تیزی سے واپس پلٹ گئی جس تیزی سے وہ آئی تھی۔

☆☆☆

پھر جس وقت وہ محتاط انداز میں سیڑھیاں اتر کر اپنے گھر کی حدود میں داخل ہوئی..... گھر کی خاموش فضا میں شہرانہ کے رونے کی ذرا ذرا آواز ابھرنے کے ساتھ ماریہ بیگم کی غصیلی آواز ذرا، ذرا سے وقفے سے ابھر رہی تھی..... جس کا مطلب تھا ابھی تک وہ تینوں ابا کے کمرے میں ہی موجود تھے..... بس اب یہ ہوا ہوگا کہ ابا، ماریہ بیگم کی باتوں کا مقابلہ نہ کر سکنے کے بعد... خاموش ہو کر ان کو گھور رہے ہوں گے اور ماریہ بیگم کلیجے میں بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہنوز شوہر کی اگلی پچھلی سب غلطیاں، کوتاہیاں سنا کر اپنے نصیبوں کو کوستی ان کو صلواتیں سنا رہی ہوں گی۔ اور یہ سلسلہ مزید اس وقت تک چلتے رہنا تھا جب تک ماریہ بیگم کی چلتی زبان تھک کر اکڑ نہ جاتی..... اور امروزیہ جانتی تھی..... ان کی زبان کے اکڑنے میں اب بس ذرا دیر باقی تھی..... اور اس ذرا دیر میں اس نے وہ کرنا تھا جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں کے زیر و بم کو روک کر اعتدال میں لانے کی کوشش کی اور تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔ افراتفری کے عالم میں الماری سے دو، تین سوٹ نکال کر بیگ میں ٹھونسے اپنے پاس جمع چند روپوں کو مٹھی میں دبوچا..... اور پھر سانس روک کر دبے قدموں سے بنا آہٹ کیے چپکے سے دروازہ کھول کر گھر کی چوکھٹ پار کر گئی۔

پبلک پارک کے مین گیٹ کے قریب نسبتاً تنہا گوشہ منتخب کر کے وہ وہاں نصب سیمنٹ کی بینچ پر اس رخ سے بیٹھ گئی کہ اب پارک میں آتے جاتے لوگوں کو آسانی سے دیکھ سکتی تھی..... اس کی نگاہیں ہر چہرے میں مستبد کو تلاش رہی تھی..... مگر اس کے بتائے پندرہ منٹ سے زیادہ وقت گزرنے کے باوجود اس کی نگاہوں کا انتظار ختم نہیں ہوا تھا۔ مستبد اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا..... وقت جوں، جوں گزر رہا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

''مستبد نے کہا تھا وہ سنبھال لے گا..... تو وہ ابھی تک پہنچا کیوں نہیں تھا؟'' اس کی بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ دل بہت خاموش سا تھا مگر دماغ اسے صلاح دے رہا تھا کہ

ہوسکتا ہے کہ مستبد اس سے پہلے پارک آیا ہو۔ اور اب اتنے بڑے سے پارک میں اسے تلاش کر رہا ہو۔ اگر وہ اسے تلاش کر رہا ہوگا تو وہ اس کی تلاش میں یہاں تک ضرور آئے گا...... دلاسوں میں مکمل تشفی ہو ناں ہو مگر وقتی سکون ضرور مل جایا کرتا ہے۔ وہ بھی دماغ کے بجھاتے دلاسے کو پا کر ذرا سا مطمئن ہوتی ہوئی نگاہوں کو دور دور تک مستبد کی تلاش میں دوڑنے لگی تھی...... مگر اس کی منتظر نگاہیں انتظار سے تھک کر بار، بار مایوس پلٹ آئی تھیں۔

''پتا نہیں وہ کہاں رہ گیا تھا...... کیا اسے خود پارک کا ایک چکر لگا کر اسے ڈھونڈ لینا چاہیے......؟'' اس خیال کے آنے پر اس نے ذرا دیر چپکی رہ کر کچھ سوچا...... پھر لبوں کو بھینچتے ہوئے بیگ پر اپنی گرفت مضبوط کر کے جوں ہی اس نے اٹھنے کے لیے پاؤں سمیٹے...... کوئی اس کے قریب آ کر بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گردن گھما کر نو وارد کو دیکھا...... نہ جانے کون جوان مرد تھا...... وہ فوراً بیگ چھوڑ کر اٹھنے لگی تھی جب اس کی سماعتوں سے اس شخص کی آواز ٹکرائی...... وہ کہہ رہا تھا۔

''بیٹھی رہو...... میں مستبد کا دوست ہوں......''

''مستبد کا دوست...... تو وہ خود کہاں تھا؟''

اس کی بات سن کر اس نے حیرت سے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا جو اپنی بات کہہ کر اب چپ سا بالکل سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کی چپ نے اسے دہلا دیا تھا جبھی سراسیمگی کے انداز میں اس کے لبوں نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔

''مستبد کہاں ہے......؟''

''وہ چلا گیا ہے......''

''چلا گیا مطلب...... میں اس کے لیے آئی ہوں۔''

''مگر اس کے ساتھ نہیں آئی ہو......''

وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا...... البتہ بہت چپ سا بالکل سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے بہت مہذب انداز میں اسے لفظوں کے طمانچے مار رہا تھا۔ اسے جوا نے مل ہوتے پر اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیل کر زندگی کو سنوارنے نکلی تھی...... اور شاید اب اس کی اپنی زندگی ہی اسے اس کی زندگی کی سب سے بھیانک شکست سے دوچار کرنے والی تھی۔ اپنی ہار کے خوف سے اس نے بھیگی نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھا تھا۔ جواب گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مستبد آیا تھا تم سے ملنے...... مگر تمہارے پاس یہ بیگ دیکھ کر اس نے اپنے قدموں کو واپس موڑ لیا...... کہہ رہا تھا وہ تمہیں پسند کرتا تھا...... اور اگر وہ تمہیں یونہی مسلسل پسند کرتا رہتا تو عین ممکن تھا اسے تم سے محبت ہو جاتی...... اور پھر جب اسے تم سے محبت ہو جاتی تو بہت سارے لوگوں کے ساتھ پوری شان سے تمہیں لینے تمہارے گھر آتا...... تب تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔ تمہارے ساتھ رہتا...... اپنی دنیا چھوڑ کر تمہاری مرضی کی دنیا میں تمہارے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلتا اور عمر تمام کر دیتا...... مگر ایسا تب ہوتا جب وہ تمہیں پسند کرتے رہنے کے بعد تم سے محبت کرتا......'' اس کے برابر ہاتھ بھر کے فاصلے پر بیٹھے اس شخص نے ابھی اپنی بات مکمل نہیں کی تھی۔ اس کے لب ابھی مزید بولنے کی پوزیشن میں وا تھے...... اس نے دیکھا مگر دیکھنے کے باوجود وہ درمیان میں اس کی بات کاٹ کر تڑپ کر بولی تھی۔

''مگر میں اس سے محبت کر چکی ہوں......''

''تو...... یہ تمہارا مسئلہ ہے اس کا نہیں......'' وہ شخص گردن موڑ کر اب پھر سے بالکل سامنے دیکھ کر سپاٹ انداز میں اسے جواب سے نواز کر پھر سے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہوئے کہنے لگا...... وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہارے پاس اس بیگ کی موجودگی بتا رہی ہے تم گھر چھوڑ کر آئی ہو...... اور کسی گھر چھوڑ کر آئی لڑکی کو وہ پسند کرتے رہنا نہیں چاہتا...... اس لیے اس نے تمہارے لیے اپنی پسند کو سمیٹ کر تمہیں یہیں چھوڑا اور چلا گیا......''

وہ تمام تفصیل اس کے گوش گزار کر کے اب خاموشی اختیار کر چکا تھا...... جبکہ وہ سب سن کر اب سر جھکا کر خاموش آنسو بہا کر رو رہی تھی۔ وہ پہلے بھی روئی تھی۔ وہ ابھی رو رہی تھی اور شاید اس نے عمر بھر رونا ہی تھا کیونکہ اب اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہار کر اس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری طرح ہاری بیٹھی تھی جبکہ برابر بیٹھے شخص کے لب ایک بار پھر حرکت میں آئے۔ لفظ پھر ہوا کے دوش لہرا کر اس کی سماعتوں میں ایسے اترنے لگے۔

"اس کے ساتھ میں بھی لوٹ جانا چاہتا تھا... مگر پھر میری واپسی کا لمحہ مجھے اس لیے یہاں تک کھینچ لایا تا کہ تم سے پوچھ سکوں۔" وہ مرد تھا اس نے غور کیا سو کیا۔ "مگر تم نے عورت ہو کر خود کو خود تباہ کیوں کیا؟"

سوال کر کے وہ جواب کے انتظار میں اب استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس [illegible] تھے جیسے اب بھی کچھ بھی نہیں بولنا چاہتی ہو۔ اس شخص نے کچھ دیر منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر اس کے [illegible]نے کا انتظار کیا تھا مگر جب وہ کچھ نہ بولی تو اس نے [illegible] پھر کہا۔

"[illegible] دیر ہوئی ہے، آؤ میں تمہیں تمہارے [illegible] چھوڑ آتا ہوں۔" [illegible] نے پھنکار کر اپنا [illegible] زبان کی نوک پر لا [illegible]

"اگر وہ گھر، گھر ہوتا [illegible] میرا [illegible] وقت یہ بیگ لے کر یہاں بیٹھی کسی کی [illegible] رہی ہوتی۔"

وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی اور دھتکار دی گئی تھی۔ مگر اب اسے اس گھر واپس جا کر ان لوگوں کی تشدد بھری نفرت قبول نہیں کرنی تھی جنہوں نے اس پر زندگی کو تنگ کر کے خود کو برباد کرنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ تو پھر ٹھیک ہے اسے اس بربادی کو ہی قبول کر کے مقدر کر لینا تھا... فیصلے کی سنا کیت جوں، جوں اس کے اندر اتر رہی تھی وہ خود کو پتھر کی طرح سخت اور سرد محسوس کر رہی تھی۔ پھر جب وہ فیصلہ کر چکی تو اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے جذبات سے عاری سپاٹ انداز میں بولی۔

"میں دھتکار دی گئی ہوں... تم مجھے انتظار کی زحمت سے بچانے کے لیے یہ بتانے آئے تمہارا شکریہ... اب تم جا سکتے ہو..."

برابر بیٹھے شخص نے اس کو سنا... اس کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کر اپنی جگہ سے اٹھا چند قدم اٹھا کر ذرا دور تک گیا... مگر پھر وہیں سے پلٹا اور پھر پلٹ کر واپس آ کر بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا۔

"اگر تم چاہو تو میں تم سے شادی کر سکتا ہوں۔"

ایک بار پھر اس کی آواز اتنے قریب سن کر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا وہ جو پہلے سے اس کی طرف متوجہ تھا... توجہ ملنے پر دونوں بھویں اٹھا کر وضاحتاً بولا۔

"گھر چھوڑ آئی ہو... گھر تو پھر بھی چاہیے ہوگا ناں... تم ضرورت مند ہو، میں بھی ضرورت مند [illegible] ایک دوسرے کے [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] تمہیں گھر مل جائے گا... اور مجھے گھر والی کے نام پر وہ رشتہ مل جائے گا جو میرے پیچھے میرے گھر اور میری بیمار ماں کو سنبھال سکے۔"

اس کے اندر آگ بھڑک گئی تھی... وہ اسے بہت سخت سست سنا کر جھڑک دینا چاہتی تھی مگر وہ اس کو بولنے کا موقع دیے بنا اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

"مستبد کی طرح جب میں نے تمہیں اس بیگ کے ساتھ دیکھا تھا تو دل میں تمہارے لیے بہت خراب لڑکی بن رہا تھا۔ میں بھی مستبد کے ساتھ واپس پلٹ جانا چاہتا تھا مگر جس سے میں واپسی کے لیے قدم اٹھا رہا تھا میری نظر کو تمہاری نگاہوں میں [illegible] بس تحریر نے جکڑ لیا... [illegible] بات کی تو [illegible] برائی کے ہاتھوں [illegible] تم ایک شدید اچھے گھر کی [illegible] بھی تھا تمہارا تھا... تم چاہتیں تو [illegible] خیر جو تم کو بہتر لگا تم نے کیا... اب جب تم نے [illegible] میں واپس جانے کو اٹھ کر چلا ہی گیا تھا۔ تب مجھے خیال آیا... ہم ایک ڈیلنگ کر لیتے ہیں... مجھے اپنے بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا ہے اور اس سلسلے میں مجھے کب تک وہاں رکنا ہوگا اس کے متعلق ابھی میں خود بھی نہیں جانتا... ایسے میں پیچھے میرے گھر اور میرے گھر میں موجود میری ماں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے یوں اپنی، اپنی جگہ ہم دونوں ہی شدید ضرورت مند ہیں۔ سو ایک دوسرے کی مدد کر لیتے ہیں۔ تم کو گھر مل جائے گا اور مجھے گھر والی کی صورت میں گھر کی فکر سے آزادی... اس طرح اپنی، اپنی جگہ ہم دونوں کی زندگی ذرا سہولت میں آ جائے گی... ہے ناں۔"

عجیب شخص تھا اس پر بھروسا کر رہا تھا جو خود اپنا بھروسا توڑ کر اپنا گھر چھوڑ آئی تھی...... تو وہ اس کا گھر اور اس کی ماں کو سنبھال سکتی کیا......؟

عجیب سے احساسات نے اس کی آنکھوں کو بھگونا شروع کیا اس نے چھپانے کو پلکوں کو جھکایا مگر سامنے بیٹھا شخص کمال کا جادوگر تھا جو بدلیوں کے پیچھے کے لفظ بھی سن سکنے کی طاقت رکھتا تھا، اس لیے اس کے لب ہلائے بنا اس کی نگاہوں کی تحریر پڑھ کر اس نے کہا تھا۔

''میں نے کہا ناں تم بری لڑکی نہیں ہو...... میں تم پر بھروسا کر سکتا ہوں اور اب ایسے وقت میں تمہیں بھی مجھ پر بھروسا کر لینا چاہیے...... جب خود تمہارے پاس پیچھے پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہے اور آگے کے راستوں سے تم ناواقف ہو...... تو کسی خراب راستے پر خوار ہونے کے بجائے میں ایسے وقت میں تمہیں جائز رشتہ دے کر ہر وہ صاف راستہ دے رہا ہوں جس کی تمہیں ضرورت ہے۔'' وہ مسلسل بول رہا تھا...... اور وہ سن کر خود سے کہہ رہی تھی۔

''زندگی نے مجھے ہر طرح سے شکست زدہ کر دیا ہے...... اب کسی جیت کی توقع کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... ہاں تھکے ہارے وجود کو رُلنے کے لیے ایک راستہ درکار ہے...... اب اگر وہی ایک راستہ خود چل کر میرے پاس آرہا ہے تو پڑاؤ ڈال کر عمر تمام کر ہی دینی چاہیے......'' اس نے سر جھکا کر خود کو کہتے سنا۔

''میں تم سے نکاح کے لیے تیار ہوں......''

دل نے مستبد کا نام لے کر ایک ہوک بلند کی تھی جسے اس نے سختی سے دبا کر اٹھنے کے لیے سختی سے زمین پر قدم جما دیے تھے۔

جس کے سہارے اس نے فلک کو چھونے جیسے دلفریب خواب دیکھ کر ان خوابوں کو چھونے جیسی گستاخی کرنے کی چاہ میں اتنا کچھ قدموں تلے روند دیا تھا۔ اب اس کے لیے اپنا آپ اپنے قدموں تلے روند دینا کون سا مشکل تھا۔ اس نے چاہے جانے کی چاہ رکھنے والی امروزیہ کی گردن پر پاؤں رکھا اور اس اعلیٰ ظرف شخص کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل پڑی جو گھر سے بھاگی لڑکی کو اپنے نکاح میں لینے کے لیے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

چند گواہوں کی موجودگی میں عزیز نے اسے اپنے نکاح میں لیا اور پھر اسے اپنے ہمراہ اپنے گھر لے آیا۔ کسی بنگلے اور پوش ایریا میں موجود وہ گھر، گھر کم اور محل زیادہ تھا...... جو ہر دیکھتی آنکھ پر عزیز کی شان و شوکت کو بہت وضاحت سے عیاں کرتی تھی۔ اس نے دیکھا اور آنکھوں سمیت سر کو جھکا لیا۔ اس نے اس سب کی چاہ کبھی نہیں کی تھی مگر جو چاہا تھا وہ تو وہ بھی نہیں تھا۔ ایک دم ہی اس کے احساسات نے کروٹ لے کر ''جو ہو چکا تھا'' اس کی توجہ مبذول کروائی تو اس نے اپنے دل کو کسی گہری کھائی میں گرتا ہوا محسوس کرتے ہوئے خود کو چکراتا... محسوس کیا۔ انہی چکراتے محسوسات کے زیر اثر اس نے اپنے قدموں کو زمین سے اکھڑ کر ذرا سا لڑکھڑاتا ہوا...... محسوس کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی اس کے برابر چلتے عزیز نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ کو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لیے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک معمر خاتون دوائیوں کے زیر اثر شاید سو رہی تھیں...... کمرے میں موجود ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک طرف کھڑی خاتون ان کو آتے دیکھ کر ایک دم الرٹ ہوئی مگر عزیز اسے نظر انداز کیے اسے اسی طرح اپنے ہمراہ لیے آگے بڑھا اور بیڈ کے قریب دائیں طرف پڑی چیئر پر اس کو بٹھا دیا۔ اور خود پہلے پلٹ کر کمرے میں موجود خاتون کو اشارے سے باہر جانے کا کہا اور پھر خود بیڈ پر موجود وجود کے قدموں کے قریب بیٹھ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔

''یہ میری ماں ہیں...... کوما کی بدولت گہری نیند میں ہیں...... اس لیے ان کو اپنے ساتھ باہر نہیں لے جا سکتا تھا اور ان کو یہاں اکیلے ملازموں کے سہارے چھوڑ کر جانے کو میرا دل راضی نہیں ہو رہا تھا...... مگر اب تم یہاں ہو، میں اطمینان سے جاؤں گا...... تم ان کو سنبھال لو گی ناں......'' بات کرتے، کرتے آخر میں اس نے اتنا اچانک سوال کیا کہ وہ فوری طور پر جواب میں کچھ بھی نہ بول سکی اور وہ شاید اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا...... اس لیے اپنے سوال کو ایک طرف کرتے ہوئے بات کا سلسلہ پھر سے جوڑتے ہوئے بتانے لگا۔

''ماں، بابا سے بہت محبت کرتی تھیں...... یا شاید بابا، ماں سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے...... یا پھر

شاید دونوں ہی ایک دوسرے سے زیادہ محبت کرتے تھے..... اتنی محبت کہ جب ماں، بابا نے شادی کرنا چاہی اور دونوں کے گھر والوں نے اس شادی کے لیے رضامندی ظاہر نہ کی تو دونوں نے اپنی، اپنی فیملیز کو چھوڑ کر اپنی الگ ایک فیملی بنالی..... بالکل ایک چھوٹی سی جنت کی طرح..... میں نے آ کر ان کی جنت کو مزید خوب صورت کر دیا..... سب کچھ بہت مکمل تھا کہ بابا ہم کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں جا بسے۔ ماں، بابا کی اس جدائی کا صدمہ سہار نہ سکی اور تب سے ایسی چپ ہوئیں کہ دوبارہ بولی ہی نہیں..... حالانکہ میں دن میں اپنا فارغ وقت ان کے پاس بیٹھ کر اتنا زیادہ بولتا ہوں کہ خود ہی بول بول کر تھک جاتا ہوں..... بہت غمگین سا دوا تھا اپنے سے جڑے لوگوں سے روشناس کرواتے ہوئے آخر میں یوں ہنسا، جیسے اگلا تھا..... مگر جب نگاہ سر جھکائے خاموش بیٹھی امروزیہ پر پڑی تو ایک دم چپ ہو گیا..... اس کی چپ محسوس کرتے امروزیہ نے سر اٹھایا تو نظر ملنے پر مزید نے کہا۔

"سوری، مجھے خیال کرنا چاہیے تھا کہ تم ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے مجروح ہو..... ایسے میں، میں تمہیں مزید تکلیف دینے کی وجہ بن رہا ہوں۔"

"نہیں..... میں سن رہی ہوں....." وہ واقعی سن رہی تھی..... اس لیے اس نے اس کے انداز میں شرمندگی محسوس کی تو فوراً اپنی توجہ کا ارتکاز اس پر ظاہر کرتے ہوئے اسے مزید بولتے رہنے کا عندیہ دیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ دیر بعد بولا۔

"میں بہت بولتا ہوں..... اس لیے جب تک یہاں ہوتا رہوں گا تم سنتی رہنا..... مگر ابھی فی الحال اٹھو میں تمہیں تمہارا کمرا دکھا دیتا ہوں..... فریش ہو کر تم تھوڑا ریسٹ کرلو....."

کس قدر مہربان شخص تھا وہ..... خیال بھی رکھ رہا تھا اور اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہونے دے رہا تھا..... اس کے باوجود امروزیہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوتی دکھائی دینے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی جگہ سے اسے اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر اس کمرے سے نکلا اور راہداری پار کر کے اپنے کمرے میں لے آیا۔

غزل

شہر کا باسی مکمل نہیں ہونے پاتا
یہ ہے وہ پیڑ جو جنگل نہیں ہونے پاتا
وہ جو چلتے ہوئے اوروں کا بھلا سوچتے ہیں
ان کا رستہ کبھی دلدل نہیں ہونے پاتا
اتنی بے جان میں پہلے تو نہیں ہوتی تھی
برف پر ہاتھ رکھوں شل نہیں ہونے پاتا
آئینے اس کا فقط درد سمجھ سکتے ہیں
جس کی خاطر کوئی پاگل نہیں ہونے پاتا
میں ہوں عورت میں کسی دیس میں محفوظ نہیں
کوئی پرچم مرا آنچل نہیں ہونے پاتا
سعدیہ مجھ کو ہواؤں سے یہی شکوہ ہے
کوئی آنسو مرا بادل نہیں ہونے پاتا

کلام: سعدیہ سیٹھی، نوٹنگھم یو کے

''صبح تک یہ میرا کمرا تھا...... مگر اب سے یہ تمہارا بھی ہوگا......'' وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا...... مگر اپنے انداز و الفاظ سے اسے اس کا حق واضح دے رہا تھا...... اس نے محسوس کیا تو ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''کم از کم مجھ جیسی لڑکی اس جیسے بہت خاص مرد کے لائق نہیں تھی۔'' اس کی اپنی سوچ نے اس کا سر مزید جھکا دیا تھا۔ عزیر اس کے اس طرح ہار، ہار چپ ہو جانے کو محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے اس بار اس کی چپ کو محسوس کیا تو ہاتھ بڑھا کر ہولے سے اس کے گال پر چٹکی دے کر ایک مہربان سی مسکراہٹ اس کے حوالے کی اور اسے پُرسکون ہونے تک کے لیے کمرے میں اکیلا چھوڑ گیا۔

وہ وہاں سے جا چکا تھا...... اس کے باوجود وہ بہت دیر تک خالی الذہنی کی کیفیت میں اسی جگہ کھڑی رہی تھی پھر جب کھڑے، کھڑے تھک گئی تو ایک گہری سانس بھر کر قدموں کو حرکت دی۔ بیگ سے ایک سوٹ نکالا اور فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گئی...... شاور کے بعد وہ خود کو ریلیکس کرنے کی نیت سے صوفے پر بیٹھی اور پھر اتنے دنوں اور راتوں کی جاگی نیند اور ذہنی تھکان نے اس کے اعصاب کی برداشت کی حد سے ہار مان کر اس کی آنکھوں کو ہوش سے غافل کیا اور وہیں سو گئیں۔ جاگی اس وقت جب عزیر نے آکر اس کو پکارا...... وہ ہڑبڑا کر اٹھی وہ کہہ رہا تھا۔

''کھانا لایا ہوں...... آؤ کھا لیتے ہیں......'' کھانے کے دوران وہ جان بوجھ کر اس کا دھیان بٹانے کے لیے یہاں وہاں کی چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتا رہا...... پھر جب وہ کھانا کھا چکے تو عزیر نے برتن کچن میں جا کر رکھے بعد آکر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کب سے میں ہی بول رہا ہوں...... اب تمہیں بھی کچھ بول لینا چاہیے ناں......'' یہ سچ تھا کہ کب سے وہی مسلسل بول رہا تھا اور اس مسلسل بولنے تک میں وہ اسے اپنے متعلق بھی کچھ بتا چکا تھا۔ اب اسے بھی بول کر اپنے متعلق سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا مگر...... اس نے کچھ بھی بولنے سے پہلے سر اٹھا کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا جو سادہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس نے اضطراری حالت میں دائیں ہونٹ کا اندرونی کونا دانتوں تلے دبا کر اپنے اندر جھانکا تھا۔ جہاں اب کسی بھی طرح کا کوئی شور سنائی نہیں دے رہا تھا...... البتہ ایک احساس تھا جو سر اٹھا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر کے جتا رہا تھا کہ ''یہ سامنے بیٹھا شخص کسی قسم کی کوئی بھی ناانصافی ڈیزرو نہیں کرتا ہے اس کے ساتھ ناانصافی ظلم کے برابر ہوگی۔''

اور وہ اس مہربان شخص کے ساتھ ظلم کی مرتکب ہونا نہیں چاہتی تھی اس لیے گہری سانس بھر کر اس نے بولنے کو لب کھولے اور پھر اپنی زندگی کے ہر رخ سے پردہ اٹھاتے ہوئے اس نے سب کچھ وہ سب جو اس نے گزارہ ایک، ایک کر کے وہ بولتی رہی...... روتی رہی اور آخر میں بول، بول کر تھکن محسوس کرنے لگی تو چپ اختیار کر لی۔ مگر آنکھوں سے بے آواز بہتے آنسوؤں کی برسات مسلسل جاری تھی۔ جتنی دیر وہ بولتی رہی تھی عزیر چپ کر کے اس کو سنتا رہا تھا...... اسے بولنے سے روکا نہ ہی رونے سے منع کیا...... ہاں جب وہ بول کے خاموش ہو چکی تو اس نے کہا۔

''دنیا میں کسی کی بھی زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہوتی ہے امروز یہ...... اسے پھولوں کی سیج بنانے کے لیے خواہشوں کی پلیٹ میں محرومیوں کو سجا کر ضبط کے چمچ سے محرومی کے ہر لقمے کو خوب چبا، چبا کر نگلنا پڑتا ہے...... تب کہیں جا کر نصیب کی زمین پھولوں کی آبیاری کے لائق بنتی ہے۔ مگر تم نے معلوم ہے کیا کیا......؟ تم نے خواہشوں کی پلیٹ کو گرفت میں لے کر محرومیوں کو الٹ کر نصیب کی زمین کو پھولوں کی چاہ میں کھود ڈالا...... تو پھر ببول کے کانٹوں نے تمہارے ہاتھوں کو زخمی کرنا ہی تھا...... مگر شکر کرو زخم ہو کے رہ گیا ناسور نہیں بنا...... ٹھیک ہے غلط ہوا ہے مگر بہت غلط ہونے سے بچ گیا۔'' اس نے ذرا سی استفہامیہ نظروں سے اس کو دیکھا تھا پھر وضاحتاً بولا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں نے تمہیں بچا لیا...... مگر میں یہ شکر کرتا ہوں کہ مجھے بھیج کر اللہ نے تمہیں کسی بھی غلط ہاتھ لگنے سے بچا لیا۔ مستند اچھا لڑکا ہے مگر تم میرا نصیب تھیں...... اور میں محبت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا مگر ہاں تمہارا

خیال ضرور رکھوں گا......'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سسکتے وجود کو اپنی مہربان آغوش میں لیا تو تھک کر اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا...... کیونکہ اب یہی اس کا نصیب تھا اور اسے قبول تھا پھر جتنے دن وہ رہا اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا رہا۔ جانے لگا تو اپنا پورا گھر، اپنی ماں اور بہت سارا بینک بیلنس اس کے حوالے کر کے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ وہ چلا گیا مگر بہت سی ذمّے داریوں میں مصروف کر گیا۔ جس میں سب سے بڑی ذمّے داری اس کی ماں تھی، وہ ماں جو بولتی نہیں تھی جو دیکھتی نہیں تھی... ہاں مگر شاید وہ سنتی ضرور تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ امروزیہ بولتی نہیں تھی لیکن وہ اس آدھی نیند سوئی خاتون کی خاموش خدمت گزار بن گئی۔ اس خدمت گزاری نے...... استاد بن کر اسے بہت سے سبق پڑھائے جس میں سب سے اہم سبق اس نے یہ پڑھا۔

''انسان کی فطرت صبر اور شکر سے جڑی ہے جس نے اس وصف کو پا کر خود کو اس پر ثابت قدم رکھا اس نے انسانیت کی معراج کو پا لیا۔ اور اس نے انسان ہو کر کیا کیا...؟ اس نے صبر کو پکار کر ناشکرے پن کی انتہا کرتے ہوئے خود کو انسانیت کی ہر معراج سے گرا لیا۔ خود لینے کے لیے جھولی پھیلاتی رہی مگر دینے والا ہاتھ کھینچ کر رکھا۔ اپنی بہت ساری کوتاہیوں کے ساتھ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ جو چاہتی تھی کہ ابو اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا تو خود اس نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر کیوں نہ رکھ لیا......؟ اسے بھائیوں کی محبت چاہیے تھی... نہیں ملی تو خود آگے بڑھ کر محبت میں ان سے یوں نہ لپٹ گئی......؟ اسے ماں کی توجہ درکار تھی... تو ان کی گود میں سر رکھ کر کیوں نہ کہا۔ ''ماں آج موبائل اور نیند چھوڑ کر مجھ سے باتیں کر لو......''

چاہ کر کے بس چاہتی ہی کیوں رہی... اپنی چاہ کیوں نہ ظاہر کی؟ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس اسے اب ہوا تھا جب پانی سر کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ وہ اب چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی...... اب ہمہ وقت جرم و ندامت کے احساس سے اس کا سر جھکا رہنے لگا تھا......

ہاں مگر اپنی ندامت کے ان لمحات میں اسے کوئی احساس تازگی بخشتا تھا تو وہ ثمرانہ کا خیال تھا...... ثمرانہ اس کی بہن...... جو اتنی صابر تھی کہ صبر خود اس پر رشک کرتا ہوگا...... اور شاکر اتنی تھی کہ گالیاں سن کر مسکرا دیا کرتی تھی... اس کی نگاہوں کے سامنے جب، جب اس کا وہی مسکراتا چہرہ آتا تو اپنی سماعتوں کے پردے پر وہ اپنے ہی کہے ان الفاظوں کی دستک سنتی۔

''میں اللہ سے کہہ چکی ہوں وہ میرے نصیب کی ہر خوشی سے تمہیں نواز دے گا۔'' اور اب ایسا ہی ہوا تھا...... اس کے لفظوں نے قبولیت پا کر اس کے حصے کی ہر خوشی ثمرانہ کے مقدر میں لکھ دی تھی ...... وہ ہمیشہ ماں، باپ اور بھائیوں کے سائے میں رہے گی۔ حق وصولے گی اور فرض نبھائے گی۔

اور شاید اس کے لفظوں کی قبولیت سے زیادہ وہ یہ ثمرانہ کے لیے اس کے اپنے صبر اور شکر کا انعام بھی تھا... وہ جب، جب ثمرانہ کو سوچتی اس کے لیے رشک میں ڈوب جاتی۔ ایک آہ خود اس کے دل سے اپنے لیے بلند ہو کر احساس دلاتی کہ کاش اس نے صبر کیا ہوتا۔ ذرا سا فرض نبھایا ہوتا...... اب اپنی کوتاہیاں اکثر اسے بے چین رکھنے لگی تھیں۔ ایسے میں خدا کو اس کی ذات پر ترس آیا اور اس نے اسے اس کے قدموں تلے جنت بخش دینے کی نوید دے دی۔ وہ ماں بن کر اب ایک وجود کو جنم دینے والی تھی...... اب اس کو یہ بات کا علم ہوا تو بہت دیر تک اس پر رقت طاری رہی تھی۔ یہ احساس ہی لرزا دینے والا تھا کہ اس قدر غلطیوں کے باوجود خدا اس پر مہربان ہو رہا ہے۔ اسے اپنی غلطی سدھارنے کا موقع دے رہا ہے۔ تب اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اپنی ہر غلطی سدھارے گی۔ اسی لیے اس نے ہاتھ پھیلا کر اللہ سے اپنے لیے اولاد میں پہلے بیٹی طلب کر لی تھی... اور پھر اللہ نے اسے بیٹی سے نواز دیا... وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی...... اور اب آج وہ اپنی اس بیٹی کو گود میں لیے اس کے ہر نقش کو چھو کر گم سی کی جگہ وہ اس کی سماعتوں میں یہ لفظ اتار رہی تھی۔

''تمہیں ایک اچھی، صابر اور شاکر بیٹی بن کر میری ہر کوتاہی کا کفارہ ادا کرنا ہے......'' اس سے وہ عجیب سی کیفیات کا شکار تھی... کبھی بولتی تھی، کبھی ہنستی تھی تو کبھی رو دیتی...... وہ خواہش کر رہی تھی اس سے اس کے پاس اس

کی اپنی ماں ہوتی، اس کا باپ ہوتا۔ اس کی بہن ہوتی، اس کے بھائی ہوتے...... اور اس کا شوہر ہوتا۔ اتنے سارے رشتوں کے باوجود اس کے پاس اس وقت کوئی بھی نہیں تھا وہ بالکل اکیلی تھی۔

عزیر بیٹی کی خبر سن کر بے حد خوش تھا...... اور پہلی فرصت میں کسی بھی پہلی فلائٹ سے اس کے پاس آنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ مگر اس کے آنے تک اسے اکیلے ہی رہنا تھا...... چنانچہ وہ اکیلی ہی اپنی بیٹی کو لے کر گھر آگئی۔

☆☆☆

نئی مصروفیت اس کو بہت مصروف رکھے ہوئے تھی۔ مگر اس نئی مصروفیت میں وہ اپنی کسی بھی پرانی ذمے داری سے کوتاہی نہیں کر رہی تھی...... وہ عزیر کی ماں کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھ رہی تھی۔ ایک اس عورت کی بدولت اسے زندگی کو سنوارنے کا موقع ملا تھا...... اگر عزیر، ماں کی وجہ سے اس سے شادی نہ کرتا تو نہ جانے اب اس وقت وہ کہاں کس حال میں زندگی گزار رہی ہوتی۔ وہ بھی شکر گزاروں کی لسٹ میں شامل نہیں رہی تھی مگر پھر بھی خدا اس پر ہمیشہ مہربان رہا تھا...... اور اپنی اس مہربانی کا ایک واضح ثبوت اس نے عزیر کی ماں کی صورت عطا کیا ہوا تھا...... اس عطائی پر وہ دل سے شکر گزار ہو کر بہت دل سے اس آدھی نیند سوئے وجود کی عقیدت مند رہتی تھی اور اپنی اسی عقیدت کا اظہار اس کی خدمت کی صورت کرتی تھی۔ اب بھی وہ ان کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ان کے بال سنوار کر ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد ان کی کیئر ٹیکر کو ان کا خیال رکھنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی...... جہاں اس کی معصوم بیٹی اس کی منتظر تھی۔

وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور اس کے کاٹ کے پاس فرشی قالین پر بیٹھ گئی۔ اسی پل ثاقبہ بیگم (میڈ) نے آکر کسی کی آمد کی اطلاع دی جسے سن کر وہ سخت حیران ہوئی۔

اسے ایک سال ہونے کو آیا تھا...... اس گھر میں بھی کوئی نہیں آیا تھا...... تو یہ آج کون ملنے چلا آیا تھا وہ بھی اس سے......؟ اس کی ذہنی رو بھٹک کر فوراً عاشدہ اور منتہٰی کی طرف گئی تھی...... کیونکہ وہی اس کے یہاں ہونے کی خبر سے واقف تھے۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے...... تو پھر یہ آج کون آیا تھا...... کیا عاشدہ اور منتہٰی......؟ مگر اب کیوں......؟ بہت سے سوالات میں گھر کر اس نے سر اٹھا کر پوچھا تھا۔

"کون آیا ہے؟"

"معلوم نہیں...... مگر کوئی مرد ہے اور کہہ رہا ہے آپ سے ملنا ہے......" اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے بلاؤ کون ہے؟"

اور وہ بلا لائی...... تب اس کی نگاہ نے دروازے سے زہیق کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھی تھی...... جبکہ زہیق قدم اٹھا کر اس کے مقابل آگیا تھا۔ وہ ہنوز اپنی جگہ ساکت کھڑی کچھ بول بھی نہ سکی تھی...... جبکہ وہ بہت سنجیدہ نگاہوں سے اس کی نظروں میں جھانکتا پوچھ رہا تھا۔

"کیسی ہو......؟" پھر جواب کا انتظار کیے بنا نگاہوں کا رخ بے بی کاٹ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"بیٹی ہے تمہاری......؟" اور ایک بار پھر جواب کا انتظار کیے بنا نیچے بیٹھ کر وہ بھی بچی پر جھک گیا...... ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک کو چھو کر بولا۔

"سوچ رہا ہوں تمہاری بیٹی کو مار دوں تا کہ پھر کسی گھر کی عزت نیلام ہونے سے بچ جائے......"

"زہیق میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں......" تیزی سے کہتے ہوئے اس نے کسی خوف کے زیر اثر زہیق کا ہاتھ اپنی بیٹی کے وجود سے دور کیا تھا...... اس کی اس حرکت کو زہیق نے محسوس کیے بنا اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مزید کہا۔

"سوچ تو رہا ہوں مگر خیال یہ آرہا ہے کہ اگر اس کو ماروں گا تو تم پھر کوئی اس جیسی کو جنم دے لو گی...... تو پھر مجھے تمہیں ہی مار دینا چاہیے......"

وہ کیا سوچ کر آیا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔

"میں تم لوگوں کی گناہ گار ہوں۔" وہ معافی کے انداز میں ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "اس کے لیے مجھے مار دینا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے مار دو...... مگر میرے گناہ میں تم بھی برابر کے گناہ گار رہے ہو زہیق......" آج پہلی بار اپنا کوئی ایسا میسر آیا تھا جس کو گناہ گار کہہ کر اپنے گناہ کا بوجھ کم ہوتا محسوس ہو رہا تھا......

اپنے بوجھ کو کم کرنے کے لیے وہ مزید کہہ رہی تھی۔

"میں غلط تھی... تم جان گئے تھے تو مجھے ٹھیک کرنے کے بجائے میرے ساتھ اتنا غلط کیوں کیا کہ پھر میں نے سب کچھ غلط کر دیا؟"

اس نے سوال کیا تھا مگر جواب دینے کے بجائے زبیق نے اپنی خاموش نگاہوں کو اس کے ہلتے لبوں پر جما دیا تھا جو کہہ رہے تھے۔

"تم مجھے سمجھاتے...... ہو سکتا ہے میں سمجھ جاتی۔" اس نے نگاہوں میں پشیمانی لیے ذرا دیر اس کی طرف دیکھا پھر مزید کہنے لگی۔

"تم...... تو میرے ہم عمر تھے...... میرے ہم شکل...... تم......" ابھی بات مزید بھی کچھ کہنا تھا مگر یہاں اس کی بات کاٹتے ہوئے زبیق نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں... یہی بات میں بھی کہہ رہا ہوں... ان دو ایک وقت میں دو... دو... نہ سکے... ہم عمر اور ہم شکل... تو وہ ہم ہیں جن کو... تم لڑکی کا گلا دبا کر مار دیتیں...... تو ہم تمہاری ذات سے ملنے والی ہر رسوائی سے اسی وقت بچ جاتے... انہوں نے تمہیں زندہ رکھ کر ہماری رسوائی کا سبب پروان چڑھنے کو چھوڑ دیا۔" اس کی آنکھوں میں اب خاموشی کے ساتھ قدرے پتھر سے تاثرات واضح ہونا شروع ہوئے تھے... اس کی ذات سے ملی رسوائی کو وہ ایک بار پھر شدت سے محسوس کر رہا تھا یا پھر شاید اس شدت کو آج نکال پھینکنا چاہتا تھا... اس لیے پُرسکون رہ کر بول رہا تھا۔

"جب تم ہمیں رسوائی بھگتنے کو تنہا چھوڑ گئیں تب سے میں اور حدید تمہیں مسلسل ڈھونڈ رہے ہیں مگر میں دعا کرتا تھا کہ ہم میں سے پہلے تم مجھے ملو...... کیونکہ تم میرے وجود کا وہ حصہ ہو۔ جس کے لیے لوگ مجھے دیکھ کر کہتے ہیں کہ اس کے جیسی اس کی بہن بھاگ گئی...... مجھ جیسی میری بہن جس نے مجھے خود سے بھی نظر ملانے لائق نہیں چھوڑا...... اسی لیے نفرت محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا میں مجھ جیسی تم بھی کہیں سانس لے رہی ہو...... اب آج تمہاری سانس روک دوں گا تو ہی اپنی سانس بحال محسوس کروں گا۔" بہت پُرسکون رہ کر وہ اطمینان سے اسے اپنے عزائم سے باخبر کر رہا تھا...... اس نے حرف بحرف غور سے سنا تھا...... سمجھا تھا...... اس کے باوجود پُرسکون تھی۔

"مجھے مار کر اگر تمہیں سکون ملتا ہے تو اجازت ہے مار دو مجھے...... مگر ایک کام کرنا۔ میرے بعد خود سے جڑی ہر عورت کو کم از کم اتنی عزت اور محبت ضرور دے دینا کہ پھر کوئی عورت، عزت اور محبت کی چاہ میں کسی غیر محرم سے کوئی تعلق نہ بنا سکے۔ ہر ماں سے کہنا کہ وہ بھلے سے بیٹوں کو عزیز رکھے مگر بیٹوں سے آدھے سے بھی کم بیٹی کو بھی عزیز رکھ لے...... تاکہ پھر کوئی بیٹی احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنے بھائی سے نفرت پر مجبور نہ ہو...... اور باپ کو کہنا...... وہ اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہوئے اپنے گھر کو اس طرح جوڑ کر رکھے کہ گھر کا ہر فرد ایک مکمل شخصیت بن کر ابھرے...... اور اپنی بیوی کو کہنا شوہر بھلے سے کمائی کر کے لائے نہ لائے مگر اس پر فرض ہے وہ اس کی تعظیم کرے...... تاکہ لڑ جھگڑ کر گھر کے ماحول کو اس قدر کشیدہ کر دے کہ اس کے بچے دُہری شخصیت کا شکار ہو کر پروان چڑھیں...... اور ہر بھائی اور باپ سے یہ لازمی کہنا کہ دن بھر میں کم از کم ایک بار اپنی بہن، بیٹی کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر انہیں احساس ضرور کرا دیا کریں کہ وہ ان سے محفوظ ہیں... تاکہ حفاظت کی چاہ میں پھر کوئی بیٹی گھر چھوڑ کر نہ بھاگے... کوئی اور محافظ نہ ڈھونڈ لے۔" وہ اب بولتے بولتے چپ ہو رہی تھی۔ اس پر گزری ہر گھڑی ایک بار پھر... تھا کہ جس سے مقابل ہوئی تو آنکھوں سے آنسوؤں کا خاموش سمندر بہہ نکلا... اور زبان لفظ بول، بول کر لڑکھڑانے لگی تھی... جبکہ اس کی نگاہیں زبیق کے ساکت چہرے کو نظروں میں رکھنے کے باوجود یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھیں کہ زبیق نے اسے غور سے سنا بھی تھا یا نہیں...... ہاں مگر جب وہ بول کر خاموش ہو گئی تو وہ بولا تھا اور کیا بولا۔

"تمہیں مار دوں گا تو میں تمہارے بعد تمہاری سوت کا ہر ماں، بہن اور بیٹی کو بتاؤں گا، میں بتاؤں گا کہ میں نے اس بہن اور بیٹی کو مار دیا جس نے بھائی اور باپ کا سر شرم سے جھکا دیا...... تاکہ اب کے بعد پھر بھی کوئی بہن اور بیٹی اپنی غرض کے لیے باپ، بھائی کا گھر چھوڑ کر نہ بھاگے......" اس کا بولا ہر لفظ ضائع ہوا تھا...... زبیق نے نہ اسے پہلے بھی سمجھا تھا نہ وہ اب اسے سمجھ رہا تھا

اور اب تو شاید وہ اسے بھتا ہی نہیں چاہتا تھا...... سوچ لیا تھا ماردوں گا تو اب بس مار ہی دینا چاہتا تھا...... اور وہ جو سانس روکے اسے سن رہی تھی اس کے لبوں سے نکلتے لفظوں میں لفظ بہن پر اٹک کر بولی تھی۔

"میری سماعتیں آج تمہارے لبوں سے لفظ "بہن" سن کر خوشی محسوس کر رہی ہیں۔ زبیق...... تم نے مجھے کبھی اپنی بہن نہیں کہا تھا ناں......؟" بہن کے بہتے آنسوؤں کی روانی میں اضافہ ہوا تھا جبکہ لب بھرائی ہوئی آواز میں لفظ ادا کر رہے تھے۔

"مارنا چاہتے ہو تو ماردو...... مگر آج مجھے "بہن" بول کر میری تشنگی کو قرار بخش دو......" ہاتھ جوڑ کر اس نے جیسے التجا کی...... اور پھر ایک دم اس نے اپنے اور زبیق کے درمیانی فاصلے کو پاٹ کر فاصلہ مٹا دیا اور اس کے گلے لگ کر بری طرح رو دی۔

"تم نے مجھے کبھی بہن نہیں بولا...... پھر بھی تم نے مجھے مارا...... تم نے مجھے بہت زیادہ مارا تھا زبیق......" اس کے آنسو اس کا گریبان بھگونے لگے تھے جبکہ ہاتھوں کی مضبوط گرفت نے اپنا احساس شدت سے کروا کر پتھر میں دراڑ کے مانند زبیق کو اپنے ارادوں سمیت بری طرح ہلا ڈالا تھا...... اس نے اپنے احساسات عجیب سے ہوتے محسوس کیے تھے۔ اندر کہیں کچھ پگھل رہا تھا...... جبکہ وہ اس کی ہر کیفیت سے بے خبر کہہ رہی تھی۔

"کسی کو اتنی بے دردی سے نہیں مارتے ہیں۔ اسے تکلیف ہوتی ہے...... جیسے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی...... کیا تمہیں بھی تھوڑا بھی احساس ہوا کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی......؟ نہیں ہوا ہوگا مگر دیکھو...... میری پیشانی پر آج بھی تمہاری دی چوٹ کی نشانی پورے کروفر سے جگمگاتی ہے...... یہ دیکھو......" وہ اس سے الگ تو ہوئی مگر ایک ہاتھ سے اس کے گریبان کو مٹھی میں دبوچ کر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنی پیشانی پر لگے زخم کے نشان پر رکھ کر اس کو دکھانے لگی...... اور پھر تھک کر دونوں ہاتھ گراتے ہوئے ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

"میں غلط تھی...... مگر مان لو اپنی، اپنی جگہ ہم سب غلط تھے۔ ہماری پرورش، ہماری تربیت غلط تھی...... غلط تھی ناں زبیق......؟" اور شاید زبیق بھی تھک گیا تھا...... اب

تک نفرت میں اس لیے جل رہا تھا کیونکہ اپنے دماغ کے فیصلے پر امروزیہ کو گناہ گار سمجھ کر اپنی ذلت و رسوائی کا ذمے دار اسے سمجھتا تھا...... مگر یہ آج امروزیہ نے کیا کہہ دیا تھا...... کچھ ایسا جس نے اس کے مقابل وہ آئینہ رکھ دیا تھا جس میں اس کا اپنا عکس اس کا منہ چڑا کر احساس دلا رہا تھا کہ امروزیہ سمیت وہ سب غلط تھے۔ ان کی پرورش کی بنیاد ہی غلط تھی۔ وہ غلط بنیادوں پر پروان چڑھتے رہے جبھی آخر میں عزتوں کی عمارت بھربھری مٹی کے مانند ڈھے گئی...... اور قصور وار وہ ایک دوسرے کو ٹھہراتے رہے جبکہ اپنی، اپنی جگہ غلط تو وہ سب ہی تھے...... ہاں وہ خود بھی غلط تھا، شرمندگی اور ندامت کے احساس نے سر اٹھایا تو امروزیہ کی تھکن جیسی تھکن اپنے اندر بھی اترتی محسوس کر کے وہیں...... قالین پر ہارے جواری کے مانند گر سا گیا۔ امروزیہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے سامنے بیٹھی تو اس کی سماعتوں نے سنا زبیق کہہ رہا تھا۔

"ہاں، ہاں اپنی، اپنی جگہ ہم سب غلط تھے...... اور ہمارے غلط ہونے کی سزا تم نے ہمیں دی...... مگر تمہیں ہمیں ایسی سزا نہیں دینی چاہیے تھی......" اس کو آخر میں بھی اسی سے شکوہ تھا...... ہر عضو کو سماعت بنا کر سنتی امروزیہ نے اس کے شکوے کو سر آنکھوں پر لے کر کہا۔

"مجھے معاف کر دو زبیق......" اس نے کہنے کے ساتھ دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے پاؤں پر رکھ دیے۔ زبیق نے فوراً پاؤں سمیٹ کر لب بھینچے اور بالآخر اپنے کانپتے ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے...... وقت ٹھہر گیا...... اور تقدیر نے سکھ کی سانس لے کر واضح کر دیا کہ......

"تقدیر اور نصیب سب کا اپنا، اپنا ہوا کرتا ہے...... آپ کی تقدیر میں اگر اوروں جیسا کچھ نہیں ہے تو اس کی مخالفت میں نصیب کو دوش دے کر اپنی قسمت کو ہاتھوں میں لے کر من مرضی کرنے سے سوائے تھکن کے اور کچھ نہیں ملتا کیونکہ ہوتا تو وہی ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے ہو کر رہتا ہوتا ہے...... تو شاکر ہو کر صابر ہو جائیں باقی وہ جانے اس کا کام جانے کہ تمام معاملات کا مالک تو وہی ہے جس نے اپنے بندوں کو پیدا کیا...... وہی انہیں سنبھالنے والا بھی ہے۔"

تفکر...... نورِ الٰہی

تمام تر تعریف تمام حمد و ثنا اللہ رب العزت کے لیے۔ اس رب کے لیے جو اپنی ذات میں صاحب جمال، صفات میں صاحب کمال اور شان میں صاحب جلال ہے۔ حیات میں ازلی و ابدی، علم میں بے مثل، عزم میں خود مختار، اختیارات و اقتدار میں یکتا ہے۔ قوت و جبروت میں سب پر غالب، حاکمیت اور ملکیت میں واحد، عطا و قضا میں بے نیاز۔ قدرت اور رزاقیت میں صاحب حکمت ہے۔ ربوبیت اور کفالت میں سب سے افضل ہے۔ بصیرت و لطافت میں اکمل ہے۔ بزرگی میں جلیل و کریم ہے۔

جو کچھ بھی اپنے تو نے چھوٹے الفاظ میں تیری تعریف کروں گی تو اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔ تو نے اپنے پیارے حبیب اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے مثل تخلیق کیا، ان کے فضائل و کمالات بے شمار ہیں۔ ان پر کروڑوں درود وسلام ہو ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر......

آج ہمارا موضوع ''تفکر'' ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں، سوچ و بچار، فکر، اندیشہ......

جس طرح اللہ رب العزت کی ذات یکتا و بے مثل ہے ایسے ہی اس کی ہر تخلیق جامع، اکمل اور پُر حکمت ہے۔ اس کی ذات اور اس کی تخلیقات کو معلومات میں لا کر ان کے مقصد کا کھوج لگانا غور و فکر کہلاتا ہے۔ تفکر دراصل ذہن کی وہ قوت ہے جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے۔ اور تفکر کا مطلب عقل کے مطابق اس قوت کو بہترین انداز میں پروان چڑھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غور و فکر کا یہ عطیہ ہر انسان کو عطا کر رکھا ہے۔ مگر اس کو ترقی دینا انسان کے اختیار میں دیا ہوا ہے...... تاکہ وہ غور و فکر کر سکے اور حقیقت کا سراغ لگائے کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جانا ہے؟

انسان کو ایک نور کی ضرورت ہے تو اس کے لیے جاننا چاہیے کہ انسان کی پیدائش ظلمت اور جہل سے ہوئی ہے اور اس کو ایسے نور کی ضرورت ہے جو اس کو تاریکی سے نکالے اور معلوم کرے کہ وہ کیا عمل کرے اور کس راہ پر چلے۔ اور اسے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس کی محبت اور چاہت کا حقدار کون ہے؟ غور و فکر کرنے سے معلوم ہوگا کہ اللہ نے انسان کو اپنی بندگی کے لیے بنایا ہے لہٰذا صرف اللہ ہی کی عبادت کی جائے دنیا کی کسی چیز کو اس کے مدِمقابل نہ سمجھا جائے۔ فرضیکہ انسان جب تک صحیح سمت کی طرف غور و فکر نہیں کرے گا اصل مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا...... کہ ''ایک گھڑی کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر بہترین انداز میں انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے تاکہ ان چیزوں کی حقیقت کے پیش نظر ان کے خالق کی پوجا کرو کیونکہ عبادت کے لائق صرف اس کی ہی ذات ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسے کھول کھول کر بیان کر دیں۔ شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔''

(سورۃ نحل)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ خوفِ الٰہی سے وہ

پست ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ ہم ان مثالوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

(سورۂ حشر)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی صفت میں غور و فکر کرو، ذات باری تعالیٰ میں تفکر نہ کرو، کیونکہ یہ تمہاری طاقت سے باہر ہے اور اس کی قدر کو تم نہ پہچان سکو گے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ "اے روح اللہ! کیا روئے زمین پر کوئی بشر آپ جیسا ہوگا؟" آپؑ نے فرمایا۔ "ہاں! وہ جس کی تمام گفتگو اللہ کا ذکر اور خاموشی، تفکر اور اس کی نظر عبرت آموز ہو وہ مجھ جیسا ہے۔" آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنی آنکھوں کو عبادت سے بہرہ مند کرو۔" صحابہ نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح سے؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "قرآن پاک دیکھ کر پڑھنے، تفکر اور عجائبات قدرت الٰہی سے۔"

حضرت شیخ ابو سلیمان دارانی نے کہا کہ "دنیا کی چیزوں میں تفکر آخرت کا حجاب ہوگا اور آخرت کے بارے میں تفکر کا ثمر یہ ہے کہ حکمت حاصل ہوگی اور دل زندہ ہوگا۔"

☆☆☆

حضرت داؤد طائیؒ ایک رات اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر ملکوت آسمان میں فکر کر رہے تھے اور روتے جاتے تھے۔ پھر بے اختیار ہو کر ایک پڑوسی کے گھر میں گر پڑے۔ ہمسایہ گھبرا کر اٹھا اور چور سمجھ کر تلوار نکال لی۔ مگر جب اس نے حضرت داؤد طائیؒ کو دیکھا تو پوچھا۔ "آپ کو کس نے گرا دیا؟" آپؒ نے فرمایا..... "میں بے ہوش تھا مجھے کچھ معلوم نہیں۔" حدیث شریف میں ہے کہ "حق تعالیٰ نے بندوں کو پیدا فرما کر ان پر اپنے نور کا پرتو ڈالا۔"

اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ ایک ایسا شخص جو اندھیرے میں ہو وہ چل نہیں سکتا پھر وہ لوہا پتھر پر مار کر اس سے آگ نکالتا ہے اور اس سے چراغ کو روشن کرتا ہے اس چراغ سے اس کی حالت تبدیل ہوتی ہے بینا ہو کر سیدھے راستے کو پہچان کر چلتا ہے۔ ایسے ہی دو عالم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جو اصل ہیں اور جب ان کو باہم ملا دیا جائے تو ان سے تیسری معرفت پیدا ہوتی ہے جس کی مثال لوہے اور پتھر کی ہے اور تفکر کی مثال اس لوہے کو پتھر پر رگڑنے کی ہے اور معرفت کی مثال اس نور کی ہے جو اس عمل سے نکلے گا تاکہ اس سے دل کی حالت تبدیل ہو اور جب اس کا حال بدلتا ہے تو اس کا عمل بھی بدلتا ہے۔ مثلاً جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ آخرت بہتر ہے تو دنیا سے منہ پھیر کر آخرت کی طرف توجہ کرے گا۔ پس تفکر سے تین چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ معرفت

۲۔ حالت

۳۔ عمل

لیکن عمل، حالت کا تابع ہے۔ حالت، معرفت کی تابع ہے اور معرفت تفکر کی۔

فکر کا میدان بہت وسیع ہے کیونکہ علوم بے شمار ہیں۔ اور سب میں فکر کی گنجائش موجود ہے۔ اس میں راہ دین سے مراد وہ معاملہ ہے جو بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے اور بندے کی وہ راہ ہے جس سے وہ خدا تک پہنچے گا۔ بندہ یا اپنے بارے میں فکر کرے گا یا اللہ تعالیٰ کے متعلق اگر اس کی فکر خدا کے بارے میں ہے تو اس کا یہ تفکر اس کی ذات کے بارے میں یا صفت یا افعال اور اس کے عجائب مصنوعات کے بارے میں ہوگا۔ اگر وہ اپنے بارے میں تفکر کرتا ہے تو وہ تفکر یا ایسی صفتوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ سے دور کر دیں۔ ان صفات کو معاصی (گناہ، قصور) اور مہلکات کہتے ہیں۔ یا یہ فکر ایسی چیزوں میں ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہوں اور بندے کو خدا کے نزدیک کرنے والی ہوں ان کو طاعات اور منجیات کہتے ہیں۔

اس لیے ایک ساعت کا تفکر سال بھر کی عبادت سے افضل قرار پایا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں تفکر کرے کہ اس میں کون، کون سی برائیاں ہیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ برائیوں پر غور کرے جس میں۔

۱۔ بخل

۲۔ تکبر

۳۔ عجب

۴۔ ریا

۵۔حسد

۶۔غصہ

۷۔حرص طعام

۸۔حرص سخن

۹۔دوستی مال

۱۰۔حب جاہ

اب پسندیدہ اخلاق پر غور کرے۔

۱۔توبہ

۲۔صبر

۳۔رضا

۴۔شکر نعمت

۵۔خوف

۶۔رجا

۷۔زہد یعنی ترک دنیا

۸۔اخلاص

۹۔خلق خوب

۱۰۔محبت الٰہی

ان میں تفکر کرے جو برائیاں ہیں انہیں دور کرے اور خوبیاں جو نہیں ہیں ان کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کی کوشش کرے..... روزانہ اس معاملے پر غور و فکر کرے..... تاکہ اپنی ذات کو اللہ کی پسند کے مطابق ڈھال سکے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کے بارے میں تفکر یا تو اس کی ذات و صفات کے بارے میں ہوگا یا اس کے افعال و مصنوعات کے بارے میں..... اس تفکر کا بڑا مقام ہے جو ذات وصفات باری تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن عوام کو اس کی طاقت نہیں..... عقل کے اندھے کو وہاں رسائی نہیں ہو سکتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ ذات باری میں تفکر کرو۔ کیونکہ یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ اس کی دشواری کا سبب یہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات پوشیدہ ہے بلکہ اس کی عظمت اس قدر روشن اور تاباں ہے کہ انسان کی بصیرت اس کی تاب نہیں لا سکتی اور وہ بے خود و متحیر ہو جائے گا۔ مثلاً چمگادڑ دن کو اڑ نہیں سکتی کیونکہ اس کی آنکھ کمزور ہے۔ آفتاب کے نور کی تاب نہیں لا سکتی۔ رات کو جب نور کم ہوتا ہے تو دیکھ سکتی ہے۔ عام عوام کی بھی یہی مثال ہے۔ لیکن صدیقین اور بزرگان دین حق کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص سورج کو دیکھ سکتا ہے لیکن ایسا شخص اگر ہمیشہ دیکھے گا تو اندیشہ ہے کہ اس کی بصارت ختم ہو جائے گی اس جمال الٰہی کے مشاہدے میں دیوانگی اور بے ہوشی کا اندیشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفات الٰہی کے اسرار جو بزرگوں کے علم میں ہیں۔ انہیں عام لوگوں سے بیان کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کی عظمت عجائب صنعت سے معلوم کریں ہر ایک چیز جو عالم وجود میں آئی ہے۔ اس کی قدرت اور عظمت کے انوار سے ایک نور ہے کیونکہ اگر کوئی سورج دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اس کے نور کو جو زمین پر پڑ رہا ہے ضرور دیکھ سکتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ "کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں فکر کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... کہ "اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر غور و فکر کرو..... اس کی ذات کے بارے میں تم کیا غور و فکر کر سکتے ہو اس کی تم میں طاقت ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی قدر پہچاننے پر تم قادر ہو۔"

حضرت ابودرداؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ لوگ خیر کو پھیلانے والے ہوتے ہیں اور برائیوں کو روکنے والے ہوتے ہیں۔ ان کو اس کا اجر ملے گا۔ اور کچھ لوگ برائی کو فروغ دینے والے اور بھلائی کو روکنے والے ہیں ان کو اس کا بہت گناہ ہوگا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو بھلائی کو عام کرتے اور برائی کو روکتے ہیں ان کا گھڑی بھر کا تفکر رات بھر کے قیام سے افضل ہے۔"

حضرت عروہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ شیطان ایک آدمی سے آ کر کہتا ہے کہ آسمانوں کو کس نے بنایا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے..... پھر پوچھتا ہے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تب وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے..... ملعون پھر پوچھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے بنایا ہے؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "جب یہاں تک بات پہنچ جائے تو یہ کہا کرو کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہوں۔"

جب کوئی بندہ طلب آخرت کی وجہ سے اپنی گزشتہ

زندگی پر غور و فکر کرتا ہے تو یہ تفکر اس کے دل کے لیے غسل کا کام دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ”ایک گھڑی کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔“
لہٰذا ہر عقلمند شخص کے لیے ضروری ہے کہ اپنے گزشتہ گناہوں کی مغفرت طلب کرے جن چیزوں کا اقرار کرتا ہے ان میں تفکر کرے اور قیامت کے دن کے لیے توشہ بنائے۔ امیدوں کو کم کرے۔ توبہ میں جلدی کرے۔ اللہ تعالیٰ کو ذکر کرتا رہے۔ حرام چیزوں سے اعراض کرے اور نفس کو صبر پر آمادہ کرے... خواہشات نفسانی کا اتباع نہ کرے کیونکہ نفس ایک بت کی طرح ہے جو نفس کا اتباع کرتا ہے وہ گویا بت کی عبادت کرتا ہے اور جو اخلاص سے اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اپنے نفس پر [illegible] رہتا ہے۔

٭٭٭٭٭

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے تھے کہ حضرت سفیان ثوریؒ نے مقام ابراہیمؑ کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی اور پھر آسمان کی طرف دیکھا تو غش کھا کر گر پڑے۔ حضرت دارانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ غش آسمان کی طرف دیکھنے سے نہیں ہوا بلکہ قیامت کے احوال میں فکر کرنے کا نتیجہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ ایک روز سورۂ تکویر کی تلاوت کر رہے تھے جب یہاں تک پہنچے (جب اعمال نامے کھولے جائیں گے) تو بے ہوش ہو کر گر پڑے اور بہت دیر تک زمین پر تڑپتے رہے۔

حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ نے فرمایا۔ اے لوگو! یاد رکھو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا عمل فکر ہے۔ فرض عبادت مقرر ہونے سے قبل آپ کی تمام عبادات اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کی مخلوق میں تفکر تھا۔

آخرکار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عبادات لازم ہوئیں۔ تم پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و نشانات پر غور کرو اور نصیحت حاصل کرو اور اگر فکر نصیحت سے خالی ہو تو یہ صرف وسوسہ اور خیال ہی رہ جائے گا اور اگر اس سے نصیحت حاصل ہو تو یہ وعظ و حکمت ہے۔ اپنے اعمال کو تفکر کے بعد درست کرو اور اپنے اخلاق کو اعمال و عبادات کے بعد بہترین انداز پر محکم کرو اور ان سب کی زینت یہ ہے کہ نیت درست رکھو۔

انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے مالک اور خالق کو پہچانے اور اس کی عبادت کرے کیونکہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اور لوگوں نے جیسی قدر اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیے تھی نہیں کی۔“

(سورۂ زمر)

اللہ کی قدر کرنے کے لیے اس کی عظمت و شان میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا شاہکار ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ اپنے بارے میں غور و فکر کرے [illegible] امام غزالیؒ نے انسانی تخلیق پر فکر کرنے کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے تو اپنی ابتدا پر ہی تفکر کرے۔ تو آیا کہاں سے؟ اور کیسے؟ آخر تیری تخلیق پانی کے ایک قطرے سے ہی تو ہوئی ہے۔ اور پانی کے اس قطرے کی پہلی قرارگاہ تیرے باپ کی پشت تھی پس اس (منی کے ایک قطرے) کو تیری پیدائش کا تخم بنا دیا اور وہ یوں کہ شہوت کو تیرے ماں، باپ پر مسلط کر دیا۔ رحم مادر کو گویا زمین بنا دیا اور مرد کی پشت میں پائے جانے والے پانی کو بیج بنا دیا تو گویا تخم ریزی کا عمل تو یوں مکمل ہوا۔ اول، اول تو محض ایک پارہ خون تھا پھر اسے خوب جما دیا گیا اور وہ علقہ کہلایا۔ پھر اس علقہ نے گوشت کی شکل اختیار کر لی جسے مضغہ کہتے ہیں پھر اس میں روح پھونک دی گئی جسے جان کہتے ہیں پھر اس قطرۂ آب و خون سے کئی مختلف چیزیں پیدا ہونی شروع ہوئیں...... مثلاً گوشت و پوست، رگیں، پٹھے، ہڈیاں وغیرہ اور پھر تیرے اعضا کی ترتیب ایسی [illegible] میں لائی کہ سر، ہاتھ، پاؤں، انگلیاں، آنکھ، ناک، کان، منہ، زبان اور دیگر اعضا پیدا کیے اور اندرونی حصے میں معدہ، جگر، گردے، تلی، پتہ، رحم، مثانہ، آنتیں وغیرہ بنا دیں۔ ہر ایک کی شناخت اور شکل دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ صفات میں بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اگر انسان صرف آنکھ کے عجائبات پر غور کرے تو تفصیل بیان کرنے کے لیے بے شمار صفحات چاہییں۔ اس کے بعد ہڈیوں پر غور کریں۔ ہر ہڈی کا جوڑ اور ساخت مختلف، بعض کھوکھلی اور بعض اندر سے بھری۔ ایک خاص ترکیب سے میرے رب نے بنائی ہیں۔ تو جسم کے ایک، ایک عضو پر اس کی ساخت پر اور اس کے کام پر غور کریں...... پھر ظاہری و باطنی قوتیں اور حواس مثلاً بصارت، سماعت، عقل، علم اور ایسی دوسری چیزیں کچھ کم حیران کن اور عجب خیز نہیں ہیں۔ خدائی شان، اگر کوئی مصور دیوار پر ایک خوب صورت تصویر بنا دے تو تجھے اس کی استادی حیرت زدہ

کررہی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ جاننے کے باوجود کہ ایک قطرہ پانی سے کیسے، کیسے ظاہری اور باطنی نقش ونگار (اس مصورِ حقیقی نے) پیدا کردیے تجھے اس نقاش کی عظمت حیرت میں نہیں ڈالتی؟ اس کا کمال اس کا بے پناہ علم لا انتہا ہی تجھے ششدر نہیں کرتا؟ اس خالق کی عظمت اس کے لطف بے پایاں اور شفقتِ کاملہ پر محوِ حیرت نہیں ہوتا۔ یقیناً بدبخت اور حیوان صفت ہے وہ انسان جو ان عجائبات پر تفکر نہیں کرتا۔ تف ہے جسے اپنے بدن کی ساخت پر حیرت نہیں ہوتی؟ افسوس ہے اس پر جو اس عقل کو فضول گنوا رہا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اور جو دنیا بھر کی تمام اشیا سے قیمتی ہے۔ افسوس اس پر جسے اس کے سوا کچھ پتا نہ ہو کہ بھوک لگی تو پیٹ بھر لیا اور غصے کا بھوت سوار ہوا تو کسی سے لڑ بھڑ لیے اور حیوانوں کی طرح گلشنِ معرفت کے رنگا رنگ نظاروں سے بے خبر اور محروم ہی رہے۔ جو حق تعالیٰ نے اس کے لیے (بلکہ خود اس کے اندر) پیدا کر رکھے ہیں۔

☆☆☆

ایک دفعہ سکندرِ اعظم ایک نہایت ہی آباد و خرم ملک میں پہنچا۔ وہاں ایک قبرستان سے اس کا گزر ہوا جس میں ہر قبر کے سرہانے ایک پتھر لگا تھا...... اور پتھر پہ مدفون کی عمر لکھی ہوئی تھی۔ کسی کی دو سال، کسی کی چار سال اور کسی کی دس سال حتیٰ کہ دس سال سے زیادہ کسی کی عمر نہیں تھی۔ سکندر اعظم کو بہت تعجب ہوا کہ یہ لوگ تو انتہائی کم عمر ہیں، چنانچہ وہاں کے لوگوں نے اسے بتایا کہ ان مُردوں کی عمریں بہت لمبی تھیں۔ مگر ہمارے نزدیک صرف وہی عمر قابلِ شمار ہوتی ہے جو یادِ الٰہی میں صرف ہو لہٰذا ان کی عمریں ان کی عبادت کے مطابق لکھی گئی ہیں۔

آپ زمین پر نظر ڈالیں کس طرح سے اسے فرش بنادیا...... آسمان دیکھیں۔ پہاڑ، دریا، سمندر، جنگل، پھول، پودے، زمین کے اندر قیمتی معدنیات، بارش۔ پھر انسانی غذا، اللہ اکبر آپ کس، کس چیز پہ غور کریں ہر ایک میں اس کی نشانی ہے اس کی عظمت عیاں ہے۔ اور یہ عجائبات ان گنت اور بے شمار ہیں۔

ہر حیوان خواہ چھوٹا ہو یا بڑا زبانِ حال سے خدا کی بزرگی بیان کررہا ہے اور اس کی ثنا میں مصروف ہے۔ حیوانات ہی نہیں بلکہ تمام نباتات اور سارے ذراتِ عالم سے خواہ ایک پتھر ہی کیوں نہ ہو ندا کررہا ہے لیکن اکثر و بیشتر لوگ اس ندا پر دھیان نہیں دیتے۔

☆☆☆

بندۂ مومن اللہ کے نورِ بصیرت کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

ایک بزرگ اپنے ایک مرید کے ساتھ بہت زیادہ پیار و محبت کا سلوک کرتے تھے۔ یعنی بہت رعایت کرتے تھے...... دوسرے مریدوں کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ایک روز ان بزرگ نے مریدوں کو ایک، ایک کبوتر دے کر کہا کہ ان کو ایسی جگہ ذبح کرکے لاؤ جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو...... سب مرید خالی جگہ یعنی (ویرانی والی جگہ) دیکھ کر کبوتر ذبح کرلائے۔ مگر وہ خاص مرید کبوتر کو زندہ واپس لے آیا۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ ”مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں اللہ تعالیٰ دیکھتا نہ ہو......“ بزرگ نے دوسرے مریدوں کو مخاطب کرکے کہا...... ”اس بات سے تم اس کا مرتبہ معلوم کرلو کہ یہ ہمیشہ مشاہدے میں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف توجہ نہیں کرتا۔“

حضرت عبداللہ ابن دینارؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ معظمہ کی راہ میں تھا ایک جگہ ہم اترے...... ایک چرواہے کا غلام بکریاں لیے آرہا تھا...... حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے کہا ”ایک بکری ہمارے ہاتھ فروخت کردے اس نے کہا۔ میں غلام ہوں، بکریاں میری ملک نہیں ہیں......“ آپؓ نے امتحاناً کہا کہ مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری بھیڑیا لے گیا اسے کیا معلوم ہوگا؟

غلام نے عرض کی...... کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ بے اختیار رونے لگے اور مالک سے اس غلام کو لے کر آزاد کردیا۔“

حضرت ابو طلحہؓ اپنے باغ میں نماز پڑھتے تھے ایک خوب صورت چڑیا سامنے سے اڑی...... اس کی خوب صورتی کا خیال آیا تو نماز میں غفلت ہوگئی۔ رکعتوں کی گنتی بھول گئے۔ اس کے بعد اس باغ کو انہوں نے خیرات کردیا۔

ایک شخص نے حضرت داؤد طائی سے پوچھا کہ آپؒ کی چھت کا شہتیر کب سے ٹوٹا ہے، آپؒ نے فرمایا۔ میں بیس برس سے اس مکان میں رہتا ہوں لیکن آج تک چھت کی طرف نہیں دیکھا۔

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں کہ ”دنیا میں تفکر حجابِ آخرت ہے اور آخرت میں تفکر کا حاصل حکمت اور

دلوں کی زندگی ہے۔"

☆☆☆

جیسے، جیسے آپ کا اپنے اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے تو بندے کی نور فراست بڑھتی جاتی ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ اکثر اپنا وقت حضرت بشر حافیؒ کی ہمراہی اور معیت میں گزارتے تھے وہ آپ کے بہت معتقد تھے ایک روز حضرت امام احمدؒ کے شاگردوں نے ان سے کہا... امام! ہمیں تعجب ہے کہ آپ اتنے بڑے عالم، محدث اور مجتہد ہو کر اکثر اپنا وقت ایک دیوانے یعنی بشر حافیؒ کے ساتھ گزارتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا۔ "ہاں! میں خدا نہیں [illegible] جو علم مجھے آتا ہے ان سے بشر حافیؒ [illegible] لیکن [illegible] اس دیوانے سے بہت زیادہ [illegible] اللہ [illegible] چنانچہ اکثر [illegible] حضرت بشر حافیؒ سے فرمایا کرتے تھے۔ "حضرت! مجھ سے میرے اللہ کی باتیں کیجیے....." حضرت بشر حافیؒ کے چند کلمات حکمت

لوگو! پانی کا قطرہ جب تک بہتا ہے صاف رہتا ہے اور جہاں رکا اس کا رنگ کیچڑ جیسا ہوا۔

یہ خیال کرنا کہ لوگ مجھے اچھا کہیں محض دنیا کی محبت کے سبب ہوتا ہے۔

آدمی کو تین کام بہت دشوار ہیں..... مفلسی میں سخاوت.... تنہائی میں پرہیزگاری.... خوف کے وقت سچائی۔

جو شخص آزادی کا ذائقہ چکھنا چاہے وہ اپنا دل پاک و صاف کرے۔

اگر انسان سے یاد الٰہی زیادہ نہیں ہو سکتی تو اسے چاہیے کہ زیادہ گناہ بھی نہ کرے۔

صوفی وہ ہے جو اللہ سے اپنا دل لگائے اور اسے صاف رکھے۔

دنیا کی نمود چاہنے والے کو آخرت کی حلاوت میسر نہیں ہوتی۔

اے مسلمان! اللہ نے روز اول میں تیرا ذکر دوستوں میں کیا ہے اب تو اس کے دوستوں میں داخل ہونے کی کوشش کر۔

☆☆☆

مخالفین اسلام میں سے ایک شخص اپنی قوم کا بڑا عالم و فاضل اور بہت بولنے والا اپنی مذہبی جماعت کو لے کر بغداد پہنچا اور وہاں کی علمی جماعت اسلام کو ایک اعلان کے ذریعے اطلاع دی کہ اگر تم لوگ ہمارے چار سوالوں کا جواب دو گے تو ہم یقیناً مسلمان ہو جائیں گے۔ اور اگر تم لوگ جواب نہ دے سکے تو تم کو ہمارا مذہب قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ ایک روز اس نے عظیم الشان مجمع کر کے اس کے درمیان ایک منبر بچھا دیا پھر اس نے حاضرین سے خطاب کر کے کہا کہ تم میں سے کوئی جواب دینے کے لیے تیار ہو تو میں وہ چار سوال پیش کروں...... جس کے جواب میں اس عظیم مجمع پر سکوت طاری تھا۔ لیکن ایک گوشے سے کسی نے جواب دیا کہ "میں آپ کے سوالات کا جواب دوں گا مگر اس شرط پر کہ آپ منبر سے نیچے اتر آئیں اور میں منبر پر بیٹھ کر جواب دوں اس لیے کہ آپ سائل ہیں اور میں مجیب......" یہ سن کر وہ عالم فوراً منبر سے نیچے اتر آیا۔ لوگوں نے دیکھا ایک نوجوان نعمان جو ابھی طالب علم ہی ہے اس منبر پر بیٹھ گیا اور اس زبردست عالم کو مخاطب کر کے کہا۔ اب آپ اپنے سوالات بیان کریں۔ ہم جواب دیں گے چنانچہ اس نے سوالات شروع کیے۔

پہلا سوال: اس وقت خدا کیا کر رہا ہے؟

جواب: اس وقت خدا یہ کر رہا ہے کہ آپ جیسے عالم و فاضل کو اس منبر سے اتار دیا اور مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کو منبر پر بٹھا دیا...... "وہ جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔" یہ جواب سن کر وہ عالم خاموش ہو گیا۔ پھر حضرت نعمانؒ نے فرمایا اب آپ اپنا دوسرا سوال پیش کریں۔

دوسرا سوال: خدا کا منہ کس طرف ہے؟ اس نے دریافت کیا۔

جواب: حضرت نعمان بن ثابتؒ نے فرمایا "اگر آپ شمع روشن کا منہ بتا دیں کہ وہ کس طرف ہے تو یہی جناب کے سوال کا جواب ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قیامت تک شمع روشن کا منہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کس طرف ہے؟ لہٰذا اسے اچھی طرح سمجھ لیں کہ روئے ایزدی کی یہی مثال ہے کہ وہ چاروں طرف اپنے نور سے عالم کو منور کرتا رہتا ہے۔" یہ کافی جواب سن کر وہ بہت ہی نادم ہوا پھر حضرت نعمانؒ نے فرمایا..... اب تیسرا سوال پیش کیجیے۔

تیسرا سوال: بتاؤ خدا کہاں ہے؟ اس نے دریافت کیا۔

جواب: حضرت نعمانؒ نے فرمایا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ روح کہاں ہے؟ حالانکہ خود آپ کے جسم میں موجود ہے تو اے شخص! وہ روح جو اس کے حکم سے پیدا ہوئی ہے

اور ہر ذی روح میں موجود ہے جب آپ جناب اس کو نہیں بتا سکتے تو کسی دوسرے کی کیا مجال ہے کہ وہ خالقِ روح کا بتا سکے۔" یہ جواب سن کر وہ متحیر ہوا پھر اس نے کہا اب چوتھا سوال پیش کریں۔

چوتھا سوال: خدا سے پہلے کیا تھا؟

جواب: حضرت نعمان نے عالم سے فرمایا....."آپ کو گنتی معلوم ہے۔

اس نے کہا "ہاں"..... آپؒ نے فرمایا..... آپ گنو تو سہی..... وہ ایک سے دس تک گن کر خاموش ہو گیا..... آپ نے فرمایا۔ پھر گنو..... وہ پھر ایک دو تین کہنے لگا آپ نے کہا۔ نہیں، نہیں یہ میں نہیں سننا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ایک سے پہلے کی گنتی مجھے سنائیں؟ اس نے کہا۔ ایک سے پہلے تو گنتی ہی نہیں ہے سناؤں کیسے؟ جب وہ ایک سے پہلے کی گنتی سے عاجز ہوا تو آپؒ نے فرمایا۔ افسوس جناب کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ مجازی گنتی میں جب ایک سے پہلے کچھ نہیں تو اس حقیقی خدائے واحد سے پہلے کیا ہو سکتا ہے۔" یہ سنتے ہی اس عالم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے..... وہ اور اس کے ساتھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ یہ حضرت نعمان امام اعظم ابو حنیفہ کی علمیت کی ایک ادنیٰ سی مثال تھی کہ اللہ اپنے مومن بندوں کو کیسے علم و حکمت کے خزانے عطا کرتا ہے۔ اسی لیے مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

بصیرت کے حصول کا سر غور و فکر ہے۔

غور و فکر کرنے سے سمت درست ہوتی ہے اور عقل سے تمام مخلوق کی اصلاح و بہتری کی جا سکتی ہے۔

علم کے سوا دیگر امور پر غور و فکر کرنا فضول قسم کی ہوس اور فکر کے بغیر خاموش رہنا گونگا پن ہے۔

غور و فکر سے انسان کو حق اور کامیابی کی راہیں نظر آتی ہیں۔

دنیا کے بے ہودہ تفکرات کو چھوڑ دو۔

غور کیا کرو تا کہ مشکل مسائل بہ آسانی سمجھ آ سکیں۔

نعمتوں میں تفکر کرنا بہترین عبادت ہے جبکہ ایثار بہترین عادت ہے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ سے دوستی اور محبت کے حصول کے لیے تفکر بنیادی اوصاف میں سے ہے۔ جس سے انسان راہِ معرفت میں گامزن ہوتا ہے۔

اچھی فکر اطاعت و عبادت کی بنیاد ہے اور جن کو فکر رہتی ہے وہی اعمال میں استقامت حاصل کرتے ہیں..... فکر عقل مندی کی بھی دلیل ہے۔ چونکہ اہلِ فکر ہی سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کی صحبت سے بھی تفکر پیدا ہوتا ہے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے سوچ کی راہیں کھلتی ہیں اور راہِ حق خود بخود منکشف ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا طالبوں اور سالکوں کو تفکر پر خوب محنت کرنی چاہیے اور پھر اللہ سے توفیق مانگنی چاہیے کہ وہ صحیح فکر عطا فرما دے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے..... اور اس تفکر کے نتیجے میں ہمیں اپنی ذات کو پاک، ستھرا اور صفا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے..... اللہ رب العزت ہمیں اپنی پسندیدہ اور قلیل بندے، بندیوں میں شامل فرمائے..... آمین الٰہی آمین۔

حرفِ آخر:

اے میرے پاک پروردگار! تیری یہ گناہ گار بندی تیری بارگاہ میں نادم دل کے ساتھ یہ دعا کرتی ہے کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی، کوتاہی نادانستگی میں سرزد ہو گئی ہو تو اے میرے مہربان رب مجھے معاف کر دے..... کہ بندہ غلطی کا پتلا ہے، الٰہی مجھے معاف کر دے۔ اور اس مضمون کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرما..... اور مطالعہ کرنے والوں کو اس کے فیوض و برکات عطا فرما، آمین۔

میں ان تمام قابلِ احترام ہستیوں کی شکر گزار ہوں جن کی کتب سے میں نے مضامین منتخب کیے۔ اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائے..... آمین۔

ماخذات

۱۔ احیاء العلوم (چہارم)..... امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۲۔ کیمیائے سعادت..... امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۳۔ بستان اولیا حصہ اول، دوئم..... مولانا حافظ محمد اسحاق دہلویؒ

۴۔ اللہ کا فقیر..... علامہ عالم فقری

۵۔ تصوف کا انسائیکلوپیڈیا..... امام ابو القاسم القشیریؒ

۶۔ سیرت الاولیا..... جناب عبد الرب درویش

۷۔ اقوالِ علیؓ..... علامہ محمد اقبال قادری

خوش گفتار، خوش اخلاق
اور باصلاحیت شیف

عابدہ بلوچ

عزیز قارئین! السلام علیکم
"بچپن ہی سے شوق تھا" یہ فقرہ اکثر بڑے
ہونے اور کسی بھی میدانِ عمل میں کامیابی حاصل کرنے
والوں کی زبانی ضرور سنا جاتا ہے لیکن ہماری پاکیزہ کی
مہمان رسماً یا لفظاً نہیں عملاً کمسنی ہی سے اپنے شوق کے
ہاتھوں مجبور ہو کر باورچی خانے کی راہ لیتی اور کچا پکا

(اپنے لیے) پکا کر ہی دم لیتی تھیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ، ساتھ یہ شوق پروان چڑھتا گیا۔ زمانہ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں فعال رہنے والی یہ الھڑ سی لڑکی خاتون خانہ بن کر بہت ذمے دار ہوگئی۔ اب گھر اور گھرداری اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ لذیذ کھانے پکا اور کھلا کر گھر والوں سے داد وصول کرنے والی کو خود شیف بننے کا خیال آیا اور وہ متحرک ہوگئی۔ شبانہ روز کی محنت، اپنے گھر اور شوق میں توازن برقرار رکھتے ہوئے اور سب سے بڑھ کر اپنے ہم سفر اور بچوں کے بھرپور تعاون کی بدولت بالآخر عابدہ بلوچ سے شیف عابدہ بلوچ بننے میں کامیاب ہوگئیں۔ بلاشبہ خوش اخلاقی اللہ کا انعام ہے اور شیف عابدہ بلوچ اس نعمت سے مالا مال ہیں۔ آپ خوش اخلاق بھی ہیں اور خوش مزاج بھی۔ چمکدار اور ذہین آنکھوں والی شیف عابدہ بلوچ کی خوش مزاجی ہی نہیں آپ کی بنائی ریسیپیز بھی ناظرین کا دل موہ لیتی ہیں۔

قارئین پاکیزہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس مرتبہ شیف عابدہ بلوچ ''اندازِ نو'' میں ہمارے سوالوں کے جواب میں اپنے اثبات و انکار اور ان کے جواز کے ساتھ حاضر ہیں۔

❁ بچپن کی کتاب کا سب سے خوب صورت ورق گڑیوں کے سنگ گزارے وقت سے مزین ہے!

☾ نہیں۔ گڑیوں کے ساتھ تو نہیں لیکن مجھے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے بچوں کے رسائل کے سنگ سے آراستہ ہے۔

❁ صبح، صبح اسکول جانے سے مجھے سخت چڑ تھی!

☾ نہیں۔ صبح، صبح میں بہت شوق سے اسکول جاتی تھی۔ اگر کبھی وین مس ہو جائے تو میں بہت افسردہ ہو جاتی تھی۔

❁ زمانہ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا!

☾ جی بالکل... بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیت بازی، اسپورٹس میں خاص طور پر۔

❁ سچ بہت میں مدد کی ہوں!

☾ جی نہیں...... گھر والوں کی حد تک تو ہوں لیکن باہر والوں کے لیے نہیں۔

❁ خرچ میں بے دھڑک کرتی ہوں!

☾ جی نہیں۔ بہت احتیاط سے خرچ کرتی ہوں۔ اس سے گھریلو بجٹ متوازن رہتا ہے۔

❁ اپنے مسائل اور پریشانیاں اپنی ذات تک محدود رکھتی ہوں!

☾ جی نہیں، بانٹ لیتی ہوں لیکن اپنے انتہائی قریبی دوستوں اور فیملی کے ساتھ۔

❁ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ ضرور لیتی ہوں!

☾ جی مشورہ لازمی کرتی ہوں کہ یہ سنت ہے اور مناسب مشوروں پر عمل بھی کرتی ہوں۔

NAVTTC کی جانب سے تہنیت کی خدمت انجام دیتے ہوئے

افواہ پھیلانے والوں سے بہت بیزاری ہوتی ہے!
جی۔ نہ میں ان کی افواہ پر یقین رکھتی ہوں اور نہ ہی سننا پسند کرتی ہوں۔
کیسا پل تھا وہ جب مجھ کو خود پر رشک آیا اور بہت آیا!
جب اللہ نے ایک ساتھ مجھے بیٹا اور بیٹی سے نوازا۔ اللہ نے اپنی رحمت اور نعمت ایک ساتھ جو عطا کر دی تھی۔
وقت کی پابندی میرے لیے ناممکن امر ہے!
نہیں کیونکہ میری حد سے زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ میں وقت کی پابندی کروں اور میں وقت پر پہنچ بھی جاتی ہوں۔
آنکھیں بند کر کے ہر میٹھے بول پر بھروسا کر لیتی ہوں!
بالکل بھی نہیں۔ بھروسا کرنے میں وقت لیتی ہوں۔
طبعاً میں بہت خوش امید ہوں!
جی یقیناً کیونکہ خوش رہنے کے لیے خوش امیدی بہت ضروری ہے اور پھر فرمان الٰہی بھی ہے کہ ''میں اپنے بندوں کے گمان کے ساتھ ہوں جیسا وہ گمان کرتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔''
ہر نئی صبح کا سورج میرے لیے نئی امنگ نئی ترنگ لاتا ہے!
بالکل۔ کیونکہ ہر نیا دن میرے لیے اللہ کا انعام اور یقین ہے کہ تاریکی کے بعد اجالا ضرور ہوتا ہے۔
میک اپ اور جیولری کے بغیر گھر سے نکلنے کا تصور تک نہیں کر سکتی!
نہیں، ہر وقت تو نہیں ہاں موقع محل کی مناسبت سے تیار ضرور ہو جاتی ہوں۔
فیشن کے ملبوسات میری کمزوری ہیں!
جی۔ دوسری خواتین کی طرح میری بھی کمزوری ہیں لیکن ساتھ ہی خیال بھی رکھتی ہوں کہ وہ مجھ پر اچھے بھی لگیں۔
وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ!
بالکل یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ دنیا کی ساری رونقیں عورت کے دم سے ہی ہیں۔ گھر میں ایک چھوٹی سی بچی کے وجود سے ہی بہت رونق آجاتی ہے۔
ڈائٹنگ کرنے کا سوچا تو کئی بار مگر ہمت ایک دفعہ بھی نہیں کی!
جی بالکل، یہ میرا وہ سالانہ منصوبہ ہے جو میرے اپنے ہاتھوں ناکام ہو جاتا ہے۔ اور میرے بھائی بہن میرا بہت مذاق اڑاتے ہیں۔
زندگی میں درپیش ہر مشکل کا مقابلہ ہمیشہ جی داری سے کیا ہے!
جی بالکل جی داری سے کیا اور کامیاب رہی کہ مستقل مزاجی میرے اندر بہت ہے۔

ہم ٹی وی نیٹ ورک کے سی ای او درید قریشی کے ہمراہ

ہم ٹی وی کی سالگرہ کے موقع پر

❁ شکست سے وقتی طور پر دل برداشتہ ضرور ہوتی ہوں لیکن جلد ہی ہمت پکڑ لیتی ہوں!

☾ شکست ہر انسان ہو جاتا ہے لیکن کوشش کرتی ہوں کہ مایوسی نہ آنے پائے۔

❁ منافقوں سے پالا پڑا تو آئینہ دکھائے بغیر رہا نہ گیا!

☾ نہیں، زیادہ تر میں نظر انداز ہی کر دیتی ہوں۔ بدمزگی کے خیال سے۔

❁ منفی سوچ کو بھی اپنے نزدیک پھٹکنے بھی نہیں دیتی!

☾ آجاتی ہے لیکن کوشش ہوتی ہے کہ فوراً منفی سوچوں کو دور کر دیا جائے اور اللہ کا شکر ہے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہوں۔

❁ بنا تصدیق کیے کسی بات کی تشہیر سخت ناپسند ہے!

☾ بالکل۔ نہ میں خود کرتی ہوں اور نہ ہی کسی دوسرے کا یہ فعل مجھے پسند ہے۔

❁ عشق انسان کی ضرورت ہے!

☾ جی بالکل ضروری ہے اور اس کا ثبوت میں خود ہوں اپنے گھر اور پیشے سے مجھے عشق ہے۔

❁ پھول کھلنے کے موسم میں دل کے گلاب کھلنے لگتے ہیں!

☾ جی بالکل کھلتے ہیں اور خوب کھل کر کھلتے ہیں کہ یہ موسم کا تقاضا ہے۔

❁ سیاحت میرا پسندیدہ شوق ہے!

☾ جی بہت زیادہ۔ لیکن مصروفیت کے باعث چند بار ہی جا سکی۔ فی الحال پاکستان کے مختلف علاقوں تک ہی اس شوق کی تکمیل ہو پائی ہے۔

❁ شادی میں نے اپنی پسند سے کی!

☾ جی۔ ان کی پسند سے رشتہ آیا اور میں نے اپنی پسند اور مرضی سے قبول کیا۔

❁ شریک حیات...... میں بہت خیال رکھنے والی ہوں!

☾ جی میں تو یہی کہوں گی اور اپنے تجربے کی روشنی میں کہوں گی۔

❁ مشترکہ خاندانی نظام میں اپنا مقام بنانا ازدواجی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہے!

☾ جی یقیناً لیکن افسوس بہت سی خواتین کو نہیں ملتی کہ اس کے لیے دونوں جانب برداشت بہت ضروری ہے۔

ہمارے شادی کی سالگرہ ہو یا میری اپنی صاحب جی سے فرمائشی تحفہ ضرور وصول کرتی ہوں!

نہیں ایسا نہیں ہے' میں بہت کم فرمائشیں کرتی ہوں اگر بن کہے تحفہ خود دے دیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔

ہمارے شیف بننے کا فائدہ صاحب جی خوب اٹھاتے ہیں' آئے دن نت نئی فرمائش کرکے!

بالکل فرمائشیں کرتے ہیں لیکن دیسی کھانے انھیں پسند ہیں۔

صاحب جی گھریلو امور میں خاصے بے نیاز ہیں!

نہیں۔ وہ دلچسپی لیتے ہیں اور خاص طور پر بچوں کے معاملے میں۔

میرے ہم سفر کی کیا بات ہے کچن میں ہاتھ بٹانے آتے ہیں اور کام بڑھا کر چلے جاتے ہیں!

ایسا ہی ہے۔ کام بڑھا کر چلے جاتے ہیں کہ کوکنگ سے اُن کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اپنی گھر گرہستی مجھے بہت عزیز ہے!

بالکل ہر عورت کی طرح مجھے بھی بہت عزیز ہے کہ یہی تو میری کائنات ہے۔

میرے بچے میرے دل کا چین ہیں!

جی نہ صرف چین بلکہ سکون اور سرور بھی ہیں۔

بچے جس وقت اور جس کھانے کی فرمائش کریں اسی وقت پوری کرتی ہوں!

اسی وقت تو نہیں پوری کرتی لیکن ان سے کمٹمنٹ ضرور کرلیتی ہوں کہ فلاں دن ان شاء اللہ ضرور بناؤں گی۔

"اولاد کو دو سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نگاہ سے" بچوں کے معاملے میں اس مقولے پر عمل کرتی ہوں!

جی بالکل کرتی ہوں' یہ ان کی تربیت کے لیے بہت ضروری ہے۔

آن لائن کلاسز نے بچوں کو مشکل میں ڈال دیا!

جی بالکل اور صرف بچوں ہی کو نہیں ان کے والدین کو بھی کیونکہ اس طرح ان کی ذمے داری بہت بڑھ گئی ہے۔

جب سے کورونا وبا پھیلی ہے بچوں کے معاملے میں بہت وہمی ہوگئی ہوں!

جی۔ شروع میں تو بہت زیادہ وہم ہوتا تھا لیکن اب جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے تھوڑا فرق پڑ گیا ہے احتیاط تو اب بھی کرتے ہیں لیکن اب اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔

بچوں کے مستقبل کے فیصلوں میں بچوں کو شامل کرنے کے حق میں ہوں!

جی بالکل کیونکہ یہ معاملہ ان کی زندگی کا ہے ہاں بحیثیت والدین ان کی رہنمائی کرنا ہمارا فرض ہے ان پر اپنی مرضی مسلط کرنا ہرگز نہیں۔

بیٹے اور بیٹی کی تعلیم و تربیت میں' میں نے کبھی تفریق نہیں کی!

نہیں۔ کبھی نہیں کی کہ یہ دونوں کا حق ہے۔

دعوت کے سیٹ پر

سابق گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد سے شیف کی تعلیم مکمل ہونے پر سند وصول کرتے ہوئے

خاص طور پر بیٹے کی تربیت زیادہ ضروری ہے کہ آنے والے وقت میں اسے گھر کا سربراہ بننا ہے۔

❁ بیٹیوں کو کھانا پکانے کے ساتھ، ساتھ انتظامی گھریلو امور کی تربیت لازمی دینی چاہیے!

☾ بالکل دینی چاہیے بالآخر اُن کو یہ کام کرنا ہی ہے۔

❁ شادی سے پہلے میں گھریلو بجٹ کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھی!

☾ ہاں بالکل بھی نہیں کیونکہ بہت جلدی شادی ہو گئی تھی۔ مجھے واقعی کچھ بھی پتا نہیں تھا۔

❁ ''کم خرچ بالا نشین'' پر عمل عورت کی کامیاب گھریلو زندگی کا اہم راز ہے!

☾ بالکل ضروری ہے کہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں۔

❁ کھانا پکانا بلاشبہ ایک آرٹ ہے!

☾ جی بالکل۔ نہ صرف کھانا پکانا بلکہ اسے سلیقے سے پیش کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔

❁ کھانا آنکھیں پہلے کھاتی ہیں زبان ذائقہ بعد میں محسوس کرتی ہے!

☾ یقیناً جو چیز دیکھنے میں خوب صورت لگے گی وہ کھانے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کھانا بنانے اور پیش کرنے میں اس کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

❁ کھانا پکانے میں میرا خاص امتیاز ہائی جین کا خیال رکھنا ہے!

☾ جی پہلے اپنے ہاتھوں کو دھو کر دال، سبزی، گوشت جو بھی پکانا ہے اسے اچھی طرح دھوتی ہوں اس کے ساتھ، ساتھ پکانے کی جگہ اور برتن کا صاف ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

❁ کھانا پکانے میں لذت اور برکت، نیت اور لگن سے آتی ہے!

☾ بے شک جو لوگ دل سے کھانا بناتے ہیں دیکھا گیا ہے وہ بہت اچھا بناتے ہیں اور برکت بھی ہوتی ہے۔

❁ دم پر رکھے کھانوں کی دیگچی کھولنے سے کھانے کا دم ہوا ہو جاتا ہے!

☾ ہاں یہ تو ہے دم کسی سالن کا ہو یا چاول کا آخری پانچ دس منٹ نہ کھولیں تاکہ کھانے کا ذائقہ اور خوشبو اسی میں رہے۔ خاص طور پر چاول، ورنہ چاول

کچے رہ جائیں گے۔

❀ جب نیا، نیا پکانا سیکھا تھا بُھنائی کی دُھنائی کر کے رکھ دیتی تھی!

☾ نہیں، بھنائی زیادہ نہیں بلکہ بہت کم کرتی تھی اور تھوڑا کچا، کچا پکاتی تھی۔ اور چونکہ صرف اپنے لیے پکاتی تھی اسی لیے کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوتا تھا۔

❀ ترکیب جتنی آسان ہو اتنا ہی کھانا پکانے میں لطف آتا ہے!

☾ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ کیونکہ دیکھنے اور سیکھنے والے اسے آسانی سے فالو کرلیتے ہیں۔

❀ فوڈ چینل پر سستی مگر اچھی ریسپیز بنا کر خود کو منوایا!

☾ بالکل میری ریسپیز میں زیادہ تر ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو بہ آسانی گھر سے نکل آئیں۔ اس طرح جیب پر اضافی بوجھ بھی نہیں پڑتا اور شوق بھی پورا ہو جاتا ہے۔

❀ وقت کم ہو تو کھانا پکاتے ہوئے مجھ سے بدحواسی سرزد ہو ہی جاتی ہے!

☾ عام طور پر تو نہیں ہاں جب لائیو شو کر رہی ہوں تو تھوڑی سی بدحواسی ہو جاتی ہے کہ ہمیں لازمی وقت پر سرو کرنا ہے۔

❀ چائنیز بنانے کے لیے وقت کا خاص رکھنا پڑتا ہے!

☾ جی بالکل لہسن کو صرف خوشبو آنے تک پکائیں اور سبزیاں اور چکن بھی ضرورت سے زیادہ نہ پکائیں۔

❀ چائنیز کھانوں کی بہت شوقین ہوں!

☾ جی بہت زیادہ شوقین ہوں کہ کبھی، کبھی ہلکے مرچ مسالے بھی اچھے لگتے ہیں۔

❀ میٹھا شوق سے کھاتی اور بے دلی سے بناتی ہوں!

☾ جی نہیں۔ میٹھا میں جتنے شوق سے کھاتی ہوں اتنے ہی شوق سے بناتی بھی ہوں۔

❀ سی فوڈز پکانے میں جتنا لطف آتا ہے اتنا کھانے میں نہیں!

☾ مجھے سی فوڈز پکانے اور کھانے دونوں ہی میں بہت لطف آتا ہے۔

❀ جاپانی کھانے بنانے میں مجھے خاص مہارت حاصل ہے!

☾ فی الحال تو جاپانی کھانے بنانے میں مہارت نہیں لیکن کوشش ضرور کرتی ہوں ان شاء اللہ ایک دن کامیاب بھی ہو جاؤں گی۔

❀ باورچی خانہ اگر صحت کا ضامن ہے تو بیماریوں کی آماجگاہ بھی ہے!

☾ جی بالکل ایسا ہی ہے کیونکہ متوازن اور غذائیت بخش غذا صحت کی ضامن۔ خاص کر غیر ضروری چکنائی کا استعمال اور صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو بیماریوں کی آماجگاہ۔

❀ پسی مرچ زیادہ ڈالنے سے کھانا زیادہ چٹپٹا ہو جاتا ہے!

☾ جی پسی مرچ سے بھی ہوتا ہے لیکن کُٹی مرچ سے زیادہ ہوتا ہے کہ اس میں مرچ کی تیزی زیادہ ہوتی ہے۔

❀ مسالوں کے درست تناسب سے کھانے میں لذت آتی ہے!

☾ بالکل بہت ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی چیز ضرورت سے زیادہ کم یا زیادہ پڑ گئی تو ذائقہ خراب ہوگا۔

❀ ہاتھ سے پسے مسالوں کی بہ نسبت گرائنڈ کیے مسالے ذائقہ دار ہوتے ہیں!

☾ ہرگز نہیں، ہاتھ سے پسے مسالوں میں زیادہ لذت ہوتی ہے کیونکہ گھر کے مسالے خالص ہوتے ہیں۔

❀ چاول مجھ سے ہمیشہ ڈھے جاتے ہیں!

☾ جی نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہاں اگر چاول بری کوالٹی کے ہوں تو کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ

شیف عابدہ بلوچ کے دل کے ٹکڑے

پکوانیں پکانے والے پر تہمت تو لگ ہی جاتی ہے۔

❁ اچھی روٹی پکانے کی بنیادی شرط اچھا گندھا ہوا آٹا ہے!

☾ بالکل درست۔ کیونکہ آٹا اچھا گندھا ہو تو روٹی نرم اور پھولی ہوئی پکے گی۔ اس کے علاوہ ایک شرط روٹی بنانے میں دلچسپی بھی ہے۔

❁ بلاشبہ اچھی چائے بنانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں!

☾ بالکل کیونکہ اگر چائے خاص تناسب اور خاص انداز سے نہ بنائی جائے تو ذائقہ نہیں آئے گا۔

❁ یہ درست ہے کہ تیل کے بجائے دیسی گھی زیادہ صحت بخش ہے!

☾ بالکل کیونکہ اصل چیز کی تو کیا ہی بات ہے۔

❁ کھانا پکانے کے معاملے میں تن آسانی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے!

☾ واقعی یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ کہ ہم سب سست ہوتے جا رہے ہیں آسانی کی عادت جو پڑتی جا رہی ہے۔

❁ بچوں میں فاسٹ فوڈ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے اصل ذمے دار والدین ہیں!

☾ جی۔ ماں باپ ہی ذمے دار ہیں کہ وہ خرید کر جو دیتے ہیں۔

❁ بازار سے لائے گئے فاسٹ فوڈز محض بچوں کی صحت ہی کے نہیں بجٹ کے بھی دشمن ہیں!

☾ جی بچوں کی صحت بھی خراب کرتے ہیں اور مہنگے ہونے کی وجہ سے بجٹ بھی تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

❁ بچوں کو گھر میں فاسٹ فوڈ بنانا سکھانے والی مائیں باہر کے کھانوں سے بچوں کو بچا لیتی ہیں!

☾ یقیناً بچا لیتی ہیں کیونکہ وہ گھر میں صاف ستھرے انداز میں بنا کر دیں گی۔ اور یہ سوگنا بہتر ہے۔

❁ نگر نگر کے ذائقے اپنی جگہ مگر پاکستانی کھانوں کا جواب نہیں!

☾ بالکل۔ پاکستانی کھانوں کے بغیر تو گزارہ ہی نہیں ہے۔

❁ ماہر پکوان اور شیف ایک ہی کام کے دو نام ہیں!

☾ نہیں دو الگ لوگوں کے نام ہیں۔ ماہر پکوان تو کوئی بھی بن سکتا ہے وہ بھی جس کے بنائے خوش ذائقہ کھانے خاندان بھر میں پسند کیے جاتے ہیں اور cullinary کی تعلیم و تربیت مکمل کر کے سند حاصل کرنے والے کو شیف کہا جاتا ہے۔ ہاں شیف بننے کے بعد ماہر پکوان کے پاس جا کر سیکھنا تو سونے پر سہاگا کے برابر ہے شیف کے لیے۔

❁ یونہی ایک دن خیال آیا شیف بننا چاہیے۔ بھاگ دوڑ شروع کر دی اور بن گئی شیف!

☾ یونہی نہیں بلکہ مصالحہ ٹی وی دیکھتے ہوئے خیال آیا مجھے شیف بننا چاہیے اور بن گئی۔

❁ گھرداری کے ساتھ شیف کی ٹریننگ

آسان نہ تھی لیکن میرے شریکِ حیات اور بچوں کے تعاون نے سہل بنا دیا!

☾ حد سے زیادہ مشکل تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری فیملی کی وجہ سے میں میرے لیے آسان ہو گئی۔

❀ شیف بننے کی بنیادی شرط، اپنے کام سے لگن، محنت اور دیانتداری ہے!

☾ نہ صرف شیف بننے بلکہ ہر کام میں کامیابی حاصل کرنے کی یہی شرط ہے۔

❀ ایک گھریلو خاتون سے شیف بننے کا تجربہ بہت دلچسپ رہا!

☾ جی بہت، بہت دلچسپ رہا اور میں بہت خوش ہوں اپنے پروفیشن سے۔

❀ شیف بنی تو سب سے زیادہ میرے ہم سفر نے سراہا!

☾ جی بالکل انہوں نے تو سراہا ہی لیکن پوری فیملی نے سراہا اگر یہ کہا جائے کہ اپنے بچوں کی کی فرمائشیں پوری کرتے، کرتے میں شیف بن گئی تو یہ بالکل غلط نہ ہوگا۔

❀ کوکنگ چینل پر بحیثیت شیف پہلی مرتبہ آئی تو کچھ نروس ہو گئی!

☾ ہاں بالکل نروس ہو گئی تھی اور میرا خیال ہے سب ہی کیمرے کے سامنے پہلی دفعہ نروس ہو جاتے ہیں۔

❀ کوکنگ شو میں کھانا پکانا سکھاتے ہیں شو کے بعد کھانا گھر لے جاتے ہیں!

☾ ارے نہیں بالکل بھی گھر نہیں لے کر جاتے۔

❀ لائیو شو کرنے کا لطف ہی اور ہے!

☾ لائیو شو کرنا مجھے بہت ہی زیادہ پسند ہے کہ مخصوص وقت پر شروع ہو کر وقت پر ختم ہو جاتا ہے۔

❀ اپنا کوکنگ شو نشر مکرر ضرور دیکھتی ہوں اور وہ بھی ایک نقاد کی نظر سے!

☾ پہلے بہت دیکھتی تھی لیکن سچی بات ہے اب بہت کم دیکھتی ہوں لیکن جب بھی دیکھتی ہوں نقاد کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ اس طرح میرے کام میں مزید بہتری آتی ہے۔

❀ بیکری کی اشیا بنانے میں خاص مہارت رکھتی ہوں!

☾ نہیں بہت زیادہ مہارت تو نہیں ہے لیکن مجھے شوق بے انتہا ہے جو ریسپیز بہت زیادہ ٹیکنیکل نہیں ہوتیں میری کوشش ہوتی ہے ضرور بناؤں۔

❀ اناڑی لڑکیوں کو کھانا پکانے کی تربیت دینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے!

☾ اناڑی لڑکیوں کو کھلاڑی بنانا مشکل نہیں لیکن جو سیکھنا ہی نہ چاہے اس کو سکھانا بلاشبہ جوئے شیر لانے کے برابر ہے کیونکہ بے جذبہ و شوق کوئی کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

❀ میں تو یہی کہتی ہوں ”کھاؤ من بھاتا اور پکاؤ فوڈ چینل دکھاتا!“

☾ ہاں بالکل، بالکل (بے ساختہ ہنسی) پکاؤ فوڈ چینل دکھاتا کہ یہی تو بن جاتا ہے کھانا من بھاتا۔

❀ جب سے شیف بنی ہوں کھانا پکاتے ہوئے اکثر تجربات کرتی رہتی ہوں!

☾ ہاں تجربات بالکل کرتی ہوں بلکہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی نئی چیز ہے تو پہلے گھر میں اس کا تجربہ کرتی ہوں۔

❀ اپنے گھر میں موسم کے لحاظ سے اچار، چٹنیاں اور مشروب ضرور بناتی ہوں!

☾ بہت شوق سے بناتی ہوں کہ مجھے بھی پسند ہے اور گھر والوں کو بھی۔

❀ شیف بننے کے بعد مجھ کو آج کیا پکائیں کے ”یومیہ مسئلے“ سے نجات مل گئی!

☾ جی بالکل نجات مل گئی ہے۔ ذہن میں ایک ساتھ اتنی ریسپیز چل رہی ہوتی ہیں کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

❀ کوکنگ چینل میں آنے کے بعد سے میرے تو رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں!

ماسٹر شیف مقابلہ کے ججز

🌙 نہیں بالکل بھی رنگ ڈھنگ نہیں بدلے۔ جیسی پہلے تھی اب بھی ویسی ہی ہوں۔

❀ ڈپریشن دور کرنے کا بہترین طریقہ اللہ سے لو لگانا ہے!

🌙 بے شک اور اگر اللہ کے حکم کے مطابق شکر گزاری کی عادت پڑ جائے تو ڈپریشن ہی نہیں ہوگا

❀ پروگرام ''دعوت'' دیکھنے والوں کی ستائش نے مجھے پہلے سے زیادہ منکسر المزاج بنا دیا!

🌙 جی بالکل ایسا ہے۔ کیونکہ تعریف کی خوشی ہوتی ہے تو اللہ کا شکر بھی ادا کرتی ہوں اور عاجزی بھی تو شکر گزاری کی ایک صورت ہے۔

❀ مصالحہ ٹی وی فیسٹیول کے موقع پر مداح بہت پریشان کرتے ہیں!

🌙 جی نہیں۔ مداح پریشان نہیں کرتے مجھے اچھی لگتی ہے ان کی محبت۔

❀ پیشہ ور شخص کی وجہ سے پیشہ ور باورچیوں کا روزگار متاثر ہوا ہے!

🌙 نہیں کسی کی وجہ سے کاروبار خراب نہیں ہوا سب اپنے نصیب کا رزق کما رہے ہیں۔

❀ کھانا پکانا اب منافع بخش کاروبار کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے!

🌙 بالکل بہت منافع بخش کاروبار ہے۔ کئی جگہ مختلف کھانوں کے کاروبار کھل گئے ہیں اور لوگ اچھا کھانے میں کھل کر خرچ کرتے ہیں۔

❀ کورونا کے زیر اثر لگنے والے لاک ڈاؤن نے فوڈ انڈسٹری کو بری طرح متاثر کیا!

🌙 یقیناً اس انڈسٹری کو متاثر کیا باقی کاروبار کی طرح ریسٹورنٹ بند رہے تو ظاہر ہے محض کھانا پکانے اور فروخت کرنے والے ہی نہیں دیگر متعلقہ حضرات کا کاروبار بھی متاثر ہوا

❀ 2021ء سے اگر کورونا کی وجہ سے خدشات ہیں تو توقعات بھی بہت ہیں!

🌙 بین الاقوامی مارکیٹ نیچے آ گئی ہے مزید نقصان نہ ہو لیکن ساتھ میں پُر امید ہوں کہ اللہ نے بیماری دی ہے تو اس کا علاج بھی دے دے گا ہم سب کو اس سے نجات مل جائے گی۔

❀ پکوان کی دنیا میں میری کامیابی میں میرے مداحوں کا کردار بہت اہم ہے جب ہی تو میں ان سے کہتی ہوں!

🌙 ہماری کامیابی میں آپ کا بہت ہاتھ ہے خوش رہیے۔ اچھے، اچھے کھانے پکاتے کھاتے رہیں۔ سیکھنے سکھانے کے عمل کو جاری رکھیں ہم سے جو سیکھ رہے ہیں وہ اوروں کو بھی سکھائیں خود بھی مثبت سوچ رکھیں اور اس کو عام بھی کریں۔ اچھی بات اوروں تک پہنچانا بھی صدقہ ہے۔

☆☆☆

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں۔۔۔۔ مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی، کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

مرزا عابد عباس اردو مزاح نگاری کا ایک نہایت معتبر و معروف نام ہے۔ اس ماہ اپنے باذوق پڑھنے والوں کے لیے ہم نے انہی نامور مزاح نگار کی تصنیف زوآفت سے اقتباس منتخب کیا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین لطف اندوز ہوں گے

ٹیلی ویژن کل اور آج

ابتدائی دور میں ٹیلی ویژن کی شکل چوپائے سے مشابہ تھی اور اس کے رکھے جانے کا مقام بھی ڈرائنگ روم میں دھرے ریفریجریٹر کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔ اس شیطانی چوپائے کی رسی کو دراز کر کے بجلی کے بورڈ کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا کیونکہ بجلی اس کی مرغوب غذا ہے۔ بک جانے کے بعد یہ صرف ایک ڈبا رہ جاتا ہے بلکہ اس کا تو ڈبا ہی گول ہو جاتا ہے۔

ٹی وی آنے سے پڑھنے لکھنے کا رواج کچھ ختم سا ہو چلا ہے یا کم از کم پڑھنے میں کمی ضرور واقع ہوگئی ہے۔ پہلے گھریلو خواتین میں ناول اور ڈائجسٹ پڑھنے کا عام رواج پایا جاتا تھا لیکن اب اس کی جگہ ٹی وی کے قسط وار ڈراموں نے لے لی ہے۔ ٹی وی نے اپنے آپ کو ایک اچھا وقت ضائع کرنے کی مشین ثابت کر دکھایا ہے۔

قربِ قیامت کی نشانی ہے کہ گھر، گھر سے ناچ گانے کی آوازیں آئیں گی۔ پہلے یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی تھی کہ کیا ہر گھر میں ناچنے گانے والے لوگ پیدا ہو جائیں گے لیکن پھر ریڈیو ایجاد ہونے کے بعد سمجھ میں آگئی یا یوں کہیں کہ ریڈیو نے اسے پورا کر دکھایا۔

ساٹھ کی دہائی میں جب ہمارے گھر ٹی وی آیا تو الف نون Live جاتا تھا اور بہت Like کیا جاتا تھا کیونکہ ہفتہ بھر اس پروگرام کا انتظار کیا جاتا تھا۔ خاص الف نون آنے والے دن ہمارے ٹی وی نے سے ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہم لوگوں میں شروع سے ظرافت کی چاشنی کی مقدار کافی بڑھی ہوئی تھی اور مزاح سینہ پھاڑ، پھاڑ کر باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ ظرافت کی چاشنی کی مقدار کو شوگر کے جیسی بیماری نہ سمجھ لیا جائے۔ بہر حال! ٹی وی تو عین اسی دن آگیا جس دن الف نون آتا تھا لیکن انٹینا نہ لگنے کے سبب ہم اس دن پروگرام نہ دیکھ پائے۔ اس دور میں انٹینا جوڑ کر لگانے کے لیے ٹی وی کی دکان سے آدمی ساتھ آیا کرتا تھا جو اس دن میسر نہ آسکا۔

تھی خبر گرم کہ ٹی وی کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اس دور کے موسیقی کے پروگرام اور آج کے موسیقی کے پروگراموں میں نمایاں فرق ہے۔ موسیقی کے فن میں ناسمجھ اور نافہم لوگ معلوم نہیں کہاں سے وارد ہو گئے جو کہ موسیقی کے رموز سے بالکل بھی واقف نہیں ..... اور سونے پر سہاگا یہ کہ انہوں نے کچھ سیکھنے کی کوشش بھی قطعاً محسوس نہ کی انہوں نے اس بھدے بے ڈھنگے میوزک کو پوپ میوزک کا نام دیا ہے جس میں سُر، تال اور لے عجیب ہی نوعیت کی ہوتی ہے۔ پہلے موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا تھا اور یہ غذا Slow Tempo کے گانے ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج یہ تشدد بھرے گیت معلوم نہیں کس جرم کی سزا ہیں جن کو سن کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ پہلے کانوں میں خوب صورت شاعری سے جان پڑتی تھی جیسے "اب کے برس تو اتنا برس" لیکن آج کی یہ شاعری بھی کاٹنے کو دوڑتی ہے مثلاً ساری رات جھوم گول، گول گھوم وغیرہ۔

پچھلے دور میں دس بیس گھروں میں ایک دو آدمیوں کے گھر ٹی وی ہوا کرتے تھے جو پورے اہلِ محلہ کے لیے کافی تھے لیکن اب یہ عالم ہے کہ چار افراد کے مختصر خاندان کے لیے بھی دو بھی ناکافی ہو گئے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ چار آدمیوں میں کم از کم چار ٹی وی تو ضرور ہونے چاہئیں تاکہ آدمی مشکلات سے دو چار نہ ہو۔ گھر میں مرد کا سکون اٹھ چکا ہے۔ بیوی ڈرامے کی سات سو چالیسویں قسط آرام سے بیٹھ کر دیکھے۔ بچے کارٹون فلم محو ہو کر دیکھے اور اسے کوئی آواز نہ ستائے۔ بچی موسیقی کے پروگرام کو توجہ سے سنتی ہو تو کوئی اس وقت اس میں مخل نہ ہو لیکن یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہے کہ جب فی آدمی ایک ٹی وی گھر میں موجود ہو۔ ممکن ہے آگے چل کر ایسا بھی دور آئے جس میں چار ٹی وی ایک آدمی کے لیے کم پڑ جائیں۔ ٹی وی خریدنے کی کسی آدمی کو اتنی ہوس نہیں ہے کہ کئی ٹی وی خریدے لیکن اس کی زیادتی ہونے کا سبب بالواسطہ طور پر چینل کی زیادتی سمجھ میں آئی ہے اور زیادتی کسی کے ساتھ بھی روا نہیں ہونی چاہیے وہ آپ کی بیوی ہی کیوں نہ ہو ان دونوں میں (V) مشترک ہے اور وی سے وکٹری مراد لیا جاتا ہے جو فتح اور کامرانی کی علامت ہے۔

پہلے ٹی وی کا شمار تعیشات میں ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ وقت کی ضرورت بن گیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ خاص طور پر بیوی کی ضرورت بن کر ابھرا ہے۔ پہلے سہ ماہی ڈرامے تیرہ اقساط پر مشتمل ہوتے تھے لیکن آج قسط کی اشتعال انگیزی اتنی بڑھی کہ ڈراما ہزاروں اقساط پر مبنی ہونے لگا۔

شاید مستقبل میں ہر گھنٹے بعد خبروں کے بولیٹن کی طرح ڈرامے کی قسط دیکھنا ممکن ہو جائے اگر ترقی کا سفر اسی طرح جاری رہا تو اس جدید دور میں وقت سے زیادہ ٹی وی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے گھڑی میں ٹی وی آجائے گا جس طرح آج کل کیلکولیٹر وغیرہ گھڑی میں ہوتا ہے اور اس کے بعد شاید گھڑی کی ضرورت ختم ہو جائے جس طرح سے کمپیوٹر نے آکر کاغذ، قلم دوات کو بالائے طاق رکھوا دیا ہے۔ دورِ جدید میں انسان اتنا active ہو جائے گا کہ passive کی ضرورت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیوی کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن جب میں کمرے میں آیا تو دیکھا کہ ٹی وی چل رہا ہے اور اس پر ایک مشہور ڈرامے کی بارہ سو بیسویں قسط آرہی ہے۔ بیگم صاحبہ بڑے انہماک سے یہ ڈراما دیکھ رہی تھیں۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر بیگم سے پوچھا کہ آپ کی طبیعت قدرے بہتر معلوم ہو رہی ہے تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک شعر سنا کر لاجواب کر دیا۔

ٹی وی دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

☆☆☆

بہار آئی کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر

شائستہ زریں

معزز قارئین! السلام علیکم

رنگ و خوشبو بکھیرتا موسم بہار اور اس سے فیض پاتے انسان یہ تمام کے تمام خالقِ کائنات کی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں۔ سورۂ رحمٰن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی جن بیش بہا رنگا رنگ نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سبزہ، درخت اور پھول بھی شامل ہیں۔ موسم بہار میں کھلنے والے قطع قطع کے پھول اور بہار کے اندر کا موسم سب ہی بہاروں کی نوید دیتے ہیں گویا

جب بہار آئے تو خود ہی چلے آتے ہیں
وجد میں دیدۂ دل، سوزِ دروں، نغمۂ جاں

(زریں)

بہار کے کئی رنگ ہیں اور ہر انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے ان سے محظوظ ہوتا ہے۔ پھول کھلنے کے موسم میں گلوں سے محبت کرنے والے پھولوں کی نمائش میں جا کر قدرت کے حسین اور دلکش مظاہر سے قلب و نظر کو منور اور روح کو معطر کرتے ہیں اور جو صاحب دل اور صاحب نظر باوجود شدید خواہش اور کوشش کے نہیں جا پاتے وہ اپنے ذوق اور شوق کی تسکین اور تکمیل کے لیے گھر آنگن کی کیاریوں میں لگے پھول اور پودوں سے ہی مشامِ جاں کو معطر کر لیتے ہیں۔

پھول کھلنے کے موسم میں اپنوں کے لیے خواہ ان سے تعلق اور رشتے کی نوعیت کچھ بھی ہو، دل میں گلاب کھلنے لگتے ہیں۔ تب ان کے لیے پُر بہار فقرہ یا شعر ہمارے باطنی جذبات و احساسات کا ترجمان بن جاتا ہے۔

تیری حیات کا ہر لمحہ شادماں گزرے
بہار سجدہ کرے تو جہاں، جہاں گزرے

بہار رُت میں کیے جانے والے سروے کے اہتمام میں بہاروں سے آراستہ ہمارے سوال اور شرکا کے جواب نذرِ قارئین ہیں۔

سوال 1: موسم بہار کا کون سا رنگ آپ کا من بھاتا ہے؟

سوال 2: کبھی پھولوں کی نمائش میں جانے کا اتفاق ہوا؟ اگر ہاں تو کیسے لطف اندوز ہوئیں؟ نہ جا سکیں تو بہار میں کھلتے پھول دیکھنے کے شوق کی تکمیل کیسے کرتی ہیں؟

سوال 3: پھول کھلنے کے موسم میں آپ کے دل کے گلاب کس کے لیے کھلتے ہیں؟ اس عزیز ہستی کے لیے کوئی پُر بہار فقرہ یا شعر جو آپ کے جذبات کا ترجمان ہو؟

غزالہ رشید

(مصنفہ)

1: پھول کھلتے ہیں جب۔ اور ایسے دوستوں سے ملاقات ہو جو بہت سے اچھے لمحات بغیر جتائے سونپ جاتے ہیں۔ کبھی باتوں کی صورت، کبھی نظموں، غزلوں کی شکل میں، وہ لمحے کبھی بے رنگ نہیں ہوتے یعنی محبتوں کے رنگ۔

2: اب تو عرصہ ہوا، ورنہ پھولوں کے تو جشن ہونے چاہئیں۔ اسلام آباد اور ہمارے کراچی میں جب بھی پھولوں کی نمائش ہوتی تھی۔ ویسے تو سچ بتاؤں ہم کراچی والوں کو پھولوں کے نام بھی کبھی کبھی پتا ہوتے ہیں یہ مزہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں جا کر ہی ملتا ہے۔ پھول اور پھل بھی، چھوٹی سی بالکونی میں، پودوں کو لگانا، پانی دینا، اس کارنر کو سجانا، رنگوں سے بھی لائٹ سے، میرا بہترین مشغلہ بھی ہے اور ریلیکس ہونے کی جگہ بھی۔

3: اب تو کیلی کے پیارے بچوں SELD (اسکول آف کوگنیشن اینڈ لینگویج ڈیولپمنٹ) کے بچوں کے ساتھ جب، جب ملتی ہوں مجھے یہی لمحہ یادگار لگتا ہے، خوشبو جیسا، امید لیے، اس دعا کے ساتھ کہ آنے والا وقت انہیں بہار جیسا

لے جس میں یہ پھولے پھلیں ان شاء اللہ۔

افسر سلطانہ

(پروفیسر۔مصنفہ)

1: زرّیں جی! موسم بہار کے سارے رنگ ہی خوب صورت ہوتے ہیں نیلے، پیلے، اودے، سرخ، گلابی، زعفرانی رنگوں کے ساتھ مزید مہکنے والی ہوائیں جو بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ روح کو سرشار کردیتی ہیں۔ اس مہکتی فضا میں چند لمحوں کے لیے آپ ان تفکرات، پریشانیوں اور تکالیف کو بھی فراموش کردیتے ہیں جو اندر ہی اندر آپ کی روح کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہوتی ہے سو ثابت ہوا کہ بہار کا ہر رنگ ہی بھاتا ہے۔ دل میں اتر جاتا ہے۔

2: نہیں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ جانے کی بہت کوشش کی پھر غم روزگار کہا یا بے انتہا مصروفیات نے مجھ سے یہ خوب صورت سی یادیں چھیننے کی بھرپور کوشش کی اور کامیابی حاصل کی۔ تو بس ٹی وی پر جھلک دیکھ پائی۔

لطف اندوز تو نہ ہو سکی ورڈز ورتھ کی daffodils تک کو یادوں میں سمویا کہ وہ تو صرف ان کو ہی دیکھ کر جیتا رہا اور میں نے یہ خطا انجانے میں کر ڈالی تو اس کی تکمیل یوں کرتی ہوں کہ میرے گھر کی کیاریاں پھولوں سے لدی ہیں الحمدللہ اس شوق کو ایک زمانے میں، میں نے اس حد تک سجایا کہ ایک صاحب نے طنزیہ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ گھر نہیں باغ لگتا ہے۔ کاش وہ محترم میرے ابو کے دوست نہ ہوتے۔ طنز کے بجائے تعریفی جملہ ہی کہہ ڈالتے۔ خیر قصہ مختصر اب بھی میرے ڈرائنگ روم سے لے کر ہر کمرے میں پھول نظر آئیں گے۔

3: ان بچوں کے لیے کھلتے ہیں اور کھلتے رہیں گے جن میں اور پھولوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہی معصومیت وہی خوب صورتی جیسے پھول کچلے اور روندے جاتے ہیں اس طرح بچوں کو بھی کچلا اور روند دیا جاتا ہے۔ بہت کم ہاتھ ہیں جو انہیں بہت پیار سے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ میرے گھر کے سامنے والے گھر کی کیاری کانٹوں اور جھاڑیوں سے اٹی پڑی تھی میں نے ان سے اجازت لی مالی سے کہہ کر اسے سنوار دیا۔ لوگوں نے تنقید کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ خرچہ کیا۔ ضروری بتانا یہ مقصود تھا کہ لوگ اس طرح اپنے بچوں کو احتیاط سے پال لیتے ہیں اور دوسرے بچوں کی جو درگت بناتے ہیں اللہ کی پناہ۔ بچوں پر تشدد کے واقعات سنتی اور پڑھتی ہوں۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کچرے چننے والے بچوں پر نگاہ پڑتی ہے حقیقتاً آنسو بہتے ہیں۔ لو میں کہاں نکل گئی تم نے خوب صورت موسم کی بات کی اور میں؟ شاید تم اتفاق کرو بچے اور پھول سے بڑا سچ کائنات کا کوئی سچ نہیں۔

لبنیٰ غزل

(قلمکار۔لائبریرین)

1: بہار کی آمد کا خوشگوار احساس زرد اور سوکھے شجر کے تن من میں جس طرح ہریالی کا نشہ اور اس کا حیات آفریں لمس اتار دیتا ہے اسی طرح بہار کے کھلتے ہوئے سبز رنگ نگاہوں کو تراوٹ بخشتے اور روح میں تازگی کا احساس بھر دیتے ہیں، تمام عالم پھولوں کی سوغاتیں سمیٹ لیتا ہے تو قدرت کی اس صناعی اور فطری حسن کو بصارتیں داد دیتی ہیں اور خوشبو بھری سانسوں سے بے اختیار سبحان اللہ نکلتا ہے کہ فطرت کے جو حسین اور حقیقی رنگ ہیں وہی کائنات کا اصل حسن ہیں اور قدرت کی صناعی اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہر جگہ اور ہر لمحہ موجود ہونے کی دلیل اور احساس کو زندہ رکھتے ہیں۔ بہار کے یہ سارے رنگ ہمارے اپنے ہیں اور ہمیں عزیز ہیں کہ یہی سبز رنگ گنبد خضریٰ کا ہے۔ یہی سبز رنگ میرے پاک وطن کے

کے ہیں۔ ہر انداز جدا، ہر پھول قدرت کا شاہکار گویا۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے

ہمیں تو بہار کا ہر رنگ من بھاتا لگتا ہے۔ صرف ایک کو چننا ناممکن ہے۔ کس کو دیکھیں، کس کو چھوڑیں؟

2: جی ہاں کئی دفعہ پھولوں کی نمائش کا حصہ بنے۔ ہر پھول، ہر پتا ہر رنگ جدا۔ پھول قدرت کی بہترین تخلیق ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' سبحان اللہ کہتی جاتی اور ان دیدہ زیب خوش رنگوں پھولوں کو سراہتی جاتی تھی۔

3: آہم، آہم، آہم! (کیا غضب کا ترنم آ رہا ہے۔ ماشاء اللہ) ہمارے دل کا گلاب تو کئی سال پہلے اپنے مجازی خدا کو دیکھ کر ہی کھل چکا تھا۔ الحمد للہ آج بھی روزِ اوّل کی جیسی تازگی اور شگفتگی ہے اور یہ ''ان'' کے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

کہہ رہا ہے بہار کا موسم
ہم سفر ہو کوئی تیرے جیسا

شگفتہ شفیق

(شاعرہ، مصنفہ)

1: موسم بہار کا ہر رنگ مجھے دل سے پسند ہے کہ میں فطرت سے پیار کرتی ہوں۔

2: موسم بہار ہو، پھولوں کی نمائش ہو اور شگفتہ شفیق نہ جائے۔ ارے بھئی یہ ناممکن ہے۔ ہم تو ضرور جاتے ہیں کہ وہاں بے شمار پھولوں کی ورائٹی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جسے دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ وہاں ہم ان پھولوں کی حسین تصویریں اپنے کیمرے میں قید کر لیتے ہیں اور خود اکثر اپنے پسندیدہ پھولوں کے ساتھ بہت ساری تصاویر بنواتے ہیں۔ ویسے میں موسم بہار میں خاص طور پر اپنے گھر کے لان میں پھول ضرور لگاتی ہوں کہ باغبانی کا بھی شوق ہے اور اس پودے میں جب پہلا پھول آتا ہے تو اس کی خوشی نہ پوچھیں۔ ہم تو پھولوں سے بہت باتیں بھی کرتے ہیں۔

3: ہمارے ''گھر والے'' کے لیے دل میں گلاب کھلتے ہیں۔ موسم بہار سے متعلق شفیق کے لیے ایک نظم

''صرف تیرے نام''

ترے لمس نے کھلایا
دل کا میرے ایسے پھول
جھڑ گئی میرے بدن سے
زخمِ دل کی ساری دھول
خزاں جو تھی پلٹ گئی
بہار مسیح آ گئی
خوش رنگ حسیں پھولوں کی
ہر سمت چادر چھا گئی
دن حسین ہو گئے
شامیں جگمگا اٹھیں
اک صرف تیرے نام سے
بہار اللہ کے آ گئی
دل میرا کھلا گئی

اسما ناصر

(گھریلو خاتون)

1: موسم بہار بذاتِ خود اپنے اندر ایسی تازگی اور دلکشی لیے ہوتا ہے کہ اس کے سارے ہی رنگ دل کو بھاتے ہیں۔ کسی ایک رنگ کی بات کرنا زیادتی ہوگی۔

2: پھول کسے پسند نہیں ہوتے؟ اور موسم بہار میں تو ایسے خوشنما اور شگفتہ رنگوں کے خوب صورت پھول کھلتے ہیں کہ پھولوں کی نمائش میں جانا انسان کے دل و دماغ پر خوشگوار اثرات ڈالتا ہے۔ ایک ہی جگہ پر وسیع پیمانے پر پھولوں کی کئی اقسام اور منفرد

تراش خراش دیکھنے کا جو موقع ملتا ہے وہ عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے زیادہ تو نہیں دو تین دفعہ جا کر ہم بھرپور لطف اندوز ہوئے۔

3: اب اس عمر میں آکر ہمارے دل کے گلاب کسی ایک کے لیے پوری فیملی کے لیے کھلتے ہیں۔ جس کا اثر ہماری فیملی پر بھی خوشگوار موڈ کی صورت میں پڑتا ہے۔ ہاہاہا۔ اپنی فیملی کو بھی یہی پیغام دوں گی کہ بہار بن کے رہو موسم بہار بن کے رہیں۔

انیس زہرا
(براڈ کاسٹر)

1: ویسے تو مجھے بہار کا ہر رنگ پسند ہے مگر ہم میں شوخ رنگ بہت بھاتے ہیں۔

2: پھولوں کی نمائش میں ایک دو بار گئی ہوں تو وہاں جا کر دل و دماغ کے ساتھ ساتھ نگاہوں کو بھی تراوٹ محسوس ہوتی اور انواع و اقسام کے خوب صورت پھولوں کی خوشبو سے قوت شامہ کو بھی اچھا محسوس ہوا۔ تمام پھول اللہ کی قدرت اور صناعی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جنہیں دیکھ کر بے ساختہ دل سے نکلا کہ ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' اور جب میں پھولوں کی نمائش میں نہیں جا پاتی تو ارد گرد کھلتے پھولوں کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔

3: ظاہری بات ہے اپنے شریکِ حیات کے لیے

کھلتے ہیں اور ان کے لیے پیغام یہی ہے کہ میری زندگی میں بہاروں کے رنگ بھرتے رہیں۔

فہمیدہ جاوید
(پاکیزہ قاری، تبصرہ نگار، مراسلہ نگار)

1: ہر رنگ اور پھول کی اپنی خاصیت ہوتی ہے۔ موسم بہار میں تمام رنگ بھاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر خدا کی نعمتوں پر غور و فکر کرنے کا دل چاہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں جب دنیا میں اتنے حسین رنگ اور موسم ہیں تو جنت تو پھر دنیا سے اچھی ہوگی۔

2: جی اتفاقیہ طور پر پھولوں کی نمائش دیکھی۔ ایک بار اپنی نند کے گھر سے شوہر کے ساتھ واپس آرہی تھی تو راستے میں شوہر نے کہا ''دیکھو'' اور ہم پھر باغ میں گئے تو ہر طرف مختلف قسم کے رنگ برنگے پھول اپنی دلکش خوشبو کے ساتھ باغ کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے جو باغ کی انتظامیہ کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ درختوں اور گھاس کو مختلف ڈیزائن کی شکل کے ساتھ چمکتی لائٹوں سے سجایا ہوا تھا۔

3: شوہر، اولاد، دوسرے خونی رشتوں اور میری پاکیزہ کے لیے کھلتے ہیں۔ پاکیزہ ہر ماہ میرے لیے ... کے لیے شعر ہے کہ

[illegible]

☆

بلاشبہ بہار کا ہر رنگ دلفریب اور قدرت کا کرشمہ ہے۔ عزیز بہنو! پھول کھلنے کے موسم میں دل کے گلاب کھلنے کے لیے عمر نہیں جذبہ اہم ہوتا ہے جو ماہ و سال کی مسافت سے گرد آلود نہیں ہوتا بلکہ ان میں پہلے سے بڑھ کر شدت آجاتی ہے اور پھولوں کی نمائش ہو یا گھر آنگن میں کھلتے دل پذیر پھول تمام کے تمام لطیف احساسات سے معمور ہو کر دل کو شاد ہی نہیں شاداب بھی کر دیتے ہیں ایسے میں اپنوں سے ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی جشن بہار دل کے منائیں گے آج ہم اور کیا ہی اچھا ہو کہ دلوں سے باہمی کدورتیں ختم کر کے بہار رت کو خوش آمدید کہتے ہوئے بہار رت میں شاداب پھولوں کے مانند کھلے رہیں، آمین!

☆☆☆

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

تمام حمد و ستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کر دے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش و عنایات پائیں۔ (الہٰی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری پاکیزہ بہنو! سلام اور پُرخلوص دعائیں۔ ماہ مارچ میں جیسے سبزہ ہر طرف پھیل جاتا ہے اسی طرح ہماری دعا ہے کہ یہ وبائی مرض ختم ہو اور صحت و تندرستی ہر طرف پھیل جائے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی یہ وبا ختم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب پر رحم کرے۔ (آمین)

فروری کے شمارے میں طیبہ عنصر مغل بھی کا آب خورہ لے کر آئیں اور بہنوں سے پسندیدگی کی سند حاصل کی۔ طیبہ عنصر مغل نے بہت مہارت سے بڑے مشکل موضوع کو قلم بند کیا۔ اتنے مشکل موضوع پر لکھنا کمال ہوتا ہے۔ طیبہ اتنا اچھا لکھنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد۔

نزہت جبیں ضیا کی تحریر نے اس دفعہ بہت سے لوگوں کو بڑی اہم بات کی طرف متوجہ کیا اور میری نند نے ان کا افسانہ پڑھ کر مجھے فون کیا کہ نزہت کو میری طرف سے دعا کہنا کہ میں بہت بیمار ہوں لیکن میری توجہ اس طرف نہیں گئی تھی۔ ان کی تحریر پڑھ کر میں نے بھی اپنے اس فرض کو پورا کیا۔ نزہت جبیں ضیا تم بہت اہم اور اچھا موضوع لے کر آئیں۔ ایسے ہی سبق آموز اور فائدے مند موضوعات پر ضرور لکھا کرو۔

حسب توقع شیریں حیدر کی یہ قسط بھی بہت پسند کی گئی۔ مجھے ذاتی طور پر ان کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ فرحین اظفر تم نے اپنی تحریر سے ان لڑکیوں کی جو کسی بھی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہیں، بہت حوصلہ افزائی کی، اس تحریر کے ذریعے...... باقی تمام تحریریں بھی بہت اچھی رہیں جس کا اظہار بہنوں نے اپنے خطوط کے ذریعے کیا۔ اسی لیے ہمیشہ بہنوں کی رائے کا انتظار رہتا ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں پتا چلتا ہے کہ تحریریں کیسی تھیں۔

اچھا بہنوں اب بشرط زندگی اگلے شمارے میں ملاقات ہوگی۔

اللہ نگہبان، دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

پیاری بہنو...... حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی دیرینہ دوست، شاعرہ، سماجی کارکن ہما بیگ نے اپنے شہید بیٹے ولید بیگ کے خوابوں کو عملی جامہ اس طرح پہنایا کہ مستحق اور نادار خواتین کے لیے نرسری، کراچی میں سلائی سینٹر کھولا ہے۔ جہاں وہ بچیوں اور خواتین کو سلائی، کڑھائی سکھانے کے انتظامات کرتی ہیں اور وہ بچیاں اور خواتین اس کے ذریعے روزگار کمانے کے قابل ہو رہی ہیں۔ (اللہ ترقی دے، ماشاء اللہ بہت اچھا کام کر رہی ہیں ہما)

☆ پاکیزہ کی قاری و تبصرہ نگار اور شاعرہ افتخار شوق کی بہن ماہ نور شوق کی شاعری کا مجموعہ تیرے بعد بی ایچ پرنٹرز، لاہور کے سینٹر سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کا انتساب والدین کے نام کیا ہے۔ بہت خوب صورت سرورق سے مزین اس کتاب کی قیمت صرف 300 روپے ہے۔ کتاب کے حصول کے لیے یٰسین بک سینٹر عبدالحکیم، خواجہ بک سینٹر سرکلر روڈ میاں چنوں سے فون نمبر 03006326463 پر رابطہ کریں۔

☆ اس ماہ پاکیزہ کی رائٹر مدیحہ شاہد کی سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ ان دنوں نزہت اصغر کی طبیعت کچھ ناساز ہے تو آپ سب بہنیں ان کی صحت و تندرستی کے لیے دعا کریں کہ پروردگار انہیں صحت کلی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ، مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کی طبیعت ان دنوں کافی خراب ہے...... بہنوں سے خصوصی دعائے صحت کی گزارش ہے۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری اور مراسلہ نگار بہن روحی صبا کراچی پچھلے دنوں ہیپاٹائٹس اور یرقان کے مرض میں مبتلا رہیں۔

انتقالِ پُرملال

☆ گزشتہ ماہ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، مراسلہ نگار فریدہ افتخار کے شوہر کی برسی کے سلسلے میں فاتحہ خوانی و قرآن خوانی کی گئی۔ اللہ پاک مغفرت کرے...... آمین!

☆ اختر شجاعت کے ماموں مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی قاری و تبصرہ نگار نسیم کوثر کے شوہر کی اس ماہ بارھویں برسی ہے۔ پروردگار مرحوم کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رفیعہ ابدالی کے بڑے بھائی سید محمد رضی ابدالی کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ رفیعہ دیگر اہلِ خانہ شدید غم کی حالت میں ہیں۔ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

☆ گزشتہ ماہ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار بہاول نگر کی پروین افضل شاہین کے بیٹے محمد اسلم شاہد، کراچی میں وفات فرما گئے۔ دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے پیارے خطوط کی طرف۔

✉ فریدہ ہاشمی گل، کراچی سے۔ ”رسالہ پابندی سے اور بہت جلدی مل جاتا ہے۔ سب سے پہلے اختر بہن اتنے خوب صورت اور دل پذیر انداز میں لکھتی ہیں کہ الفاظ سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ اور موضوعات بھی بہت چن کر لاتی ہیں، بہت شکریہ اختر بہن۔ خدا آپ کے علم میں اور اضافہ عطا فرمائے اور یونہی ہم لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں، آمین۔ دونوں ناول بھی دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں، روحیلہ خان کا ناول بڑا اچھا لگا۔ شرجیل کا انجام بہت خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے۔ سب خدا کی توفیق کی بات ہے۔ زندگی دھوکے بازی میں گزری مگر وقتِ آخر کلمہ پڑھ کر گویا جنت کا پروانہ مل گیا۔ ہر مسلمان کے لیے یہی دعا ہے کہ کلمے پر خاتمہ ہو۔ اتنی اچھی سوچ پر روحیلہ خان کو شکریہ کہہ دیں۔ اسما طاہر کا ناولٹ بھی خوب رہا۔ پہاڑی علاقوں کی خوب صورتیوں اور مشکلات کے ساتھ محبتوں کی دلکش کہانی ہے۔ نزہت جبیں ضیا کی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ ایک حقیقت کا بیان ہے جس پر کم ہی دھیان جاتا ہے۔ مگر بہت ضروری ہے کہ اپنی زندگی میں ہی جائداد کا بٹوارہ کر دیا جائے چاہے وہ زمین اور مکان کی شکل میں ہو یا زیورات و نوادرات کی شکل میں۔ یہی بات بہن نے بہت عمدگی سے اپنی کہانی میں بیان کی ہے۔ شیریں حیدر، بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

اگلی قسط کا انتظار ہے۔ سحر ساجد تو ہمیشہ ہی اچھے خوب صورت سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ اس بار بھی سیجا نے دل خوش کر دیا۔ ناول مٹی کا آب خورہ بھی پسند آیا۔ بہت اچھی بات کی ہے کہ محبت بھی رزق کی طرح ہوتی ہے۔ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ نہیں ملتی۔ فرحین اظفر ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں مگر اس بار کہانی بہت سبق آموز ہے۔ عنایت آپا کا کردار بہترین تھا۔ جو ساس بن کر بھی ماں جیسا رویہ اختیار کر رہی تھیں۔ بہت اچھی بات مردوں کے بارے میں بتائی۔ سیما رضا ردا اور شازیہ انوار سے تعارف بہت اچھا لگا۔ خوب صورت سوالات کیے گئے جس کے خوب صورت جوابات دیے گئے۔ ماشاء اللہ ہماری بہن بڑی لائق و فائق ہیں اور بڑے بلند پایہ خیالات رکھتی ہیں جس کا اظہار افسانوں، ناولوں اور ذاتی تعارف میں ہوتا ہے۔ خدا سب کو سلامت رکھے۔ آمین۔ پاکیزہ ڈائری میں اقتباسات اور شاعری بہت اچھی رہی۔ خاص کر ذکیہ بہن کی نظمیں تو بہت ہی پُر اثر ہوتی ہیں۔ جنوری کے پرچے میں میری نظم اور خط دونوں موجود تھے۔ شکریہ آپ کی محنت کا۔ اداریہ ہر بار بہت عمدہ ہوتا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے، آمین۔ سب بہنیں میری دعاؤں میں شامل ہوتی ہیں۔ جب سے رسالہ باقاعدگی سے پڑھنے لگی ہوں ایسے ہی ہم لوگ ایک فیملی کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ ایک الفت سی ہو گئی ہے۔ یقین کریں معراج صاحب بھی دعاؤں میں یاد رہتے ہیں اور آپ سب کی خیریت کی بھی دعا کرتی ہیں۔ لوگ نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ اللہ ہم سب کو نیکی کرنے والا اور اپنا شکر گزار بندہ بنائے رکھے۔ الٰہی آمین۔" (فریدہ آپ بھی ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔)

☆ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے "میرے میاں پچیس جنوری کو کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ میرے بیٹو کی تیمارداری کرتے رہے مگر اللہ نے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ہر جوڑ ہی پڑتا ہے۔ میں جنوری نومبر خالق حقیقی سے جا ملے۔ انکل معراج رسول وجدا ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ میں تمام پاکیزہ بہنوں سے گزارش کروں گی کہ وہ اول آخر درود شریف اور ایک بار سورۂ فاتحہ تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر میرے بیٹو اور انکل معراج رسول کے لیے تحفہ میں بھیج دیں۔ عذرا آپی آپ نے اداریے میں فرمایا ہے کہ معراج انکل کارکنان ادارہ کے ساتھ ساتھ تمام قلم کاروں، نامہ نگاروں، قارئین سے کا ہے بگاہے رابطے میں رہتے تھے، ان کی آراء مشورے، تجاویز، تنقید کو خوش دلی سے سنتے تھے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ عذرا آپی! میں نے معراج صاحب کے لیے اول و آخر درود شریف ایک بار سورۂ فاتحہ تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر تحفہ بھیج دیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نند فریدہ جاوید فری، امینہ عندلیب، حبیبہ عنبر مغل کو صحت دے، آمین۔ عذرا آپی جانے والے چلے جاتے ہیں مگر ان کی یادیں ہمیشہ سے ہمارے ذہنوں میں تازہ رہتی ہیں۔ جتنی سانسیں ہماری لکھی ہیں ہمیں اتنی ہی سانسوں میں جینا ہو گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم پانچ وقت نماز پڑھیں.... کلام پاک کی تلاوت کریں اور مرحومین کی بخشش کی دعا کریں۔" (جی بالکل)

☆ سعدیہ رحیم، کراچی سے "سال 2021ء کا آغاز ہو چکا ہے اور میں سدا کی کاہل پورا سال خط لکھنے کا سوچتی رہ گئی۔ شاید گزشتہ سال کی تباہ کاریوں، خراب حالات اور بری خبروں نے خوشی، اطمینان اور امنگ چھین لی ہے۔ کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا۔ بہت سے کام التوا میں پڑے رہ جاتے ہیں۔ اب دعا ہے کہ نیا سال سب کے لیے سلامتی اور خیر لے کر آئے۔ (آمین) فروری کے پاکیزہ میں جناب معراج رسول کی دوسری برسی کا پڑھا تو حیران رہ گئی اتنی جلدی دو سال گزر گئے۔ کل کی بات لگتی ہے کہ جب عذرا رسول بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ مجھے وہ منظر نہیں بھولتا۔ میں نے پہلی بار انہیں روتے دیکھا ورنہ وہ ہمیشہ ہنستی مسکراتی نظر آتی تھیں۔ میاں، بیوی کا رشتہ تو ویسے بھی بہت گہرا ہوتا ہے برسوں کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ دکھ سکھ کے ساتھی بچھڑ جاتے ہیں تو دل کی جو حالت ہوتی ہو گی عذرا رسول اس کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ انہی دنوں پاکیزہ کی سابقہ مدیرہ انجم انصار کے شوہر کی وفات کی خبر ملی تھی آگے پیچھے کئی خبریں..... اور اب تو ہر طرف سے یہی خبریں سننے کو ملتی رہتی ہیں۔ بہر حال جانا تو سب نے ہی ہے ایک دن مجھ سمیت بس اس کا کرم رہے اور کیا چاہیے۔ اس بار میں خاص طور پر تمام قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جنہوں نے میرے ناول۔ میں انمول کی پذیرائی کی اپنے تئیں میں نے پوری کوشش کی کہ ایک اہم مسئلے کو ہلکے پھلکے انداز میں نمایاں کروں۔ بہت سی بہنیں الجھ گئیں کہ ناول سمجھ میں نہیں آ رہا تو ان سے یہ کہنا ہے کہ جس طرح عام زندگی میں کسی انسان کا کردار آہستہ آہستہ دوسروں پر کھلتا ہے اسی طرح کہانی بھی آہستہ آہستہ واضح ہوتی ہے۔ سب کچھ ایک دم سے کھول کر فوراً ہی سامنے لے آؤ تو کیا مزہ رہے گا اس میں اور اسی میں قاری کی دلچسپی بھی بڑھتی ہے اور تجسس بھی سامید ہے کہ اینڈ تک پوری کہانی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ اس کے علاوہ انجام میں اگر کمی محسوس ہوئی ہے تو اس کے لیے یہ کہوں گی کہ طوالت کی وجہ سے واضح نہ کیا ویسے بھی شمع اور یوسف کی ناکام اور ناہموار زندگی ہم میں سے کئی سے چھپی نہیں رہی تھی چونکہ انمول ناول کی ہیروئن اور مرکزی کردار ہے اس لیے انجام میں اسی پر فوکس کیا گیا۔ سو فیصد نمبر ملنے پر

جو خوشی ہوئی وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میرا مقصد پیغام پہنچانا تھا جسے آپ سب نے بہت اچھی طرح سمجھا۔ آپ سب کی تعریف سے محبت وصول ہوگئی۔ جزاک اللہ...... (بہت خوب صورت وضاحت دی سعدیہ) پاکیزہ میں تمام مصنفات بہت اچھا لکھ رہی ہیں ماسوا بھی چند ایک کہانیوں کے تقریباً سارے ناول اور افسانے اچھے، بامقصد اور معیاری ہوتے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں سدا بہار رونق دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نزہت بڑے خلوص اور اپنائیت سے سب بہنوں کو وقت اور توجہ دیتی ہیں۔ میں پہلے کہانی پڑھوں نہ پڑھوں سب کے خطوط ضرور پڑھتی ہوں۔ (یہی تو محفل کی خاص بات ہے) شمع ہدایت اپنی طرز کا منفرد سلسلہ ہے۔ اختر شجاعت کے لیے بہت داد...... روحانی مشورے بھی اچھا سلسلہ ہے۔ دعاؤں اور وظائف سے بہت سی بہنوں کو رہنمائی اور آسانی ملتی ہوگی۔ صدقہ جاریہ بھی ہے، ثواب کا ثواب اور لوگوں کو مسائل کا حل بھی مل جاتا ہے۔" (بہت شکریہ خط کافی عرصے بعد لکھا ہے، کبھی کبھی اپنی ماہرانہ رائے رسالے پر دیا کرو)

☆ مسکی غزل، کراچی سے۔ "پاکیزہ پڑھا جلدی آنے کا بھی فائدہ ہے کہ سکون سے پڑھ لیا جاتا ہے۔ خاموشی پر اختر شجاعت نے خوب لکھا اور مجھے بھی تھوڑا سبق مل گیا کہ میں بولتی بہت ہوں مگر آج تک کسی نے ٹوکا نہیں بلکہ یہی کہا کہ آپ اردو بہت بامحاورہ بولتی ہیں۔ (میاں مٹھو بننے کا قطعی شوق نہیں) اب کوشش کروں گی کہ **Silience is gold** پر عمل کرسکوں...... (بہت خوب) اب آتے ہیں افسانوں کی طرف سب سے پہلے خولہ سعید سے معذرت شاید انہوں نے میرا تبصرہ غور سے نہیں پڑھا جس میں ابتدا ہی اس جملے سے کی کہ "میں اسے نقل ہرگز نہیں کہہ سکتی۔" پھر میرا افسانہ پاکیزہ میں نہیں 2009ء میں ہر دا میں چھپا تھا سنی سنائی نہیں سچی کہانی جب لڑکی سے کہا گیا کہ اپنے شوہر کی شکل دیکھ لو تو اس نے جواب دیا۔ "یہ میرے لیے نامحرم ہیں کل گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے مجھے طلاق دے دی تھی۔" وہ ڈائجسٹ اب بھی میرے پاس ہے...
بہرحال یہ بحث اب ختم ہوگئی مزید اس موضوع پر بات کرنا فضول ہے۔ (ہاں فضول بحث ہے مماثلت تو ہوتی رہتی ہے) میرا اسارا زنگ اتار دو، اب طوالت کی وجہ سے مزہ نہیں دے رہا۔ عروج کشتی کا اصل اور نقل بامعنی اور زبردست۔ نیلی آنکھوں نے زیادہ مزہ نہیں دیا۔ وادی گم، اسماء طاہر کا لاجواب منظر کشی دلفریب اور اینڈنگ زبردست۔ نزہت جبیں ضیا کی تحریر دل جو کہتا ہے، بامعنی اور بامقصد میری فیملی میں ایک ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ نزہت نے بڑی اچھی نشاندہی کی ہے۔ سحر ساجد کا مسیحا بھی اچھا لگا۔ ہما علی کا اب دہائی ملے گی تو ماں کے جذبات کی سچی ترجمانی اور عکاسی ہے انہوں نے ہر ماں کو پورٹرے کیا ہے۔ طیبہ عنصر مغل بہت اچھی رائٹر ہیں مگر افسانے کی طوالت اور پھر اتنے سارے کردار میرا تو دماغ ہی گھوم گیا مگر مجموعی طور پر اختتام اچھا تھا۔ فرحین اظفر کا یہ جملہ سارے افسانے کا نچوڑ ہے کہ "یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔" اور اس میں کوئی شک نہیں...... شازیہ انوار کا انٹرویو بہت اچھا لگا کس قدر ہمہ صفت موصوف، متحرک اور بے حد توانا اور مضبوط کاش ہر عورت ایسی ہی جیدار اور محنتی ہو جائے۔ عذرا رسول نے ادرک کے حلوے کی ترکیب خوب بتائی اس میں اضافہ میں کر دیتی ہوں...... (میری امی نے شادی کے کافی بعد بتایا تھا۔) آٹا نہ ڈالیں، چاروں مغز اور تمام میوہ جات کے ساتھ کھجور ضرور ڈالیں۔ سردی میں زیادہ کھائیں، ساتھ ہی ادرک کو دودھ میں گلائیں اور پھر گھی میں بھونیں کڑواہٹ کم ہو جاتی ہے آزمایا ہوا ہے۔" (واہ بھئی آپ نے بھی آزمایا ہے)

☆ ثمینہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ "سال نو کا پہلا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ دل کو بے حد بھایا۔ اور دل سے... بے ساختہ یہ دعا نکلی کہ نیا سال تمام عالم اسلام اور پاکیزہ بہنوں کے لیے بے حد مبارک، خیر و عافیت اور کورونا وائرس جیسی خطرناک وبا کے خاتمے کا سال ہو، آمین یا رب العالمین۔ نزہت اصغر صاحبہ کا اداریہ اپنے موضوعاتی اعتبار سے بہت بہترین اور پُر اثر ہوتا ہے نزہت اصغر صاحبہ اتنا بہترین لکھنے پر مبارک باد کی مستحق ہیں (بہت شکریہ) اور بہن اختر شجاعت صاحبہ کا ذو...... قرب الٰہی پر لکھا مضمون دل میں گھر کر گیا۔ بہت ہی ایمان افروز تحریر تعریف سے بالاتر ہے اتنے بہترین انداز میں لکھتی ہیں کہ لگتا ہے چاروں طرف علم و آگہی کی روشنی پھیل گئی ہو۔ ایسی سحر انگیز تحریر لکھنے پر اللہ تعالیٰ انہیں صحت و شفائے کاملہ والی زندگی کے ساتھ جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔ ریحانہ اعجاز صاحبہ، لاک ڈاؤن اور لاڈلے کی شادی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ وہ آئے بزم میں، نزہت اصغر صاحبہ کے ساتھ سیما رضا ردا سے ملاقات مع تصاویر دل کو بہت بھائی۔ میرا اسارا زنگ اتار دو، افشاں آفریدی اور میں عشق ہوں، نایاب جیلانی صاحبہ دونوں ناول بہت بہترین انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ روحیلہ خان صاحبہ کا ناولٹ بوجھ اچھا لگا اس کا اختتام۔ میں اور قارہ، محبت سیما صاحبہ کی تحریر اچھی لگی۔ سعدیہ عمیس، میں ناسول کا اختتام بہت ہی بہترین اور اچھا لگا۔ فرحین اظفر صاحبہ کے عورت لی لحاظ تو ہمیشہ ہی اپنے تحریری لحاظ سے دل کو بھا جاتا ہے۔ باقی تمام رائٹرز کے افسانے بھی بہت اچھے لگے۔ معراج بھائی

صاحب کی دوسری برسی کے بارے میں یہی کہوں گی کہ معراج بھائی کی کمی ہمیشہ رہے گی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس دنیا سے جانے کے بعد بھی ان کے نام و مقام میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ان میں سے ایک نام معراج بھائی صاحب کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں بہت ہی اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ پیاری بہن عذرا صاحبہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور بہت سی خوشیاں ہمیشہ آپ کی منتظر ہوں۔ اللہ پاک معراج بھائی صاحب کے درجات بلند فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین یارب العالمین۔ فروری کا خوب صورت سا ٹائٹل آنکھوں کو بھلا لگا۔ نزہت اصغر صاحبہ کا اداریہ معراج رسول صاحب کے بارے میں پڑھ کر دل بہت اداس ہو گیا اور معراج بھائی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح دین کی باتیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی پڑھ کر ایمان کو تازہ اور دل و روح کو سرشار کیا۔ خاموشی... وجدان الٰہی اختر شجاعت صاحبہ کی تحریر کے کیا کہنے ہر جملہ قابلِ تعریف اور جیسے سیپ میں موتی ہونے کے برابر ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو بلا مقصد بولنے سے نجات دیں تاکہ ہماری نیکیوں میں اضافہ ہو، آمین۔ اختر شجاعت صاحبہ کو جزائے خیر عطا ہو اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ شائستہ زریں صاحبہ، پاکیزہ کے مہمان، شازیہ انوار صاحبہ سے ملاقات زبردست رہی۔ گوشہ ظرافت میں مشتاق یوسفی صاحب کی کتاب سے اقتباس اچھا لگا۔ ناول دونوں میں عشق ہوں اور میرا اسرار زنگ اتار دو، بہت خوب صورتی سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ شیریں حیدر صاحبہ کا وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا، ناولٹ کا دوسرا حصہ بھی بہت اچھا لگا۔ وادی گل، اسما طاہر اور مسیحا سحر، ساجد بھی بہترین لگے۔ حبیبہ منصور مغل صاحبہ کی آب خورہ اچھی تحریر تھی مکمل ناول کی صورت میں۔ فرحین اظفر صاحبہ کی ع عورت م ماضی کہانی اچھی لگی۔ عروج فاطمی قدیر، اصل و نقل میں رشتوں کے اصل و نقل کو ظاہر کرتا اچھا افسانہ تھا۔ دل جو کہتا ہے، نزہت جبین ضیا صاحبہ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ ساحل کی قسم مت طوفان کریں گے، سلمیٰ غزل صاحبہ، ہما علی، اب رہائی ملے گی، نیلی آنکھیں حور یہ بتول شفا سعید، ہمارے حصے کی خوشی تمام افسانے اچھے لگے۔ عذرا آپی کو خلوص بھرا اسلام کچھ باتیں اپنی بہنوں سے۔ ان کی باتیں اچھی لگیں اور ادرک کے حلوے کی ترکیب پسند آئی۔ اللہ پاک عذرا آپی کو صحت زندگی اور لمبی عمر عطا فرمائے اور وہ اسی طرح کچھ باتیں اپنی بہنوں سے کر کے رسالے کی رونق بڑھائیں آمین یا رب العالمین۔ بہن مسکان نور صاحبہ نے بہنوں کی محفل میں میری کمی محسوس کی یہ پڑھ کر بہنوں کی محفل کا یہ رشتہ بہت پرخلوص لگا۔ میری نواسی پی سائرہ پردہ دین کا تحفہ بھیجنے کا بھی بہت شکریہ جزاک اللہ... پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں، خوش ذائقہ، بزم پاکیزہ، روحانی مشورے، حسن نکھارئیے بھی سلسلے خوب سے خوب تر ہیں۔ تمام بیمار بہنوں کے لیے دست دعا بلند ہیں اللہ پاک ان کو مکمل شفا و صحت یابی سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔ تازہ تازہ گرمیوں میں سب کو اپنی خوشیاں مبارک ہوں...... انتقالِ پُرملال میں جن کے نام ہیں ان کی مغفرت کے لیے دعا ہے اور ان کے لواحقین کے لیے صبر عظیم کی دعا ہے۔ تمام بہنوں کو سلام اور خلوص بھری دعائیں اللہ تعالیٰ پاکیزہ کی ترقی میں مزید اضافہ فرمائیں آمین یا رب العالمین.....'' (مستقل تبصرے کا شکریہ اور آپ بھی سب کی دعاؤں میں شامل ہیں)

روحیلہ خان، کراچی سے۔ ''پاکیزہ کو چلانے والے، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے بہت دعائیں اور پیار۔ وقت کس قدر تیز رفتاری سے گزرتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ جب جنوری کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو 2021ء کی دستک بڑی زور سے سنائی دی کہ پچھلے برس کی یادیں ہی ایسی تھیں کہ کیا کہنا..... پر یہ تو زندگی کا دستور ہے آنا اور جانا لگا رہتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ ناولٹ، بوجھ، ایک کہانی نہیں ہے، اس میں سچائی پوری طرح سے شامل ہے۔ البتہ کہانی کے رنگ ڈال دینے سے پڑھنے والوں کے لیے یہ کتابی بن گئی میری کوشش نہیں ہوتی بلکہ یہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ بچپن میں ہی اس سچی کہانی کو اپنی مہرین باجی (مرحومہ) کے کہنے پر لکھا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ ایک طویل عرصہ کہانی لکھنے سے دور رہی اور اخبار کے کالمز سے ایسا جڑی کہ بھول ہی بیٹھی کہ زندگی میں کہانی لکھنے کا بھی شوق ہوا کرتا تھا۔ بہن مرحومہ کا کہنا تھا کہ تم بہت عرصے سے کچھ نہیں لکھ رہیں، ان کے کہنے پر دوبارہ لکھنا شروع کیا پہلے ایک آدھا افسانہ اور پھر اب ناولٹ، شکر ہے خدا کا کہ میری پیاری بہنوں نے اسے پسند کیا۔ ان تمام پڑھنے والی بہنوں کا بہت شکریہ کہ انہوں نے تبصرے کیے۔ پڑھا اور حوصلہ دیا۔ دراصل کالمز اور انٹرویوز کرتے عادت سی بن گئی کہ لمبا چوڑا منظر نامہ نہیں کھینچ سکتی پھر بھی اس مختصر کو ہی ہم نے بہت جانا طوالت کہانی کی مجبوری تھی۔ اپنے لکھے پر تبصرہ کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ قرۃ العین سکندر کا سالِ نو مبارک، پڑھا اچھا لگا۔ ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں جب اپنے طعنوں، تشنوں پر اتر آتے ہیں تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ نگہت سیما کا مکمل ناول میں اور فارہ بھی اچھا لگا۔ ایسے جیسے سرد گوشت کی ہدایات میں کوئی ڈراما دیکھ رہے ہوں۔ (واہ بہت خوب کہا) تسلیم شیخ کا

نیا سال دوستوں کے سنگ...... نیا ہی تھا کچھ ہلکا پھلکا سا۔ شیریں حیدر کا ناولٹ وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا، سچ ہے کہ شباب کیرانوی کا نام دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئے کہ نئے دور کے لوگ کیا جانیں شباب صاحب کو...... ویسے تو ہمارے دور کے لوگ بھی کچھ اس قدر مانوس نہیں ہیں۔ البتہ ماضی کے حوالے سے بہت سے لوگوں کا تذکرہ گھر میں سنتے آئے ہیں لہٰذا شباب صاحب کو کیسے بھول سکتے ہیں کہ بہت سی یادیں جڑی ہیں بہر حال ہر دور میں ہی اچھے لوگ ہوتے ہیں سرورق پر ماڈل سدرہ کی تصویر کے ساتھ موسیٰ رضا کا نام...... طالب علمی کے دور سے ان کے ساتھ کچھ کام کیا ہے میگزین کے حوالے سے وہ بہت اچھے اور مددگار بھی ہیں۔ شیریں حیدر کے ناول کے تبصرے سے کہاں جا پہنچے۔ اندازہ تو ہو رہا ہے کہ کہانی مضبوط ہے...... ابھی اتنا کچھ پڑھ نہیں پائی۔ ایک اور بڑی رائٹر کی کہانی پڑھی تھی اس کا نام ایک بار گرت ہیں ہے۔ ویسے تو ماشاءاللہ ساری رائٹرز بہت اچھا اور پر ہی لکھتی ہیں لیکن میں ناقص عقل کے مطابق اس طرح کے نام نہ ہی رکھے جائیں تو اچھا ہے۔ میری اپنی اردو اور انگریزی بس گزارے لائق ہی ہے لیکن میری دو بڑی بہنیں ماشاءاللہ زبردست ہیں۔ ان کے لیے پیارے، پیارے نام رکھ لینا بہت آسان ہے۔ فصیح باری، آصف الیاس اور سیما رضا دو تینوں ہی بہت پیارے اور خوب صورت لوگ ہیں ان کے انٹرویوز اچھے تھے۔ سیما رضا اور آصف الیاس کی ترقیاں دیکھ کر سیروں خون بڑھتا ہے۔ رب العزت میرے سارے بہن بھائیوں کو بہت عزت اور ترقی دے، آمین...... وہ تمام لوگ جو بہت اپنے تھے پچھلے برس ان کے ہو گئے جن کی ساری دنیا ہے ان سب کے درجات کو رب العزت بلند فرمائے، آمین۔ اگر میرے کسی لفظ و عمل سے کسی کو کوئی تکلیف یا اذیت پہنچی تو اس کے لیے معذرت...... آج کل کورونا کی وبا کے باعث دعائیں اب یوں ہو گئی ہیں کہ خدایا ہم اور ہمارے عزیز و اقارب گھر والے اور جنہیں ہم جانتے ہیں اور جنہیں نہیں جانتے ان سب کو وبائی امراض سے محفوظ رکھیے اور جو اس میں مبتلا ہیں انہیں جلد شفا دیجیے۔ زمانے کی تیز رفتار دوڑ میں ارد گرد کی زندگی اور لوگ ویسے ہی کچھ زیادہ تیز چلنے لگے تھے کہ محبت، خلوص، اپنائیت اور رکھ رکھاؤ کم سا ہو گیا ہے کہ کورونا نے کچھ اور دوریاں اور مہنگائی پیدا کر دی بہر حال زندگی کا سفر تو پھر بھی رواں دواں ہے۔ (جی بالکل)۔ خدا سے دعا ہے کہ پسند بھی آئے اور پاکیزہ کی مقبولیت کو چار چاند لگے جو اتنے پیارے سب کو یاد رکھتا ہے۔" روحیلہ بہن ایک عرصے بعد محفل میں شرکت کا شکریہ...... اب ایک کہانی کے بعد دوبارہ کالم کی طرف مت چلی جانا...... تم نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا سب کی الگ، الگ رائے ہوتی ہیں اور یہی اس کی خوب صورتی ہے جس سے بہت کچھ بھی سیکھنے کا موقع ملتا ہے)

روحی صبا، کراچی سے۔ "جنوری کا پاکیزہ بھی میرے سامنے ہے مگر پہلے دسمبر کے شمارے میں شائع اک کہانی ہمیں بھی جینے دو...... کے بارے میں اک بات، عطیہ ہدایت اللہ کی تحریر بہت پسند آئی۔ جانے کتنے گھروں کی کہانی تھی۔ بس آخر میں چند الفاظ بہت نامناسب تھے کہ جب حسن شاہ بیٹے کو شادی کی اطلاع دے کر کہتا ہے کہ ستارہ تو ہماری ملازمہ ہے میں اتنا گھٹیا نہیں کہ اک ملازمہ سے شادی کر لوں۔ مصنفہ سے اتنا کہنا ہے کہ ملازمہ سے شادی برائی نہیں بلکہ نیکی ہے ہاں اس پر ظلم کرنا، بری نظر رکھنا گناہ ہے۔ میرے خیال میں اسے ڈاکٹر سے شادی کے بجائے ستارہ سے کرنی چاہیے تھی جو اتنی خدمتیں کر رہی تھی۔ (ارے ستارہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی اس کی خدمت بے لوث تھی) جنوری کے پاکیزہ میں سب سے پہلے میرا اسارا زنگ اتار دو پڑھا۔ بہت پیاری تحریر ہے بس مصنفہ سے گزارش ہے در مکنون کا رویہ عکرمہ سے خراب نہ کرے پلیز ― بوجھ روحیلہ خان نے بہت اچھا لکھا۔ بیچاری مینی کو کافی آزمائشوں سے گزرنا پڑا مگر شکر ہے اینڈ اچھا ہوا شاباش روحیلہ...... سال نو مبارک بھی بہترین تھی اور عورت کہانی تو ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے اس دفعہ بھی فرزین نے بہت اچھی تحریر دی۔ اختر شجاعت صاحبہ نے بہت آگاہی دی دینی معلومات بہت خوب صورت طریقے سے دے رہی ہے، مجھے تو اب بھی مہمانوں کے بارے میں اور مال کی محبت کے بارے میں ان کے الفاظ یاد ہیں کاش کوئی کچھ سیکھے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، آمین۔ شاعری کا معیار بہت بہتر ہو گیا ہے۔ شروع سے اچھا تھا مگر بیچ میں تھوڑا سا کم ہوا اب ماشاءاللہ کافی محنت ہو رہی ہے اس پر...... (بہت شکریہ) ارے ہاں سیما رضا کا انٹرویو بہت، بہت پسند آیا۔ مجھے تو نہیں پتا تھا اتنی پیاری ہستی کی سوچ بھی اتنی پیاری اور اچھی ہے میرا اسلام کہیے گا ان کو (ہاں ضرور) دعاؤں میں یاد رکھیں اور واقعی یاد رکھیں ہاتھ اٹھا کر جب اپنے لیے اپنے پیاروں کے لیے دعا مانگیں تو روحی کا نام بھی لیں کیا پتا میرے نصیب کی خوشیاں آپ کے ہاتھ اٹھانے کی منتظر ہوں۔ خوش رہیں کامیاب رہیں، اللہ آپ سے راضی ہو۔ الٰہی آمین......" (ضرور دعا کریں گے سب قارئین ہمارے دل و جان کی طرح ہیں بہت دنوں بعد آئیں۔ اب آتی رہنا...... اللہ تمہیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا کرے آمین)

☆ زیبنا حسن، کراچی سے۔ ”پیاری نزہت یہ خط میں نے ستمبر 2020ء میں لکھا تھا مگر اپنی طویل علالت کی وجہ سے پوسٹ نہ کروا سکی۔ اب تو سال بھی بدل گیا ہے مگر میرے جذبات میری عزیز ہستیوں تک پہنچا دیں تو بہت ممنون ہوں گی۔ (جی ضرور) آہ! ابھی ہما بیگ اور شائستہ اعجاز کا دکھ جس نے دل کو پھاڑ ڈالا تھا روز اول کی طرح تازہ تھا کہ ستمبر 2020ء کے پاکیزہ میں عبدالرب صدیقی مرحوم کی خبر پڑھی۔ دل پھٹ گیا۔ میری پیاری انجم، جی میرے دل کے قریب بے حد قریب ... ہما بیگ کے بیٹے کی خبر پڑھ کر بھی یہی سوچا تھا کہ کاش یہ سب جھوٹ ہو اور یہ پڑھ کر بھی دل نے کہا کاش یہ نام غلطی سے شائع ہو گئے ہوں۔ مگر عذرا باجی کی طرح جو معراج صاحب کے انتقال کے بعد حتی صابر، مضبوط اور منظم طریقے سے زندگی گزار رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح میری انجم باجی بھی بہت بہادر اور مضبوط ہیں۔ میں گزشتہ چند ماہ سے بے حد علیل ہوں..... (اب تو خیر سال ہو گیا) اور خیر بیٹھ کر بستر سے نہیں اٹھ پا رہی۔ پاکیزہ میں کئی مصنفات نے ہما بیگ کو بہت صابر قرار دیا۔ حادثے کے چند دن بعد کیوں؟ وہ رو نہیں رہی تھیں، اس لیے۔ ارے، مجھ سے پوچھیں جس نے اپنی اسکول گوئنگ بچی اور ٹھیک دو سال بعد بیٹے کو کھو دیا۔ دل کی جگہ ایک زخم ہے جس سے ہر پل خون ٹپکتا ہے مگر اولاد کے اس غم نے مجھے اللہ کے اور زیادہ قریب کر دیا ہے۔ (اللہ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے) نومبر 2017ء میں اپنے محبوب شوہر کو کھو کر اپنے آٹھ اور بارہ سال کے بیٹوں کو دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اتنی سی عمر میں یتیم ہو گئے خود کو بے حد تنہا محسوس کرتی ہوں۔ انسان بھی کتنا بے وقوف ہے..... سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔ کاش میں رضوانہ پرنس کی طرح بہادر بن جاؤں ... وہ مجھے نہ جانتی ہوں مگر میں جانتی ہوں، مسکراتی۔ بے حد معصوم اور بہادر رضوانہ پرنس کو اپنی بہترین سہیلی سمجھتی ہوں جو بے حد باصلاحیت اور کامیاب (ماشاء اللہ) مصنفہ اور اسکرپٹ رائٹر ہیں اور ہمیشہ خلوص دل اور پیار سے ملتی ہیں۔ انجم باجی کی پہلی کال مجھے آج بھی یاد ہے وہ آواز، وہ انداز، الفاظ میں آج بھی نہیں بھولی ہوں۔ میرے لکھے افسانے پاکیزہ میں شائع کرنے والی انجم انصار سے میرا بہت مضبوط قلبی تعلق ہے۔ جس پر مجھے فخر ہے۔ میرا اور عذرا باجی کا بھی بہت دلی تعلق ہے۔ یہ عظیم خواتین ہیں، اب طبیعت قدرے بہتر ہے۔ میں اپنی NGO (یتیمی فلاحی تنظیم) پر کام کر رہی ہوں جو یتیموں، بیواؤں کے لیے پوری ایمانداری سے کام کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ پاکیزہ بشمول میری شفائے کاملہ کی دعاؤں کے ساتھ خدمت خلق میں بھی میرا ساتھ دیں گی۔ جنہیں مدد کی ضرورت ہے، ضرور رابطہ کریں۔ (یہ تو اچھی بات ہے، بقول زیبنا کے نمبر بھی دیتی ہیں جو آپ ہم سے معلوم کر سکتی ہیں) پیاری ہما بیگ تمہارا بیٹا شہید ہے، فخر کرو اور خوش رہو، انجم باجی شائستہ اعجاز، ہمیشہ خوش رہیں آمین۔ (بہت پیارے پرخلوص خط کا شکریہ آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ اللہ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا کرے)

☆ زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ سے۔ ”پیلا مایوں جیسا جوڑا پہنے خوب صورت سی ماڈل پر ایمان تھی۔ بہت نبیروا خوب صورت نام ہے۔ نزہت اصغر کا مجھے کچھ کہنا ہے پڑھ کر اداسی چھا گئی لیکن نئے سال کے لیے نئی امیدیں بھی جاگ اٹھیں۔ امید تو اچھی رکھنی چاہیے، ہم اصولوں پر کاربند ہو جائیں ہر بندہ یہ سوچ لے تو مشکلات ختم ہو سکتی ہیں۔ ریٹائرمنٹ جیسی کہانی بالکل سچی ہے۔ آس پاس یہی دیکھا ہے جو شخص ریٹائرڈ ہوا لوگ ادھار مانگنے سبز باغ دکھاتے پہنچ جاتے ہیں۔ اوڑھنی عورت کی عزت ہے یہی بتایا گیا ہے کہانی میں۔ مسلمان عورت کا اوڑھنی کے بغیر تصور ہی نہیں ہے تا سور..... اف پھر وہی عورت پر ظلم۔ یا حی یا قیوم ایک نصیحت آموز کہانی، ہر گھر میں ایسا دادا ہونا چاہیے تاکہ بچوں کی تربیت ہو سکے۔ ورنہ آج کل کے دادے تو پوتوں کے ساتھ ناچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عالیہ حرا نے بہت پیاری کہانی لکھی ہے۔ بہت سی معلومات ہمیں بھی حاصل ہوئی ہیں۔ ہمیں بھی جینے دو حقیقت کے قریب تر کہانی ہے جو والد بیچارے رنڈوے ہو جاتے ہیں اولادیں دوسرا نکاح نہیں کرنے دیتے اور نہ ہی خود ان کی خدمت کرتے ہیں۔ والد کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی سہولت کے لیے دوسری شادی کرے بچوں کو بھی دل بڑا کرنا چاہیے۔ نیر نعیم کا داغ اچھے ہوتے ہیں کس، کس بات کو روئیں ہمارے بچے کہتے ہیں سارے کام ڈورے مون کرتا ہے، بھیم میں طاقت ہے سب کو مار سکتا ہے۔ جھوٹ بکا یا ہوا مزہ آیا۔ اچھی باتیں بھولتے جا رہے ہیں، جھوٹ بولنا فخر سمجھتے ہیں۔ ستار العیوب واقعی اللہ تعالیٰ عیب ڈھانپنے والا ہے جس نے شایان کا پردہ رکھ لیا۔ ع عورت شکر ہے لائبہ کو ہوش آ گیا شہرت کا نشہ اتر گیا۔ یقین کا سفر پیاری کہانی تھی بچھڑے کزن مل گئے۔ سال نو کا شمارہ ملا..... سال نو کی مبارک باد ملی۔ تمہیں مبارک ... سمپل سی ماڈل پر جان جیسی ہلکی، ہلکی مسکراہٹ دل کو بھائی..... آگے بڑھے کہانی سال نو مبارک تھی۔ کہانی بڑی غمزدہ کر دینے والی تھی لیکن شکر ہے کہ آخر میں سارہ کو کنارہ مل گیا..... لڑکوں کی مائیں کتنی ظالم ہوتی ہیں بیگانی بیٹی کے جذبات کی قدر ہی نہیں ہوتی۔ کسی بیچاری ساس صاحبہ پر بہت ترس آیا۔ اتنی گھن چکر بننے کی حد بھی نکی ہی رہیں لیکن تھی

عظیم تھیں، بہو کو صاف بچالیا۔ شکر ہے، بہو کو بھی احساس ہوا۔ وہ بجر جو ہم کو لازم تھا حرے سے پڑھ رہے تھے۔ باقی آئندہ دیکھ کر بہت بدمزہ ہوئے۔ شگفتہ شفیق کی غزل بہت پسند آئی اپنی ڈائری پر نوٹ کرلی۔ (نوازش) بوجھ کا انجام بہت اچھا ہوا۔ آپ نے شرجیل کو مار کر اچھا نہیں کیا لیکن شکر ہے وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان مرا، پتا ہوتا ہے کہ یہ صرف فرضی کہانی ہے لیکن ہم قاری لوگ اس میں بہت انوالو ہو جاتے ہیں۔ کہانی کا ہیرو یا ہیروئن کسی مصیبت میں پڑ جائے تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے عینی کو اس کا نعم البدل مل گیا۔ نیا سال دوستوں کے سنگ...... بچوں کی تھوڑی شرارت سے بچھڑے ہوئے مل گئے۔ میں اور فارہ بیسٹ کہانی کی منفرد موضوع تھا۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ عورت کا لحاظ مرد کی مجبوری کو ظاہر کرتی کہانی تھی بیچارہ شوہر، بیوی کو مظلوم سمجھتے ہوئے بھی ماں کو غلط نہیں کہہ سکتا ہے شکر ہے عالیہ بیگم کو شکر سمجھ آ گیا۔" (بہت شکریہ تبصرے کا...... آپ کی کہانی کے سلسلے میں معذرت دوبارہ کوشش کریں)

٭ سمیرا انجم وحید، واہ کینٹ سے۔ "آپی دعا کرتی ہوں آپ پاکیزہ کی پوری ٹیم اور اس معیاری رسالے سے جڑے ہر فرد کو اللہ پاک اپنی حفاظت میں رکھے۔ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی دعاؤں کو اللہ پاک قبولیت کا درجہ دے۔ ہمارے ملک کو ترقی کی جانب گامزن کرے، آمین۔ حضرت عمرؓ کے اسمائے گرامی پڑھا جس میں آپؓ واقعی ایک بے مثال امین تھے۔ میرا ساراز رنگ اتار دو سلسلے وار ناول اچھا جا رہا ہے۔ قرۃ العین سکندر کا افسانہ سال نو مبارک بہت اچھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر قسمتوں کے فیصلے کسی انسان کے ہاتھ میں ہوتے تو وہ دوسروں کو جینے بھی نہ دیں۔ نیا سال دوستوں کے سنگ سبق آموز تحریر تھی۔ ماضی اچھا ہو یا برا...... ماضی کو یاد کر کے مستقبل کو خراب نہیں کرنا چاہیے بلکہ محرومیاں ختم کر کے خوشحال زندگی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ میرا ایک خواب تھا کہ پاکیزہ میں میری تحریریں شائع ہوں۔ یقین کیجیے پاکیزہ کے صفحات پر اپنی تحریریں اور شاعری دیکھ کر اتنی خوشی ہوگی کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ پاکیزہ وقت بدل رہا ہے اس بار پاکیزہ کچھ پرانی یادیں لے کر جلوہ گر ہوا۔ 22 فروری 2019 وہ دن معراج صاحب کی وفات کا دن ہم جیسے کئی ان کے چاہنے والوں اور ان کی فیملی کے لیے انتہائی اہم ہے۔ کئی چاہنے والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی عظیم شخصیت کے حوالے سے ذکر کیا۔ اللہ پاک معراج صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ (آمین) سلسلے وار ناول اچھا جا رہا ہے۔ ہمارے حصے کی خوشی افسانہ پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کالج کا دور یاد آ گیا۔ کسی کی قابلیت سے جیلس ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے کنونز صلاحیت ہوتی ہے۔ اپنی سوچ کو ہمیشہ positive رکھنا چاہیے۔ اس سے انسان کو جو خوشی اور تسکین ملتی ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ اور کچھ ابھی پڑھنا باقی ہیں۔ بہنوں کی محفل پڑھنے کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے اور اپنائیت کا احساس محسوس ہوتا ہے پاکیزہ کی ڈائری میں معیاری انتخاب موجود تھا۔ میں اکثر گنگناتی ہوں شوق سے پڑھتی ہوں۔ بزم پاکیزہ کا سلسلہ بھی مجھے بے حد پسند ہے، کوشش کریں کچھ اچھا کرنے کی یا سچ بولنے کی کیونکہ سچائی اور اچھائی ہمیشہ دنیا میں رہنے والی ہیں اور زندگی آج ہے تو کل کا بھروسا نہیں۔" (بالکل سچ کہا...... مختصر تبصرے کا شکریہ)

٭ نرگس نسیم مصاحبہ سوہدرہ سے۔ "ماہ جنوری کا شمارہ ملا دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل کی سیر کرلی یہاں ملاحظہ فرمائیں۔ جو بہنیں بیمار ہیں اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کے لیے دعا گو اور جو ہم سے بچھڑ گئے اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ آپ نے تمام بہنوں سے پاکیزہ میں کچھ منفرد سا کے بارے میں پوچھا اگر میں اپنی رائے دوں تو مثلاً آج کل نیٹ کا دور ہے کھانا پکانا، حسن سنوارنا یہ دونوں سلسلے ختم کردیں اس کی جگہ تبصرہ نگار بہنیں اپنی ذاتی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ لکھ سکتی ہیں یا اپنی زندگی کا کوئی حسین یادگار واقعہ۔ شکر ہے میں ناولز میں انھوں نے اپنے نام کی لاج رکھ لی، نیا سال دوستوں کے سنگ زبردست تحریر تھی۔ مکمل ناول میں، میں اور فارہ اس ماہ کی بیسٹ تحریر تھی۔ نرمین اظفر بھی ہر ماہ مختلف انداز میں اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپی اس بار کہانیاں کم تھیں۔ (جی افسانے کم تھے، طویل ناولٹ اور ناول زیادہ تھے اسی طرح کا امتزاج ہوتا ہے) لاک ڈاؤن اور لاڈلے کی بے ساختہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سیمار ضا روا کے پیارے پیارے خیالات جان کر دل شاد ہو گیا۔ سروے بھی زبردست تھا۔ تمام بہنوں کے جوابات پسند آئے۔ ماشاء اللہ پڑھتے، پڑھتے دوسری طرف جو نظر دوڑائی تو آگے ایک کال کی لڑکی نظر آئی۔ ارے یہ تو اپنی سیمار ضا ہے اچھا، اچھا یہ ہمارے جھنڈ (گاؤں) میں شاید نرگس بی بی کا انٹرویو کرنے کے چکر میں ہے۔ ذرا ٹھہرو سیمابی بی، میں اپنا حلیہ تو ٹھیک کر لوں۔ (واہ بہت دلچسپ نقشہ کھینچا ہے) آگے بڑھے تو شائستہ بی بی کو دیکھا، کچھ دعا کرتی ہمیں ڈرانے کو حاضر ہیں ڈر کر جھٹ، پٹ دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری تو آگے محفل کی میزبان میرے صحن میں بیٹھی تھیں۔ بمشکل ان کو بہلایا۔ شکر ہے ڈاکٹر کا کلینک نظر آیا۔ سر درد کی گولی لی تو چائے کی حاجت ہوئی۔ کیا دیکھتی

ہوں۔ ڈیئر نزہت نے پاکیزہ کے ایجنٹ کے صفحے پر قہوے کے ساتھ جو ہر جو شاندے کا اشتہار دے رکھا ہے۔ جھٹ اس سے قہوہ چھینا، پیا تو کچھ افاقہ ہوا۔ کچھ ہمت ہوئی تو...... تو کچھ لکھنے کے قابل ہوئے تو...... تو...... تو سسرالی غم کی ماریں مجھے اپنے آنسوؤں کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لیے ذرا دروازے تک تو رخصت کرآؤ...... اچھا بہنوں اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔" (ارے کیا، کیا لکھ ڈالا۔ آئندہ ذرا نیند میں نہیں بیداری میں تبصرہ کرنا)

☜ خالد محمود، اسلام آباد سے۔ "اسلام آباد، آب پارہ میں رسالہ کبھی، کبھی شارٹ ہو جاتا ہے۔ مجھے پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے۔ جنوری میں سیما رضا کا انٹرویو پڑھا بہت اعلیٰ پائے کی قابل خاتون ہیں۔ بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ انجم انصار صاحبہ کے شوہر صاحب کے اچانک انتقال کا بہت شدید افسوس ہوا۔ ان کے شوہر عبدالرب صدیقی بہت اچھے انسان تھے۔ میری بھی کئی دفعہ بات ہوئی ہے انجم صاحبہ سے درخواست ہے کہ صدیقی صاحب کے لیے بھی ضرور لکھیں اس طرح ان کا غم ہلکا ہوگا۔ (جی ضرور) آپ سب کے لیے بہت دعائیں ہیں۔ بس ہر لمحہ خوش اور make the present moment emotional success مطمئن رہیں...... یہی زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔" (آپ کا پیغام انجم باجی تک پہنچ جائے گا۔ ان شاء اللہ وہ ضرور لکھیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی سے رکھے۔)

☜ علیشہ رخسار، صابہ موبزہ سے۔ "پیاری آنٹی السلام علیکم (وعلیکم السلام) میں کسی بھی رسالے میں پہلی بار لیٹر لکھ رہی ہوں۔ بچپن ہی سے اپنی امی کو رسالے پڑھتے دیکھ کر بڑی ہوئی ہوں۔ امی کے شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے بھی شوق ہوا اور میں بھی پڑھنے لگی۔ میری امی کا نام نرگس تبسم ہے۔ مجھے پاکیزہ میں سب سے زیادہ پاکیزہ ڈائری اور بزم پاکیزہ پسند ہے۔ کہانیاں ساری نہیں پڑھتی اس لیے میں تبصرہ نہیں لکھ سکتی۔ امی کہتی ہیں پہلے پڑھو پھر خود سے تبصرہ کرو...... تو آنٹی میں جب ساری کہانیاں پڑھوں گی تو پھر میں بھی تبصرہ لکھا کروں گی۔" (ہاں ضرور لکھنا اپنی پڑھائی سے فارغ ہو کر پاکیزہ بھی ضرور پڑھا کرو نرگس بہن تو بہت پرانی قاری ہیں سلامت رہیں آپ سب)

☜ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ "پاکیزہ تو ہم سب کی جان ہے بلکہ یقین کریں میرا سب اسکول کا اسٹاف، محلے والے سب اس سے میری وابستگی سے واقف ہیں۔ یہاں تک ایک فنکشن میں بھی پاکیزہ کے حوالے سے بات کر رہی تھیں...... علامہ اقبال کے بارے میں تقریب کی کوریج آپ نے بہت اچھی لگائی بہت شکریہ یہاں اکثر چھوٹی موٹی تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔ (جی آپ کچھ نہ کچھ احوال ضرور بھیجا کریں۔ آپ تو خود بھی پورے میاں چنوں کی معزز شخصیت ہیں) لفظ تراشنا اور محسوسات کو لفظوں میں پرونا کوئی آسان کام نہیں...... کبھی فرصت اور فراغت نہیں، کبھی طبیعت کو بہلا کر اس کام پر آمادہ کیا تو نہ جانے کون سی غیر مرئی طاقت دھیان ہٹانے کو آموجود ہوتی ہے مگر آپ کی محبت سب پر حاوی ہو جاتی ہے اور قلم بیٹھے لفظ کشید کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنی چھوٹی بہن ماہ نور شوق کی کتاب تیرے بعد تبصرے کے لیے بھیج رہی ہوں...... جو مجھ سے ناراض ہے کہ پاکیزہ پر آپ کی اجارہ داری تو نہیں جو میری کتاب آپ نے تبصرے کے لیے نہیں بھیجی......؟ ساون رُت پر پاکیزہ والوں نے بہت اچھا تبصرہ لکھا تھا۔ اب آتے ہیں پاکیزہ تحریروں پر جو گوشہ تنہائی کی ساتھی ہیں۔ شعور کی دہلیز سے بڑھاپے تک کی وابستگی اور بیتے کا احساس جہاں ہر خوف سے بالاتر ہو کر دکھ سکھ سنائے جاتے ہیں۔ ناول میرا اسرار رنگ اتار دو، افشاں آفریدی کو سلام کہ ذہن کون کا دکھ، کرب اس کی ذات کی شکست و ریخت اور بحی، کی کیفیت کو حسن دلیری اور سچائی سے نوک قلم سے کندن بنا دیا ہے اس تخلیقی عہد ساز کارنامے کو سلام۔ زاویار کو ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر کے چراغ فکر نظر سے دل کی آنکھیں کھول کر تنہائی اور کرب کی حقیقی عکاسی کی ہے۔ تشنہ لب زمین دل کی عکاسی کی ہے۔ میں عشق ہوں، نایاب جیلانی نے ناموں کی جلترنگ سے کہانی کو دوام بخشا ہے۔ شام، عماد، فیقہ چلتے پھرتے کردار جو اذیت کی خلش، محبت سے دو چار ہیں۔ ساعورت م ماسی، فرمین اظفر نے عورت کے وقتی اور ازلی دکھوں پر گہرے رنج کا اظہار کیا ہے اور دکھوں پر مسیحائی کی ہے۔ نزہت، گوشہ ظرافت میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کی کتاب خاکم بدہن سے اقتباس دیں۔ مضامین پطرس سے اقتباس دیں۔ گوشہ ظرافت ادبی کارنر ہے۔ اس میں معیاری ادبی تخلیقات ہونی چاہئیں۔ ادرک کا حلوا، عذرا رسول صاحبہ کی خصوصی شفقت سے لگتا ہے کہ ساری پاکیزہ بہنیں حلوا کھا کر نئی خوشی ایام جوانی کی حب و تاب جاودانہ حاصل کریں گی۔" (آپ بھی ضرور حاصل کریں اور تبصرے کا شکریہ)

☜ بختاور ایڈوو، بستہ محمد سے۔ "ماہ دسمبر اور جنوری کا پاکیزہ مجھے آج ملا ابھی تک پڑھا بھی نہیں...... لیکن پاکیزہ کے پچھلے

م ماہنی کہانی اچھی لگی۔ عروج لکھی قدریہ، اصل ونقل، رشتوں کے اصل ونقل کو ظاہر کرتا اچھا افسانہ تھا۔ دل جو کہتا ہے، نزہت جبین ضیا صاحبہ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ ساحل کی قسم منت طوفان نہ کریں گے، سلمیٰ غزل صاحبہ، ہما علی، اب رہائی ملے گی، نیلی آنکھیں حوریہ بتول شفا سعید، ہمارے حصے کی خوشی تمام افسانے اچھے لگے۔'' عذرا آپی کو خلوص بھرا اسلام کچھ باتیں اپنی بہنوں سے۔ ان کی باتیں اچھی لگیں اور ادرک کے حلوے کی ترکیب پسند آئی۔ اللہ پاک عذرا آپی کو صحت زندگی اور لمبی عمر عطا فرمائے اور وہ اسی طرح کچھ باتیں اپنی بہنوں سے کر کے رسالے کی رونق بڑھائیں آمین یارب العالمین...... بہن مسکان نور صاحبہ نے بہنوں کی محفل میں میری کمی محسوس کی یہ پڑھ کر بہنوں کی محفل کا یہ رشتہ بہت پُرخلوص لگا۔ میری نواسی کی سالگرہ پر دعاؤں کا تحفہ بھیجنے کا بھی بہت شکریہ جزاک اللہ...... پاکیزہ ڈائری، میں اکثر لکھتی ہوں، خوش ذائقہ، بزم پاکیزہ، روحانی مشورے، حسن نکھار یہ بھی سلسلے خوب سے خوب تر ہیں۔ تمام بیمار بہنوں کے لیے دست دعا بلند ہیں اللہ پاک ان کو مکمل شفا وصحت یابی سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔ تازہ بہ تازہ سرگرمیوں میں سب کو اپنی خوشیاں مبارک ہوں...... انتقال پُرملال میں جن کے نام ہیں ان کی مغفرت کے لیے دعا ہے اور ان کے لواحقین کے لیے صبر عظیم کی دعا ہے۔ تمام بہنوں کو سلام اور خلوص بھری دعائیں اللہ تعالیٰ پاکیزہ کی ترقی میں مزید اضافہ فرمائیں آمین یارب العالمین......'' (مستقل تبصرے کا شکریہ اور آپ بھی سب کی دعاؤں میں شامل ہیں)

کہ درود بخاری، اسلام آباد سے۔ ''سب سے پہلے تو بہت، بہت شکریہ...... میرا فون اٹھانے کے لیے جب میرا فون دوسری بیل پر ہی اٹھا لیا گیا تو مجھے تو یقین ہی نہیں آیا اپنے کانوں پر...... اور پھر جب ڈرتے، ڈرتے اپنی کہانی کے بارے میں پوچھا تو اس قدر مفصل انداز میں میری تشفی کرائی گئی کہ دل باغ، باغ ہو گیا۔ کہانیاں جمع کرنے اور پھر ہر مہینے کے حساب سے ان کے اندراج کا اتنا جامع نظام جان کر دلی خوشی ہوئی کہ ہم رائٹرز جو کہانی اتنی محنت اور جانفشانی سے لکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف آپ لوگ غور سے پڑھتے ہیں بلکہ قابل قدر بھی جانتے ہیں۔ بہت شکریہ۔ (شکریہ کی کیا بات ہے یہ تو ہمارا فرض ہے) اب آتے ہیں پاکیزہ کے جنوری کے شمارے کی طرف تو خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام کہانیاں بہت دلچسپ تھیں۔ پاکیزہ کے تمام رائٹرز مبارک باد کے مستحق ہیں اس قدر خوب صورت کہانیاں قلم بند کرنے کے لیے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

کہ یاسمین کنول، پسرور سے۔ ''پاکیزہ کا سرورق دیکھ کر لگتا ہے کہ کراچی میں بھی سردی آگئی ہے۔ پہلے تو ہمارا خیال تھا کہ کراچی میں سردی نہیں آتی کیونکہ ہمارے کچھ رشتے دار ادھر رہتے ہیں وہ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم رضائیاں، کمبل نہیں لیتے آپ پنجاب والوں کی طرح...... خیر سرورق کی ماڈل پیاری ہے تیکھے نقوش کی مالک عائکہ خان کے دیکھنے کا انداز غضب کا ہے۔ 22 فروری 2019ء کو ہم سے بچھڑنے والے معراج رسول کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ دو سال کا عرصہ بیت گیا اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے لگتا ہے اسے پر لگ گئے ہیں۔ پاکیزہ کو بنانے، سنوارنے والے معراج رسول کے اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے اور ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے، آمین۔ اس ماہ کا اداریہ بھی ان کی یاد میں لکھا معلوم ہوتا ہے۔ محترمہ ذکیہ بلگرامی، ناہید سلطانہ اختر، نیلوفر عباسی، اختر شجاعت، تسنیم منیر علوی، شگفتہ شفیق، انجم انصار، سلمیٰ غزل، فاطمہ حسن، ڈاکٹر ممتاز عمر، شائستہ زریں، ناہید فاطمہ حسنین اور مسرت اکرم کے تاثرات بیاد معراج رسول میں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غم کے جذبات کو کیسے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی صلاحیتیں اجاگر ہوگئی ہیں اور ان کی جدائی آنکھیں نم کرتی محسوس ہوئی ہے۔ دوسری برسی آگئی ان کی، اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین اور پڑھنے والوں کو صبر جمیل بخشے۔ (آمین ثم آمین) شازیہ انوار پاکیزہ کی مہمان بنیں اچھا لگا۔ تصویریں زبردست ہیں یعنی انٹرویو کے ساتھ سونے پر سہاگے کا کام کر رہی ہیں۔ پاکیزہ ڈائری پسند آئی۔ افسانوں میں دل جو کہتا ہے اچھا لگا۔ سحر ساجد کا ناولٹ مسیحا پسند آیا۔ ح محورت م ماہنی کمال تحریر ہے۔ مٹی کا آب خورہ قابل ستائش تحریر ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

کہ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''اس بار بھی ہمیشہ کی طرح پاکیزہ دل کو چھو گیا۔ اتنے دلکش وخوب صورت ناولز اور دوسرے سلسلے بھی جواب نہیں...... میرا سارا زنگ اتار دو ہمارا پسندیدہ ناول بنے لگتا ہے افشاں آفریدی نے بازی ہاتھ میں لے لی ہے اور ایسا ہی شیریں حیدر کا زبردست ناولٹ وہ ہنر جو ہم کو لازم تھا۔ ماشاء اللہ قیامت ڈھا رہا ہے اس کے لیے پیاری سی مصنفہ دلی مبارک باد کی مستحق ہیں اور جناب سنسنی خیز جاسوسی طرز پر مبنی میں عشق ہوں ابھی کافی دھوم مچا رہا ہے۔ اور جناب سحر ساجد نے اپنا ناولٹ مسیحا بہت شاندار لکھا ہے۔ ہم انہیں پورے سو نمبر دیتے ہیں اور بھی طیبہ عنصر مغل کی کیا بات ہے یہ تو جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ ان کا سحر انگیز زبردست مکمل ناول مٹی کا آب خورہ لاجواب بے مثال تخلیق لگا۔ بہت دل سے پسند آیا تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ گئے ہیں۔

افسانوں میں ہماری سلمٰی غزل صاحبہ سرِفہرست رہیں۔ ان کا دلکش و حسین افسانہ ساحل کی قسم مت طوفان نہ کریں گے بہت، بہت پسند آیا ان کی خدمت میں ہمارا سلام اور مبارک باد عرض ہے۔ اور نزہت جبیں ضیا صاحبہ افسانہ دل جو کہتا ہے بہت پُراثر ایک نہایت عمدہ نصیحت آمیز لگا...... کہہ سکتے ہیں کہ دل پر اثر کر گیا اور اصل اور نقل یہ افسانہ عروج لبنیٰ قدیر نے عمدہ لکھا اسی طرح نیلی آنکھیں بھی بہترین رہا گرداب رہائی طے کی ہمار علی کے افسانے نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا اور ہاں بھئی اسما طاہر کا پیارا نا ول وادی گل بہت پیارا لگا۔ شمع ہدایت کی کیا بات کریں اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون تو دل و دماغ کو منور اور معطر کر دیتا ہے پیاری اختر بہن ہمیں دعاؤں میں یاد رکھا کیجیے...... باقی بزم پاکیزہ، میں اکثر گنگناتی ہوں، بہنوں کی محفل جیسے خوب صورت سلسلے تو پاکیزہ کی رگ جاں ہیں، معراج رسول صاحب کی اللہ مغفرت فرمائے اور عذرا رسول صاحبہ اللہ آپ کو خوش رکھے (آمین) وقت تو گزرتا رہتا ہے لیکن دل پر جو غم لگتا ہے وہ بھولے نہیں جاتا۔'' (سچ کہا، مختصر تبصرے کا شکریہ)

☆ تسنیم ماپارا، کراچی سے۔'' پیاری عذرا اور آپ کا بہت شکریہ اتنی محبت سے آپ نے میری مکمل صحت یابی کے لیے دعا کی درخواست کی۔ اللہ کا شکر ہے Covid 19 ہمارے بھی مہمان بنے اور وہ مشکل وقت بھی کٹ ہی گیا۔ اللہ کے فضل و کرم اور فیملی دوستوں، عزیزوں کی دعاؤں سے۔ اللہ تعالیٰ اس موذی بیماری کو اک کُن کہہ کر ہمیشہ کے لیے پوری دنیا سے دور کر دے۔ (آمین) فروری کا شمارہ معراج صاحب کی یادوں، ان کی ہمت، جدوجہد، سخاوت اور دوست نوازی کی کئی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ عذرا نے جس حوصلے سے ان کی خدمت کی اور اب بھی اپنے رکھ رکھاؤ، سلیقے سے زندگی بسر کر رہی ہیں وہ تحسین آمیز ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) رسالے سے کچھ افسانے پڑھے جس میں اب تک بہترین نزہت جبین نے لکھا، سچ ہے ہم ہر ایک سے چھپانے کے چکر میں چھوٹی، چھوٹی باتیں بھول جاتے ہیں جو ہمیں دینِ اسلام نے بتائی ہیں۔ بہت خوب۔ شیریں حیدر کی تحریر بہت ہی خوب صورت تحریر میں جکڑتی ہوئی۔ باقی سلسلے ابھی باقی ہیں۔ پھر تبصرہ بھی۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ)

☆ اچھا بہنوں اب اجازت ان شاء اللہ اگلے ماہ آپ سے پھر ملاقات ہوگی آئندہ ماہ سالگرہ نمبر ہوگا تو بہنوں سے گزارش ہے کہ اپنے مراسلات جلد ارسال کریں اور نیچے دی گئی گزارشات کو مدِنظر رکھیں۔ آپ سب کے لیے نیک تمنائیں اور پُرخلوص دعائیں ہیں۔ پروردگار سب کو صحت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔ الٰہی آمین ......

خیر اندیش، نزہت اصغر

چند گزارشات عرض ہیں

1۔ تمام لکھنے والوں اور تبصرہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ صاف اور واضح لکھائی میں لکھیں۔ 2۔ اپنا نام، پتہ، رابطہ نمبر ضرور لکھیں۔ 3۔ خط کتابت کے لیے دو پتے دیے جاتے ہیں ایک دفتر کی بلڈنگ کا ایڈریس دوسرا پوسٹ بکس نمبر۔ آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوسٹ بکس نمبر پر رجسٹرڈ پوسٹ نہیں جاتی یہ آپ کے علاقے کے ڈاک خانے کے عملے کو معلوم ہے اور انہیں آپ کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ 4۔ کوریئر یا رجسٹری کرنا ہو تو دفتر کا پتا لکھا کریں تا کہ ڈاک بہ آسانی پہنچ جائے ورنہ پوسٹ بکس سے پہنچ تو جاتی ہے مگر بہت دن لگ جاتے ہیں اس لیے خوب دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر ڈاک روانہ کیا کریں۔ عام ڈاک تو پوسٹ بکس پر پہنچ جاتی ہے مگر رجسٹری نہیں رسید کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں تا کہ بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔ 5۔ اپنی نگارشات بھیجنے کے ہفتہ دس دن بعد درج ذیل نمبروں پر رابطہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ڈائریکٹ نمبر 02135386783 صبح 10 بجے سے شام 5 بجے۔ 02135802552 Ext -110 صبح 10 سے شام 5 بجے۔ 02135895313 Ext -110

موبائل نمبر۔ 03316266612 صبح 11 بجے سے شام 4 بجے فون کریں میسج کسی بھی وقت send کر سکتی ہیں۔

جوابی ٹیکسٹ کا انتظار کریں۔ جواب ضرور دیا جاتا ہے اگرچہ کچھ دیر سے ہی سہی۔ امید ہے ہماری پیاری اور بے حد سمجھدار بہنیں ان وضاحتوں کو خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی۔ اب دفتر کا پتا بھی نوٹ فرما لیں محفل کے آغاز میں پی او باکس اور ای میل ایڈریس واضح لکھ دیا گیا ہے۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
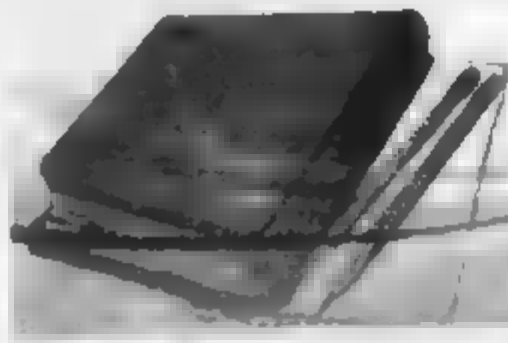
حمد باری تعالیٰ

یارب کریم یارب رحیم یارب عظیم
نام تیرے جتنے بھی ہیں میرے مولا سب ہیں عظیم
رحیم بھی تو، کریم بھی تو غموں کے ہمارے طبیب تو
یارب کریم یارب رحیم یارب عظیم
ہر مشکل میری دور ہوئی نام کے تیرے جب تسبیح پڑھی
یارب صبور یارب غفور یارب شکور
چاروں سو تھے غموں کے سائے
ہاتھ میں تھیں تیرے نام کی شمعیں
جن سے روشن میرے عروش ہوئے
یارب جبار یارب ستار یارب غفار
ہاتھ اٹھائے سر کو جھکائے سامنے تیرے
دامن پسارے، تیری چوکھٹ پہ
بنادے بگڑے اب تو کام میرے
یارب جلیل یارب خلیل یارب وکیل۔

کلام: بختاور ایڈوو، اوستہ محمد

نعت رسول مقبول

دل میں حسرت ہے کہ دیکھوں تو مدینہ دیکھوں
رحمتوں کا میں ان آنکھوں سے خزینہ دیکھوں
ناؤ گھر جائے بھنور میں بھی تو پھر کیا غم ہے
موج دریا سے جو نکلے وہ سفینہ دیکھوں
ہے لبوں پہ یہ دعا عشق نبیؐ میں ڈوبوں
سارے نبیوں میں انہیں مثل نگینہ دیکھوں
آپؐ ہی کو تو بنایا گیا رہبر سب کا
زندگی کیسے گزاری وہ قرینہ دیکھوں
مر تو سکتی ہے بس یاد نبیؐ میں یارب
کوئی ساعت نہ کوئی دن نہ مہینہ دیکھوں

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

خوب صورت معجزہ

دین اسلام معجزات سے بھرا پڑا ہے ایک معجزہ آذر بائیجان میں دیکھنے کو ملا جس کی رپورٹنگ کرنا امریکی میڈیا نے بھی ضروری سمجھا۔ وہ بھی اس معجزے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی اینکرز نا قابل یقین، نا قابل یقین کی گردان کرتی چلی گئی۔ آذر بائیجان ان کے پھولوں کے ایک شوقین محمد رحیم... اللہ وردو گزشتہ پندرہ سالوں سے باغبانی کر رہے ہیں۔ ان کے باغیچے میں طرح، طرح کے پھول اور پودے موجود ہیں تاہم ایک پودا ایسا جس پر کھلنے والے پیلے پھولوں کو اذان پھول یا عربی میں وردۃ الاذان کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ منفرد پھول ہر اذان کے وقت کھل جاتا ہے روزانہ پانچوں وقت مساجد سے اذان کی آواز کے ساتھ یہ پھول اپنی پنکھڑیاں کھول کر خدا کی کبریائی بیان کرتے ہیں۔ (سبحان اللہ)

از: زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

تلاش

حضرت عطا اللہ شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ مجھے پوری زندگی میں دو لوگوں کی تلاش رہی پر وہ مجھے نہ مل سکے۔ ایک وہ جس نے صدقہ کیا ہو اور وہ مفلس ہو گیا ہو اور دوسرا وہ جس نے ظلم کیا ہو اور وہ اللہ کی پکڑ سے محفوظ رہا ہو۔

از: ثمینہ کوکب، جہلم

غزل

مقدر جب گریزاں ہو فضائیں روٹھ جاتی ہیں
ہم ایسے کم نصیبوں سے دعائیں روٹھ جاتی ہیں

ہمارے کھیت تپتی دھوپ میں جلتے ہی رہتے ہیں
کبھی جو مہرباں تھیں وہ گھٹائیں روٹھ جاتی ہیں
سمندر کے سفر پر جانے والو سوچ کر جانا
کھلے ہوں بادباں پھر بھی ہوائیں روٹھ جاتی ہیں
دلوں کی بے بسی ایسا بھی اک موسم دکھاتی ہے
بہاریں منہ چھپاتی ہیں خزائیں روٹھ جاتی ہیں
اک ایسا مرحلہ آتا ہے تنہائی کے جنگل میں
تعاقب کرنے والی سب صدائیں روٹھ جاتی ہیں

شاعر: اظہر جاوید
پسند: فرخندہ جعفری

وہ بھی مہرباں تھا میری طرح

منور کے دوست ایک بہت بڑی این جی او کا سرگرم رکن تھا۔ منور جب بھی اس سے ملتا خوش ہو جاتا کہ اس این جی او میں کچھ نہ کچھ غریبوں کی بھی مدد ہو جاتی تھی اور بے اختیار اس کا بھی دل چاہتا کہ کوئی ایسا ہی کام وہ بھی کرے۔ تو اس بار وہ بھی لنڈے سے کئی بورے بھر کے سردی روکنے والے کوٹ، سوئیٹر اور جینز لے آیا تھا۔ جن کو وہ مستحقین کو دے کے دلی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ آج صبح دروازے پر دستک ہوئی اور ایک سات، آٹھ سال کے کچرا چننے والے بچے نے اندر جھانک کر پوچھا کہ صاحب سنا ہے کہ آپ فری میں گرم کوٹ لوگوں کو دے رہے ہو...... میں نے کہا کہ ہاں، ٹھیک سنا ہے...... اس نے اپنا کچرے کا تھیلا دروازے کے باہر رکھا اور اندر آتے ہوئے کہا۔ ایک ٹوپی والا کوٹ مجھے بھی چاہیے۔ میں نے ایک جیکٹ اس کو نکال دی اس نے فوراً خوش ہو کر پہن لی اور کہا کہ ایک ذرا اس سے چھوٹا کوٹ میرے بھائی کے لیے بھی دیں۔ وہ بھی دے دیا تو چلتے، چلتے اس نے ایک اور کوٹ بھی اٹھا لیا۔ میں نے کہا کہ تمہارا اور بھائی کا تو ٹھیک ہے، یہ تیسری جیکٹ کیوں لی ہے، وہ بھی سمجھاتے ہوئے گویا ہوا۔ یہ میں نے اپنے بہت غریب دوست کے لیے لی ہے۔ اور مجھے حیران چھوڑ کر چل دیا۔

از: شگفتہ شفیق، کراچی

اچھے لوگ اچھی باتیں

☆ اپنے آپ سے محبت اتنا سنگین گناہ نہیں جتنا سنگین گناہ اپنے آپ سے بے پرواہی ہے۔ (شیکسپیئر)
☆ حسد حاسد کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔ (بقراط)
☆ غلطی مان لینے سے انسان کا ذہنی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ (سقراط)

ایماندار چور

کسی چور کو راستے میں ایک بٹوا ملا...... اس میں کافی سارے پیسے تھے گمشدگی کی صورت میں بٹوا ملنے کی دعا بھی لکھی تھی۔ ایک خانے میں بٹوے کے مالک کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ چور نے وہ بٹوا پتا لکھے ہوئے مالک کے حوالے کر دیا۔ اس شخص نے چور سے پوچھا کہ تم آرام سے سارے پیسے رکھ سکتے تھے۔

چور: آپ نے جو بٹوے پر عقیدت کے ساتھ دعا لکھوائی ہوئی کہ اگر کھو جائے تو اس دعا کی برکت سے آپ کو واپس مل جائے گا۔ میں چور صرف دولت کا ہوں عقیدے چوری نہیں کر سکتا...... اگر میں بٹوا واپس نہ کرتا تو آپ ضرور پڑھ جاتے اور میں ایمان کا چور ہوتا جو دولت کی چوری سے بڑا گناہ ہوتا ہے۔

از: سائرہ ظفر، کندیاں

خوشبو

ا۔ تحریر وہ آواز ہے جو سنائی نہیں دیتی بلکہ دکھائی دیتی ہے۔
۲۔ سخت سے سخت گیر حکمران ایسی زنجیر نہیں بنا سکتا جو ذہنوں کو جکڑ سکے۔
۳۔ اگر تم غلطی پر تو اپنی غلطی کو فوراً اور جرأت کے ساتھ مان لو۔
۴۔ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کو حسرت کی خاک میں نہ ملاؤ۔
۵۔ سچی محبت کبھی تھکا نہیں کرتی۔
۶۔ صوفی وہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو۔

۷۔ کسی کے اخلاق پر اعتماد نہ کرو جب تک اسے غصے کی حالت میں نہ دیکھو۔

۸۔ والدین کی خوشنودی دنیا اور آخرت میں باعثِ نجات ہے۔

۹۔ ستاروں سے روشن رہنے کا سبق ضرور دیکھو مگر ستارہ بننے کی خواہش مت کرو کیونکہ یہ راستہ تو دکھا سکتے ہیں لیکن منزل نہیں ہو سکتے۔

۱۰۔ عورت مرد سے زیادہ عقلمند ہوتی ہے وہ جانتی کم سمجھتی زیادہ ہے۔

نظم

اکثر بچے آنگن میں
کچی دھوپ میں پھرتا ہے
میرے بن میرا بچپن
دیکھو کتنا تنہا ہے

لمس

اکثر دنیا سے گھبرا کر
ماں کی گود میں سر رکھتی ہوں
اس پل بالکل یوں لگتا ہے
تپتی ریت پر چلتے، چلتے
تر ساحل کا لمس ملا ہے

شاعرہ: زینیا حسن، کراچی

ستاروں کی طرح روشن

زندگی ایک سفر ہے جس کے دوران انسان کو طرح، طرح کے لوگ ملتے اور متاثر کرتے ہیں مگر انہی لوگوں میں کچھ لوگ اپنی ذات کی روشنیوں کے سبب ہمیشہ دل میں رہتے ہیں...... ان کی کاوشوں، محبتوں اور خلوص کی یہ قندیلیں دوسروں کو ہمیشہ حوصلہ دیتی اور ان کی امیدیں سنورتی رہتی ہیں۔ معراج بھائی بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ ان کی بے مثال کوششیں آج بھی ستاروں کی طرح روشن ہیں ان کے جانے کے بعد بھی ان کی ذات زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ سلام عذرا بہن کی انتھک محبتوں اور کاوشوں کو جن کے سبب یہ سارے چراغ روشن ہیں۔

از: فریدہ ہاشمی تحفی، کراچی

چائے گرم ہے، بچپن کی ایک یاد

ہم پانچ برس کے ہوگئے تو دادی کے پاس شہر (پشاور) بھیج دیا گیا تاکہ اسکول میں داخلہ کرایا جائے۔ بڑی آپا ہم سے پانچ برس بڑی ایک کزن پندرہ سال بڑی پہلے ہی دادی کے قبضے میں تھیں۔ ابا کا تبادلہ شہر سے دور ہوگیا تھا۔ اماں اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کے ساتھ رہتیں۔ ابا ہفتے میں ایک بار آتے دادی کو خرچہ دیتے ملازموں کی تنخواہ دیتے اور بچوں کو بھی جیب خرچ دیا کرتے جو آج کل کے حساب سے ہزاروں بنتے......

ایک بار آگئے سب کو خرچہ دیا۔ میری باری آئی تو اس وقت جیب میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے کہ ارے آپ کو اگلی بار تنخواہ ملنے پر دوں گا...... میرے ہاتھ میں چائے کا پیالہ تھا سب مل کر چائے پی رہے تھے اور میرا دل یوں بھی اداس تھا کہ اب ابا ایک ہفتے کے بعد ہی آئیں گے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے کزن نے پوچھا کہ کیوں رو رہی ہیں؟ میں نے جواب دیا چائے گرم ہے...... بہانے، بنا کر کام کر دکھایا مگر اندر کمرے میں جا کر خوب روئی اپنا دل ٹوٹنے پر...... تینوں میں سے کسی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ بچی ماں سے بھی دور ہے...... اس کے ننھے دل کا خیال کرنا چاہیے تھا مگر کیا بے دردی تھی؟ سالوں بعد میں نے یہ قصہ سب کو سنایا بطورِ خاص ابا کو...... انہوں نے بے اختیار مجھے اپنے ساتھ لگا لیا کہ اوہ بیٹا...... مجھ سے بھول ہوگئی تھی۔ اب جب بھی میں اداس ہوتی ہوں...... تو خاندان میں بطورِ خاص کزن چھیڑتی ہیں کہ ارے فریدہ کی چائے گرم ہے اسے نہ چھیڑیں۔ بعد میں میں نے دادی سے بھی زوردار شکوہ کیا تھا۔

وہ ایک سیدھی سادی بزرگ تھیں...... ہمارے لیے اس وقت رعب ہی کافی تھا ان کا......

تو اس طرح ہماری چائے اب بھی گرم ہو جاتی ہے۔

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

آزمائش شرط ہے آزماؤ تو سہی
پوری اتروں گی آزمائش میں کچھ بتاؤ تو سہی
ٹھنڈی آہیں بھرتی ہو ہر دم
کھل کر اشک اپنی آنکھوں سے بہاؤ تو سہی
اتنی اداس اتنی تنہا کیوں ہو جاناں
کبھی مجھے دیکھ کر مسکراؤ تو سہی
زخم اتنے دیے ہیں زندگانی نے مجھے
زخموں پر میرے مرہم لگاؤ تو سہی
ہر ستم ہنس کر سہہ لوں گی اے جانِ فری
اپنی محبت کا یقین کبھی دلاؤ تو سہی

کلام: فریدہ فری یوسفزئی، لاہور

گناہ

جو گناہ کا مرتکب ہو جائے اسے انسان سمجھو۔ جو گناہ کر کے پچھتائے اسے صاحب ایمان سمجھو۔ جو گناہ کر کے اترائے اسے شیطان سمجھو۔

زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

اچھی باتیں

☆ اگر کوئی تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اور تم کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو دونوں کو بھول جاؤ۔

☆ طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

☆ آپ خود کو دیانتدار بنا کر یہ یقین کر لیں کہ دنیا میں ایک بے ایمان کی کمی ہو گئی ہے۔

☆ مصیبت سب کے لیے بہترین کسوٹی ہے جس پر یار دوست پرکھے جاتے ہیں۔

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھول جائے پر کسی کی دی ہوئی خوشی نہ بھلا سکے۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

میرا ملک

ملکوں میں میرا ملک ہے اور سب سے جدا ہے
نقشے میں یہ دنیا کے عجب ڈھب سے کھڑا ہے
آیا جو کڑا وقت کبھی دیس پہ میرے
ہر ایک سپاہی مرا جی جاں سے لڑا ہے
دلکش ہے بڑا اللہ اکبر کا یہ نعرہ
اس نعرے کی برکت سے یہ ملک کھڑا ہے
اس ملک کی حرمت کو بچانے کے لیے اب
اس دیس کا ہر بچہ جواں جاگ رہا ہے
وہ درس نئی نسل کو دینا ہے ضروری
تاریخ کے صفحات میں جو ہم نے پڑھا ہے
کرتے ہیں سلام ان کے جذبوں کو کنول ہم
جن لوگوں نے سر دے کے لیا ملک بچا ہے

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

خدا کی پناہ

مولوی نیاز صاحب اپنا گھوڑا فروخت کرنا چاہتے تھے۔ خدا بخش اسے خریدنے پر تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب بولے۔ ''لیکن ایک بات سن لو میں نے اسے ذرا اپنے ہی انداز میں سدھایا ہے۔ اگر اس پر بیٹھ کر کہو 'خدا کی پناہ' تو یہ دوڑنے لگتا ہے اور اگر کہو۔ 'اللہ معاف کرے۔' تو رک جاتا ہے۔

خدا بخش کو یقین نہ آیا۔ وہ آزمائشی طور پر گھوڑے پر بیٹھا اور بولا۔ ''خدا کی پناہ''۔ گھوڑا آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ خدا بخش نے ایک بار پھر کہا۔ ''خدا کی پناہ.....''

گھوڑا طوفانی رفتار سے دوڑنے لگا۔ اچانک خدا بخش نے دیکھا وہ ایک ایسی چٹان کے کنارے پر پہنچ رہے تھے جس کے نیچے شور مچاتا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے تاہم وہ بروقت چلا اٹھا۔ ''اللہ معاف کرے۔''

گھوڑا عین چٹان کے کنارے پر پہنچ چکا تھا مگر یہ الفاظ سنتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا۔

خدا بخش کے سینے سے بے اختیار ایک طویل سانس خارج ہوئی اور وہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ''خدا کی پناہ.....''

از: سباس گل، رحیم یار خان

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ شگفتہ شفیق ..... کراچی

یہی بس شگفتہ کا کہنا ہے ہر دم
محبت کے نغمے میں گاتی رہی ہوں

☆ حمیرا ..... میرپور خاص

شعر دراصل وہی ہے حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

☆ لائبہ کائنات ..... لاہور

دل آجائے گا وہ میرے مقابل
ابھی جو چوم کر چوکھٹ گیا ہے

☆ مہرین بخش ..... ہزاری

میں نے دشمن کو بھی احساس محبت بخشا
میرے اپنے مجھے نفرت کی سزا دیتے ہیں

☆ مسز اکرام شہزاد ..... ٹاؤن شپ لاہور

آؤ چپ کی زبان میں خاور
اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں

☆ ماہ نور خان ..... بہارہ کہو

کون کہتا ہے نفرتوں میں درد ہے محسن
کچھ محبتیں بھی بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں

☆ فریدہ ہاشمی تحتی ..... کراچی

نکہت گل سے دریچے یوں محبت کے کھلے
جیسے کہ وصل کی شب میں ہو ستاروں کا ہجوم
یوں تیری یاد کے جگنو ہیں چمکتے ہر سو
غازۂ حسن میں ہو جیسے چراغوں کا ہجوم

☆ ارم کمال ..... فیصل آباد

چھڑکا ہے عجیب زہر فضا میں کہ ابد تک
لگتا ہے کسی پیڑ پہ پتا نہ رہے گا
ہم پھول اگانے پہ جو آئے تو اِک دن
اس روئے زمین پر کوئی صحرا نہ رہے گا

☆ فردوس شاذیہ ..... لاہور

دیکھ اسے وعدہ خلافی پہ تو میرا چھوڑ دے
سنگ کٹ جاتے ہیں پانی کی اگر دھار گرے

☆ ساجدہ ظفر ..... کمالیہ

طلب کریں تو یہ آنکھیں بھی ان کو دے دوں میں
مگر یہ لوگ ان آنکھوں کے خواب مانگتے ہیں

☆ ساجدہ ..... پنجاب

عمر تمام کاٹ دی وعدہ نبھانے کے لیے
عہد باندھا تھا کسی نے آزمانے کے لیے
وہ بظاہر تو ملا تھا ایک لمحے کو عدم
عمر ساری چاہیے اس کو بھلانے کے لیے

☆ فضیرہ آصف خان ..... ملتان

ابھی ابھی تو مجھے رنج نے سنبھالا ہے
میری تقدیر کو مجھ سے ابھی خفا رکھو

☆ جبینا ..... کراچی

چاند پورا ہے چودھویں کا
جانے کیوں ہے اداس ایسا
کہ جیسے اس کا کچھ کھو گیا
یا دل سے خالی ہو گیا

☆ سنبل ملک ..... شاہدرہ

میں دے رہا تھا سہارے تو اِک ہجوم میں تھا
جو گر پڑا تو سب راستہ بدلنے لگے
بھگت لیا وہیں خمیازہ تنگ نظری کا
بدن بچانے لگے تھے کہ شہر جلنے لگے

☆ رانی زرتاب ..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

دم واپسی اسے کیا ہوا، نہ وہ روشنی نہ وہ تازگی
وہ ستارہ کیسے بکھر گیا وہ تو آپ اپنی مثال تھا

☆ بختاور ابڑو ..... اوستہ محمد

ہر شام سے وابستہ ہے اس کی یادیں بخت
بچھڑ کر وہ میری شامیں اداس کر گیا

☆ حمیرا انجم وحید ...... واہ کینٹ
فطرت سے ہوں مجبور میں دھوکا نہیں دیتا
ہر بار مگر خلوص بہت مہنگا پڑا مجھے

☆ دلشاد انجم ...... گوجرہ
ابھی جلتے ہوئے خوابوں کا دھواں باقی ہے
اِک ستم اور میری جان ابھی جاں باقی ہے

☆ عرشیہ جنید ...... کراچی
میرے وطن تو سلامت رہے ہمیشہ یونہی
ترا عروج رہے اور کبھی زوال نہ ہو

☆ ثمینہ کوکب ...... جہلم
جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیرتا ہے کیسے لہجے کا روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے

☆ زرینہ خان ...... بھارہ کہو
میں ہوں تقسیم شام ہجرت کی
میں ہوں حصہ اُداس لوگوں کا

☆ سائرہ وارم ڈوگر ...... کمالیہ
سکوت دشت میں اِک بار کھل کے برسی تھی
پھر اس کے بعد بہت بارشوں کا کال رہا
دعا یہ کس کی تھی جو ڈھال بن گئی میری
یہ کون آکے بھنور سے مجھے اچھال رہا

☆ کائنات زہرہ ...... میانوالی
آشنا سے چہروں کے اجنبی رویوں کو
سہہ کے مسکرا دینا آفریں اذیت ہے

☆ عروبہ ناز ...... کوٹلی
وہ جا چکا ہے مگر اب تک برستا رہتا ہے
اسی کا رنگ شفق میری اداس شاموں پر

☆ سعیدہ بانو ...... کوہمری
ہوا جب سرد پتوں کو جدا شاخوں سے کرتی ہے
مجھے اس سے بچھڑ جانا بہت ہی یاد آتا ہے

☆ سونا رضوان ...... کراچی
کھلتے ہیں بہت دور کہیں پھول تمہارے
خالی ہی پڑا رہتا ہے گل دان ہمارا

☆ بیگم نشین ...... لیہ
اتر جاتے ہیں کچھ لوگ دل میں اس قدر
کہ جن کو دل سے نکالو تو جان جاتی ہے

☆ شبانہ نواز ...... لیہ شہر
کبھی سینے سے لگا کر سن وہ دھڑکن
جو ہر پل تیرے جینے کا ورد کرتی ہے

☆ ثمرین قیصر ...... کمالیہ
آئینہ گر تجھے معلوم نہیں ہے شاید
لوگ محروم خدوخال ہوئے جاتے ہیں

☆ عنبر وسیم ...... گوجرانوالہ
قافلے راکھ ہوئے دشت جنوں میں کتنے
کاش خوشبوؤں کی طرح درد بھی ہجرت کرتے

☆ کائنات عبدالحلیم ...... میرپورخاص
جو آنا چاہو ہزار رستے، نہ آنا چاہو تو عذر لاکھوں
مزاج برہم، طویل رستہ، برستی بارش، خراب موسم

☆ روحی صبا ...... کراچی
آیا نہ راس زیست کا کوئی سفر مجھے
کانٹوں سے پُر ملی ہے ہر اِک رہ گزر مجھے
دستور شہر کا ہے یا چہرہ بدل گیا
نظریں وہ پھیر لیتے ہیں کیوں دیکھ کر مجھے

☆ انیس جبار ...... آزاد کشمیر
آؤ کہ ساحلوں سے کچھ سیپیاں چنیں
کچھ خواب رہ گئے تھے انہیں پھر سے اب بنیں
سورج کو آج ہاتھ میں آؤ پکڑ کے دیکھیں
حدت کو اس کی آؤ محسوس تو کریں

☆ ثوبیہ ظہور ...... ضلع اٹک
ہماری آنکھ ذرا مختلف ہے لوگوں سے
جو دیکھتے ہیں وہی آپ کو دکھاتے ہیں
ہم ایسے لوگ گنواؤ نہ اے زمیں والوں
ہم ایسے لوگ کہاں بارہ بار آتے ہیں

☆ زلیخا حسن ...... کراچی
سمندر کی موجوں سے میں پوچھتی ہوں
مجھے جانے کیوں تم سے ہے اتنا پیار
سکوں اس کو بخشو جو ہو بے سکوں
مگر جانے کیوں ہو خود ہی بے قرار

منتخب غزلیں

ماہ مارچ اردو ادب کے معروف شاعر حبیب جالب کا ماہ پیدائش و ماہ وفات ہے اسی مناسبت سے ان کا کلام آپ جیسی باذوق قارئین کے لیے . . .

تری آنکھوں کا عجب طرفہ سماں دیکھا ہے
ایک عالم تری جانب نگراں دیکھا ہے

کتنے انوار سمٹ آئے ہیں ان آنکھوں میں
اِک تبسم ترے ہونٹوں پہ رواں دیکھا ہے

ہم کو آوارہ و بیکار سمجھنے والو
تم نے کب اس بت کافر کو جواں دیکھا ہے

صحن گلشن میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں جانے کہاں دیکھا ہے

وہی آوارہ و دیوانہ و آشفتہ مزاج
ہم نے جالب کو سر کوئے بتاں دیکھا ہے

نظر نظر میں لیے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثال موج نسیم بہار پھرتے ہیں

ترے دیار سے ذروں نے روشنی پائی
ترے دیار میں ہم سوگوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجب ہے کہ تیرے دیوانے
لگائے دل سے غمِ روزگار پھرتے ہیں

لیے ہوئے ہیں دو عالم کا درد سینے میں
تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

بہار آ کے چلی بھی گئی مگر جالب
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

24 مارچ 1928ء - 21 مارچ 1993ء

خوش ذائقہ

شگفتہ یاسمین

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان "امی کی ریسپی" لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

حیدرآبادی دال گوشت

اجزا: بڑی والا چکنا گوشت، ۲ کلو۔ سرسوں کا تیل، حسب ضرورت۔ املی، ۲،۱/۲ پاؤ (بھگو دیں) پیاز، ۴ عدد۔ ادرک لہسن، پسا ہوا ۲،۱ چائے کے چمچ۔ پسی لال مرچ، بھر کے ۳ چائے کے چمچ۔ پسا ہوا دھنیا، 3 چائے کے چمچ۔ ہلدی، ڈیڑھ چمچ۔ ۵ لونگیں، ۱۲ کالی مرچ، ۷ بڑی الائچی، مسور کی دال بغیر چھلکے کی ایک پاؤ، کڑی پتے کی چھوٹی چیاں ۴۔ پیاز ۲،۱/۲ ڈلی۔ لال ثابت مرچ، لہسن، کڑی پتا، زیرہ، ہری مرچ تمام چیزیں ۷، ۷ عدد۔

ترکیب: سرسوں کا تیل اچھی طرح کڑکڑا کر اس میں گوشت ڈال کر پیاز، ادرک، پسی لال مرچ، دھنیا، نمک، لونگ، کالی مرچ، بڑی الائچی یہ تمام چیزیں ملا کر گوشت پر ڈال کر ہلکی آنچ پر بھون لیں جب اچھی طرح بھن جائے تو پانی ڈال کر گلانے کے لیے رکھ دیں۔ مسور کی دال الگ برتن میں اُبال لیں اُبالتے وقت کڑی پتا اور آدھی ڈلی پیاز بھی ڈال دیں جب دال گل جائے تو اُسے گھوٹ کر چھ نکال کر املی کا پانی ڈال دیں۔ جب گوشت گل جائے اس میں دال ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں جب تیار ہو جائے تو لال ثابت مرچ، زیرہ لہسن کڑی پتا کا بگھار ڈال دیں۔ دم پر رکھیں تو اس میں ہری مرچیں ڈال دیں۔

مچھلی پلاؤ

اجزاء: سنگھاڑا یا راہو مچھلی ۲،۱/۲ کلو۔ چاول ۲،۱/۲ کلو۔ تیل، ۳ چھٹانک۔ لہسن، ۲ گٹھی۔ بڑی پیاز ۲ عدد۔ سفید زیرہ، اور سوکھا دھنیا ملا کر ایک چائے کا چمچ۔ ثابت گرم مصالحہ حسب ضرورت۔

ترکیب: مچھلی صاف کر کے دھو لیں اس کے بعد ڈبل روٹی کے سلائس کے مانند ایک ہی سائز کے ٹکڑے کر لیں ۲،۱ پاؤ لہسن چھیل کر اس میں نمک سُرخ مرچ، ۲ لونگ ایک چٹکی سفید زیرہ اور ایک چٹکی سیاہ زیرہ، سوکھا دھنیا ۲ عدد۔ سیاہ مرچ، ۱ بڑی الائچی ڈال کر باریک پیس لیں اور ذرا سا پانی ڈال کر پیسٹ بنا لیں اور یہ پیسٹ مچھلی کے ٹکڑوں پر لگا دیں اور ۲ گھنٹے کے لیے مچھلی فریز کر دیں اس کے بعد ہلکی آنچ پر مچھلی تل لیں اور جب مچھلی گل جائے تو اُتار لیں۔ چاول کو ۲،۱ گھنٹے کے لیے بھگو دیں پیاز براؤن کر کے اوپر تھوڑا سا گرم مصالحہ ڈالیں اور چاول سے دوگنا پانی ڈالیں جب ایک اُبال آ جائے تو چاول ڈال دیں جب چاول پک جائیں تو مچھلی کے تلے ہوئے ٹکڑے ڈال دیں۔ اس کا مصالحہ اور گھی بھی ساتھ ہی ڈال کر دم دے دیں ذرا سی دیر بعد مچھلی پلاؤ تیار ہے۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسپی، کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

میٹھی ٹکیاں

خستہ اور مزیدار میٹھی ٹکیاں بنائیں۔ بچے بڑے سب شوق سے کھائیں گے۔

اجزاء: میدہ، ایک کلو۔ دودھ، ایک کپ۔ انڈے، چار عدد۔ خمیر، ایک ساشے۔ دہی، ایک پاؤ۔

خشخاش، ایک چٹکی نمک۔ چھوٹی، بڑی الائچی، سونف، سفید زیرہ، میوہ جات، حسب پسند (پیس لیں) چینی، آدھ کلو۔ گھی، آدھ کلو۔

ترکیب: میدے کو دودھ، دہی اور انڈوں کے ساتھ گوندھ لیں اور خمیر، خشخاش، الائچیاں، سفید زیرہ، سونف، میوہ جات، چینی، ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں پھر چھوٹی، چھوٹی ٹکیاں بنائیں اور گھی گرم کر کے تلتی جائیں۔

زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

بیسن اور سوجی کا حلوا

اجزا: بیسن (چھنا ہوا) ۲ پیالی۔ سوجی (چھنی ہوئی) ۲ پیالی۔ تازہ دودھ، ایک پیالی۔ چھوٹی الائچیاں (چھیل لیں) ۸ عدد۔ کشمش، ۱۰ عدد۔ چینی، ۳ پیالی۔ گھی، آدھی پیالی (چکنا کرنے کے لیے) بادام، پستے (باریک کٹے ہوئے) چھڑکنے کے لیے۔ چاندی کا ورق سجانے کے لیے

ترکیب: کڑاہی میں گھی گرم کر کے خوشبو آنے تک پکائیں۔ اس میں سوجی اور بیسن ملا کر خوب بھونیں اور نکال لیں۔ اسی کڑاہی میں چینی اور پانی ڈال کر ۵ منٹ تک پکائیں۔ پھر سوجی اور بیسن ڈال کر دونوں اشیا کے یکجان ہونے تک بھونیں۔ اس میں چمچہ چلاتے ہوئے کشمش اور دودھ ملا کر آمیزہ بھونے تک پکا کر چولھا بند کر دیں۔ تھالی کو چکنا کر کے حلوا پھیلائیں۔ اسے چمچ سے ہموار کر کے بادام اور پستے چھڑک دیں۔ چاندی کے ورق سجا کر پیش کریں۔

از: آسیہ عامر، کراچی

باربی کیو چکن پاستا سلاد

اجزا: مرغی کا سینہ، ایک عدد۔ چھنی پاستا (اُبلا ہوا) ۴۰۰ گرام۔ وسابی، ایک چائے کا چمچہ۔ گاجر (باریک کٹی ہوئی)، ایک عدد۔ اناناس (باریک کٹا ہوا)، ایک پیالی۔ بھٹے، ایک پیالی۔ تازہ کریم، ایک پیالی۔ باربی کیو ساس، ۲ کھانے کے چمچ۔ مایونیز ۲، کھانے کے چمچ۔ ہاٹ چلی ساس، ایک کھانے کا چمچ۔ سوئٹ چلی ساس، ۲ کھانے کے چمچ۔ پیپریکا پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ لیموں کا رس، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، پسی ہوئی کالی مرچ، حسب ذائقہ۔ زیتون کا تیل، ۳ کھانے کے چمچ۔ ہری پیاز (باریک کٹی ہوئی) سجانے کے لیے۔

ترکیب: مرغی کے سینے پر تیل، کالی مرچ، نمک ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں گاجر، اناناس اور بھٹے ملا کر ایک گھنٹے کے لیے فرج میں رکھ دیں۔ گرل پین کو گرم کر کے چکنا کر کے سینے کو دونوں جانب سے سینک کر اُتاریں۔ اس کے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں باقی اجزاء اور سبزیاں ملا کر ڈش میں نکالیں۔ اس پر مرغی کے ٹکڑے رکھیں اور ہری پیاز سے سجا دیں۔

از: ایلیا شیراز، لاہور

چنے کی دال کا حلوہ

اجزا: چنے کی دال، آدھ کلو۔ چینی، آدھ کلو۔ تازہ دودھ، ایک لیٹر۔ چھوٹی الائچیاں ۴ عدد۔ چھوٹی الائچی، (پسی ہوئی)۔ ایک چائے کا چمچہ۔ کھویا، آدھی پیالی۔ زردے کا رنگ، ایک چٹکی۔ گھی، ڈیڑھ پیالی۔ بادام پستے، (باریک کٹے ہوئے)۔ چاندی کا ورق سجانے کے لیے۔

ترکیب: چنے کی دال ۶ گھنٹوں کے لیے بھگو دیں۔ اسے ایک لیٹر دودھ کے ساتھ گلنے کے لیے رکھ دیں۔ دودھ خشک ہو جائے اور دال گل جائے تو چوپر میں پیس لیں۔ دیگچی میں گھی گرم کریں۔ اس میں الائچی توڑ کر ڈال لیں، اس میں دال ڈال کر کم از کم آدھ گھنٹے تک بھونیں۔ پھر چینی ملائیں اور گاڑھا ہونے تک بھون لیں۔ اس میں کھویا زردے کا رنگ اور الائچی ملا کر بلبلے اُٹھنے تک بھونیں۔ چولھا بند کر کے حلوا چکنی ٹرے میں نکالیں۔ بادام پستے اور چاندی کے ورق سے سجا دیں۔

از: مہرین بخش، کراچی

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ سائرہ ودم ڈوگر...... کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال ﴾ لوگ ٹریفک کے اشارے کی پروا نہیں کرتے مگر آنکھ کے اشارے پہ مر جاتے ہیں کیا وجہ ہے؟

جواب ﴾ یہی تو بات سمجھنے کی ہے ناکام عاشق۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ حیا جاوید...... ملتان

سوال ﴾ شادی کے ابتدائی دنوں میں "آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کر......" اور شادی کے دس سال بعد؟

جواب ﴾ آئے ہو میری زندگی میں تم بہار بن کے...... یہی سننا چاہتی ہو۔

☆ مسز اکرام شہزادہ۔ ٹاؤن شپ لاہور

سوال ﴾ عورتوں کے آنسوؤں اور مگر مچھ کے آنسوؤں میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴾ ایک اشرف مخلوق ہے دوسرا حیوان فرق صاف ظاہر ہے۔

سوال ﴾ اندھے کو کیا چاہیے...... دو آنکھیں یا دو لینز؟

جواب ﴾ دو آنکھیں وہ بھی چشم بینا۔

☆ فردوس شازیہ...... لاہور

سوال ﴾ مایوسی اگر گناہ ہے تو لوگ یہ گناہ کیوں کرتے ہیں؟

جواب ﴾ اکثر گناہ بے لذت بھی تو ہوتے ہیں۔

سوال ﴾ طعنوں کی مار زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے یا تنہائی کی......؟

جواب ﴾ دونوں کی۔

☆ ریحانہ سعدیہ ڈوگر...... کمالیہ

سوال ﴾ کہتے ہیں داغ تو اچھے ہوتے ہیں مگر کیا دل اور جوانی کے داغ بھی؟

جواب ﴾ بالکل نہیں۔

سوال ﴾ بہار و سیتی ٹائنز ر چیز کا ؤ...... میرا محبوب آیا ہے...... کون سا محبوب......؟

جواب ﴾ ہم کیا جانیں سا تواں ہیجاستر جواں۔

☆ حمیرا انجم وحید...... واہ کینٹ

سوال ﴾ نئے سال کا آغاز ہو چلا ہے آپ نے شوہر اور بچوں کے لیے کیا پلان کیا؟

جواب ﴾ اچھے، اچھے پکوان اور کیا۔

سوال ﴾ دلوں پر راج کرنے والے لوگ کون ہیں؟

جواب ﴾ جو دلوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے ہیں۔

☆ تسنیم کوثر...... کراچی

سوال ﴾ سستی چیزیں بالکل بھی اچھی نہیں ہوتیں مگر اچھی چیزیں بھی سستی نہیں ملتیں تو بھی کیا کریں کہ ہر چیز اچھی، اچھی ہو جائے؟

جواب ﴾ آنکھ سے دیکھو دماغ سے جانچو اچھا اور سستا۔

سوال ﴾ جلدی سے بتایئے خواتین دوسری خاتون کی تعریف و توصیف کرنے میں کنجوسی سے کیوں کام لیتی ہیں؟

جواب ﴾ اصل میں ہر چیز میں کنجوسی کرتے، کرتے اس میں بھی عادت پڑ جاتی ہے۔

سوال ﴾ بزمِ پاکیزہ کی گمنام بہن ذرا نام تو بتایئے آپ نزہت اصغر ہیں، آمنہ حماد ہیں، صغریٰ زیدی ہیں، شائستہ زریں ہیں وغیرہ......؟

جواب ﴾ جو بھی آپ سمجھیں...... کیوں جواب پسند نہیں آتے۔

سوال: کہیں پر پڑھا تھا کہ زندگی کی سانسیں دنیا میں بہت کم ہوتی ہیں مگر قبر کی عمر بے حد لمبی ہوتی ہے ٹھیک ہے ناں.....؟

جواب: صرف سنا نہیں دیکھا جانچا پرکھا سبق حاصل کیا۔

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

سوال: اس زمانے میں سو فیصد سچ بول کر زندگی گزارنا کیسا ہے؟

جواب: مشکل ترین۔

سوال: وقت تو وقت پر بدلتا ہے اور انسان کسی بھی وقت بدل جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: خطا کا پتلا جو ٹھہرا۔

☆ فریدہ جاوید..... ملتان

سوال: کسی کو ناچ کیسے نچایا جاتا ہے؟

جواب: میڈم جی کو دل مرچی کھلا دو۔

سوال: مرد کے لیے سونا حرام ہے مگر میرے میاں تو گدھے گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

جواب: شکر ہے صرف گدھے گھوڑے ہی بیچتے ہیں..... گھر کا باقی سامان تو سلامت ہے ناں۔

☆ پروین افضل شاہین..... بہاولنگر

سوال: ہنسلی کا جوڑ یا بیکلی کا جوڑ کون سا ہوتا ہے؟

جواب: برفی کا جوڑ بس جلدی سے کھالو۔

سوال: اپنے بال کی کھال کس سے نکلواؤں؟

جواب: ایک سے ایک ماہر کھال موجود ہے ناں نیٹ پر۔

سوال: جھوٹ بولے کوا کاٹے اور سچ بولیں تو کیا ہوگا؟

جواب: ابا ڈانٹے۔

سوال: میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین میرے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے لڑکیوں کو کیوں گھورتے ہیں؟

جواب: وہ اُن کے گنج پن پر ہنس کے کیوں گزرتی ہیں، وہ تو گھوریں گے۔

☆ ثمرینہ قیصر..... کمالیہ

سچ بول کر ذلیل و خوار ہونے اور جھوٹ بول کر ذلیل و خوار ہونے میں کیا فرق ہے؟

جواب: عارضی اور مستقل کا۔

سوال: انسان کو محبت نہ ملے تو صبر نہیں کرتا اور محبت مل جائے تو قدر نہیں کرتا آخر کیا وجہ ہے؟

جواب: ناشکرا اور بے قرار ہے انسان۔

☆ ساجدہ..... پنجاب

سوال: لوگ دنیا کو بدلنے کی بات کرتے ہیں مگر خود کو بدلنے کی بات نہیں کرتے..... کیا وجہ ہے؟

جواب: یہی تو ناسمجھی ہے۔

سوال: یہاں سے بچ کر کوئی نہیں گیا پھر لوگ زندگی کو اتنا سیریس کیوں لیتے ہیں؟

جواب: بس آج سے تم بھی نہ لینا ڈیئر۔

☆ لائبہ کائنات..... لاہور

سوال: درختوں کی خزاں اور دماغ کی خزاں میں کیا فرق ہے؟

جواب: اول الذکر قابل برداشت ہے۔

سوال: پتھروں سے زندگی کا سفر مشکل ہو جاتا ہے یا پتھر دلوں سے؟

جواب: پتھر دل و دماغ دونوں سے۔

☆ ثمرینہ قیصر..... کمالیہ

سوال: اگر خواب اور خیال دل کی دیواروں میں قید ہو کر رہ جائیں تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: قرطاس پر بکھیر دو۔

سوال: سگریٹ اور عورت میں کیا بات مشترک ہے؟

جواب: سلگتی دونوں ہیں۔

☆ نرگس نسیم صبا موہڑہ..... چکوال

سوال: آبیل مجھے مار..... جب خود منہ سے بول کر بیل سے خود کو مارنے کو بولتے ہیں تو پھر دہائی کیوں دیتے ہیں؟

جواب: یقین نہیں ہوتا ناں کہ وہ آ بھی جائے گی مارنے۔

سوال: آسمان جب ہمارے سر کے اوپر ہی ہے تو مزید کیسے آسمان کو سر پر اٹھاتے ہیں؟

جواب: نادانی میں..... آنکھیں مزید آگے نہیں دیکھتیں۔

☆☆☆

الاسماء الحسنیٰ

وللّٰہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بہا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس شخص نے ان کو محفوظ کیا وہ بہشت میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

لفظ ''اللہ'' اس کا ذاتی نام ہے بقیہ صفاتی نام ننانوے ہیں۔ ان ناموں کو ایک خاص طریقے پر پڑھا جائے تو اس کے بہترین اثرات مرتب ہوتے ہیں اللہ کے ان ناموں کو پڑھنے کا ادب تو یہی ہے کہ ان کو جب بھی پڑھا جائے پاک حالت میں وضو کے ساتھ پڑھا جائے لیکن اگر بے وضو اور خواتین اپنے خصوصی ایام میں بھی پڑھنا چاہیں تو شریعت میں اس کی اجازت ہے لہٰذا ان ناموں کو ہر حال میں پڑھا جاسکتا ہے۔

آنکھوں کی بیماری سے شفا۔ یا شکور اکتالیس مرتبہ پانی پر دم کر کے وہ پانی آنکھوں پر لگائے اور باقی پانی پی لے تو ان شاء اللہ سات روز میں شفا ہوگی۔

اولاد صالح

یاقدوس ہر روز اکتالیس 41 مرتبہ پانی پر دم کر کے بیوی کو پلائیں تو بچہ صحیح سالم وتندرست اور نیک و صالح ہوگا۔

آنکھوں میں پانی اترنا

یا بصیر گیارہ سو دفعہ پڑھنے اور آنکھوں پر دم کرنے سے بہت جلد آنکھوں کو فائدہ ہوگا۔

بچھو کا کاٹنا

اگر بچھو کاٹ لے تو یا واسع ستر دفعہ پڑھ کر تھوڑے سے شورہ پر دم کر کے اس کو پانی میں گھول لے اور پھر جس جگہ بچھو نے کاٹا ہو اس پر پانی لگائے تھوڑی دیر میں تکلیف جاتی رہے گی۔

بیماری سے شفا

اگر کوئی شخص سات دن تک دس مرتبہ یاماجد کسی شربت یا دوا پر پڑھ کر کسی مریض کو کھلائے تو اس مریض کو شفا نصیب ہوگی۔

بیٹے کے لیے

اگر کسی کے بیٹا نہ ہوتا ہو تو وہ یاواحد رمضان کے پہلے جمعے کو بعد نماز جمعہ ایک سو ایک 101 مرتبہ لکھ کر اس کو بطور تعویذ گلے میں پہن لے۔ یہ تعویذ اپنے داہنے بازو پر باندھے۔ ان شاء اللہ اسی سال فرزندِ صالح ہوگا۔

بیٹے کی خواہش

اگر بیٹا نہ ہوتا ہو تو وہ شخص چالیس دن تک چالیس مرتبہ پڑھے یااول اور اس کو پانی یا شربت پر دم کر کے آدھا خود پیے اور آدھا بیوی کو پلائے۔ ان شاء اللہ بیٹا بھی ہوگا اور روزی میں برکت ہوگی۔

بچوں کی ضد اور رونا

یامتعنت سات دفعہ پڑھ کر مٹی کے برتن یا مٹی کے چراغ پر دم کرے پھر اس میں بچے کو پانی پلادینے سے بچے کی ضد اور رونا بند ہو جائے گا۔

بواسیر، کینسر سے نجات

یامالک اور یاقدوس ہر روز فجر اور مغرب کی نماز کے بعد گیارہ، گیارہ مرتبہ پڑھنے سے بواسیر کینسر میں

جلانا ہوگا۔

بے ہوش کو ہوش میں لانا

یا رحمن یا سلام ایک ہزار مرتبہ بے ہوش کے سرہانے پڑھنے سے بے ہوش کو ہوش آجائے گا۔

چار عظیم فائدے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سو (۱۰۰) مرتبہ

لا اله الا الله الملك الحق المبين

پڑھے (تو یہ کلمات) اس کے لیے فقر و فاقہ سے حفاظت کا ذریعہ اور قبر کی وحشت و تنہائی میں انسیت کا باعث ہوں گے اور ان کلمات (کی برکت) سے پڑھنے والا غنا (ظاہری اور باطنی) حاصل کرے گا اور (قیامت کے دن) ان کلمات کی برکت سے وہ جنت کے دروازے پر دستک دے گا۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزانہ سو بار پڑھنے والے کو چار بڑے، بڑے فائدے حاصل ہوں گے ان میں سے ہر فائدہ ایسا ہے جس کا ہر شخص محتاج ہے لہٰذا ہر شخص کو ہر روز اس کی ایک تسبیح پڑھ لینی چاہیے وہ فوائد یہ ہیں۔

۱۔ فقر و فاقہ اور معاشی تنگی دور ہونا۔

۲۔ قبر کی وحشت دور ہو کر راحت و انسیت حاصل ہونا۔

۳۔ غنا ظاہری و باطنی نصیب ہونا۔

۴۔ جنت کے دروازے پر دستک دینے اور جنت میں داخل ہونے کی سعادت ملنا۔

اسّی سال کی عبادت کا ثواب

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے اسی مرتبہ یہ درود شریف پڑھے۔

اللهم صل على محمد ن النبي الامي وعلى آله وسلم تسليما

تو اس کے اسی سال کے گناہ معاف ہوں گے اور اسی سال کی عبادت کا ثواب اس کے لیے لکھا جائے گا۔ (القول البدیع)

بیس لاکھ نیکیاں

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص (ایک مرتبہ درج ذیل کلمات) کہے۔

لا اله الا الله وحده لا شريك له احدا صمدا لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا احد

تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے لیے بیس لاکھ نیکیاں لکھیں گے۔ (الترغیب والترہیب)

مذکورہ کلمہ ایک بار کہنے پر بیس لاکھ نیکیاں ملتی ہیں اگر ہر فرض کے بعد یا اس سے پہلے یہ کلمہ پانچ بار کہہ لیا کریں تو روزانہ بہ آسانی ایک کروڑ نیکیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔ آپ بھی حاصل کر لیجیے۔ کل یہ نیکیاں کام آئیں گی، ان شاء اللہ۔

دوزخ سے بری

حضرت ابوالدرداءؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص (ایک مرتبہ) لا اله الا الله والله اكبر کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس (کے جسم) کا ایک چوتھائی (حصہ) دوزخ سے بری کر دیتے ہیں، اگر دو مرتبہ کہے تو اس (کے جسم) کا آدھا حصہ جہنم سے آزاد کر دیتے ہیں اور اگر چار مرتبہ یہ کلمہ کہے تو اللہ تعالیٰ اس کو (مکمل طور پر) دوزخ سے بری کر دیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد)

روزانہ صبح اور شام لا اله الا الله والله اكبر چار، چار مرتبہ کہنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ان وظائف کو ورد میں رکھنے کے بعد بخشش کی تمنا ضرور کریں مگر پہلے گناہوں سے بچیں۔

☆☆☆

غذا سے اپنے حسن کا نکھار

قدرت نے بے شمار ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن کے درست استعمال سے آپ نہ صرف اپنی صحت بہتر کر سکتی ہیں بلکہ حسن میں بھی نکھار پیدا کر سکتی ہیں۔ ذیل میں چند ایسی غذائی اشیا درج کی جا رہی ہیں جنہیں آپ نہ صرف نوش فرما کر مختلف صحت کی شکایات سے محفوظ رہ سکتی ہیں بلکہ بیرونی طور بھی استعمال کر کے اپنی جلد اور چہرے کی رونق اور دل کشی میں اضافہ کر سکتی ہیں۔

انڈا۔ غذائی طور پر اس میں حیاتین د کافی مقدار میں پایا جاتا ہے جو دانتوں کو مضبوط اور صحت مند رکھنے اور ہڈیوں کی ساخت کے لیے بہت ضروری ہے۔ انڈے میں حیاتین الف بھی پایا جاتا ہے۔ اس حیاتین کی کمی سے شب کوری (رات میں نظر نہ آنے) کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔

انڈے کی زردی بالوں میں لگا کر نکھار دینے سے بال صحت مند رہتے ہیں۔ انڈے کی سفیدی میں لیموں کا رس ملا کر لگانا چکنی جلد اور بالوں کے لیے بہترین تدبیر ہے۔

دودھ۔ دودھ ہر عمر کے افراد کے لیے بہترین غذا ہے۔ اس میں کیلشیم، حیاتین الف، د، آیوڈین اور فلورین کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔

یہ بذاتِ خود جلد کو صاف کرنے والا بہترین جز ہے۔ ہلدی کے سفوف میں دودھ ملا کر کٹی ہوئی جلد پر لگانے سے زخم جلد مندمل ہو جاتا ہے۔ بیسن میں دودھ ملا کر چہرے پر اس کا ماسک لگانے سے جلد صاف اور چمک دار ہو جاتی ہے۔

بادام۔ غذائی طور پر دیگر تمام مغزیات کی طرح اس میں بھی فولاد اور حیاتین و (وٹامن ای) کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ حیاتین و جلد کی بیرونی کیفیت اور اندرونی ساخت کی صفائی دونوں کے لیے موثر ہے۔ فولاد آپ کے رخساروں کو گلاب کی طرح رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی درست مقدار آپ کو سرخ و سفید رکھتی ہے۔ بال اور دانت صحت مند رہتے ہیں۔

روغن بادام حسن کے نکھار کے لیے بہترین چیز ہے۔ یہ خاص طور پر ہونٹوں اور آنکھوں کے نیچے کی نرم و نازک جلد کو صحت مند رکھتا ہے اور انہیں خوش نما بناتا ہے۔

خلاف علاوہ مغزیات کی طرح اس میں بھی حیاتین الف اور ج ہوتے ہیں جو آنکھوں اور جلد کی چمک کے لیے ضروری ہیں۔

کھیرا۔ اس کا گودا یا محض ایک قتلہ چہرے پر لگانے سے جلد کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ اس کے کھانے سے جلد کے داغ دھبے غائب ہو جاتے ہیں۔

پپیتا۔ آنکھوں کو صاف اور چمک دار رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پپیتا نظام ہضم میں موجود خامروں (اینزائم) کو تحریک دے کر جلد کو چمک دار بناتا ہے۔ پپیتے کا چھلکا جلد پر رگڑ کر لگانے سے جلد کا رنگ نکھر جاتا ہے اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

لیموں اور نارنگی تمام ترش پھل مثلاً لیموں، نارنگی، مالٹا، کینو، سنگترہ، موسمی وغیرہ حیاتین الف اور ج سے بھرپور ہوتے ہیں۔ یہ گرمیوں میں جلد کو خصوصیت سے تر و تازہ رکھتے ہیں اور روغنی غذاؤں کے استعمال سے ہونے والی خارش اور جلد کی شکایات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

لیموں کا رس جلد پر لگانے سے جلد صاف ستھری ہو جاتی ہے۔ یہ چکنی جلد کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ انڈے کی زردی کے ساتھ لیموں کا رس ملا کر لگانے سے چہرے کی رنگت نکھر جاتی ہے۔ جن خواتین و حضرات کے بالوں میں بفا (بھوسی یا خشکی کے چھلکوں) کی شکایت ہو انہیں بال دھونے سے پہلے تھوڑا سا رس اچھی طرح بالوں میں لگا لینا چاہیے۔ موسمی، کینو، مالٹا وغیرہ کے چھلکے خشک کر کے سفوف بنا کر دودھ میں ملائیں اس کو چکنی جلد پر لگانے سے جلد صاف اور چمک دار ہو جاتی ہے۔

آلو۔ آلو بہت ہی بہترین غذا ہے۔ اس میں ریشہ بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ حیاتین ب اور ج آلو میں کافی مقدار میں ہوتا ہے جو آپ کے بالوں کو بڑھاتا ہے اور جلد کو چمک دار رکھتا ہے۔ آلو چھیل کر اس کا رس نکالیں اور آنکھوں کے ارد گرد لگائیں اس کے استعمال سے چند دنوں ہی میں آنکھوں کے گرد پائے جانے والے سیاہ حلقے غائب ہو جائیں گے۔ ☆☆
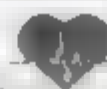
اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

وزن کی زیادتی و جلدی مسائل

اریبا فہد...... لاہور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا جسم روز بروز موٹا ہوتا جارہا ہے۔ جبکہ میں مرغن غذائیں اور پراٹھا بھی نہیں کھاتی۔ میرا پیٹ بہت بڑھا ہوا ہے اور کولہے بھی۔ چہرے پر بہت زیادہ داغ، جھائیاں اور تل ہیں جو کہ براؤن اور بلیک ہیں۔ سارا چہرہ سیاہیوں سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر ناک پوری سیاہ ہوگئی ہے۔ اور گول وائروں کی صورت میں بدنما داغ ہیں۔ سہیلیاں ہر وقت باتیں کرتی ہیں۔ وزن کے بارے میں خاص طور پر مذاق کرتی ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز ڈاکٹر صاحب میرے تمام مسائل کا حل ضرور بتایئے گا۔

جواب: وزن بڑھنے کے اسباب میں کھانا، اوور ایٹنگ، آرام طلب زندگی، نیند کم زیادہ لینا کے علاوہ ہارمونز ایک اہم سبب ہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ مینسز آپ کو کیسے ہوتے ہیں۔ لیکوریا کی شکایت کیسی ہے۔ عمر لکھی، نہ وزن اور نہ قد لکھا جس سے اندازہ کیا جاتا کہ اگر وزن زیادہ ہے تو کتنا؟ (قارئین نوٹ کرلیں، نامکمل معلومات پر دوا تجویز نہیں کی جائے گی) آپ کی دی گئی معلومات کے مطابق آپ کو رحم کا مسئلہ ہے اور Ringworm کا بھی۔

چہرے کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thuja30, Sepia30, Graphite30 کے 3،3 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد تمام تفصیل کے ساتھ آگاہ کریں۔

کریں۔ Ferrum Pentarkan Ptk45 کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں یا آکر چیک اَپ کرائیں۔

لیکوریا

ریحانہ......کراچی

ڈاکٹر صاحب بہت امید سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں بہت خوشی ہوتی ہے جس طرح آپ لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھے 13 سال کی عمر سے لیکوریا ہے۔ 16 سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ 7 سال بعد امید سے ہوئی، مینسز کا بھی پرابلم رہتا ہے۔ پاؤں لٹکا کر بیٹھتی ہوں تو ایڑھی میں شدید تکلیف ہوتی ہے خاص طور پر سیدھے پاؤں میں۔ کپڑے دھونے میں ہاتھوں میں درد ہوتا ہے۔ رگیں پھول گئی ہیں گلٹیاں بھی ہو گئی ہیں ابھار کی طرح۔ ڈاکٹر نے کہا کیلشیم اور خون کی کمی ہے۔ میرے جسم پر تل ہونے شروع ہو گئے جو مسے بن جاتے ہیں۔ بلیک، براؤن اور ریڈ کلر کے جو بہت بُرے لگتے ہیں اور گرمیوں میں خارش ہوتی ہے۔ اب تو گردن کے بعد چہرے اور ہاتھوں پر بھی پھیل رہے ہیں۔ بال بہت سفید ہو رہے ہیں، جھریاں پڑ رہی ہیں ہاتھوں پیروں میں۔ میں ہومیوپیتھک دوا لے رہی ہوں زیادہ فرق نہیں پڑا۔ مجھے ایسی دوائیں بتا دیں جس سے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں۔

جواب: مریض کی بہتری و بھلائی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ معالج سے اپنا چیک اَپ کرائے۔ اس کی تشخیص کے مطابق علاج کرائے۔ آپ کو دوائیں تجویز کر رہے ہیں۔ پھل، سبزیاں، گوشت اور دالوں کا استعمال مناسب مقدار میں کریں۔ ہلکی پھلکی ورزش بھی کریں۔ ڈاکٹر... ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل دوائیں استعمال کریں۔ Borax30, Secale.cor30, Calc. Carb30, Thuja30 کے 7، 7 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال

اٹک کر بولنا

مریم......دیر

میرا بیٹا جس کی عمر ڈھائی سال ہے، اس نے بولنا شروع کیا تو اس کی زبان بالکل صاف تھی لیکن اب تین، چار ماہ سے وہ بولتے ہوئے ہکلاتا ہے اور ایک لفظ کو تین چار بار بولتا ہے۔ سوتے میں اس کے منہ میں پانی آتا ہے جس سے وہ نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اور بہت روتا ہے۔ اکثر پیٹ میں بھی درد ہوتا ہے۔ پیٹ کے کیڑوں والی دوا بھی دی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے کچھ ٹیسٹ بھی کرائے ہیں، شکر ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں آیا۔

جواب: ایسا جب ہوتا ہے جب بچے کو ڈانٹا، مارا یا خوف زدہ کیا جائے۔ بچے کو پیار و محبت دیں اس سے کہیں کہ جلدی جلدی نہ بولے بلکہ آرام سے ٹھہر ٹھہر کر بولے اور آپ کے شوہر اور آپ صبر و حوصلے سے کام لیں۔ بچے کے سامنے جھگڑیں مت۔ بچے کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک خوراک Ignatia200 کی دیں اس کے 2 دن بعد Stramonium30 کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

الرجی

زیبا ریحان......چیچہ وطنی

مجھے کئی سالوں سے چھینکوں کی الرجی کی شکایت ہے، ریشہ بھی حلق میں گرتا ہے اور ناک کے اندر خارش بھی ہوتی ہے۔ تین ماہ پہلے ناک کا آپریشن کروایا تھا، جس سے پہلے سے تو بہتر ہے مگر ابھی تک مکمل آرام نہیں آیا۔ بعض اوقات چھینکیں نہیں آتیں اور بعض اوقات تو بہت زیادہ آتی ہیں پھر اینٹی الرجی دوا لینی پڑتی ہے۔

جواب: جب ناک کا گوشت یا ہڈی بڑھی ہوئی ہوتی ہے تب بھی اس طرح چھینکیں آتی ہیں۔ کولڈ ڈرنک، تیز ٹھنڈا پانی کا استعمال بند کریں۔ نہانے کے بعد سینے کو ہوا سے بچائیں، اے سی میں نہ آئیں یعنی گرم ٹھنڈا اور ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ وضو کرتے وقت ناک میں پانی اوپر تک چڑھائیں۔ ایک سے دو مرتبہ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کو ناک میں اوپر چڑھایا کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کریں پھر تفصیل کے ساتھ حال بتائیں۔ Natr.mur 30, Teucrium Marum 30, Belladona 30, کے 7،7 قطرے۔ ہر شیشی میں سے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

کم عمری میں بلڈ پریشر

کریم فیصل......فیصل آباد

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے 19 سال کی عمر سے ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ اب اکثر سر کی رگیں کھنچ جاتی ہیں۔ گھٹنوں میں بھی بہت درد ہوتا ہے۔

جواب: آپ سب سے پہلے Blood CP + , ESR Lipid Profile HbA1C Renal Function Test Thyroid Profile کرائیں۔ 19 سال کی عمر میں بی پی ہرگز نہیں بڑھنا چاہیے اس طرح یہ گردوں پر اثر ڈالے گا، شوگر بھی بڑھ سکتی ہے۔ اپنی فیملی ہسٹری بھی دیں تاکہ دوا صحیح تجویز ہو سکے۔

ناک کا گوشت

نیلوفر سعید......لطیف آباد

میرے حلق میں ریشہ گرتا ہے اور ناک میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ پھنسا ہوا ہے۔ سانس لینے میں مسئلہ ہوتا ہے۔ اکثر سوتے میں ریشہ حلق میں گرنے سے میرا دل بھی خراب ہوتا ہے۔ میں سارا دن ریشہ تھوکتی رہتی ہوں۔ برائے مہربانی میرے ان مسائل کا حل ضرور بتائیے گا مجھے انتظار رہے گا اور یہ بھی بتائیں کہ دوا... کتنا عرصہ استعمال کرنی ہے؟

جواب: آپ کی ناک میں گوشت یا ہڈی بڑھنے کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ دھول، مٹی اور تیز خوشبو سے بچیں، ٹھنڈا اور ٹھنڈی چیزوں سے احتیاط کریں۔ 4/5 مرتبہ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں اوپر تک چڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل میڈیسن استعمال کریں Cinnabaris Pentarkan Ptk31 کی 3،3 گولیاں دن میں 3 مرتبہ چبا کر کھائیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

حالت بہتر ہے!

حدیقہ......لاہور

پچھلے چار ماہ سے آپ کی بتائی ہوئی ادویات استعمال کر رہی ہوں۔ اللہ کے کرم سے چہرے کے بال کم ہو رہے ہیں۔ حافظہ بہتر ہو رہا ہے اور سر کا سن ہونا بھی بہتر ہے۔ مجھے گنج پن کا مسئلہ بھی ہے۔ سر کے بال سامنے سے بہت کم ہیں کہ جلد دکھائی دیتی ہے۔ بال دو منہ بھی ہیں۔ کچھ دنوں سے مجھے لیکوریا کا پرابلم بھی ہو رہا ہے۔

جواب: جو دوائیاں پہلے تجویز کی ہیں ان کو اب صرف صبح و شام لیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Kreosotum30, Graphite30 کے 3، 3 قطرے دن میں 3 بار لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔ نمبر پاکیزہ ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔

قد چھوٹا، وزن زیادہ

ارم......کلفٹن

عمر کے لحاظ سے میری بیٹی کا قد چھوٹا اور وزن زیادہ ہے۔ آپ سے وزن کم کرنے اور قد بڑھانے کی دوا کے بارے میں پوچھنا تھا۔ پلیز جواب ضرور دیں۔

جواب: آپ کی بیٹی کا وزن اور قد دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ اچھی متوازن خوراک دیں اور ورزش کرائیں، پیار و محبت کے ساتھ پیش آئیں۔ کسی قسم کی کوئی

دوا کی ضرورت نہیں۔

قد اور بڑھانا ہے

سفینہ......لاڑکانہ

میں نے آپ کو اپنے دو بیٹوں کے متعلق لکھ کر بھیجا تھا، ان کے قد چھوٹے ہیں، عمر کے لحاظ سے آپ نے جو دوا تجویز کی تھی اس سے زیادہ فرق نہیں پڑا۔ 3 ماہ دوا کھلائی ہے مگر قد بہت کم بڑھا ہے۔ پلیز بیٹوں کے لیے مزید دوا تجویز کر دیں تاکہ ان کے قد بڑھ جائیں۔

جواب: بیٹوں کا قد پہلے کیا تھا؟ 3 ماہ میں کتنا قد بڑھا یہ لکھیں اور کونسی ادویات دی تھیں یہ بھی لکھیں۔ قد آہستہ آہستہ بڑھتا ہے ایک دم نہیں ورنہ اونٹ یا جرافہ بن جائے۔ فی الحال جو دوا دی تھی اس کو استعمال میں رکھیں۔ تفصیل کے بعد بتایا جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔ ہاں متوازن غذا اور ورزش کا خیال رکھیں۔

حساس بچہ

قمر النساء......خیرپور

آپ کا یہ سلسلہ خدمت خلق بہت اچھا ہے اسے میں شوق و دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس خدمت کی جزائے خیر عطا فرمائے (آمین) میرے بیٹے کی عمر ساڑھے سات سال ہے۔ بچے کا پیٹ باہر نکل آیا ہے اور وزن 40 کلو ہے۔ اگرچہ میں نے اسے جنک فوڈ کا عادی نہیں بنایا۔ گھر کا سادہ کھانا، روٹی اور چاول، سبزی، دال کا استعمال ہے، گوشت نہیں کھاتا، چکن بھی پسند نہیں۔ فروٹس اور دودھ کا دن میں دو تین بار استعمال ہے۔ کوک یا جوسز بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیونکہ ٹانسلز کا پرابلم ہے۔ گلا بہت حساس ہے بہت زیادہ پرہیز کرواتی ہوں۔ ٹھنڈے اور کھٹے سے۔ 4 سال کی عمر میں ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے کہا تھا لیکن نہیں کروایا۔ یہی چاہتی ہوں کہ اسے ہومیو یا قدرتی طریقہ علاج سے شفا مل جائے۔ اب تو گلا اس قدر حساس ہو گیا ہے کہ پراٹھا بھی نہیں کھا سکتا۔ لیکن جب موسم ٹھنڈا ہو یا حساسیت زیادہ ہو رہی ہو تو پرابلم ہو ہی جاتی ہے۔ پھر اینٹی بائیوٹک لینی پڑتی ہیں کیونکہ مسلسل کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر میڈیسن نہ دوں تو فیور بھی ہو جاتا ہے۔ ٹانسلز کے ساتھ ناک بھی بند ہو جاتی ہے۔ رات کو سانس ٹھیک سے نہیں آتی اور بہت بے چین رہتا ہے۔ ناک کے ایکسرے ہوئے تھے اس میں کوئی پرابلم نہیں آئی۔ رات کو سوتے میں بہت بے چین رہتا ہے۔ ہر وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ پیشاب میں بدبو زیادہ ہے۔ پانی کم پیتا ہے۔ بچپن سے قبض رہتا ہے۔

جواب: بچوں کے بھی جذبات اور احساسات ہوتے ہیں خواہ بچہ نومولود ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ہم بڑے اس کو سمجھتے نہیں اور ان کا خیال نہیں رکھتے اس کا اظہار بچے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر پھر بھی بات ہوگی۔ بچے کو ٹھنڈ سے بچائیں اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ کوئی بھی گرم چیز کھلا کر پانی نہ پلائیں۔ حتیٰ کہ کلی بھی نہ کرائیں۔ 5 نوالے خالی روٹی کھلا کر پھر کلی کرا سکتی ہیں۔ کوئی بھی چیز کھا کر پانی پینے کی عادت ختم کرا دیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Calc.Carb30, Ferr.Phos30, Rhustox 30 کے 5،5 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ 2 ماہ بعد حال بتائیں۔

ہاتھوں میں سن ہونے کا احساس

سمیرا عنایت......سرگودھا

میرے ہاتھ اکثر سن ہو جاتے ہیں۔ بازو موڑ کر سونے سے زیادہ ہوتے ہیں۔ بازو سیدھا رکھوں تو بہتر رہتا ہے۔ کافی علاج کرایا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کا حل سرجری ہے جو کہ میں کروانا نہیں چاہتی۔ برائے مہربانی ہومیوپیتھی میں اگر اس کا کوئی علاج ہے تو مجھے ضرور بتائیں اور دوا بھی تجویز کریں، بہت مشکور ہوں گی۔

جواب: محترمہ آپ کو اپنی رپورٹس بھی بھیجنی چاہیے تھیں۔ تاکہ ہم اپنے طور پر اس کو جانچ سکیں۔ لہٰذا پہلی فرصت میں رپورٹس بھیج دیں۔ ساتھ خون کا ٹیسٹ

HbA1C بھی کرائیں۔ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb30 اور Rhustox30 کے 10،10 قطرے 1/4 کپ پانی میں ڈال کر دن میں 4 مرتبہ پئیں۔

جسمانی نشوونما

شبانہ رئیس......راجن پور

ڈاکٹر صاحب میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ ہومیو کلینک سے استفادہ کیا ہے۔ امید ہے اب بھی آپ کا بورڈ میرے مسئلے پر غور فرمائے گا۔ مسئلہ میری بیٹی کا ہے۔ میری بیٹی کی عمر تقریباً ساڑھے دس سال ہے۔ اس پر جوانی کے آثار بہت جلد نمایاں ہو گئے ہیں۔ مینسز وغیرہ تو ابھی نہیں آئے مگر اس کا اوپری جسم تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ 13-14 سال کی بچی ہے۔ برائے کرم مشورہ یا دوا بتا دیں۔

جواب: محترمہ آپ کی بیٹی کے ساتھ معاملہ قدرتی ہے۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ کا استعمال کم کریں۔ متوازن غذا دیں، ورزش کرائیں، صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔

چہرے کے دانے

نازیہ ریاض......بھکر

میں جسمانی طور پر بے حد کمزور ہوں۔ مجھے کافی عرصہ پہلے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ کمزوری بہت ہے، کبھی کبھی چکر آتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چہرے پر دانے نکلے تو ایک اسکن اسپیشلسٹ کو دکھایا، انہوں نے 5 ہفتے علاج کیا وقتی طور پر دانے ٹھیک ہوئے مگر بعد میں اور زیادہ بڑھ گئے جہاں نکلتے ہیں وہاں کالے داغ چھوڑ جاتے ہیں۔ پہلے رنگت صاف تھی اب سیاہی مائل ہوتی جا رہی ہے۔ جسم میں کیلشیم خون اور آئرن کی کمی ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں، اچھی خوراک اور موسم کے پھل کھانے کے باوجود ختم نہیں ہو رہے۔ ایسا نسخہ تجویز کریں جس سے سیاہ حلقے اور میری جسمانی کمزوری دور ہو اور رنگت نکھر جائے۔

جواب: بی بی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بہت ساری وجوہات کے بنا ہو سکتے ہیں۔ نیند کا پورا نہ ہونا، کھانا جسمانی ضرورت کے مطابق نہ کھانا۔ آئندہ خط لکھتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھیے گا۔ ابھی فی الحال ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Kali bromide 30 کے 5،5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی PTK-45 کی 2 گولیاں دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی سے لیں۔ یاد رکھیے گا اپنا حال مکمل تفصیل کے ساتھ لکھنا ہے۔

آنکھ میں دانہ

ریحانہ بتول......لاڑکانہ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھ میں ایک دانہ ہوا تھا جیسے ہو جاتے ہیں آنکھ کی کھال پر۔ مجھے اس میں کوئی تکلیف یا چبھن نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ گرم کپڑے کی سکائی کرو، سکائی کی، ڈاکٹر کو دکھایا، کھانے کے لیے دوا دی اور کہا کہ بیس دن بعد آ کر نتیجہ بتائیں لیکن مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تھوڑی سی سوجن کم ہو گئی لیکن دانہ ابھی تک ہے اور اس کو ہوئے تقریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے مسئلے کا حل بتا دیجیے، میں آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔

جواب: بی بی آنکھ کا معاملہ ہے بغیر دیکھے دوا تجویز نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے آپ آ کر ملیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

☆☆☆